خطباتِ

حکیم الامت

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد - ۱۱

حقیقتِ تصوف و تقویٰ

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

عنوانات

منشی عبد الرحمن خان

تصحیح و تزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ



تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

اِدارۂ تالیفاتِ اَشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

حقیقتِ تصوف و تقویٰ

تاریخ اشاعت................ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
ناشر.........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت.....................سلامت اقبال پریس ملتان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

قارئین سے گذارش

ادراہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ...ملتان مکتبہ رشیدیہ.......راجہ بازار.......راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.... ...انار کلی........لاہور یونیورسٹی بک ایجنسی....خیبر بازار.......پشاور
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار......لاہور ادارۃ الانور.........نیو ٹاؤن.......کراچی نمبر 5
مکتبہ رحمانیہ.......اُردو بازار .... لاہور مکتبہ المنظور الاسلامیہ....جامعہ حسینیہ....علی پور
مکتبہ المنظور الاسلامیہ..........بلاک زیڈ.......مدینہ ٹاؤن.......بنک موڑ........فیصل آباد

ادارہ اشاعت الخیر - حضوری باغ روڈ - ملتان

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K 119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

فہرست مواعظ

التقویٰ

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

المرابطۃ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

المجاہدہ

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ

التحصیل والتسہیل مع التکمیل والتعدیل

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

تکمیل الاعمال تبدیل الاحوال

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

طریق القلندر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ اِنَّمَا

وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ
رٰكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

اوج قنوج

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ

دستور سہارنپور

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ

ترک مالا یعنی

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ

رفع الموانع

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ وَاِنْ
تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ
وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

سیرت صوفی

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ
وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ
وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ
تَبْتِيْلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا
يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝

فہرست عنوانات

☆……☆……☆……☆

التقویٰ

وہ ذراسی بات جو تصوف کا حاصل ہے۔ یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی ہو سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کرے۔ اور جس گناہ کا تقاضا ہو تقاضے کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے۔ جس کو یہ بات حاصل ہوگئی اس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے یہی اس کی محافظ ہے اور یہی اس کو بڑھانے والی ہے۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰه نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (تغابن)

ترجمہ: سوڈ رواللہ سے جہاں تک ہو سکے اور سنواور مانواور خرچ کرواپنے بھلے کواور جس کو بچادیا اپنے جی کے لالچ سے سووہ لوگ وہی مراد کو پہنچے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

تمہید: یہ ایک آیت ہے۔ سورہ تغابن کی جس کو اس وقت بیان کے لئے قصداً نہیں اختیار کیا گیا بلکہ ایک اتفاقی امر ایسا پیش آیا جس سے اس کو اختیار کیا گیا وہ یہ کہ کل میں سیو لی تھا۔ وہاں کے بیان میں تین آیتیں پڑھی گئی تھیں۔ ایک یہ اور ایک اس کے قبل کی اور ایک اس کے بعد کی سیولی میں تو قبل کی آیت کو بیان کیا گیا بوجہ مناسبت وہاں کے حالات کے اب یہ ان تینوں میں کی دوسری آیت ہے۔ مناسب معلوم ہوا کہ چونکہ سفر ایک ہے اس لئے اس سفر میں اول ان ہی آیتوں کو بیان کیا جاوے۔ چنانچہ اس وقت اس آیت کو اختیار کیا گیا اور عجب نہیں کہ کل آئندہ کے بیان میں اس کے بعد کی آیت کا بیان ہو۔ اس طرح سے یہ آیت سلسلہ بیان میں آ گئی مگر اب یہاں اسباب خارجیہ سے اس کے بیان میں آنے کے ساتھ یہ

مناسب حال بھی ہے اور اگر خاص مناسبت بھی نہ ہوتی تب بھی اس لئے مناسب ہے کہ قرآن مجید میں ہر مضمون ضروری ہے۔ یہ بھی قرآن ہی کی ایک آیت ہے۔ اس بناء پر اس میں کسی خاص ترجیح کے بیان کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ قرآن ایک مطب روحانی ہے اور ہم مریض ہیں تو ہر آیت تمام امراض کا علاج ہے۔ اور اسی وجہ سے قرآن مجید کی عجیب ترتیب ہے کہ اس میں ابواب وفصول نہیں بلکہ ہر مضمون میں ایسی جامعیت کا لحاظ ہے کہ جو آیت بھی لی جاوے وہ ہر مرض کے علاج کے لئے کافی وافی ہے۔ گو ہر مقام پر ظاہر نظر میں کسی خاص مرض کا علاج معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تعمق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مرض کا علاج ہے۔

قرآن اور تصنیف

یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن مجید کا طرز مصنفین کے کتب کے طرز پر کیوں نہیں ہے۔ یعنی طبائع اس بات کی خوگر ہیں کہ ہر باب میں جدا مضمون ہو۔ نماز کا الگ، زکوٰۃ کا الگ، علی ھذا فنون عقلیہ میں بھی یہی بات ہے۔ چنانچہ مولانا نے مثنوی میں کسی معترض کا یہی قول نقل بھی کیا ہے کہ اس نے کہا تھا کہ اس میں دیگر کتب تصوف کے طور پر علیحدہ علیحدہ ہر چیز کا بیان نہیں بلکہ مخلوط طور پر ہے تو مولانا نے اس کا جواب دیا ہے۔ کہ یہ نادانی ہے۔ یہ طرز تو قرآن کا بھی ہے اور اس وقت یہ جواب کافی تھا کہ قرآن کا کوئی منکر نہ تھا۔ مگر اس زمانہ میں تو حدیث اور قرآن کو بھی نہیں چھوڑتے ہیں گو صاف انکار تو نہیں کرتے مگر شبہات لاتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ قرآن میں مسلمانوں کو وسوسہ کا گذر بھی نہ تھا اس میں کاوش نہ ہوتی تھی وجہ یہ ہے کہ قلب میں جس کی عظمت ہوتی ہے اس میں کبھی شبہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ جن لوگوں کے دلوں میں سلطنت کی عظمت ہے اس کے احکام میں کبھی چون و چرا نہیں کرتے خاص کر پرانی وضع کے لوگ کہ ان کا مذہب ہی یہ ہے کہ ع

رموز مصلحت ملک خسرواں دانند (سلطنت کے اسرار ورموز بادشاہ جانتے ہیں) تو نکتہ چینی کا کبھی موقع نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو زبان تک نہیں آتا کہ بغاوت نہ ہو جاوے تو قانون سلطنت میں تو نہیں آتا لیکن قرآن کو ایسا تختہ مشق بنایا ہے کہ الف بے تے کی تمیز نہیں ہے اور قرآن پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ استعداد علمی کی بھی ضرورت نہیں تو اس وقت تو مولانا کا

وہ جواب کافی تھا مگر اب یہ دوسرا سوال پیدا ہوگا۔ کہ قرآن میں یہ کیوں طرز ہے۔ اس لئے میں اس کا جواب دیتا ہوں کہ اس کا سبب ظاہر ہے مگر اسی کے لئے جس کو تعلق بین اللہ و بین العبد معلوم ہے سو اول وہ تعلق سمجھئے کہ کیا ہے سو وہ تعلق ہے شفقت ذاتی کا۔ اس لئے کہ خدا کو کئی غرض نہیں اور جو ایسی شفقت ہوگی وہ نہایت کامل ہوگی۔ ایک مقدمہ تو یہ ہے دوسرا یہ کہ کامل شفقت کا اثر تعلیم میں کیا ہے۔ مثلاً باپ ہے تو جس کو خدا نے باپ ہونے کی دولت عطا فرمائی ہے اس کو تو خوب معلوم ہے لیکن اگر کوئی بیٹا ہے تو اس کو بھی یاد ہوگا باوجود باپ کی شفقت کے اس قدر کامل نہ ہونے کے پھر اس کا ایک خاص قسم کا برتاؤ ہوتا ہے کہ اس کی نصیحت میں کوئی خاص ترتیب نہیں ہوتی جس طرح سے مصنف کی کتاب ہوتی ہے۔ کہ مبوب و مفصل ہوتی ہے اس طرح سے باب کا طرز نہیں ہوتا مثلاً وہ تمیز سکھانے بیٹھا کہ بڑوں کا ادب کیا کرتے ہیں اور اس کو سلام کیا کرتے ہیں۔ عین اس موقع پر بیٹے نے کھانے کا بڑا لقمہ لے لیا۔ باپ نے فوراً کہا کہ بیٹا لقمہ چھوٹا لو تو اگر کوئی کہے کہ باپ کا کلام بے جوڑ ہے تو بھائی تم کو اس لئے بے جوڑ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو شفقت کی اطلاع نہیں جس کو شفقت ہوتی ہے اس کو ربط کے انتظار کی ضرورت نہیں اور اگر باوجود اس کے بھی وہ کلام مرتب اور مربوط ہو تو غایت بلاغت ہے لیکن اگر اس میں ترتیب نہ بھی ہوتی تب بھی غایت درجہ کی حسن و خوبی تھی اور افسوس ہے کہ آج یہی بات جو شفقت کی ایک بالغ دلیل ہے لوگوں کے نزدیک موجب نقص ہے تو وجہ یہ ہے کہ خدا سے تعلق نہیں۔ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کو بھی اجنبیوں کا سا تعلق ہو جو قرآن کے اجزاء میں ربط کو لازم سمجھتے ہیں۔ گو واقع ہے مگر لزوم نہیں ہے۔ تو صاحبو! وہ خدا ہیں آپ چاہے ان سے خدا نہ ہونے کا برتاؤ چاہیں۔ مگر وہ تو خدا ہی ہونے کا برتاؤ کریں گے چنانچہ اس کا اثر ہے جو فرماتے ہیں۔ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ یعنی ہم تم کو ہمیشہ سمجھاویں گے خواہ تم نہ مانو بخلاف غیر شفیق کے کہ جب مخاطب نہیں مانتا وہ تفہیم چھوڑ دیتا ہے۔ غرض خدا کے کلام کا یہ طرز ہے سو اس کا مقتضا یہ تھا کہ اگر اس میں کوئی ترتیب بھی نہ ہوتی تب بھی وہ خوبی ہی تھی اور اب تو ربط بھی ہے۔ جس سے حسن دوبالا

ہو گیا تو حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ربط صریح نہ ہونے کا سبب شفقت ہے اس لئے ہر جگہ جامعیت کی شان ہے کہ ہر مقام پر ہر مضمون سے تعرض ہے یہ دوسری بات ہے کہ کوئی مضمون مدلول بعبارۃ النص ہے اور کوئی مدلول بدلالۃ النص وغیرہ۔ لیکن یہ بات کہ کسی مقام پر صرف ایک ہی مضمون کا بیان ہو یہ نہیں ہے اور اس لئے مجھے کسی خاص آیت کے انتخاب کی ضرورت نہیں ہوئی اور اسی تخصیص کے ضروری نہ ہونے کے سبب میرا یہ معمول ہے کہ لوگوں کے کہنے سننے سے کسی خاص مضمون کا بیان نہیں کرتا۔ گو مشورہ سن لیتا ہوں مگر عامل اس پر ہوں کہ۔

سن لاکھ کوئی تجھے سناوے کیجو وہی جو سمجھ میں آوے

نیز اس کا اثر بھی اچھا نہیں ہوتا اور اصل بات تو ہے کہ جب کلام جامع ہے تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے جب ہر آیت ہمارے امراض کا علاج ہے تو جس مقام سے چاہا آیت پڑھ دی تو مرجح کی ضرورت ہی نہیں لیکن اس وقت یہ ایک اتفاقی مرجح بھی ہے کہ یہ آیت ترتیب میں آ گئی۔ خیر یہ تو وجہ ترجیح تھی۔

اجر عظیم

اب اصل مضمون سنئے کہ اس کے قبل فرمایا تھا۔ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ (اور اللہ کے یہاں بڑا اجر ہے) اس سے یہ آیت مرتبط ہے اور ضرورت ارتباط یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں (ف) ہے جس کا ترجمہ ہے پس اور لفظ پس یا لفظ تو ایسے مقام پر آتا ہے کہ مرتبط ہو ماقبل سے اور یہاں ماقبل میں ربط کے لئے تو سب سے سہل جز وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ہے۔ یعنی جب اللہ کے یہاں بہت اجر ہے۔ تو تم کو چاہیے کہ اس پر نظر کر کے خدا سے ڈرا کرو کیونکہ اس کا مالک اجر عظیم ہونا مقتضی اس کا ہے کہ تم وہ برتاؤ کرو کہ اس اجر کے مستحق ہو جاؤ یعنی استحقاق بسبب وعدہ خداوندی کے نہ اس لئے کہ اس کے ذمہ کسی کا حق واجب ہے اور کیونکر کسی کا حق ہو سکتا ہے اگر حق ہوتا عمل کے سبب ہوتا اور عمل کی کیفیت یہ ہے کہ وہ محض بظاہر آپ کی طرف منسوب ہے ورنہ حقیقت میں وہ آپ کا عمل ہی نہیں کیونکہ تمام آلات ہاتھ پیر جن سے عمل ہوتا ہے سب اسی کے دیئے ہوئے ہیں۔

نیاوردم از خانہ چیزے نخست تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

ہم اپنے گھر سے کچھ نہیں لائے ہیں جو کچھ بھی ہے وہ آپ ہی کا عطیہ ہے۔

میں اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں جو اس کے قبل میرے ذہن میں بھی نہیں تھی کہ آپ کا ایک باورچی ہے اس نے کھانا پکایا تو کیا اس کو حق ہے کہ اس کو اپنا کھانا بتادے۔ ہرگز نہیں کیونکہ سب چیزیں آپ کی ہیں اور ہاتھ پیر جو باورچی کے ہیں تو ان کے تصرف وفعل کو جس سے کھانا پکا ہے۔ ہم نے خرید لیا ہے۔ کیونکہ اجارہ کا خلاصہ مبادلۃ المال بالمنافع ہے تو اس باورچی کی کیا چیز ہوئی۔ کچھ بھی نہیں تو اگر وہ ایسا دعوے کرے تو اس کی تحمیق کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کی کوئی چیز نہیں تو پھر اس مجموعی سامان کا نتیجہ حاصلہ اس کی ملک کیونکر ہوگا پس ایسا ہی آپ کی نماز کا حال ہے کہ اعضاء اس کے دیئے ہوئے ارادہ اس کا دیا ہوا سب کچھ تو اسی کا ہے تو آپ کی کونسی چیز ہے جس سے یہ دعوے ہو کہ میری نماز ہے تو جیسا اس باورچی کا دعویٰ غلط ہے ایسا ہی ہمارا دعویٰ بھی تو اس حالت میں ہمارا کیا استحقاق ہوا بلکہ اتنا فرق ہے کہ باورچی کے منافع تو اصل میں اسی کے تھے جس کے سبب معاوضہ کی ضرورت ہوئی اور یہاں تو شروع ہی سے سب اسی کے پیدا کردہ ہیں معتزلہ نے بڑی غلطی کی کہ خدا تعالیٰ کے ذمہ بندہ کا حق بتلایا اہل سنت نے اس کو سمجھ کر حقیقت کو ظاہر فرمادیا۔ معتزلہ کو دھوکہ ہوا لہ حق علینا وغیرہ نصوص سے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حقیقت کو ایسے مضامین سے ظاہر فرمادیا کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو بے وجہ عذاب دینے لگے تب بھی وہ ظالم نہیں اور آپ کا فرمانا بالکل خدا کا فرمانا ہے۔ گفتہ او گفتہ اللہ بود۔ تو گویا خدا تعالیٰ نے ہی فرمادیا کہ ہم پر کسی کا حق واجب نہیں اور یہ جو فرمایا گیا ہے حق علینا نصر المومنین ونحوہ تو انہوں نے سمجھا نہیں یہ ایسا ہے جیسے بچہ سے کہہ دیں کہ یہ کھٹولا تیرا ہے تو خدا تعالیٰ چونکہ صادق الوعدہ ہیں اس لئے فرمادیا کہ ہم اس کو ایسا پورا کرتے ہیں کہ گویا وہ بندے کے حقوق ہمارے ذمہ ہیں تو شریعت کے سب پہلوؤں کو سمجھنا چاہیے سو اس کو اہل سنت نے سمجھا تو میرے کلام میں جو استحقاق کا لفظ ہے یہ وہ استحقاق نہیں جو معتزلہ نے سمجھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو تفصیلاً مستحق اجر ہونا ہے تو خدا سے ڈرو جس سے دوسرے احکام کا امتثال بھی لازم ہے تو حاصل یہ ہوا کہ تم امتثال کرو یہ حاصل ہے مقام کا اور یہاں چند صیغے امر کے فرمائے ہیں اور تقریر ربط

سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان میں ہر مامور بہ ضروری ہے کیونکہ ان کو اجر عظیم کا مدار قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنے کو اجر سے مستغنی نہیں کہہ سکتا اس لئے ان کا ضروری ہونا بھی ظاہر ہو گیا۔ اگر کوئی استغنا کا دعوے کرے تو اس قسم کے دعوے دو وجہ سے پیدا ہوتے ہیں یا تو اس لئے کہ دین کی طرف توجہ نہیں یا توجہ ہے مگر اپنی احتیاج کی خبر نہیں۔

اشتیاق منافع

واقعی اکثر لوگوں کو ویسا اشتیاق جنت کی نعمتوں کا نہیں جیسا کہ دنیا کے منافع کا اشتیاق ہے اس کو تو گھنٹوں سوچتے ہیں کہ فلاں جگہ سے مال لاویں گے اور اس میں اس طرح نفع حاصل کریں گے۔ غرض ایک شوق کے ساتھ حدیث النفس ہوتا ہے اور ایک ارمان ہوتا ہے اور حوصلہ ہوتا ہے لیکن سچ بتلائیے کہ کبھی یہ بھی حوصلہ ہوا ہے کہ خدا ہم کو توفیق دے کہ عمل کریں اور جنت میں جاویں اور وہاں اس طرح کھاویں گے۔ اس طرح پیئں گے۔ اس طرح حوروں سے باتیں کریں گے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا دیدار دیکھیں گے۔ سو اس کا حدیث النفس ہرگز نہیں ہوتا۔ ہاں کبھی کسی سے سن لیا تو تھوڑی دیر سرسری توجہ ہوگئی پھر کچھ نہیں اور میں کسی اور کو کیا کہوں اپنے ہی کہتا ہوں کہ بہت کم ایسا تمنا اور آرزو ہوئی ہوگی صاحبو! اجر کی احتیاج وہ چیز ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر دوسرے انبیاء بھی نہیں ہیں لیکن احتیاج اجر کے باب میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی نسبت یہ ارشاد ہے کہ حدیث میں ہے کہ ایک مقام پر حضورؐ سفر میں تھے اور اونٹ کم تھے اور سوار زیادہ تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باری مقرر کر دی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی دو آدمی مقرر ہوئے اللہ اکبر غور کیجئے کہ حضور نے کیا مساوات کو عمل میں لا کر دکھلایا ہے۔ آج دعوے تو بہت ہیں جن کو سن کر معلوم ہوتا ہے کہ جنید اور شبلی یہی ہیں لیکن کام کے وقت سب کے پیچھے ہیں صاحبو! ہمارے بزرگوں نے ہمیشہ کام کیا ہے نام نہیں کیا اور آج نام ہی نام مقصود ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کیا ہے اور سلف نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور ابھی بھی پچیس تیس برس پہلے لوگ کام کرتے تھے لیکن یہ نام والقاب سیکرٹری وغیرہ کہیں نہ تھے میں ان لفظوں پر اعتراض نہیں کرتا لیکن اگر عمل

نہ ہوتو بیشک اعتراض ہے پہلے لوگ جو کچھ کر گئے وہ آج نظر بھی نہیں آتا ہم لوگ آج محض ضابطہ کے مولوی ہیں اور پہلے بے ضابطہ کے مولوی ہوتے تھے لیکن ان کی استعدادوں کا آج عشر عشیر بھی نہیں دیکھا جاتا ہم نے اپنے بزرگوں کے متعلق سنا ہے کہ بازار سے پتے اٹھا کر لاتے تھے ان کو پکا کر کھاتے تھے اور بخاری شریف کو لکھ لکھ کر پڑھتے تھے اور آج تو کتاب میں ایک غلطی نکل آئے تو وہ بھی نہیں بنائی جاتی وجہ یہی ہے کہ وہاں خلوص تھا اور یہاں ضابطہ ہے۔ سو ضابطہ میں خلوص کہاں نام تو سب سے بڑا اور کام کے وقت سب سے پیچھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے کبھی نہیں جتلایا کہ ہم تم کو اپنے برابر سمجھتے ہیں لیکن کر کے دکھادیا۔ اب کرنے میں تو کم ہیں مگر ظاہر بہت زیادہ ہوگا۔ کیونکہ کام کرتے ہیں محض مخلوق میں نام پیدا کرنے کو اور نام کہنے سے زیادہ ہوگا غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کر کے دکھلا دیا کہ آپ کے اونٹ میں دو اور شریک تھے حضورؐ نے اس پر یہ عمل کیا کہ تھوڑی دیر خود سوار ہوئے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر اترے اور ان سے فرمایا کہ اب تم سوار ہو۔ انہوں نے عذر کیا تو حضور نے فرمایا کہ بھائی تم ہمت میں مجھ سے زیادہ نہیں اور میں اجر سے مستغنی نہیں ہوں کہ تم تو ثواب لوٹو اور میں ثواب نہ لوں۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے۔

عبدیت کاملہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا کمال یہی عبدیت کاملہ ہے۔ خوب کہا ہے۔ ایک شخص نے ایک نصرانی سے کہا کہ تم جو خدا کہتے ہو عیسیٰ علیہ السلام کو تو ناقص خدا کہو گے اور ہم کہتے ہیں بندہ کامل تو تم ہی انصاف کرلو کہ کمال نسبت کرنا بہتر ہے یا کہ نقص کی نسبت کرنا تو ہم ساری دنیا کے سامنے کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا کمال، کمال عبدیت ہے۔ ہم کسی درجہ میں بھی آپ کے لئے الوہیت ثابت نہیں کرتے تو اس عبدیت کاملہ کے سبب آپ اس پر قانع نہیں ہوئے بلکہ بوجہ اس کے کہ اتنے غیر متناہی کمالات میں اگر ایک چھوٹا سا عمل تناوب رکوب کا کمال نہ ہوا تو کیا حرج ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی اختیار فرمایا اور ہماری یہ حالت ہے کہ جتنا جانتے جاویں چاہیے کہ اجر کی رغبت بڑھتی مگر بالعکس ہم کو تو نیہ میں نفل کی تعریف پڑھنے سے کہ کرنے سے ثواب اور نہ

کرنے میں گناہ نہیں یہ بات حاصل ہوئی تھی کہ اس روز سے نفلیں چھوٹ گئیں تو وجہ یہ ہے کہ ہم کو کامل محبت نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبت کامل ہے تو اس لئے آپ کا دل ایک ذرا سا درجہ چھوڑنے کو بھی نہیں چاہا یہ کام کہ اپنے ساتھی کو سوار کر دینا بالکل معمولی بات ہے ہم تو اگر سفر میں اپنے کسی شاگرد کے ساتھ ہوں تو باوجودیکہ ہمارے ذمہ بھی ہے کہ اس کو بھی راحت دیں مگر سب سے اول اپنے ہی کو کہتا ہوں کہ اس کو پوچھیں بھی نہیں اور یہ واقعی بات ہے اللہ اکبر کیا چیز ہم میں سے کم ہوگئی۔ ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ملاحظہ فرمایئے اگر ہم ہوتے تو فوراً چڑھ بیٹھتے اور شاید ساتھی سے کہتے بھی نہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت کی یہ حالت تھی کہ اتنے بڑے تو کامل اور تعظیم کے معمولی الفاظ کی نسبت بھی فرماتے ہیں کہ ایسا نہ کہو باقی ہماری ہدایت کے لئے اپنے کمالات بھی ظاہر فرماتے ہیں۔

فطری مذاق

یہ دوسری بات ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فطری مذاق یہی ہے کہ آپ نے کبھی مخدوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے کہ ذرا سی بات میں زبان پر یہ لفظ آتا ہے کہ تم ہم کو نہیں جانتے ہم کون ہیں اس کے جواب میں ایک حکایت یاد آ گئی کہ ایک شخص نے ایک بزرگ سے ان کی ایک نصیحت پر کہا تھا کہ **اما تعرفنی** کہ تم مجھ کو نہیں جانتے اور انہوں نے کہا جانتا ہوں **اولک نطفة مذرة واخرک جیفة قذرة وانت بین ذلک تحمل العذرة** یعنی اول تیرا ایک نطفہ ہے اور انتہا ایک گندی لاش ہے اور درمیان حالت یہ ہے کہ پیٹ میں پاخانہ لئے پھرتا ہے تو میں اول سے آخر تک تمہارے پرپرزوں کو جانتا ہوں تو جب کسی کے دل میں ایسا وسوسہ آوے تو خود ہی جواب دے لے خوب کہا ہے۔

زخاک آفریدت خداوند پاک پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

''حق تعالیٰ نے تجھے خاک سے پیدا کیا ہے پس اے بندہ تو خاک کی طرح عاجزی اختیار کر''

اور واقعی ہمارے پاس فخر کی ہے ہی کیا چیز ہم کو اگر شرافت نسب پر دعویٰ ہے تو اول تو اس کا ثابت ہونا ہی مشکل ہے۔ پھر بعد ثبوت ذرا تاریخ اٹھا کر دیکھئے کہ جن کی طرف منسوب ہیں ان میں سے بہت کی نسبت اہل تاریخ نے کس قدر اختلاف کیا ہے اور اگر سب اجزاء

ثابت بھی ہوجاویں تو یہ کیا فخر ہے کہ ہم فلاں کی اولاد ہیں جبکہ ہم ویسے نہ ہوں۔

لئن فخرت باباء ذوی نسب لقد صدقت ولکن بئس ماولدوا

''اگر تو شریف النفس باپ داؤد پر فخر کرتا ہے تو سچ کہتا ہے لیکن اولاد انکی ناخلف ہے''

تو ایسے شخص کو تو کبھی کہنا ہی نہ چاہیے کیونکہ یہ ناخلف ہونے کا دعوی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شریف النسب ہونا کوئی چیز نہیں۔ ضرور ہے آج بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ اس کو مٹاتے ہیں تو یہ بھی غلطی ہے لیکن کہتا یہ ہوں کہ یہ فخر کی چیز نہیں۔ ہاں ایک نعمت ہے۔ اس پر خدا کا شکر کرو لیکن غریبوں پر فخر اور ان کی تحقیر نہ کرو۔ اسی طرح تمام مفاخر کو سمجھ لو۔ غرض ہم کیا دعوی کر سکتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں مگر یہ وہ بلا ہے کہ ہم میں سے شاید کوئی اس سے خالی ہو۔ حتی کہ تواضع جو کہ فخر کی ضد ہے ہم اس میں بھی فخر کے مرتکب ہو رہے ہیں اور یہ بات آپ کو نئی معلوم ہو گی لیکن بہت پرانی ہے۔ یعنی یہ کہ ہماری تواضع بھی تکبر ہے چنانچہ اگر کوئی شخص تعریف کرے تو کہتے ہیں کہ صاحب میں تو محض نالائق ہوں مگر دل سے وہ ہرگز ایسا نہیں سمجھتا چنانچہ جو شخص یہ کہے وہ غور کر کے دیکھ لے کہ دل سے کہتا ہے یا زبان سے۔ اگر محض زبان سے ہے تب تو ظاہر ہے کہ تکبر ہے اور اگر دل سے ہے تو امتحان یہ ہے کہ وہ تعریف کرنے والا ذرا پلٹ کر کہہ دے کہ ہاں جناب آپ بڑے نالائق ہیں مجھ کو معلوم نہ تھا اس لئے تعریف کرتا تھا۔ بس اب دیکھئے ان کی حالت کیا ہوتی ہے حضرت گولی مارنے کو تیار ہو جاویں گے اور عمر بھر کو آپس میں بغض ہو جاوے گا۔ پس جب ہماری تواضع بھی تکبر ہے تو تکبر تو کیا کچھ ہوگا۔ سو ہماری تو یہ حالت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں باوجودیکہ کونسی خوبی نہ تھی۔

حسن یوسف دم عیسٰی ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ صلی اللہ علیہ وسلم حسن یوسف، دم عیسٰی، ید بیضا رکھتے ہیں جو تمام انبیاء علیہم السلام تمام کمالات رکھتے تھے آپ وہ سب تنہا رکھتے ہیں۔

آپ کی یہ کیفیت ہے کہ ہر چیز میں افتقار کا اظہار فرماتے ہیں چنانچہ سواری میں دیکھئے کیا فرمایا اور خیر یہ تو اجر آخرت کی بات ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک اپنے افتقار کو ظاہر فرمایا ہے کہ بعد کھانے کے فرمایا کرتے کہ غیر مودع و غیر مستغنی عنہ ربنا کہ اے اللہ ہم اگلے وقت بھی اس سے مستغنی نہیں تو کھانا جو بہت ہی سرسری چیز ہے آپ اس کو بھی

نعمت عظمیٰ سمجھتے ہیں اوراس کی طرف بہت احتیاج ظاہر فرماتے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کومجبور کر کے سوار کیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا مذاق

ادھر صحابہؓ کا مذاق یہ تھا کہ وہ اصلی عاشق تھے جب انہوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کواسی میں راحت ہے بس وہ بھی سوار ہو گئے اور ہماری حالت بزرگوں کے ساتھ یہ ہے کہ ایسے موقع پر اصرار کے ساتھ ان کی مخالفت کرتے ہیں او، غضب تو یہ ہے کہ بعضے بزرگوں کی بھی یہ حالت ہے کہ وہ جو اپنے چھوٹوں کے ساتھ تواضع کرتے ہیں تو وہ بھی دل سے نہیں ہوتی اگر دل سے ہوتو اس میں اثر ایسا ہوتا ہے کہ اثر تو فوراً ہی مان لیا جاوے اور بعض جگہ جھوٹے تکلف کرتے ہیں۔ میں ایک بزرگ کے پاس گیا وہ پائنتی بیٹھے ہوئے اور مجھے سرہانے بٹھانا چاہا۔ میں نے عذر کیا آخر انہوں نے تندی سے فرمایا۔ میں بیٹھ گیا اس کے بعد انہوں نے غالباً فرمایا کہ میاں آؤ ہم تم کو ایک حکایت سنادیں پھر عالمگیر اور داراشکوہ سنایا کہ یہ دونوں عطائے سلطنت کی دعا کرانے کے لئے ایک دوسرے کی بے خبری میں ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان بزرگ نے ان کی شہزادگی کے ادب سے سرہانہ چھوڑ کر ان کو بٹھانا چاہا۔ داراشکوہ نے تو تکلف کیا پھر جب اس نے درخواست کی تو ان بزرگ نے فرمایا کہ میں تو تخت پر بٹھلاتا تھا مگر تم نے نہ مانا۔ عالمگیر کو جب بٹھلانا چاہا یہ فوراً سرہانے بیٹھ گئے پھر جب درخواست کی تو انہوں نے فرمایا تم تو تخت ہی پر بیٹھے ہو تو داراشکوہ کا ادب تو ظاہری تھا اور باطناً بے ادبی یعنی مخالفت اور عالمگیر کا ادب ظاہری تو نہ تھا لیکن باطنی تھا یعنی اطاعت پھر مجھ سے ان بزرگ نے فرمایا کہ جو کچھ اپنا بزرگ کہے اس میں کوئی راز ہوتا ہے لیکن یہ موافقت اس وقت ہے جب کہ دل سے ہو۔ بناوٹ سے نہ ہو۔ غرض بزرگوں کا ادب یہ ہے کہ جب وہ دل سے کہیں مان لے مگر ہم نے تو یہ سبق پڑھا ہی نہیں الا ماشاء اللہ ہم اپنے استاد مولانا صاحب کے آنے سے تعظیماً کھڑے ہو جاتے لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کو بار ہوتا ہے تو اس کو ترک کر دیا محبت تو یہ ہے کہ جس سے ان کو راحت ہو ہمارے استاد ابتدائی کتابوں کے تھانہ بھون کی جامع مسجد سے جوتہ اپنا لیکر چلے ایک معتقد صاحب آئے

اور جوتہ لینے لگے انہوں نے تواضع سے انکار فرمایا معتقد صاحب نے جھٹکا دے کر چھین لیا اس میں تو ادب وہی ہے کہ جو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سیکھا کہ جو فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بس بہت اچھا۔ سبحان اللہ عجیب وغریب شان تھی عاشق اسی کو کہتے ہیں۔

مجھے ایک بزرگ کی حکایت یاد آئی کہ ان کے ایک شاگرد آئے دیکھا کہ شیخ پر فاقہ ہے وہ فوراً اٹھے اور گھر سے کھانا لائے شیخ نے فرمایا کہ کھانے کی مجھ کو حاجت تو ہے مگر قبول سے ایک امر مانع ہے وہ یہ ہے کہ جب تم اٹھ کر چلے تو مجھے خطرہ ہوا کہ تم کھانا لینے جاتے ہو اور اس سبب سے نفس کو انتظار رہا اور حدیث میں قبول ہدیہ کی شرط فرمائی گئی ہے۔ **ما اتاک من غیر اشراف نفس فخذہ** اور (بغیر اشرافِ نفس تمہارے پاس کوئی چیز آئے اسے قبول کرلو اور مجھ کو اشراف ہوگیا۔ وہ شاگرد معاً کھانا اٹھا کر واپس چل دیئے جب نظر سے غائب ہوگئے پھر لوٹ کر آ گئے اور عرض کیا کہ حضرت اب تو ناامیدی ہوگئی ہے۔ اشراف نہ رہا تھا اب لے لیجئے۔ شیخ اور شاگرد دونوں متبع سنت تھے۔ حضرت یہ ہے اتباع سنت ایک ہم ہیں کہ ہم نے سنت میں بھی انتخاب کر رکھا ہے کہ معاشرت میں کہیں اس کا نام ہی نہیں صاحبو! سنت تو یہ ہے کہ ہر چیز میں اتباع ہو چنانچہ ان بزرگ کا اتباع دیکھئے ہم ہوتے تو شاید فرض بھی یاد نہ آتا اور سنت تو درکنار مگر انہوں نے کہا کہ اس وقت لینا سنت کے خلاف ہے کیونکہ اشراف نفس ہے اور ان سے بڑھ کر ان کے شاگرد کا ادب اور اتباع سنت دیکھئے کہ پھر اصرار نہ کیا ہم سے واں ہوتے تو ہاتھ پکڑتے منت کرتے۔ غرض جس طرح ہوتا ان کے سر کر کے آتے لیکن ان کا ادب دیکھئے کہ عرض کیا کہ حضرت بہت اچھا اٹھا کر سینی گھر چل دیئے۔ آپ کہتے ہوں گے کہ عجب بے مروت تھے لیکن

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

''نیک لوگوں کے کام کو اپنے اوپر مت گمان کرو''

اس ادب اور خدمت کے جمع کرنے پر ان کو جوش اٹھا اور سینہ سے لگالیا اور فرمایا کہ واقعی جب کوئی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اس کی ہزاروں صورتیں ہیں ایک ہم ہیں کہ ستا کر خدمت کرتے ہیں صحابہ کا طرز یہ تھا کہ وہ آپ کی مرضی کو دیکھتے تھے حتیٰ کہ جس وقت ہنسی کا موقع

دیکھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک صحابی کی کوکھ میں انگلی چبھودی انہوں نے کہا کہ میں بدلہ لوں گا آپ نے اجازت دی انہوں نے کہا کہ میرے بدن پر تو کرتہ نہ تھا۔ آپ نے کرتہ اٹھادیا۔ وہ دوڑ کر لپٹ گئے اور بوسہ دیا اور عرض کیا کہ میرا تو یہ مطلب تھا۔ تو صحابہ کی حالت یہ تھی اتنے بے تکلف تھے اور ایک قصہ ہے کہ صحابہ میں ایک شخص تھے۔ فارس کے رہنے والے وہ شوربہ اچھا پکاتے تھے۔ ایک بار وہ حضور کی دعوت کرنے آئے۔ آپ نے حضرت عائشہ کے لئے بھی اجازت چاہی انہوں نے انکار کردیا۔ آپ نے دعوت سے انکار کردیا وہ چلے گئے پھر لوٹے اور اسی طرح دو تین بار ہوا۔ تیسری مرتبہ میں حضرت عائشہ کو بھی اجازت دی تو آپ نے اتنا بے تکلف کر رکھا تھا اور اس قدر آپ نے ایک خاص حکمت سے بے تکلف فرمایا تھا اس حکمت کو میں نے کہیں کتاب میں نہیں دیکھا لیکن اب خواب میں اس کا القا ہوا میں نے انگلستان کی ایک شہزادی کو خواب میں دیکھا کہ اسلام پر شبہ کرتی ہے میں نے کہا کہ وہ کیا شبہ ہے۔ کہا کہ حضور مزاح فرماتے تھے۔ اور یہ متانت کے خلاف ہے اور نبوت کے لئے متانت لازم ہے میں نے کہا کہ یہ شبہ جب ہوسکتا ہے کہ جب آپ مزاح اور ہنسی کو مقصود سمجھتے ہوں وہ تو ایک حکمت کی وجہ سے تھی کہ آپ کو خدا تعالیٰ نے ایک رعب عطا فرمایا تھا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت مشہور ہے اس حالت میں ممکن نہ تھا کہ لوگ دین کی باتیں پورے طور پر بے تکلف دریافت کریں اس لئے مزاح کے واسطے سے آپ لوگوں کو بے تکلف بناتے تھے تو اس کی تسلی ہوگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ حکمت تھی کہ ہماری اس بے تکلفی سے محبوب راضی ہوں صحابہ کا مشرب یہ تھا کہ۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

زندہ کریں آپ کی عطاء ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں دل آپ پر مبتلا ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں

وہ ہر چیز میں حضور کی مرضی کو دیکھتے تھے انہوں نے اپنے ارادوں کو فنا کردیا تھا تو صحابہ نے دیکھا کہ حضورؐ اس پر راضی ہیں کہ ہم سوار ہوں تو سوار ہوگئے تو حضورؐ میں اتنی تواضع بڑھی ہوئی تھی کہ اتنے اجر کی ضرورت کو بھی ظاہر فرمادیا۔

توکل کے معنی

تو ہم کو بھی اجر کی ضرورت ہے تو اس کی بہتر تدبیر کرو جیسے کہ روٹیوں کے لئے تدبیر ہے ہمارے بھائیوں کو روٹیوں کے لئے تو یہ شعر یاد ہے کہ

شرط عقل ست جستن از درہا

روزی کے اسباب کی تلاش عقل کی شرط ہے

لیکن آخرت کی روٹیوں کے لئے کچھ بھی یاد نہیں حالانکہ خدا نے یہاں کی روٹیوں کے لئے تو یہ فرمایا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا اور کوئی جاندار زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اسکی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو اور وہاں کے لئے ارشاد ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا (جو شخص نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے لئے کرتا ہے اور جو شخص برا عمل کرتا ہے اس کا وبال اسی پر پڑے گا) تو یہاں کے لئے تو اس قدر ذکر اور وہاں کے لئے متوکل تو اگر ایسا برا توکل ہے تو دنیا کے لئے توکل کیجئے تو یہ الٹا توکل کے ساتھ ہے اور پھر یہ توکل بھی تو نہیں کہ عمل کو چھوڑ بیٹھے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھے رہے توکل کی حقیقت وہی ہے جو توکیل کی ہے تو جب آپ کسی کو وکیل بناتے ہیں تو کیا آپ بےفکر ہو جاتے ہیں۔

اب اگر وکیل کہے کہ شاہد لاؤ اور آپ کہیں کہ جناب اب مجھ سے کیا واسطہ جبکہ میں آپ کو وکیل بنا چکا تو ہر شخص آپ کو نادان کہے گا۔ تو وکیل بنانے کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کام کو یہ نہیں سمجھ سکتا اس کو دوسرے کے سپرد کر دیا ہے کہ اس کے بتلانے کے موافق کرتا رہے پس توکل بھی یہی کہ خدا کے سپرد کام کر کے تدبیر کرو اور وہ جو بتلاتا جائے کرتے جاؤ اب توکل اس کو سمجھا ہے کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہیں۔ غرض توکل یہ ہے کہ جو خدا نے بتلایا ہے وہ اس کے بتلانے سے کرو مثلاً یہ بتلایا ہے کہ جو نماز پڑھے گا وہ جنت میں جاوے گا تو نماز پڑھو خلاصہ یہ ہے کہ اجر کی سب کو ضرورت ہے تو اس کی بتلائی ہوئی تدبیر اختیار کریں اور وہ تدبیر اور طریقہ وہ ہے جو اس مقام پر ذکر فرمایا ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ الخ پس اس میں ایک امر تو یہ ہے کہ خدا سے ڈرو جتنا تم سے ہو سکے دوسرا امر فرمایا ہے کہ سنو اور تیسرا امر ہے اطاعت کرو اور چوتھا یہ ہے کہ خرچ کرو تمہارے لئے بہتر ہوگا اور یہ یا تو اخیر کے ساتھ ہے یا سب کے ساتھ

ہے پس یہ چار امر ہیں اور ظاہر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اوامر سب الگ الگ ہیں تو اگر ایسا ہوتا بھی تو بھی مضائقہ نہ تھا لیکن واقع میں اس میں ربط بھی ہے اور اس سب مجموعہ سے مقصود ایک ہی چیز ہے جو کہ اصل ہے یعنی اطاعت اور یہ دوسرے اوامر اس کے طرق ہیں۔

آجکل کا تقویٰ

تفصیل اطاعت کی یہ ہے کہ اول دیکھا جاوے کہ ہماری ترکیب کتنے اجزا سے ہے تو انسان میں دو چیزیں ہیں ایک جوارح ایک قلب یا ایک ظاہر اور ایک باطن تو خدا نے اس اطاعت کی تفصیل فرمائی کہ اول اتَّقُوا اللّٰہ اللہ سے ڈرو فرمایا ہے یہ تو قلب کے متعلق ہے نہ جیسا کہ آجکل ہمارے بھائیوں نے تقویٰ کو خاص پانی کی احتیاط میں لیا ہے نفس بھی بڑا سمجھدار ہے کہ پانی میں تقوے تجویز کیا کیونکہ پانی سستا ہے اسی واسطے ہمارے بھائیوں نے کبھی کھانے میں تقوے نہیں تجویز کیا۔ پانی کی دو قسمیں کیں طاہر و نجس۔ لیکن کھانے کی ایک قسم ہے کہ سب حلال ہے۔ بہن کا رکھ لو وہ بھی حلال ہے چندہ کا روپیہ کھا جاؤ وہ بھی حلال ہے البتہ اگر اس میں گھی نہ ہو تو وہ حرام ہے۔ چنانچہ رڑکی میں ایک واعظ صاحب گئے ایک شخص نے ان کی دعوت کی۔ کہنے لگے کہ بھائی میں تو ایک خاص قسم کا کھانا کھایا کرتا ہوں اور اس کو ہماری ماما پکا سکتی ہے اس لئے میں دوسری جگہ نہیں جا سکتا نقد دیدو مگر اس نے کھانے ہی پر اصرار کیا۔ آخر کھانا بھیجنے کی اجازت دی گئی وہ کھانا لایا تو واعظ صاحب نے اس کو مسجد میں رکھ کر اور کھول کر سب نمازیوں کو دکھلایا کہ دیکھو بھائی یہ دعوت کا کھانا۔ گھی کتنا کم ہے۔ بوٹیاں پلاؤ میں بھی نہیں ہیں۔ غرض وہ رسوا کیا کہ خدا کی پناہ۔ وہاں سب لوگوں نے مولویوں کو برا بھلا کہا مگر واقع میں وہ مولوی نہ تھے یعنی وہ صاحب علم نہ تھے کیونکہ علم کے ساتھ اگر تقویٰ بھی نہ ہو۔ تاہم وہ ایک مال ہے اور صاحب کمال میں خواہ وہ کمال کیسا ہی ادنیٰ درجہ کا ہو ایک طرح کی انسانیت اور غیرت ہوتی ہے حتیٰ کہ ایک بڑھئی جو کہ ادنیٰ درجہ کا ہے اس میں بھی ایک شان استغناء کی ہوتی ہے تو جب بڑھئی کے پیشہ میں یہ شان ہے تو کیا علم دین میں کچھ بھی نہ ہوگا باقی اس کا کچھ علاج ہی نہیں کہ کوئی راہ نجات دیکھ کر واعظ ہو جاوے اور جہلاء اس کو عالم سمجھنے لگیں اس کا علاج صرف یہ ہے کہ آپ کسی مولوی کا وعظ اس وقت سنیں جب اس کے پاس

کسی مسلم عالم کی سند دیکھ لیں اور میں اس مشورہ سے ان کی روزی نہیں مارتا۔ وعظ سننے سے منع کرتا ہوں باقی خالی لینا دینا تو تم ان کو پہلے دیدیا کرو تو غرض یہ ہے کہ یہ لوگ مولوی نہیں اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ لوگوں نے مولویوں کو دیکھا نہیں کیونکہ آپ نے ان کے دروازوں پر جانا چھوڑ دیا۔ انہوں نے آپ کے دروازوں پر آنا چھوڑ دیا اور نام کے مولویوں کا تو یہ حال ہے کہ میں کیا بتاؤں کہ ایک جگہ دیکھا کہ کرایہ پر ایک مولوی صاحب جھگڑ رہے تھے کہ اتنا کرایہ دو اور بلانے والے حساب کتاب بتلا رہے تھے۔ غرض ایسے پیشہ ور لوگوں کی نظر اس پر ہے کہ کھانا کیسا تھا۔ اور ہمارے لینے کو اسٹیشن پر آئے تھے یا نہیں تو غرض جب لکھے پڑھوں کی یہ حالت ہے تو عوام الناس اور دنیاداروں کی شکایت کیا ان کو زیادہ حق ہے کہ حلال ہونے کا معیار صرف یہ سمجھیں کہ اس میں گھی ہو البتہ پانی کا تقویٰ سہل تھا اس کو اختیار کر لیا اور وہ بھی ہندوستان میں ہے میں نے حج کے سفر میں دیکھا کہ ایک صاحب نے جو کہ یہاں بڑے متقی تھے وہاں پانی سے استنجا بھی چھوڑ دیا تھا تو آدمی حد سے زیادہ نہ بڑھے۔ شریعت نے اعتدال سکھایا ہے۔ غرض پانی میں اس لئے تقویٰ ہوتا ہے کہ وہ بہت ہے اور کھانا بہت کہاں اور پھر حلال کہاں اس لئے اس میں حلال وحرام کے قصہ ہی کو حذف کر دیا اور خواہشوں کو خوب وسعت دیدی حتی کہ ہمارے بھائی بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ بغیر گوشت کے کھانا ہی نہیں کھاتے مگر صاحبو! دنیا کی لذات سب ہیچ ہیں خواہ وہ کھانے کی ہوں یا نگاہ کی یا ہاتھ کی لوگ ان کو خفیف سمجھتے ہیں خصوص تمتعات شہوانیہ کو لیکن ان کے بارہ میں کسی نے خوب کہا ہے۔

لب برلب دلبران مہوش کردن　　آہنگ سرزلف مشوش کردن
امروز خوش ست لیک فردا خوش نیست　　خودرا چونسے طعمۂ آتش کردن

''حسینوں کے لب پر لب رکھنا اور زلف مشوش کرنے کا ارادہ کرنا آج (دنیا میں) اگر اچھا معلوم ہوتا ہے تو کل قیامت کے دن اچھا نہیں۔ اپنے آپ کو دوزخ میں جلانا ہے''

ایک بزرگ کو کسی بادشاہ نے لکھا کہ ہم مرغ کھاتے ہیں اور تم خشک روٹی۔ ہم حریر پہنتے ہیں اور تم گدڑی تو تم سخت مصیبت میں ہو۔ ہمارے پاس آجاؤ ہم خوب خدمت کریں گے۔ انہوں نے جواب میں لکھا ہے۔

خوردن تو مرغ مسمے دے　　طمعۂ مانا تک جویں ما

پوشش تو اطلس ودیبا حریر بخیہ زدہ خرقہ پشمین ما

''تمہارا فربہ مرغ کھانا اور ہمارا جو کی روٹی کھانا ایک دم کیلئے ہے تیرا لباس ریشم و اطلس کا ہے اور ہمارا خرقہ پشمین بخیہ زدہ ہے''

آخر میں فرماتے ہیں کہ

نیک ہمین ست کہ مے بگذرد راحت تو محنت دوشین ما

باش کہ تا طبل قیامت زنند آں تو نیک آید و یا این ما

''ذرا صبر کر قیامت میں معلوم ہو جائے گا کہ وہ تمہاری راحت اچھی تھی یا ہماری محنت''

یعنی اس روز معلوم ہوگا کہ وہ حالت اچھی تھی یا یہ۔ حضرت! نہ تو تمام عمر کباب پیٹ میں رہتا ہے نہ سوکھے ٹکڑے تو انجام پر نظر کیجئے تو تقوے تو اس میں زیادہ ہونا چاہیے نیز پانی میں تو وسعت بھی ہے۔ اگر کہیں حنفیہ کے ہاں تنگی ہے تو شافعی مالک کے ہاں وسعت ہے۔ بخلاف کھانے کے کہ مثلاً رشوت چاروں ہی مذہب میں ممنوع ہے۔ تو جہاں وسعت تھی وہاں تو یہ تنگی اور جہاں تنگی تھی وہاں یہ وسعت۔

تقویٰ کی حقیقت

سو تقویٰ حقیقت میں یہ نہیں جس کو لوگوں نے تجویز کیا ہے۔ تقویٰ وہ ہے کہ جو حدیث میں ہے الا ان التقویٰ ھھنا واشار الی صدرہ[1] ہاں ظاہری درستی بھی اس پر مرتب ہوتی ہے تو اصل لغت میں اس کی حقیقت ہے ڈرنا اور شریعت میں ایک مضاف الیہ کی تخصیص ہے کہ خدا سے ڈرنا پس تقویٰ تو افعال قلوب سے ہے تو فاتقوا اللہ میں تو یہ فرمایا کہ قلب کو درست کرو جو کہ قلب کی اطاعت ہے اس کے بعد فرمایا واسمعوا یہ جوارح کا فعل اور اس کی اطاعت ہے بس حاصل یہ ہوا کہ تم ظاہر اور باطن دونوں کو اطاعت میں مشغول کرو۔ یہ ہے اصلاح مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض نے تو صرف ظاہر کی درستی پر اکتفا کیا ہے کہ داڑھی اور پاجامہ درست کر لیا اور دوسروں پر ہزاروں طعن کریں گے اگرچہ قلب کی حالت کیسی ہی ہو۔ حدیث میں ہے کہ ایک قوم ہوگی کہ یلبسون جلود الضان

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ: ۳۲، سنن الترمذی: ۱۹۲۷، مسند احمد ۲: ۲۷۷

والسنتهم احلى من السكر وقلوبهم امر من الذباب بھیڑ بکری کی پوستین پہنیں گے اور انکی زبانیں شکر سے زیادہ شیریں ہوں گی اور دل بھیڑیوں سے زیادہ سخت ہوں گے اوریلبسون کے یا تو یہ معنی ہیں کہ فقیرانہ لباس پہنیں گے یا یہ کہ ظاہر میں ایسے نرم بنیں گے مگر قلوب ان کے گرگ سے سخت ہوں گے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں

از بروں چوں گور کافر پر حلل　　واندروں قہر خدا عز وجل

ظاہر سے تو گور کافر کی طرح آراستہ ہے اور باطن میں خدا کا غضب وقہر نازل ہے۔

کہ ظاہر تو ایسا اور باطن ایسا خبیث تو ایک طبقہ ایسا ہو گیا اور دوسرا ایک طبقہ ان کا مقابل ہو کہ

در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش

''عمل میں کوشش کرو اور جو جی چاہے کرو''

لیکن کبھی انہوں نے زنانے کپڑے نہیں پہنے۔ صاحبو! اس مقابل کے دعوے میں دو جزو ہیں۔ ایک تو یہ کہ ظاہر میں کیا رکھا ہے تو اس کی تو نصوص سے تغلیط ہو گئی دوسرا جز یہ کہ باطن ٹھیک ہونا چاہیے تو یہ درست مگر یہ غلط کہ ان کا باطن درست ہے کیونکہ ظاہر تابع باطن کے ہوتا ہے اگر باطن درست ہوتا تو ظاہر جو کہ تابع ہے وہ کیسے نہ درست ہوتا اگر آپ کسی حاکم کے سامنے جاویں اور آپ سلام بھی نہ کریں اور جب باز پرس ہو تو آپ کہیں کہ جناب میرا قلب آپ کی محبت وعظمت سے پر ہے تو وہ حاکم کہے گا کہ ہرگز نہیں ممکن نہیں کہ قلب میں محبت وعظمت ہو اور پھر گردن نہ جھک جاوے تو اگر ظاہر خراب ہے تو یہ دلیل ہو سکتی ہے اس کی کہ باطن ہرگز درست نہیں۔ مرزا قتیل کی ایک حکایت یاد آئی کہ یہ نہایت آزاد تھے لیکن صوفی المشرب اور کلام بھی صوفیانہ مذاق کا ہوتا ہے کسی ایرانی کو ان کے کلام سے دھوکہ ہوا کہ یہ شخص صاحب حال ہے اور مرزا سے ملاقات کا شوق ہوا آخر وہ دہلی آئے اور آ کر اس حالت میں دیکھا کہ بیٹھے ریش تر شوا رہے ہیں اس ایرانی نے کہا کہ آغا ریش می تراشی جناب کیا ریش تر شواتے ہیں مرزا قتیل نے جواب دیا کہ بلے ریش می تراشم لیکن دل کسے نمی خراشم۔ ہاں ریش تر شواتا ہوں لیکن کسی کے دل کو رنجیدہ نہیں کرتا۔ آجکل یہ بہت زبان زد ہے کہ بس کسی کو آزار مت دو یہی سب کچھ ہے اور یہ شعر سب نے یاد کر رکھا ہے۔

مباش درپے آزار ہرچہ خواہی کن   کہ در شریعت ماغیراز یں گنا ہے نیست

کسی کے ستانے کے درپے نہ ہو جو چاہو کرو اس لیے ہماری شریعت میں بجز اسکے اور کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس مسافر نے فی البدیہ یہ جواب دیا کہ ارے دل رسول اللہ می خراشی۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ ہفتہ میں دو مرتبہ آپ پر اعمال پیش ہوتے ہیں اس سے مرزا قتیل پر ایک حالت طاری ہوئی اور آنکھیں سی کھل گئیں ہوش آیا تو بزبان حال کہا کہ

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرا باجان جاں ہمراز کردی

حق تعالیٰ تجھ کو جزائے خیر عطا فرمائے تو نے میری آنکھیں کھول دیں مجھ کو محبوب حقیقی سے ہمراز کر دیا

اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مباش درپے آزار ہرچہ خواہی کن :۔ کا کیا مطلب ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہ ستاؤ تو مطلب یہ ہوگا کہ خلاف شریعت نہ کرو پس یہ بالکل غلط ہے کہ ظاہر میں کیا رکھا ہے اور اگر غور کرو تو اس کے معنے تو یہ نکلتے ہیں کہ ہمارا قلب تو عبد ہے اور جوارح عبد نہیں۔ یہ تو ایسی مثال ہے کہ آدھا عملہ درست ہو اور آدھا درست نہ ہو تو خدا تعالیٰ نے ہم کو دو عملے دیئے ہیں۔ ایک ظاہر ایک باطن تو اطاعت میں سب ہی مقید ہیں۔ چنانچہ خداوند جل جلالہ نے اتقوا کے ساتھ اسمعوا فرما کر ظاہر فرما دیا کہ دونوں ہی درست ہوں اور اسی میں مقائسہ کے طور پر سارے جوارح لے لئے کیونکہ جارحہ سمع و دیگر جوارح میں کوئی وجہ فرق کی نہیں پھر اس کے بعد اطیعوا فرما دیا کہ کوئی کسی خاص عمل کی تخصیص نہ سمجھ جاوے اور اطیعوا میں ایک بات ہے طالب علموں کے سمجھنے کی وہ یہ کہ اطاعت مشتق طوع سے ہے اور طوع کہتے ہیں رغبت کو تو ترجمہ اس کا یہ ہے کہ خوشی سے کہنا مانو اور خوشی قلب میں ہوتی ہے اور کہنا ماننا جوارح کو بھی عام ہے پس اس میں بھی جمع بین الظاہر والباطن ہو گیا۔

اطاعت کی اقسام

آگے ارشاد ہے اَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ خرچ کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اس میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ طاعات دو قسم کی ہیں ایک مالی ایک بدنی ہر چند کہ اطیعوا (اطاعت

کرو) میں سب آ گئے ہیں لیکن چونکہ حرص ہم میں غالب ہے چنانچہ اکثر کا مذاق یہ ہے کہ

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ورز طلبی سخن دریں است

"اگر جان مانگو مضائقہ نہیں اگر مال مانگو اس میں کلام ہے"

اللہ میاں سے لوگوں کو ایسی محبت ہے جیسے ایک بخیل کو اپنے دوست سے تھی کہ مانگنے پر بھی انگوٹھی نہ دی اور اس کی اس مصلحت کے جواب میں کہ اس کو دیکھ کر تمہیں یاد کیا کروں گا یہ کہا کہ جب اپنا ہاتھ خالی دیکھنا یاد کرلیا کرنا کہ ہم نے انگوٹھی مانگی تھی نہیں دی تو ایسی ہی محبت اللہ میاں سے بھی آج کل مسلمانوں کو ہے۔ مجھے یاد آ گیا کہ بہت لوگ ایسے ہی کہ انہوں نے بیہودہ موقع پر دس ہزار روپیہ دیا اور ایک دینی موقع پر سو روپیہ دیا حالانکہ وہ موقع ایسا تھا کہ سارا گھر دیدیں لیکن خیر کچھ تو دیں اور انفاق فی سبیل اللہ کی ایک ایسی صورت ہے کہ کچھ بار ہی نہیں پڑتا جس کو میں نے اٹاوہ میں لکھا تھا کہ تمہارے گھر میں بہت سی چیزیں بیکار ہوں گی تو تم فی سبیل اللہ وہی دیدو اس میں تمہارا کیا حرج ہے۔ بحمد اللہ اس پر لوگوں نے عمل کیا اور لکھا تھا کہ ٹھیلے کے ٹھیلے آتے ہیں اور اس میں ایک ذرا اور توسیع کرلو اس طرح ایک تو وہ چیزیں ہیں کہ ناکارہ ہیں ان کے متعلق تو تجویز پیش کر ہی چکا اور ایک وہ ہیں کہ ہیں تو کام کی ان کی سال سال بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً میز، کرسی، پلنگ حتی کہ بعض ایسی چیزیں بھی ہیں کہ ان کا ہونا معلوم بھی نہیں کہ آیا ہمارے گھر میں ہے بھی یا نہیں تو اگر ایسی چیزیں نکل جاویں تو کیا حرج ہے ایسی اشیاء کی نسبت خوب کہا ہے

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش انچہ اوکار داریم اکثرے درکار نیست

صائب حرص قانع نہیں ہے ورنہ پھر اسباب زندگی ہمارے پاس ایسے ہیں جو کام میں نہیں آئے۔

تو ان کو بھی دیدیا جاوے اس میں کیا مشکل ہے غرض عبادت مالیہ میں چونکہ غلبہ حرص میں ہمارا یہ مذاق ہے اور اس میں ہمت کم ہے اس لئے عبادت مالی کو علیحدہ بھی ذکر فرمایا اور اس پر وعدہ فرمایا خیر کا اور ایک بات میری سمجھ میں آئی کہ خداوند کریم کا کلام طب کامل ہے طب میں ایک تو دوا ہوتی ہے اور ایک پرہیز۔ قرآن شریف میں ہر جگہ اس کی رعایت کی ہے یہاں وہ اس طرح ہے ہمارے اکثر امراض کا سبب ہے حب دنیا یہ وقت زیادہ نہیں ہے ورنہ میں اس کو مفصل ذکر کرتا اور دنیا میں بھی سب سے زیادہ محبوب ہے مال کہ اکثر گناہوں کا ذمہ دار یہی

ہے تو خدا تعالیٰ نے اتقوا سے پرہیز بتلایا ہے کہ یہ پرہیز کرو ورنہ اطاعت کہ دوا ہے اس کے اثر کی گاڑی چلے گی نہیں چنانچہ مشاہدہ ہے کہ ہم میں جب تک مال ہے اس وقت تک ہم اطاعت شروع کرتے ہیں لیکن چلتی نہیں جیسے ٹھیلی ہوئی گاڑی کہ جہاں چھوڑ دی وہاں ہی رک گئی تو اب تو ہم اپنے کو ٹھیل رہے ہیں کہ گھسیٹ کر اٹھایا تو تہجد کے لئے اٹھے اور نہ اٹھایا تو نہ اٹھے دل میں شوق نہیں ہے اور واقعی اکثر کام شوق ہی سے ہوتے ہیں اسی کو کہتے ہیں۔

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی — کہ دراز دور دیدم رہ ورسم پارسائی

''طریق خشک بہت دور دراز کا راستہ ہے مجھے تو آپ طریق عشق میں چلایئے''

تو نری پارسائی بدون شوق کے چلتی نہیں بلکہ وہ حالت ہوتی ہے کہ۔

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا آمد — کہ مرا خراب کردی تو بسجدہ ریائی

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند — تو برون درچہ کردی کہ درون خانہ آئی

''جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے ریا کا سجدہ کر کے مجھے بھی خراب کیا...خانہ کعبہ کے طواف کو گیا تو حرم نے مجھ کو راستہ نہ دیا اور کہا کہ تو نے حرم کے باہر کیا کیا ہے جو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے''

تو یہ حالت ہے ہمارے اعمال کی جب قلب میں کوئی حصہ محبت کا نہ ہو اور وہ اس وقت آتا ہے کہ غیر کی محبت نکلے۔ایک بزرگ کا قول ہے۔

حب حق ہو دل میں یا حب پسر — جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

آجکل کا تصوف

اکثر طبائع میں یہ حب غیر برنگ حب مال زیادہ ظاہر ہوا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے ایک لطیف طریقہ بتلایا ہے اس کے نکلنے کا کہ خرچ کیا کرو واللہ العظیم کوئی بتلا نہیں سکتا کیا خبر ہو سکتی ہے کسی کو معانی کے خواص کی۔صاحبو! حکماء صرف خواص اجسام کو دریافت کر سکے مگر انبیاء علیہم السلام نے خدا کے بتلانے سے معانی کے خواص کو بتلایا ہے مثلاً حب مال کے خاصہ کو دیکھ کر اس کا علاج بتلایا ہے کہ خرچ کیا کرو اور علاج بھی کیسا آسان کہ جس میں نہ محنت ہو نہ مشقت ہر شخص کر سکے وہ تعلیم نہیں جو غیر محقق کی ہوتی ہے کہ اس میں ایسی سخت

شرطیں لگاتے ہیں کہ خدا کی پناہ ایسے لوگوں کی تعلیم پر یہ یاد آتا ہے کہ۔

خستگاں راچوں طلب باشد وقوت نبود   گر تو بیداد کنی شرط مروت نہ بود

''ضعیفوں میں جب طلب ہو اور قوت نہ ہو اگر تو ان پر ظلم کرے تو یہ شرط مروت نہیں ہے''

اس کے معنے تو یہ ہوئے کہ اس کا ایک بندہ ایسا بھی ہے جو اس تک پہنچنے کے قابل نہیں حالانکہ وہاں سفرہ عام ہے اور اس میں اس کی پوری رعایت ہے کہ۔

طفل راگرناں وہی برجائے شیر   طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

چار پارا قدر طاقت بار نہ   برضعیفاں قدر قوت کار نہ

''اگر لڑکے کو بجائے دودھ کے روٹی دینے لگو تو اس غریب کو اس روٹی کے بدولت مردہ ہی سمجھ لو۔ چار پایہ پر اس کی طاقت کی قدر بوجھ رکھنا چاہئے اسی طرح ضعیفوں پر انکے قوت کے قدر کام ڈالنا چاہئے''

تو جو مشائخ غیر محقق ہیں ان کے ہاں محض روٹیاں ہیں دودھ نہیں وہ بچہ کو بھی روٹی کھلاتے ہیں۔ اور قرآن وسنت میں تو سب کچھ ہے یہ غضب نہیں کہ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا جاوے تصوف یہ ہے جو آج گم ہے کیونکہ اب تو ہر شخص کو ایک ہی لکڑی ہانکتے ہیں کہ بیوی کو چھوڑ و اور اولاد کو عاق کردو گو بعض ایسے بھی ہیں جو ان تعلقات سے مجرد رکھے جاتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں کہ نوکری بھی کریں اور صوفی بھی بنیں میں نے اس کو خاص طور سے اس لئے ذکر کیا کہ آجکل لوگ اپنے کو تحصیل کمالات باطن سے اس بناء پر بہت معذور سمجھتے ہیں کہ نہ تو ہم سے نوکری چھوڑی جاوے گی نہ بیوی چھوڑی جاوے گی سو بے فکر رہو یہ چیزیں نہیں چھوڑائی جاویں گی ہاں یہ ضرور ہے کہ رشوت سے روکا جاوے گا۔ نیز آپ پر محنت شاقہ ڈالی جاوے گی جتنی قوت ہو اتنا ہی بتلایا جاوے گا چنانچہ جو محقق ہیں وہ دماغی قوت اور فرصت کو دیکھ کر تعلیم کرتے ہیں اور سب کو الگ الگ بتلاتے ہیں اور اسی وجہ سے تصوف کی تعلیم مخفی ہے کہ ہر ایک کا حال جدا ہے تو علانیہ تعلیم میں احتمال ہے کہ ایک طالب براہ ہوس دوسرے کی تعلیم پر بلا اجازت عمل کرنے لگے یہ وجہ ہے اس کے مخفی تعلیم کی نہ اس وجہ سے جو کہ مشہور ہے کہ تصوف کے مسائل سینہ بسینہ علاوہ شریعت کے چلے آتے ہیں

دوسری اس میں یہ حکمت ہے کہ خلوت کی بات خصوصیت کی سمجھی جاتی ہے اور اس کی قدر زیادہ ہوتی ہے تو بہر حال محققین کے یہاں ہر شخص کو اس کی حالت کے موافق تعلیم دی جاتی ہے قوی کو اس کے موافق ضعیف کو اس کے موافق جب اس میں اس قدر سہولت ہے تو یہ دولت اصلاح باطن ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ حب دنیا کو نکالنے کے لئے ظاہرا کیسی مشکل پیش آئی تھی مگر خدا تعالیٰ نے اس کا بھی کیسا آسان طریقہ بتلا دیا کہ خرچ کیا کرو تو اب کیسی جامع تعلیم ہوگئی کہ مرض بتلایا دوا بتلائی پرہیز بتلا دیا اس لئے ان کو اس جگہ جمع کر دیا گیا اور ہر ایک میں مناسب مناسب اور مفید رعایتیں فرمائیں۔ میں ہر ایک کو مفصل ذکر کرتا مگر وقت گذر گیا ہے اور مجملاً ذکر بھی ہوگیا ہے اس لئے میں سب کا قدرے قدرے بیان کرتا ہوں پس اتقوا اللہ میں یہ قید لگائی کہ ما استطعتم جس سے معلوم ہوا کہ ہم کو اسی قدر کا مکلّف کیا گیا ہے کہ جس قدر طاقت ہو اگر اس پر کوئی کہنے لگے کہ ہم کو تو صرف ایک ہی وقت کی نماز کی طاقت ہے تو جواب یہ ہے کہ تم نے صرف اسی کو دیکھا ہے دوسرے مقام کو نہیں دیکھا کہ حق تعالیٰ نے پانچ وقت کی نماز کا مکلّف فرمایا اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اسکی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے اس سے صاف معلوم ہوا کہ جتنے کا مکلّف فرمایا ہے اس کی طاقت ضرور ہے پس اب جو یہاں فرمایا مَا اسْتَطَعْتُمْ تو مطلب یہ ہوا کہ جتنا تم کو بتلایا سب کرو اور یہ عنوان دل بڑھانے کے لئے فرما دیا جیسے کوئی نوکر سے کہے کہ تم سے یہ کام تو ہو سکتا ہے تو جو ہو سکتا ہے وہ تو کرو تو گویا تصریحاً متنبہ کیا کہ تم سے تو ہو سکتا ہے تو یہ شبہ تو دفع ہو گیا۔

عدم توجہی

اب ایک اور شبہ رہا کہ یہ تو مشاہدہ ہے کہ نہیں ہو سکتا تو یہ دعویٰ مشاہدہ کا بالکل غلط ہے بات یہ ہے کہ آپ ہمت نہیں کرتے اس لئے کچھ ثقل معلوم ہوتا ہے جس کو آپ نے سمجھ لیا کہ نہیں ہو سکتا اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ کو رات کے وقت خفیف ترشح میں پیاس لگے مگر سردی کی وجہ سے آپ کو باہر جانا ایسا دشوار ہوا کہ یوں سمجھے کہ ہم جا ہی نہیں سکتے لیکن رات کو دو بجے کے وقت ایک سوار آیا اور پروانہ دیا کہ کلکٹر صاحب نے بلایا ہے پس آپ نے معاً

حکم دیا کہ گھوڑا کسو اور بارانی پہن کر دو میل چلے گئے اور راستہ میں رعد و برق بھی ہوا سب کچھ ہوا مگر گئے ضرور تو اگر اس وقت پانی پینے کے لئے باہر نکلنا مشکل تھا تو اسی وقت دو میل چلنا کیسے آسان ہو گیا تو بات یہ ہے کہ فرق فقط ہمیت کا ہے کہ اول پیاس کے وقت عزم و ارادہ نہ کیا تھا اور اب ارادہ کیا ہے تو جتنے کاموں کو آپ کہہ رہے ہیں کہ نہیں ہو سکتا ان سب میں آپ نے ارادہ ہی نہیں کیا بس یہ ہے وجہ حضرت مولانا استاذنا کی حکایت یاد آئی کہ نماز کے بارہ میں ایک حدیث ہے کہ ایسی نماز ہو کہ جس میں حدیث النفس وسوسہ نہ لاوے وہ حدیث سبق میں آئی ایک طالب علم نے کہا کہ حضرت کیا ایسی نماز ہو سکتی ہے۔ مولانا نے کہا خوب فرمایا کیا کبھی ارادہ کیا تھا کہ نہیں ہوئی ویسے ہی سمجھ لیا کہ نہیں ہو سکتی کر کے تو دیکھا ہوتا خلاصہ یہ ہوا کہ تمام اعمال میں پورا تقوی اختیار کرو اور وہ سب استطاعت میں ہے مگر شرط ارادہ آگے فرمایا ہے واسمعوا اس سے ایک مسئلہ مستنبط کرتا ہوں کہ احکام کا سننا بھی ایک بہت بڑا مقصود ہے ہم میں جو زیادہ کمی ہوئی ہے اس کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ علم حاصل کرنے کی طرف توجہ نہیں اور ہے بھی تو صرف علم معاش کی طرف اور میں معاش سے منع نہیں کرتا لیکن یہ شکایت ضرور ہے کہ باوجودیکہ معاد غیر محدود غیر منقطع ہے اور معاش محدود و فانی ہے پھر غضب ہے کہ غیر محدود تو آپ کی نظر میں وقعت نہ رکھے اور محدود وقعت رکھے حتی کہ احکام کو معلوم بھی نہ کیا جاوے میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر عمل کی بھی نیت نہ ہو تب بھی علم حاصل کرو چاہیے تو عمل بھی کرنا لیکن اخیر بات ہے کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تب بھی علم حاصل کیجئے بہت بڑی بڑی خرابیاں دور ہو جاویں گی۔ مثلاً عقائد کی کیونکہ ان میں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا دوسرے اعمال پر یہ اثر ہوگا کہ کبھی توفیق ہوئی عمل کی تو راہ تو معلوم ہوگا مثلاً کسی کو خارش ہوا اور وہ علاج کرنا نہ چاہے تب بھی نسخہ تو ضرور ہی حاصل کرے۔ تیسرے یہ نفع ہے کہ اب تو گناہ کرتے ہیں مگر گناہ نہیں سمجھتے جس میں ایمان جانے کا اندیشہ ہے اور بعد حصول علم گناہ تو سمجھے گا تو اس سے جرم قدرے خفیف ہو جاوے گا اور جرم کا خفیف ہو جانا گو برات نہ ہو خود یہ بھی ایسا مقصود ہے کہ اگر کسی مقدمہ میں پیروی کرنے سے جرم سے بری ہونے کی تو توقع نہ ہو مگر خفیف ہو جانے کی امید ہو تب بھی اپیل کریں گے تو معلوم ہوا کہ

خفیف ہونا بھی مقاصد میں سے ہے پس علم سے یہ فوائد ہیں اور میں یہ نہیں کہتا کہ سب مولوی بنیں بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ سب لوگ مولوی نہ بنیں لوگ مولویوں کو ناحق ...... ہی بدنام کرتے ہیں کہ یہ سب کو مولوی بنانے کی فکر میں ہیں مگر یاد رکھو کہ ہم سب کو مولوی نہ ہونے دیں گے کیونکہ مولوی بننے کے معنے ہیں مقتدا بننا اور اس کے لئے ہر شخص اہل نہیں بلکہ اسکے لئے چند شرطیں ہیں کہ اس میں مثلاً تحمل اور وقار بھی ہو اس میں شان استغناء بھی خاص طور سے ہو اور یہ سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس کی حالت طبیب کی سی ہے کہ جس کے لئے یہ امر مضر ہے کہ وہ دوائیوں کی دوکان بھی رکھے کہ اس سے شبہ خودغرضی کا ہوتا ہے ہم لوگوں میں کثرت سے تملق اور حرص ہے تو اگر ایسا شخص مقتدا ہو جاوے تو قوم کے لئے برا نمونہ ہو جاوے گا اس کی وہ حالت ہوگی کہ۔

زیاں میکند مرد تفسیر داں　　که علم و عمل می فروشد به ناں

وہ عالم نقصان کرتا ہے کہ علم وعمل روٹی کے عوض فروخت کرتا ہے۔

ایسا شخص اگر کہیں سفر میں ہو اور اس کو روپیہ کی ضرورت ہوئی تو وہ ضرور وعظ کہہ کر مانگ لے گا بخلاف صاحب استغناء کے کہ گو حاجت اس کو بھی ہوتی ہے لیکن اس کی غیرت اس کو ظاہر نہیں ہونے دیگی مجھے اس پر ایک شہزادہ کا قصہ یاد آ گیا جو ایک شخص نے بیان کیا تھا کہ ایک والی ملک لکھنؤ میں تھے ایک جلاوطن شدہ شہزادہ ایران سے دوچار ہو گئے شہزادہ نے نواب صاحب کی دعوت کی نواب صاحب نے درخواست کی کہ کبھی ہماری ریاست میں آیئے چنانچہ اتفاق سے یہ شہزادہ ایک سفر میں بالکل مفلس ہو گیا اور اس وقت نواب صاحب کی وہ درخواست یاد آئی اور اس ریاست میں بحال خستہ پہنچے۔

نواب صاحب نے ان کی یہ حالت دیکھ کر براہ ترحم یہ شعر پڑھا

آنکه شیراں راکند روبه مزاج　　احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

"جو چیز شیروں کو لومڑی مزاج بنادیتی ہے وہ احتیاج ہے احتیاج"

وہ شہزادہ مارے غیرت کے آگ بن گیا اور فی البدیہہ نہایت تندی کے ساتھ جواب دیا۔

شیر نرکے می شود روبه مزاج　　میز ندبر کفش خود صدا احتیاج

"شیر نر لومڑی مزاج کب بن سکتا۔ ہے وہ سو ضرورتوں کو جوتے پر مارتا ہے"

اور فوراً واپس ہو گیا نواب صاحب دوڑے کہ خدا کے لئے ذرا ٹھہریئے مگر نہیں ٹھہرا حضرت غیرت علمی تو اس سے بڑھ کر ہوتی ہے اور ایک شرط مقتدا ہونے کی یہ ہے کہ اس کو حق میں خوف کسی سے نہ ہو اس کی یہ شان ہو کہ

موحد چہ بر پائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکش   ہمیں ست بنیاد توحید وبس

''موحد کے پیروں پر خواہ مال و زر نچھاور کر دو یا اس کے سر پر تلوار رکھ دو اس کو کسی سے خوف و ہراس اور امید نہیں ہوتی یہی بس توحید کی بنیاد ہے''

تو کیا ہم میں ہر شخص ایسا ہے جو ان شرائط کا جامع ہو ہرگز نہیں جب ہر شخص ایسا نہیں تو آپ ڈریں نہیں کہ ہم سب کو مولوی بناتے ہیں۔

حصول علم

ہاں سب کو عالم ضرور بنانا چاہتے ہیں لیکن عالم ہونے کے لئے عربی پڑھنا ضروری نہیں بلکہ احکام کا دریافت کرنا کافی ہے۔ پس اتنا سب کے لئے بیشک ضروری ہے کہ احکام کو معلوم کریں اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ پڑھ سکتے ہیں وہ تو یہ کریں کہ ایک نصاب مقرر کر کے اس کو روزانہ سبقاً سبقاً کسی عالم سے پڑھ لیں اور جو لوگ لکھے پڑھے نہیں ہیں وہ یہ کریں کہ ہفتہ میں دو مرتبہ ایک ایک آدمی پچاس پچاس آدمیوں کو لے کر بیٹھ گیا اور آدھ گھنٹہ کوئی دینی کتاب سنادی اب رہی عورتیں سو یا تو ان کو مرد پڑھاویں یا ان کو کتاب سنادیا کریں اور عمر بھر اسی طرح شغل رکھیں بتلایئے کیا مشکل کام ہے یہ تو روزمرہ مسائل سننے کا طریقہ ہے دوسرے یہ کام کیجئے کہ جو کام کرنا ہو علماء سے دریافت کر کے کیجئے اگر کوئی مل جاوے تو وہاں دریافت کیجئے یا مراسلت کے ذریعہ سے۔ اس سے احکام معلوم ہوتے رہیں گے پس اس طریقہ سے علم حاصل ہو جانا کتنا آسان ہے اس طریقہ سے دو برس میں ہر شخص عمل کے لئے مولوی ہو سکتا ہے لیکن وعظ نہ کہنا چاہیے کہ یہ نازک کام ہے اس کے لئے اتنی معلومات کافی نہیں اس لئے وعظ تو وہی کہیں جو باقاعدہ علوم حاصل کئے ہوئے ہوں تو اسمعوا سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا اور میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اس سے بتاء کی بھی ضرورت ہے کیونکہ یہ سب طرق علم کے وجود پر

موقوف ہیں تو اگر اس کا سامان بقاء نہ ہوتو یہ سلسلہ میں گم ہو جاوے گا اور اس کا کوئی طریقہ
ائے اس کے نہیں کہ ہر شہر میں ایک مدرسہ ہو جس میں نصاب عربی کی تکمیل ہو خیر اگر اس کی
ہمت نہ ہو تو کم از کم ہر شہر میں ایک عالم ہی رہے گو اس وقت آپ ان سے فائدہ نہ اٹھاویں
لیکن تب بھی رہنا ضروری ہے اور ان عالم سے ایک کام تو یہ لیں کہ چھوٹے بچوں کو ان کے
سپرد کریں دوسرے یہ کہ ان سے مسائل پوچھیں اور محلّہ درمحلّہ ان سے ضروری وعظ کہلاویں
اطیعوا کے متعلق اتنا کہنا ضروری ہے کہ جب اس کے معنے خوشی سے ماننے کے ہیں تو آپ
پر واجب ہوا کہ آپ خوشی سے مانیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ محبت دل میں پیدا کرو تا کہ کہنا
ماننا خوشی سے ہو اور اس کے پیدا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ عمل شروع کر دیں اول تکلف ہوگا
پھر اس کی برکت سے محبت بڑھنے لگے گی اور راز اس میں یہ ہے کہ سہولت ہوگی ظاہر سے بھی
باطن میں مدد ملتی ہے دیکھو اسی ظاہر کی برکت ہے کہ اس سے شدہ شدہ ایسی محبت پیدا ہو جاتی
ہے کہ ہماری نماز گو کوئی نماز نہیں مگر باوجود اس کے یہ حالت ہے کہ اگر کوئی پکا نمازی ہو اور وہ
غریب ہو اور اس سے کہا جاوے کہ سو روپیہ دیں گے آج کی نماز قضا کر دو تو ہرگز نہ راضی ہوگا
تو دیکھئے عمل کی ظاہری پابندی سے بھی قلب میں محبت پیدا ہوگئی تو سب اعمال کو بتکلف کیا
کیجئے اس سے محبت پیدا ہوگی اور اس محبت کے قائم رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت
اختیار کیجئے زیادہ نہ ہو تو کم از کم ہفتہ میں ایک ہی بار یا مہینہ میں ایک بار کسی اہل اللہ کے پاس
بیٹھئے اس میں خاصیت ہے کہ اس کے اندر جو چیز ہے وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آوے گی
اور میں آپ سے دنیا کے کام نہیں چھڑاتا اپنی فرصت کے وقت جا کر ان کے پاس رہیے اور
اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ان کے ملفوظات ہی پڑھیے لیکن محض تذکرہ اور فن کی کتابوں کی طرح نہ
دیکھیے گا۔ اس طریقہ سے محبت قائم رہتی ہے اور بڑھتی بھی ہے تیسری چیز جس سے محبت
بالخاصہ بڑھتی ہے وہ ذکر اللہ ہے گو تھوڑی ہی دیر اللہ اللہ کرے اور اسی میں سے کچھ وقت نکال
کر نفس کا محاسبہ کیا کیجئے کہ تو نے یہ نافرمانی کی ہے ایک وقت تجھ کو خدا کے سامنے جانا پھر خدا
کے عذاب کو یاد کرے اور توبہ کرے کہ مجھے نافرمانی سے بچا لیجئے۔ یہ وہ طریقہ ہے کہ اس میں
نہ نوکری چھوٹے نہ تجارت اور اپنی اولاد کے لئے بھی یہی کیجئے۔

صحبت علماء

بلکہ ان کے لئے اور بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ آپ نے پھر بھی بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں اس لئے آپ میں زندقہ تو نہیں ہے اور ان نوعمروں میں زندقہ ہے کہ تمسخر کرتے ہیں مگر اس میں اول خطا ماں باپ کی ہے مجھے ایک لڑکا ملا بریلی میں کہ اس کے دادا نے اس غرض سے پیش کیا کہ اس کو نماز کی فہمائش کر دیں میں نے نرمی سے پوچھا کہ جب خدا تعالیٰ کا حکم ہے پھر تم کیوں نہیں پڑھتے اس نے بے دھڑک کہا کہ صاحب مجھ کو خود خدا ہی کے وجود میں شک تھا میں نے اس کے دادا سے کہا کہ تم نماز کو لئے پھرتے ہو اس کو تو ابھی مسلمان بنانے کی ضرورت ہے اس کے بعد وہ آبدیدہ ہوا اور کہا کہ یہ سب وبال باپ پر ہوگا کہ مجھ کو فلاں کالج میں بھرتی کیا اور میں کیا بتلاؤں کہ وہ کہاں پڑھتا تھا۔ ایک اسلامی کالج میں پڑھتا تھا اسی لئے کہا کرتا ہوں کہ گورنمنٹ اسکول میں پڑھنے سے اس قدر بے دینی نہیں ہوتی جس قدر وہاں ہوتی ہے غرض یہ حالت ہوگئی ہے۔ نئی تعلیم کی سو یہ ماں باپ کے ذمہ ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان بچوں کو زیادہ ضروری سمجھ کر علم دین پڑھایئے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کیجئے کہ سال میں کم سے کم ہفتہ دو ہفتہ کسی اہل اللہ کے پاس ان کو ضرور رکھیے وہاں یہ حالت ہوتی ہے۔

گر تو سنگ خارہ مر مر شوی — چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی
صحبت نیکاں اگر یک ساعت ست — بہتر از صد سالہ زہد وطاعت ست
ہر کہ خواہد ہمنشینی باخدا — گونشیند در حضور اولیا

''اگر تم سخت پتھر اور سنگ مرمر بھی ہو گے مگر جب اہل اللہ کے پاس پہنچو گے تو موتی ہو جاؤ گے۔ نیک لوگوں کی صحبت ایک گھڑی کی' سو سال کے زہد وطاعت سے بہتر ہے جو شخص حق تعالیٰ کی ہم نشینی اور تقرب کا خواہاں ہو اس سے کہو کہ اولیاء اللہ کی صحبت اختیار کرے''

اور اس کے مقابل کی صحبت میں اس کا مقابل دوسرا اثر ہے

تاتوانی دور شواز یار بد — یار بد بدتر بود از مار بد

''حتی الوسع برے ساتھی سے دور رہو برا دوست برے سانپ سے بھی بدتر ہے''

خصوص جہاں تمام عمر کی صحبت ہو یعنی تعلق نکاح اور آجکل اسی میں زیادہ بے احتیاطی

ہے ایک بار بعض انگریزی خواں میری اس بات پر خفا ہوگئے کہ میں نے یہ بیان کیا تھا کہ لڑکی کے پیغام کے وقت یہ بھی تو تحقیق کرلیا کرو کہ لڑکا مسلمان بھی ہے یا نہیں کیونکہ ان نوعمروں میں ایسا بیباک ہے کہ بعض اوقات ان کے بعض کلمات سے کسی طرح ایمان نہیں رہ سکتا ان بچوں کے لئے بہت ہی ضروری ہے کہ کسی کے پاس رہیں یہ ایسی مفید چیز ہے کہ اگر اعمال میں بھی کوتاہی ہو تب بھی وہ مسلمان تو ہوگا چنانچہ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ عمل میں آزاد اور عقیدے میں نہایت پختہ تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ کسی مولوی کی صحبت میں رہے ہیں تو صحبت سے عقائد درست رہتے ہیں حضرت عمل دوسری چیز ہے لیکن اصل دین وہ ہے جو قلب میں رچ جائے سو یہ صحبت پر موقوف ہے تو بچوں کے لئے آپ ضرور ایسا کیجئے ورنہ کل کو آپ پچھتائیں گے اور روئیں گے جب ان کی حالت تباہ دیکھیں گے چنانچہ ایک صاحب بیرسٹری پاس کرکے آئے اور نماز کی تاکید پر باپ کو یہ جواب دیا کہ کس کی نماز پڑھوں باپ نے کہا کہ جس نے تم کو پیدا کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھ کو تو تم نے اور میری ماں نے پیدا کیا باپ روئے اور کہا کہ میں نے چالیس ہزار روپیہ میں جہنم خریدا ہے اور اگر آج نہ روئے تو کل قیامت میں رونا پڑے گا۔ جب دیکھا جاوے گا کہ لڑکا کندہ جہنم ہے میں انگریزی کو منع نہیں کرتا بلکہ میں تو اس وقت نماز روزہ کو بھی نہیں کہتا صرف یہ کہتا ہوں کہ کسی اہل اللہ کی صحبت میں رہنے کا اہتمام کچھ کرلو پس یہ ہے حاصل مجموعہ ذرائع محبت کا جس سے حقیقت اطاعت کی میسر ہوگی۔ یعنی بتکلف عمل کرنا اور صحبت اہل اللہ کی اختیار کرنا میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس وقت آپ خوشی سے قبول کریں گے۔ پھر نماز کا قضا ہوجانا آپ کو ایسا گراں ہوگا کہ جیسے بیٹا مرگیا اور یہی تو وجہ ہے کہ سلف کی اگر تکبیر اول قضا ہوجاتی تھی تو لوگ تعزیت کرتے تھے تو آپ کی بھی یہ حالت ہوجاویگی کہ

بردل سالک ہزاراں غم بود   گرز باغ دل خلالے کم بود

سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں اگر ذرہ بھر بھی اس کی باطنی حالت میں کمی ہوتی ہے۔

اب بتلایئے اس میں کونسی دشواری ہے ہم تو یرید اللہ بکم الیسر اللہ تعالٰی کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا مقصود ہے پر عمل کرکے طریق کی تعلیم کرتے ہیں لیکن اب بھی اگر

کوئی نہ کرے تو ہم کہیں گے کہ

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر تجھے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

یہ اطیعوا کے متعلق ہے

حب مال

انفقوا کے متعلق میں اتنا کہتا ہوں کہ اکثر خرابیاں حب مال سے ہوتی ہیں چنانچہ اسراف بھی حب مال سے ہوتا ہے اور اس کا عکس بھی ہوتا ہے اور بخل بھی اسی سے ہوتا ہے اس کا خصوص کے ساتھ علاج ہونا چاہیے آگے فرماتے ہیں وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں یہ خاص متعلق ماہ ہی کے ہے کہ جو شخص بخل نفس سے بچالیا جاوے اس کی فلاح ہوگی حرص و بخل سے بچنے کی خاص کر کے ترغیب دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ مفسدہ ہوتا ہے اور اس میں ایک نکتہ بھی ہے کہ شُحَّ نَفْسِہٖ فرمایا ہے۔ الشح نہیں فرمایا وہ نکتہ اسی مجلس میں قلب میں آیا ہے وہ یہ کہ نفس کا لفظ جو بڑھا دیا گیا ہے اس میں یہ امر بتلا دیا کہ حرص ایک تو یہ ہے کہ اس کی ذات میں ہو دوسری یہ ہے کہ حاجت کی وجہ سے ہو تو روپیہ تو کسی کو برا نہیں لگتا اور اگر کہو کہ بعض کو روپیہ بھی برا لگتا ہے تو وجہ یہ ہے کہ اول سے بڑی چیز مل گئی مثلاً دنیا کی چاہ یا آخرت کی نعمت سو جب دیکھتے ہیں کہ اس جگہ مال لینے سے دین ضائع ہوتا ہے یا اس کی ذلت ہوتی ہے تو وہاں مال مبغوض ہوتا ہے ورنہ فی نفسہٖ مال مرغوب ہے پس اگر نفس کا لفظ نہ ہوتا تو لوگ مر جاتے کیونکہ سب میں کم و بیش حرص ضرور ہے تو نفسہ بڑھا کر بتلا دیا کہ اگر حاجت کے موافق حرص رہے تو وہ ذات میں نہیں ہے اس لئے اس سے بچنا ضروری نہیں ہاں حاجت سے قطع نظر خود جب ذات ہی میں اس کی محبت ہو تو وہ حالت خطرناک ہے اور اس تحقیق سے ایک بڑے جھگڑے کا فیصلہ ہو گیا کہ علماء میں اور اہل دنیا میں بڑا جھگڑا ہے ترقی کی بابت کہ ترقی کریں یا نہ کریں پس فیصلہ یہ ہوا کہ حاجت کی قدر تو جائز لیکن اس کو خود مقصود سمجھنا ناجائز جس کا حاصل دوسرے عنوان میں یہ ہے کہ طلب دنیا یعنی دنیا کمانا تو برا نہیں ہے لیکن حب دنیا برا ہے ہمارے حضرت نے اس کی ایک مثال

دی ہے کہ مال مثل پانی کے ہے اور قلب مثل کشتی کے اور

آب در کشتی ہلاکت کشتی ست   آب اندر زیر کشتی پشتی ست

یعنی کہ پانی کشتی کا معین بھی ہے اور اس کو ڈبونے والا بھی ہے اس طرح کہ کشتی سے باہر رہے تو معین ورنہ مہلک اسی طرح مال ہے کہ اگر مال قلب سے باہر صرف ہاتھ میں ہے تو معین اور اگر قلب کے اندر اس کی محبت ہے تو مہلک اور اسی کو کہا ہے۔

مال را نو بہر دیں باشی حمول   نعم مال صالح گفت آں رسول

حدیث میں ہے نعم المال الصالح للرجل الصالح[1] نیک مرد کی پاک کمائی اچھا مال ہے ایسی حالت میں وہ لوگ مال اقارب کو دیں گے چندہ دیں گے تو حاصل فیصلہ کا یہ ہوا کہ علماء حب دنیا کو منع کرتے ہیں کسب دنیا کو منع نہیں کرتے تو شح حاجت کا مضائقہ نہیں شح نفس برا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس راز کو خوب سمجھا کہ جب فارس کا خزانہ آپ کے سامنے آیا تو آپ نے آیت زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ پڑھی اور فرمایا کہ اے اللہ اس سے معلوم ہوا کہ ہم میں اسی کی رغبت تو پیدا کی گئی ہے تو اس کا ازالہ تو نہیں چاہیے۔ مگر یہ دعا ہے کہ یہ محبت آپ کی محبت میں معین ہو جاوے۔ غرض گرنا پڑنا اور قبلہ بنانا درست نہیں اب میں ختم کرتا ہوں دیکھئے خدا تعالیٰ نے کن کن شفقتوں سے ہمارا علاج فرمایا ہے کہ ظاہر و باطن سب کی درستی ہو جاوے اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم سب مل کر ہمت کریں اور علم و عمل کا اہتمام کریں اور یہ سب تدابیر ہیں لیکن تدابیر کا نافع ہونا خدا کی مدد سے ہوتا ہے تو دعا کیجئے کہ وہ اس کی توفیق دے اور ہماری مدد فرمادے۔ آمین ثم امین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا

وحبیبنا و مولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

---

[1] مسند احمد ۴:۱۹۷ المغنی عن حمل الأسفار ۴:۱۰۱

المرابطه

علم وعمل کے متعلق یہ وعظ ۲۹ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ

بروز شنبہ صبح ساڑھے آٹھ بجے برمکان اہلیہ صغریٰ حضرت موصوف نے کرسی پر بیٹھ کر فرمایا۔ جو پونے چار گھنٹہ میں ختم ہوا۔ تعداد سامعین، مرد قریباً ۶۰ مستورات کثیر در پردہ تھیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰه نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِیْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلا هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لا شَرِیْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّم اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (ال عمران آیت نمبر ۲۰۰)

ترجمہ: اے ایمان والو صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم مراد کو پہنچو۔

تمہید: اس بیان کا سبب بجز مہمانوں کی درخواست کے کچھ نہیں ہے پہلے سے قصد نہ تھا اور درخواست کے بعد بھی اس واسطے قصد نہ تھا کہ مضمون ذہن میں کوئی حاضر نہ تھا مگر توکلا علی اللہ اس شرط کے ساتھ وعدہ کرلیا کہ اگر مضمون ذہن میں آ گیا تو بیان کردوں گا اس کے بعد میں نے بہت سوچا مگر کوئی مضمون نہ آیا پھر رات کو خود ہی فضل ہوا کہ مضمون ذہن میں آ گیا اور یہ کوئی نیا مضمون نہیں بلکہ وہ مضمون ہے جس کا تذکرہ قریب قریب ہر جلسہ میں مختلف عنوانوں سے آجکل ہوتا تھا عنوان اس کا عمل ہے بزرگوں نے اس کا بہت اہتمام فرمایا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں جابجا ارشاد ہے۔

کارکن کار بگذر از گفتار کاندریں راہ کار باید کار

عمل کرو عمل، دعویٰ کو ترک کرو۔ اس طریق میں عمل اور کام ہی کی ضرورت ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جس وقت خلیفہ ہوئے اور پہلے پہل خطبہ پڑھنے کھڑے ہوئے تو مضمون کی آمد نہ ہوئی تو آپ نے کچھ دیر سوچا جب سوچنے سے بھی آمد نہ ہوئی تو فرمایا انتم الی امام فعال احوج منکم الی امام قوال وستاتیکم الخطب بعد قوموا الی صلواتکم رحمکم اللہ کہ تم کو کام کرنے والے امام کی ضرورت ہے باتیں بنانے والے کی ضرورت نہیں مطلب یہ تھا کہ میں ان شاء اللہ کام کر کے دکھلاؤں گا خالی باتیں نہ بناؤں گا تو حضرت عثمان نے بھی اس ارشاد میں عمل کی اہمیت پر تنبیہ فرمائی ہے۔ حضرت عثمان میں حیا و خجلت کا مادہ زیادہ تھا جیسا حدیث پڑھنے والوں پر مخفی نہیں اور حیاء کثرت کلام سے مانع ہے اس لئے حضرت عثمان بوجہ غلبہ حیا کے خطبہ طویلہ بیان نہ کر سکے۔

کثرت کلام

آجکل لوگ کثرت کلام کو ہنر سمجھتے ہیں لیکن حدیثوں سے اس کی مذمت معلوم ہوتی ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے ان اللہ یبغض البلیغ من الرجال[1] اللہ تعالیٰ بلیغ لوگوں کو پسند نہیں فرماتے بلیغ سے مراد وہ نہیں جو اہل معانی کی اصطلاح میں ہے بلکہ بلیغ سے مراد وہ شخص ہے جو بے تکلف بولتا چلا جائے کیونکہ مذموم یہ ہی ہے اور بلاغت مصطلحہ مذموم نہیں (بلکہ محمود ہے۔ لقولہ تعالیٰ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ۱۲) بہرحال کثرت کلام مذموم ہے حضرت شیخ فرید عطار فرماتے ہیں۔

دل زپُر گفتن بمیرد دُرّ بدن　　　گرچہ گفتارش بود در عدن

زیادہ باتیں کرنے سے دل مرجاتا ہے خواہ وہ باتیں درعدن کی ہی ہوں۔

حضرات عارفین کو اس کا مشاہدہ شب و روز ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک کلمہ سے قلب سیاہ ہو جاتا ہے اس کے متعلق تجربہ یہ ہے اور میں اس لفظ سے بھی شرماتا ہوں کیونکہ در پردہ اس میں اپنے عارف ہونے کا دعویٰ ہے اور میں تو ان کی خاک پا بھی نہیں ہوں بس یوں کہیے کہ تجربہ کاروں سے سنا ہے کہ ضروری گفتگو دن بھر ہوتی رہے تو اس سے قلب پر ظلمت کا اثر

---

[1] سنن الترمذی: ۲۸۵۳ – سنن ابی داؤد: ۵۰۰۵ – مشکوٰۃ المصابیح: ۴۸۰۰

نہیں ہوتا چنانچہ ایک کنجڑا دن بھر لیلوا مرود پکارتا پھرے تو ذرہ برابر اس سے قلب میں ظلمت نہ آئے گی کیونکہ بضرورت ہے اور بےضرورت ایک جملہ بھی زبان سے نکل جائے تو دل سیاہ ہوجاتا ہے پس شیخ فرید عطار کے قول کا مطلب یہ ہوا کہ بےضرورت باتیں کرنے سے دل سیاہ ہوجاتا ہے اور یہی مراد بلیغ سے حدیث میں ہے جو بےضرورت زیادہ باتیں کرے اور بےتکلف بے سوچے گفتگو کرے کیونکہ ایسا وہی شخص کرسکتا ہے جو بےفکر ہو اور جس کے دل کو فکر لگا ہوا ہو وہ بےتکلف گفتگو نہیں کرسکتا میں دیکھتا ہوں کہ جس قدر علوم میں ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر کلام کی روانی کم ہوتی جاتی ہے اور اگر کبھی روانی زیادہ ہوتی ہے تو وہ مخاطبین کا فیض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخاطب کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں ان کے افادہ کے لئے قلب میں مضامین مفیدہ کثرت سے وارد ہوجاتے ہیں پس شیوخ ناز نہ کریں کہ ہم نے بڑے بڑے علوم واسرار بیان کردیئے کیونکہ کبھی سامعین کی برکت سے بھی مضامین کا ورود ہوتا ہے اور اس وقت اس کی مثال قیف جیسی ہوتی ہے کہ وہ محض واسطہ ہے بوتل میں تیل پہنچانے کا اب اگر قیف ناز کرنے لگے کہ میں نے تیل پہنچایا یہ اس کی حماقت ہے بلکہ اس کو بوتل کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس کی برکت سے اس کو بھی تیل سے کسی قدر تلبس ہوگیا ایک عالم کی حکایت ہے کہ ان کے وعظ میں ایک عارف موجود تھے۔ جو ان کی طرف متوجہ تھے ان کی توجہ کا یہ اثر ہوا کہ وعظ میں عجیب عجیب علوم بیان ہوئے درمیان میں واعظ کو عجب ہوا کہ آج تو میں نے بڑے علوم بیان کئے ہیں عارف کو اس خطرہ کا کشف ہوگیا تو اس نے اپنی توجہ ان کی طرف سے ہٹالی توجہ کا ہٹانا تھا کہ واعظ کو آمد بند ہوگئی اس لئے کسی وقت روانی بیان میں ہوا اور علوم عجیبہ ہوجائیں تو اس کو سامعین کا فیض سمجھنا چاہیے غرض کثرت کلام خود مقصود نہیں بلکہ افادہ واستفادہ کے لئے ذریعہ ہے اور مقصود عمل ہے۔

عمل کی حقیقت

بزرگان دین کی یہ ہی وصیت ہے شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

قدم باید اندر طریقت نہ دم   کہ اصلے ندارد دمے بے قدم

طریقت میں قدم رکھنا یعنی عمل کرنا چاہیے اس لیے بغیر قدم یعنی عمل کے دعویٰ کی کوئی حقیقت نہیں۔
قدم سے مراد عمل ہے اہل طریقت تو یہاں تک مشاہدہ کرتے ہیں کہ جس کام کو وہ خود

نہیں کرتے اس کی نصیحت بھی دوسروں پر موثر نہیں ہوتی اور جس کام کو خود کرتے ہیں اس کی نصیحت بھی موثر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بزرگوں نے وصیت کی ہے کہ عارف کو بھی خلوت کی ضرورت ہے گو وہ اس درجہ پر پہنچ چکا ہو کہ۔

خلوت و چلہ بر ولا زم نماند (خلوت اور چلہ اس کے لئے ضروری نہیں)

مگر دوسروں کے افادہ کے لئے اس کو خلوت لازم سمجھنا چاہیے تاکہ جلوت میں جو علوم کا افادہ ہو چکا ہے ان کے علاوہ خلوت میں نئے علوم مجتمع ہو جائیں اور چشمہ بند نہ ہو بلکہ پانی کی آمد برابر ہوتی رہے چونکہ آجکل لوگوں کو عمل کی طرف توجہ نہیں عوام تو عوام خواص کو بھی زیادہ توجہ اسرار و ذوقیات ہی کی طرف ہے اس لئے بھی یہ مضمون زیادہ ضروری ہو گیا اور خواص کو عمل کی طرف توجہ ہے اس لئے کم ہے کہ عمل میں ابتداء لذت نہیں ہوتی اور ذوقیات میں سراسر لذت ہے عمل کی مثال ابتداء میں مثل دوا کے ہے اور انتہا میں مثل غذا کے ہے منتہی کو عمل میں زیادہ لذت ہوتی ہے چنانچہ حدیث میں ہے **جعلت قرة عینی فی الصلوٰة**[1] (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) اب جو سالکین یہ شکایت کرتے ہیں کہ ذکر میں اور نماز و روزہ میں مزہ نہیں آتا ان پر ہنسی آتی ہے کہ انہوں نے طبیب سے کبھی یہ شکایت کی کہ دوا میں مزا نہیں آتا پھر یہاں اس شکایت کے کیا معنی صاحب تم کو جو ذکر و اوراد بتلائے گئے ہیں بطور دوا کے بتلائے گئے ہیں پھر دوا میں لذت کی طلب کیسی ہاں اس کی عادت کرلو تو پھر مثل غذا کے اس میں بھی لذت آئے گی کیونکہ عادت کے بعد دوسرا بھی غذا بن جاتی ہے جیسے افیون اور تمباکو کہ حقیقت میں یہ چیزیں دوا ہیں مگر عادت کے بعد غذا سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتے ہیں پس عمل میں لذت اور سہولت کا طالب ہونا غلطی ہے اور اگر شیخ ایسا طریقہ بتلا دے جس سے عمل میں سہولت ہو جائے تو یہ اس کا فرض منصبی نہیں محض تبرع ہے چنانچہ حکیم کا فرض منصبی صرف نسخہ لکھ دینا اور دوا بتلا دینا ہے مریض کو یہ حق نہیں کہ طبیب سے الائچی اور پان کا مطلب کرنے لگے اگر وہ نسخہ بتلا کر الائچی اور پان بھی کھلا دے تو یہ اس کا احسان ہے جیسا بعض اطباء شفقت کے طور پر مریضوں کو بد پرہیزی کی اجازت دے دیتے ہیں مولانا حکیم معین الدین

---

[1] فتح الباری لابن حجر ۱۱: ۳۴۵، کنز العمال: ۱۸۹۱۴، المعجم الصغیر للطبرانی ۱: ۲۶۲

صاحب مرحوم کی حکایت سنی ہے کہ وہ اپنے سامنے مریض سے پرہیز نہ کراتے تھے اور کہتے تھے کہ میرے سامنے جس چیز کو دل چاہے کھالو کیونکہ وہ نسخہ میں اس کی رعایت کر لیتے تھے مگر پیچھے اس کی اجازت نہ تھی تو یہ محض ان کی شفقت تھی مریض کو اس کی درخواست کا حق نہ تھا۔

شیوخ و مریدین

شیوخ چونکہ عربی ہیں اور بد پرہیزی کرانا تربیت کے خلاف ہے اس لئے ان سے بھی بد پرہیزی کی اجازت مانگنے کا کسی کو حق نہیں اور لذت وسہولت کی طلب بھی ایک درجہ میں بد پرہیزی کی طلب ہے کیونکہ معالجہ باطن کا مدار مجاہدہ پر ہے اور مجاہدہ میں لذت کہاں اگر مجاہدہ میں لذت ہو تو مجاہدہ نہ رہے گا اس لئے بعض دفعہ شیوخ قصداً بھی سہولت ویسر کا طریقہ نہیں بتلاتے ہاں بعض دفعہ کسی کو شفقت کے طور سے ایسے طریقے بتلا دیتے ہیں جن سے عمل میں سہولت ہو جائے وہ بھی اسی وقت تک جب تک خود سالک درخواست نہ کرے اور اگر ان سے درخواست کی تو اس وقت اس کی رائے بدل جاتی ہے کہ تجھ کو تو سہولت کی راہ سے نہ پہنچایا جائے گا بلکہ ناک رگڑ کے ہی عمل کرایا جائے گا خلاصہ یہ ہوا کہ طالب کو سہولت ولذت کی درخواست کا حق نہیں بلکہ اس کو لازم ہے کہ خاموشی اختیار کرے شیخ جو طریق مناسب سمجھے گا خود اختیار کرے گا مگر ایسی خاموشی بھی جائز نہیں کہ حالات سے بھی شیخ کو مطلع نہ کرے کیونکہ شیوخ عالم الغیب نہیں ہاں عالم الغیب (بالمہملہ) تو ہیں بشرطیکہ وہ عیب غیب نہ رہے بلکہ احوال سے اس کو برابر اطلاع دی جائے تو وہ سالک کے امراض وعیوب پر مطلع ہو جاتا ہے اسی لئے میں نے آداب سلوک کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کیا ہے اطلاع واتباع قافیہ کا تو مجھے خبط ہے کیونکہ قافیہ سے کلام موزوں اور خاوش نما ہو جاتا ہے نیز اس کا یاد رکھنا بھی آسان ہو جاتا ہے اسی طرح دو لفظ اور ہیں، اعتقاد وانقیاد کہ سالک کو شیخ سے اول اعتقاد ہونا چاہیے پھر اس کے احکام کی اطاعت کرنا چاہیے کبھی اعتقاد کی بجائے اعتماد کہہ دیتا ہوں کیونکہ اعتقاد وہی معتبر ہے جو اعتماد کے ساتھ ہو یہ حاصل ہے معاملہ شیوخ و مریدین کا۔ مگر آج کل یہ حقوق پامال کئے جارہے ہیں کہ ہر سالک اپنی رائے کو شیخ کی رائے میں شامل کرنا چاہتا ہے سو اس طرح کامیابی دشوار ہے طب ظاہر میں بھی ایسا مریض شفایاب نہیں ہوسکتا جو معالج کی رائے

میں اپنی رائے کو داخل کرے میرے پھوپھی زاد حکیم مصباح الحق بڑے قابل حکیم تھے ایک بار وہ خود مریض ہوئے اور حکیم عبدالمجید خان صاحب کے پاس علاج کے لئے گئے تو ان کی حالت یہ تھی کہ حکیم صاحب کے ہر نسخہ میں ترمیم کرتے تھے کیونکہ خود بھی حکیم تھے مگر نتیجہ یہ ہوا کہ جب حکیم عبدالمجید خان صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی صاف فرما دیا کہ یہ اس مرض سے جانبر نہ ہو نگے۔ کیونکہ ان کو کسی طبیب پر اعتماد نہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔

اسرار و ذوقیات

اسرار و ذوقیات کے نعمت ہونے میں شک نہیں اگر بدون طلب کے حاصل ہو جائیں تو شکر کرنا چاہیے مگر چونکہ مقصود مطلوب نہیں ہیں اس لئے ان کے در پے نہ ہونا چاہیے۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ ذوق وشوق وانس وغیرہ حجب نورانیہ ہیں اور حجب نورانیہ حجب ظلمانیہ سے اشد ہیں کیونکہ حجب ظلمانیہ کی طرف سالک متوجہ نہیں ہوتا ان کو خود دفع کرنا چاہتا ہے اور حجب نورانیہ کی طرف متوجہ ہو جاتا اور التفات کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے توجہ مقصود سے ہٹ جاتی ہے اس لئے حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی وقت انوار و اسرار ذوقیات کی طرف توجہ ہونے لگے تو لا الہ الا اللہ کے لا سے ان کی بھی نفی کرنا چاہیے کیونکہ مقصود وراء الوراثم وراء الوراہے۔

اے برادر بے نہایت در گہیست   ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

''اے برادر یہ نہایت درگاہ ہے جس درجہ پہ پہنچو اس پر مت ٹھہرو آگے ترقی کرو''

اور اگر کسی وقت ذوقیات واحوال سے اپنے کو خالی پائے اس وقت یوں کہے۔

روز ہا گر رفت گورو باک نیست   تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

''ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہئے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا رہنا کافی ہے''

روز ہا سے مراد احوال و کیفیات ہیں کہ اگر کسی وقت یہ نہ ہوں تو دلگیر نہ ہو بلکہ یہ سمجھے کہ خدا تو ہے پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی کے نہ ہونے کا کیا غم محبّ کو تو محبوب سے کام ہے اغیار سے کیا کام؟

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشداز وغیر اوتمنائی

''فراق ووصل کیا ہوئے رضائے الٰہی طلب کرواسکے علاوہ اورتمنا کرنا باعث صد افسوس ہے''

محبّ وہ ہے کہ محبوب فیرینی کھلائے تو اس پر راضی رہے پھیکا دودھ پلا دے تو اس پر راضی رہے ایلوا کھلائے تو اس پر بھی راضی رہے محبّ کی تو یہ شان ہونا چاہیے

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی غذائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

''تو مجھے زندگی دے یہ تیری عطاء و بخشش ہے اور اگر قتل کریں تو میں آپ پر فدا ہوں آپ سے دلی محبت ہے آپ جو چاہے کریں آپ کی رضا پر راضی ہوں''

سرمد مجذوب اس مضمون کو ذرا صاف بیان کرتے ہیں

سر مدگلہ اختصارمی باید کرد یک کار ازیں دو کارمی باید کرد

یاتن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیارمی باید کرد

''سرمدؒ شکایت کومختصر کرواور دوکاموں میں سے ایک کام کرو یا تو تن کومحبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وقف کردو یا محبوب سے قطع نظر کرو''

کیا دوٹوک فیصلہ ہے کہ اگر یہ خدا پسند نہیں تو کوئی دوسرا خدا تجویز کرلو جوتم کو ہمیشہ لذت ہی میں رکھے اور اگر یہی خدا پسند ہے تو وہ تمہاری مرضی کے تابع نہ ہوگا بلکہ اپنی مرضی کے مطابق حکم کرے گا پھر شکایت کے کیا معنی؟ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو محبوب کی ہر ادا محبوب ہونا چاہیے اس کی ایک موٹی مثال ہے اگر کوئی عاشق دصال محبوب کے لئے تڑپتا پھرتا ہو پھر اتفاق سے محبوب اس کو پیچھے سے آ کر بغل میں دبالے اور ایسا دبائے کہ پسلیاں ٹوٹنے لگیں اور وہ عاشق یوں کہے کہ اگر تجھ کو اس سے تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں اور رقیب کو بغل میں لیلوں کہ وہ بھی اس کا مشتاق ہے تو بتلایئے عاشق کیا کہے گا؟ یقیناً یوں کہے گا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

''ایسا دشمن کا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو۔ آپ کی خنجر آزمائی کیلئے دوستوں کا سر سلامت رہے۔''

افسوس ایک مخلوق کی تو ہر ادا محبوب ہو جو کہ اپنے ہی مثل ہے کہ بنی نوع میں سے ہے اور ممکن

ہے کہ محبؔ میں اس سے زیادہ کمالات ہوں عقل وفہم وہنروغیرہ مگراس کا صرف چمڑا حسین ہے خواہ صبیح ہے یا ملیح کیونکہ اس میں مذاق کا اختلاف ہے بعض کو صباحت پسند ہے بعض کو ملاحت غرض صرف اتنی سی بات کی وجہ سے اس کی ہرادا پر جان فدا کرنے کو تیار ہیں اوراللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں حالانکہ حقیقی کمال اور حقیقی حسن وجمال انہی میں ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

عشق مولا کے کم از لیلی بود گوئے گشتن بہراو اولی بود

''مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کیا کم ہے اس کی گلیوں میں پھرنا اسے اولیٰ اور افضل ہے''

سعدی فرماتے ہیں

ترا عشق ہمچو زاب و گل ربابید مہ صبرو آرام و دل
چودر چشم شاہد نیاید زرت زدو خاک یکساں نما یدبرت
عجب داری از سالکان طریق کہ ہستند دربحر معنی غریق
دمادم شراب الم در کشند وگر تلخ بینند دم درکشند

''تیرا عشق آب وگل کی مانند ہے اس لیے صبروآرام ودل چاہیے جب محبوب کی نظر میں سونے کی کوئی قدروقیمت نہیں تو پھر سونا اور مٹی دونوں برابر ہیں سالکان طریق جوحقیقت کے دریا میں غریق ہیں تو ان پر تعجب کرتا ہے اسکے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگرغم دیکھتے ہیں تو اس پر مرہم رکھتے ہیں وہ ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں۔''

اوراس سے بڑھ کران خشک لوگوں پر افسوس ہے جومحبت حق ہی کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں ہوسکتی ہے بس محبت حق کے معنی یہی ہیں کہ احکام پر چلتے رہو افسوس ان لوگوں کو اپنے حرمان پر تو افسوس نہ ہوا الٹا اہل محبت کی دولت ہی کا انکار کرنے لگے۔ صاحبو وہ تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کی محبت نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کو دیکھا نہیں۔

محبت مخلوق

میں یہ کہتا ہوں کہ غیر حق کی محبت نہیں ہوسکتی جس کو میں دلیل سے ثابت کرسکتا ہوں اور ان کے پاس کوئی دلیل نہیں میرے دعوی کی دلیل یہ ہے کہ محبت مخلوق کا سبب ذات محبوب

نہیں کیونکہ ذات من حیث ہی ذات تو بچپن میں بھی موجود ہے اور بڑھاپے میں بھی پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ محبوب سے محبت جوانی میں یا دوسرے بعض حالات میں ہوئی بلکہ محبت کے اسباب چار ہیں کمال، جمال، نوال، قرابت کمال کی وجہ سے جو محبت ہوتی ہے وہ دیدار پر موقوف نہیں کیونکہ بہت سے اہل کمال ایسے ہیں جن کو ہم نے نہیں دیکھا مگر ہم کو ان سے محبت ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب مسلمانوں کو محبت ہے اور جملہ انبیاء سے محبت ہے اور ایسی محبت ہے کہ اولاد و والدین سے زیادہ۔ چنانچہ مسلمان اپنے والدین کی شان میں گستاخانہ کلمات سن کر صبر کر سکتے ہیں مگر حضرات انبیاء کی شان میں گستاخی ہوتے ہوئے دیکھ کر صبر نہیں کر سکتے یہ تو دینی محبت کی مثال ہے اور دنیوی محبت کی مثال یہ ہے کہ شاہنامہ پڑھنے والوں کو رستم سے محبت ہو جاتی ہے مجھے خود اپنا واقعہ بچپن کا یاد ہے کہ جب میں شاہنامہ پڑھتا تھا تو ہر لڑائی کا بیان شروع کرتے ہوئے یہ تمنا ہوتی تھی کہ رستم ہی غالب ہو اس پر دوسرا کوئی نہ غالب ہو دوسرا سبب جمال ہے یعنی حسن سو اسکی عارضی ہونے کی یہ حالت ہے کہ مخلوق میں کسی کا حسن بھی ذاتی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا دیا ہوا ہے چند روز میں موت آ کر سارے حسن کا خاتمہ کر دیتی ہے اور زندگی میں بھی اگر عورت کا سر مونڈ دیا جائے تو سارا حسن جاتا رہتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

عشق بامردہ نباشد پائدار عشق را باحی وباقیوم دار
عشق ہائے کز پئے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

''مردہ کے ساتھ عشق کی پائیداری نہیں ہے اس لیے حی وقیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے۔ جو عشق محض رنگ وروپ پر ہوتا ہے اس کا انجام حسرت وندامت ہے''۔

پس مخلوق کی حالت دیکھ کر یہ حقیقت عیاں ہے کہ ان کا حسن کسی دوسرے کا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ خدا کے سوا کوئی نہیں تو اب جو شخص کسی مخلوق پر عاشق ہے وہ حقیقت میں خدا پر عاشق ہے کیونکہ جس کمال و جمال پر وہ فریفتہ ہے وہ خدا کا پیدا کیا ہوا اس کا عطا کیا ہوا ہے مکان کی تعریف کرنے والا حقیقت میں معمار کی مدح کر رہا ہے خوش خط تحریر پر فریفتہ ہونے والا دراصل کاتب پر فریفتہ ہو رہا ہے گو اس کو خبر نہیں اسی طرح ہاں سمجھو تیسرا سبب نوال ہے

وہ بھی حقیقت صفت حق تعالیٰ ہی کی ہے جیسا ابھی جمال کی تقریر میں مذکور ہوا اب رہ گئی قرابت سو قرابت متعارفہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہے البتہ اس کی حقیقت یعنی دو شخصوں میں اوروں سے زیادہ ایک نسبت یہ حق تعالیٰ کے ساتھ ایسی حاصل ہے جو کسی کے ساتھ بھی نہیں اس کی تفصیل احیاء میں مبسوط ہے اب تو میرا یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ غیر حق کی محبت نہیں ہو سکتی بلکہ محبت جب ہو گی جب خدا ہی سے ہو گی اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ　　پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

''اپنے حُسن کو حسینوں کے چہرہ سے ظاہر کیا ہے اور عاشقوں کی آنکھ میں اپنے آپ کو تماشا بنایا ہے۔''

محبت خالق

اگر اب یہ سوال پیدا ہو کہ خدا تعالیٰ کی درگاہ تک ہم کیونکر پہنچیں اور ان کی محبت کس طرح حاصل کریں تو مولانا اس مقام پر اس کو بھی بتلاتے ہیں مولانا کا کلام جامع ہوتا ہے وہ سب پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　برکریماں کارہا دشوار نیست

''تو یہ خیال نہ کر کہ بھلا ہماری پہنچ اس دربار تک کہاں ہے کیونکہ کریموں کو کوئی کام مشکل نہیں ہوتا''۔

لفظ برکریماں میں اس طرف اشارہ ہے کہ وصول الی اللہ تمہاری سعی سے نہ ہو گا بلکہ ان کے کرم سے ہو گا میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے شیر خوار بچہ کو آپ اپنے پاس بلانا چاہیں جو کھڑا تو ہو جاتا ہے مگر چل نہیں سکتا آپ اس کو بلاتے ہیں کہ یہاں آ ؤ حالانکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ آ نہیں سکتا مگر کسی مصلحت سے آپ اس کے منتظر ہوتے ہیں کہ یہ ذرا چلے اور گر پڑے تو گود میں لے لیں بس یہاں بھی اسی کی ضرورت ہے کہ ذرا چلو اور گر پڑو پھر وہ خود ہی اٹھا لیں گے ورنہ خود آپ اس راستہ کو طے نہیں کر سکتے ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

نگر دد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا　　کہ بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

''راہ عشق دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا بلکہ تاک کی طرح قطع کرنے سے اور زیادہ بڑھتا ہے''

اور عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

مابداں مقصد عالی نتوانیم رسید ہاں مگر لطف شما پیش نہد گامے چند

''اگر چہ ہم مقصد عالی تک پہنچ سکے مگر ہاں آپ کے لطف وکرم سے چند قدم آگے بڑھائے ہیں''

جب محبوب حقیقی حق تعالیٰ شانہ ہیں جیسا ابھی ثابت ہوا تو کیا محبت کا یہی حق ہے کہ بسط ہوتو قبض کی تمنا ہے اور قبض ہوتو بسط کی تمنا ہے ارے تم کوتو خاموش چلنا چاہیے کہ

خواجہ خودروش بندہ پروری داند ''پروردگار حقیقی بندہ پروری خود جانتے ہیں''۔

قبض کے اندر بعض دفعہ سخت حالت ہو جاتی ہے کہ بعض نے اس وقت خودکشی تک کا ادارہ کرلیا مگر محبت کا مقتضاوہ ہے جس کو عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

باغباں گر چند روزے صحبت گل بایدش بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

اے دراند بند زلفش از پریشانی منال مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

''اے باغباں اگر پانچ روز بھی گل کی صحبت میسر آ جائے تو جدائی کے کانٹوں کی تکالیف پر بلبل کو صبر آ سکتا ہے۔ اے دل تو اس کی زلفوں میں گرفتار ہوکر پریشان مت ہو کیونکہ عقل مند پرندہ جب جال میں پھنستا ہے تو اسکو صبر کرنا چاہیے۔''

اور اگر کوئی قبض کی تدبیر کر کے بسط حاصل کرلے اور اس پر نازاں ہو تو اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

تکیہ برتقوی ودانش در طریقت کافریست راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

''طریقت اپنے عقل وتقویٰ پر بھروسہ کرنا کفیر سالک اگر سو ہنر بھی جانتا ہو پھر بھی اس کو توکل کرنا چاہیے یعنی اپنے آپ کو اہل اللہ کے سپرد کرنا چاہیے''

غرض محبت کا مقتضی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سب تصرفات پر راضی رہے اور اسی تجویزوں کو فنا کردے دل لگنے یا نہ لگنے کا طالب نہ ہو لذت وذوق کی ہوس نہ کرے بلکہ کام میں لگا رہے۔

بس زبوں وسوسہ باش ولا گر طرب را باز دانی ازبلا

''تم بالکل مغلوب وساوس سمجھے جاؤ گے اگر محبوب کے طرب وبلا میں فرق سمجھو گے''

عارف فرماتے ہیں۔

فراق وصل چہ باشد رضائے دست طلب کہ حیف باشد از وغیر اوتمنائی

"فراق ووصل کیا چیز ہے رضائے الٰہی طلب کرواس کے سوا اور طلب باعث صد افسوس ہے"
بعض سالکین کی عمر گذر گئی کہ ان کو ذوق حاصل نہیں ہوا پھر بعض تو خالی رہے اور بعض نشتروں کے زخموں سے بھرے ہوئے ہیں مگر وہ اس پر بھی راضی ہیں۔

اے ترا خارے بپا شکستہ کے دانی کہ چیست   حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

"تمہارے پاؤں میں ابھی کانٹا بھی نہیں لگا تم ان لوگوں کا کیا حال سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر مصیبت کی تلوار چل رہی ہے۔"
یہ بھی تجویز ہے کہ قبض کی دعا کرنے لگے کیونکہ وعظ میں نے سن لیا تھا کہ قبض نافع ہے یہ بھی غلطی ہے بلکہ تفویض کلی لازم ہے اپنی طرف سے نہ لذت کی طلب کرے نہ عدم لذت کی نہ قبض نہ بسط کی۔

دعا عافیت

حضرت سمنون محبؒ کا واقعہ پیش نظر رکھیے ان پر ایک حالت غالب ہوگئی تھی اس وقت ان کے منہ سے یہ شعر نکلا۔

ولیس لی فی سواک حظ   فکیف ماشئت فاختبرنی

کہ مجھے جس طرح چاہو آزمالو مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں حظ نہیں یہ سخت بات تھی جس پر غیب سے امتحان شروع ہوگیا کہ ان کا پیشاب بند ہوگیا اسی واسطے حدیث میں ایسی دعا سے ممانعت ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو مرض شدید میں مبتلا دیکھا پوچھا کیا تم نے کوئی دعا کی ہے کہا ہاں میں نے یہ دعا کی ہے کہ اے اللہ جس قدر عذاب آخرت میں مجھے ہونے والا ہو سب دنیا میں ہوجائے حضورؐ نے فرمایا سلوا اللہ العافیۃ[1] کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرنا چاہیے کہ دنیا و آخرت دونوں میں عافیت عطا ہو۔ غرض حضرت سمنون کا پیشاب بند ہوگیا اور اب دعا بھی نہیں کرتے کیونکہ دعا کرتے ہوئے شرماتے تھے یہ بھی ایک حال تھا مگر اس سے کامل تر حال یہ تھا کہ دعا کرتے اور کہتے کہ مجھ سے خطا ہوئی میں توبہ کرتا ہوں مجھے آپ کے امتحان کا تحمل نہیں مگر مغلوب کو کوئی رائے نہیں دی جاسکتی پھر حق تعالیٰ نے ان کے صبر پر رحم فرما کر دعا کی اجازت دینا چاہی مگر صاف طور

[1] الصحیح للبخاری ۴:۲۲، سنن ابی داؤد کتاب الجہاد ب: ۹۷، سنن الترمذی: ۳۵۹۴، کنز العمال: ۳۹۲۳

سے نہیں کہ ان پر الہام ہو جاتا کیونکہ جب خود اللہ تعالیٰ سے نہیں بولتے تو وہ ان سے کیوں کلام کریں بلکہ اجازت کی یہ صورت ہوئی کہ ایک فرشتہ کو بھیجا گیا کہ سمنون کی آواز میں زور زور سے دعا کرے یہ بھی ایک عجیب انداز تھا۔

خوبی ہمیں کرشمہ وناز وخرام نیست　　　بسیار شیوہاست بتا نرا کہ نام نیست

"حسن اسی ناز وخرام اور کرشمہ کا نام نہیں ہے حسینوں کی بہت سی ادائیں ایسی ہیں جن کا نام نہیں ہے۔"

فرشتہ نے اس زور سے دعا کی کہ خانقاہ میں سب مریدوں نے سنا صبح کو ایک خادم نے عرض کیا کہ رات کو کیا آپ نے دعا کی تھی ہم نے تو رات بھر آپ کی دعا کی آواز سنی ہے سمجھ گئے اور خوش ہوئے کہ الحمدللہ کہ مجھے دعا کی اجازت ہوئی پھر اس کی یہ صورت اختیار کی کہ مکتب کے بچوں کے پاس جاتے اور ان سے فرماتے **ادعوا لعمکم الکذاب** کہ اے بچو! تم اپنے جھوٹے چچا کے لئے دعا کرو۔ کذاب اس لئے کہا کہ دعوے پر جمے نہ رہے امتحان کا تحمل نہ کر سکے۔ سبحان اللہ کیسا اچھا علاج کیا اپنے کو بچوں کا محتاج بنایا۔

امت محمدیہ

امت محمدیہ کے بچے بھی مشائخ کی امداد کے قابل ہیں امت محمدیہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بدویہ نے اپنی اولاد کی تعریف میں کہا تھا۔ **ھم کالحاقة المفرعة لایدری این طرفاھا** کہ میری اولاد ڈھلے ہوئے تھے کہ مشابہ ہے کہ کسی کو یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ اس کا کنارہ کدھر ہے یعنی سب برابر ہیں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں غضب کی تشبیہ ہے جو اس بدویہ کو سوجھی یہی حال امت محمدیہ کا ہے کہ اس کے بچے بھی مقبول بڑے بھی مقبول بعض اوقات بچے بڑوں کے محتاج ہیں اور ایک وقت میں بڑے بچوں کے محتاج ہیں طالبین مشائخ کے محتاج اور بعض اوقات مشائخ طالبین کے محتاج۔

تشنگاں گر آب جویند ازجہاں　　　آب ہم جوید بعالم تشگاں
بانگ مے آید کہ اے طالب بیا　　　جود محتاج گدایان چوں گدا

"پیاسے اگر پانی کے طالب ہیں تو پانی بھی ان کا طالب ہے آواز آتی ہے کہ اے طالب آ و جس طرح سخاوت گداگروں کی طرح خود فقیروں کی محتاج ہے۔"

ایک پیغمبر کی حکایت حدیث میں ہے کہ وہ استسقاء کو جارہے تھے راستہ میں چیونٹی کو دیکھا کہ ہاتھ اٹھائے دعا کررہی ہے آپ نے ساتھیوں سے فرمایا کہ لوٹ چلو اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کی دعا قبول فرمائی ہے جب چیونٹی کی دعا بھی قبول ہوتی ہے تو مسلمانوں کے بچے تو اس سے بدرجہا افضل ہیں ان کی دعا کیوں نہ قبول ہوگی نیز حدیث میں ہے کہ عالم کے لئے مچھلیاں اور چیونٹیاں دعا کرتی ہیں۔

لیڈر اور علماء

گو آجکل لیڈروں کے نزدیک علماء عضو معطل اور بیکار ہیں مگر حیوانات ان کے واسطے دعا کرتے ہیں کیوں؟ دو وجہ سے ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ نے ان کو اسی کام میں لگا دیا ہے کہ علماء کے واسطے دعا کریں دوسرے اس واسطے کہ حیوانات کی خیر بھی بقاء علماء ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ بقاء عالم علماء کی وجہ سے ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے **لا تقوم فی الارض حتی یقال فی الارض الله الله**[1] (او کما قال) کہ زمین میں جب تک خدا کا نام لیا جاتا رہے اس وقت تک قیامت نہ آئے گی اور مشاہدہ ہے کہ دنیا میں اللہ کے نام کی بقاء علماء کی وجہ سے ہے۔ پس علماء کا وجود بقاء عالم کا ذمہ دار ہے مگر افسوس لیڈران کو نکما سمجھتے ہیں اور سنا ہے کہ آجکل ایک جماعت علماء کے استیصال کی فکر میں ہے طرح طرح کی تدبیروں سے ان کے اثر مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے برا بھلا بھی ان کو کہا جارہا ہے مگر علماء اس بارہ میں خاموش ہیں اور بہت احتیاط کرتے ہیں وہ کسی کو بلا ضرورت برا نہیں کہتے مگر اب ضرورت ہے کہ ان لوگوں کی رعایت نہ کی جائے جبکہ وہ ہماری رعایت نہیں کرتے اور وہ ضرورت یہ ہے کہ عوام ان کی باتوں سے گمراہ ہورہے ہیں یہ لیڈر دین کے احکام میں دخل دیتے اور اپنی رائے سے جس طرح چاہتے ہیں احکام میں تحریف کردیتے ہیں اور عوام ان کو مولوی مولانا سمجھے ہوئے ہیں اس لئے میں صاف کہتا ہوں کہ یہ لوگ گمراہ ہیں مسلمانوں کو گمراہ کررہے ہیں کیونکہ دین کا مدار اعتقاد پر ہے کہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتقاد ہو اور رسول پر اعتقاد جبھی ہوگا جبکہ حاملان شریعت سے اعتقاد ہو کیونکہ عوام کو رسول کی

---

[1] لم أجد الحديث بلفظه فی "موسوعة اطراف الحديث النبوی الشريف"

معرفت علماء کے ذریعہ سے ہوتی ہے جس نے علماء کو نہیں پہچانا وہ رسول کو نہیں پہچان سکتا پس جو لوگ علماء کے استیصال کی فکر میں ہیں وہ خود مسلمانوں کی بلکہ عالم کی استیصال کی فکر میں ہیں۔ میں ایک بات اور کہتا ہوں گو کہنے کی تو نہیں وہ یہ کہ عالم اگر بدعمل بھی ہو جب بھی تم کو اس پر اعتراض کا حق نہیں کیونکہ وہ مدعی علم ہے نہ کہ عمل کا اس کی بدعملی سے علم تو غلط نہیں ہو گیا طبیب اگر بد پرہیز ہو تو مریض کا کیا نقصان ہے وہ مریض کو تو صحت ہی کا طریقہ بتلائے گا اسی طرح عالم بے عمل تم کو فتوے تو صحیح دے گا مسائل تو غلط نہ بتلائے گا اور یہ لیڈر جاہل تو احکام غلط بتلاتے ہیں دیکھئے کیمیا گر خود ننگا ہو تو تمہارا کیا نقصان ہے اور بڑے بڑے رؤسا اس کے پیچھے کیوں پھرتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ دوسروں کو ننگا نہیں کرتا اور اس کے پاس ایسی چیز ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے یہ مضمون طویل ہو گیا گفتگو اس پر چلی تھی کہ جب چیونٹیوں اور مچھلیوں کی دعا قبول ہوتی ہے تو مسلمانوں کے بچوں کی دعا کیوں قبول نہ ہو گی اسی لئے حضرت سمنون بچوں سے دعا کراتے تھے یہاں سے معلوم ہوا کہ بچوں کی دعا قبول ہوتی ہے مگر بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ بچوں کی دعا قبول نہیں ہوتی چنانچہ مشہور ہے کہ ایک میاں جی استسقا کے لئے بچوں کو لے جا رہے تھے کسی ظریف نے کہا اگر بچوں کی دعا قبول ہوا کرتی تو میاں جی سب سے پہلے تم مرتے کیونکہ بچے روزانہ تم کو کوستے ہیں مگر یہ حکایت صحیح بھی ہو تو بہت سے بہت یہ کہا جائے گا کہ بچوں کی بددعا قبول نہیں ہوتی اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ دعا بھی قبول نہیں ہوتی اور حضرت سمنون تو دعا کے واسطے بچوں کے پاس گئے تھے بددعا کے واسطے نہیں گئے تھے اس لئے حکایت پر کوئی اشکال نہیں۔

اہتمام عمل

یہ حکایت میں نے اس پر بیان کی تھی کہ اپنی طرف سے نہ قبض طلب کرے نہ بسط کی نہ بلا کی نہ امتحان کی بلکہ تفویض کلی اختیار کرنے اس پر شاید یہ شبہ ہو کہ بلا میں گرفتار ہو جائے تو کیا اس کے ازالہ کی بھی دعا نہ کرے اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں **سلوا اللّٰہ العافیه** وارد ہے جس میں دعا کی اجازت ہے بلکہ امر ہے اس لئے یہ دعا جائز و مامور بہ ہے خلاصہ یہ کہ مواجید و اذواق کے درپے نہ ہونا چاہیے بلکہ عمل کا اہتمام کرنا چاہیے مگر آج کل خواص بھی

اس میں کوتاہی کر رہے ہیں اس لئے میں نے اس آیت کا بیان اختیار کیا ہے جس میں عمل کی تاکید ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں بھی صبر کرو۔ دو لفظ اس واسطے اختیار کئے گئے کہ صبر کبھی لازم ہوتا ہے کبھی متعدی یعنی جس حالت پر صبر کیا جاوے کبھی اس کا تعلق صرف اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے جیسے مرض وغیرہ کبھی دوسروں سے تعلق ہوتا ہے جیسے محاربہ وغیرہ تو دونوں حالتوں میں صبر کا امر ہے اس کے بعد ارشاد ہے۔ ورابطوا اور اس وقت مجھے زیادہ تر اسی جملہ کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا اس کی تمہید ہے اور وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ سے ڈرو تکمیل ہے اور لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ امید کہ تم کامیاب ہو گے تمیم ہے جیسا آئندہ واضح ہو جائے گا اب رابطوا کے معنی سنیئے بیضاوی نے اس کی تفسیر داوموا اور راطبوا کی ہے یعنی عمل پر مداومت اختیار کرو کیونکہ ربط کے معنی لغت میں باندھنا ہے اور مواظبت ودوام میں بھی نفس کو باندھنا ہے اور اسی واسطے بعض نے اس کی تفسیر رابطہ الخیل سے بھی کی ہے کیونکہ اس سورت کے زیادہ حصہ میں محاجہ باللسان کا ذکر ہے اس کے مناسب رباط الخیل ہی ہے تو اس لفظ کی تفسیر میں دو احتمال ہو گئے مگر کسی مقصود کے لئے ایک تفسیر کا اختیار کر لینا جائز ہے اس لئے میں نے اس وقت بیضاوی تفسیر پر تقریر اختیار کی ہے شاید اس پر طلبہ کو اشکال ہو کیونکہ ان کو شبہات بہت پیدا ہوتے ہیں حتی کہ ایک طالب علم نے تیلی کے بیل کو بھی شبہات کی تعلیم دی تھی وہ تیلی سے تیل لینے گئے تو دیکھا کہ بیل کی آنکھوں پر پٹی ہے اور گلے میں گھنٹی پڑی ہے اور وہ چکر لگا رہا ہے پوچھا یہ گھنٹی اس کے گلے میں کیوں ڈالی ہے کہا اس واسطے کہ ہم ہر وقت اس کے ساتھ نہیں رہ سکتے بلکہ اپنے دوسرے کام میں بھی لگ جاتے ہیں تو اسی گھنٹی کے بجنے سے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ بیل چل رہا ہے۔ طالب علم نے کہا یہ تو کوئی دلیل نہیں کیونکہ ممکن ہے کسی وقت ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے سر ہلاتا رہے۔ تیلی نے کہا مولانا میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی تم یہاں سے چل دو اگر میرے بیل نے یہ منطق باتیں سن لیں تو ہم تو پریشان ہو جائیں گے تم تیل بھی کسی اور سے لے لینا۔ اس تیلی نے الزامی جواب دیا کہ میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی ورنہ تحقیقی جواب یہ تھا کہ مولانا چلنے کی

آواز میں اور ایک جگہ کھڑے ہو کر سر ہلانے کی آواز میں بڑا فرق ہے اس لئے یہ شبہ لغو ہے غرض طلبہ کو احتمالات بہت پیدا ہوتے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ یہاں بھی کسی کو یہ شبہ ہو کہ استدلال کو احتمال مضر ہے پھر دو تفسیروں کے ہوتے ہوئے ایک سے استدلال کیونکر صحیح ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ احتمال استدلال کو مضر اس وقت ہے جبکہ اسی آیت پر مقصود کا مدار ہوتا اور یہاں ایسا نہیں بلکہ دوسری نصوص اس مقصود میں صریح موجود ہیں مگر اس وقت اس آیت کی تلاوت بطور عمود کلام کے کر دی گئی ہے اس پر مدار مقصود نہیں۔ غرض عمل میں مواظبت کی ضرورت ہے ورنہ بدون مواظبت کے تو اس عمل کی وہ مثال ہوگی جیسے ایک طالب علم نے گاؤں کے سب بے نمازیوں کو نمازی بنا دیا تھا قصہ یہ ہوا کہ اس طالب علم نے گاؤں میں جا کر وعظ کہا اور بے نمازیوں کی مذمت کی اور ان کو سور سے بدتر کہا واعظ کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ بلا ضرورت خشن گفتگو نہ کرے اور ضرورت سے ہو تو جائز ہے جیسے میں نے ابھی لیڈروں کو ضال و مضل کہا تھا کیونکہ انہوں نے علماء کو برا بھلا کہا ہے اور اس میں اہل اسلام کا ضرر ہے مگر حضرات علماء نے اس بارہ میں بہت احتیاط کی ہے کہ وہ ان کو بھی برا نہیں کہتے اور ان سے زیادہ صوفیہ نے احتیاط کی ہے کہ صوفیہ تو اجماعی برے کو بھی برا نہیں کہتے چنانچہ ایک بزرگ سے کسی نے یزید کے بارہ میں سوال کیا کہ یزید کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں فرمایا شاعر بہت اچھا تھا مگر کسی نے ان سے یہ سوال نہیں کیا کہ شیطان کے بارہ میں کیا فرماتے ہیں سو اس میں ان کی وکالت میں کرتا ہوں کہ مظہر مضل اعلیٰ درجہ کا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہادی ہے اس کے مظاہر تو حضرات انبیاء ہیں اور سب سے اکمل ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ایک صفت مضل ہے اس کا مظہر کامل شیطان ہے اور خدا کی صفت اضلال کا مظہر ہونا بھی ایک صفت کمال ہے گو نقص ہی کا کمال ہے۔

محبت کا اثر

اسی طرح حضرت رابعہ بصریہ کے سامنے بعض زاہدین دنیا کی مذمت کر رہے تھے قوموا عنی فانکم تحبون الدنیا ان کو دنیا کی مذمت بھی ناگوار تھی اس لئے فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ کہ تم کو دنیا سے محبت معلوم ہوتی ہے اہل مجلس نے کہا کہ ہم تو اس کی

مذمت کر رہے ہیں پھر محبؔ کدھر سے ہوئے فرمایامن احب شیئا اکثر ذکرہ کہ تذکرہ بھی محبت کی دلیل ہے یہ ایک مجمل کلام ہے ایک مجذوبہ کا جس کی شرح کی ضرورت ہے میں نے ثواب کے لئے ان دیوانوں کی وکالت اختیار کی ہے اس لئے اس کی شرح کرتا ہوں کہ ذکر مذمت بھی بعض دفعہ عظمت کی دلیل ہوتا ہے دیکھو اگر ایک چمار سے تمہارا مقابلہ ہو اور غلبہ تم ہی کو حاصل ہوا ہو جب بھی تم اس کے تذکرہ سے شرماتے ہو اور اگر کسی جرنیل سے مقابلہ ہوا ہو اور تم غالب آ گئے ہو تو اس کو ہر جلسہ میں ذکر کرتے ہو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ چمار کی تمہارے قلب میں عظمت نہیں اس لئے مذمت کے ساتھ بھی اس کا ذکر نہیں کرتے جرنیل کی عظمت ہے اس لئے اس کا ذکر کرتے ہو تو دنیا کا ذکر مذمت بھی ہمیشہ خیر نہیں بلکہ کبھی عظمت سے ناشی ہوتا ہے یعنی ایسی عظیم الشان چیز ہے ہم رغبت نہیں رکھتے سو حضرت رابعہؒ کو قرائن سے معلوم ہو گیا کہ ان کا ذکر دنیا گو مذمت کے ساتھ ہے مگر عظمت سے ناشی ہے کیونکہ ان کا مقصود اس مذمت سے مخاطبین کے دلوں سے عظمت دنیا نکالنا نہ تھا کیونکہ مخاطب سب زاہد تھے بلکہ صرف اپنا کمال ظاہر کرنا تھا کہ ہم نے دنیا پر لات ماردی ہے اور حضرات انبیاء کے کلام میں جو دنیا کی مذمت وارد ہے وہ عظمت سے ناشی نہیں کیونکہ ان کا مقصود مخاطبین کے قلب سے اس کی عظمت و محبت نکالنا ہے لیجئے باولی کا کلام بھی راولا ہو گیا۔ مگر میں ہر جگہ ان باولوں کی وکالت نہیں کرتا صرف ضرورت کے موقعہ پر کرتا ہوں اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں وکالت نہیں کرتا مثلاً حضرت رابعہ ایک دفعہ حج کو تشریف لے گئیں اور حج سے فارغ ہو کر دعا کی کہ اے اللہ! مجھے اجر دیجئے اور آپ کو اجر دینا ہوگا کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو میرا حج قبول ہو گیا ہے تو اس صورت میں تو حج مبرور پر اجر کا وعدہ آپ نے فرمایا ہی ہے یا قبول نہیں ہوا تو یہ بہت بڑی مصیبت ہے۔ کہ محبوب کے در سے محروم جاوں

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم   ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

دوست کے دروازہ پر ہم کس حال میں گئے تھے، ذوق و شوق اور خوشی سے آئے تھے لیکن مایوسی کی حالت میں واپس ہوئے۔

اور مصیبت پر بھی آپ کا وعدہ ہے کہ مصیبت زدوں کو ثواب دیا جائے گا پس میرا ثواب

ہر حال میں ثابت ہو گیا تو اس کلام پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر جہنمی بھی اس مقدمہ سے ثواب کا استحقاق ثابت کرنے لگیں گے کہ ہم سے زیادہ مصیبت میں کون ہے اور اہل مصیبت کیلئے اجر کا وعدہ ہے تو ہم کو بھی ثواب دیا جائے مگر یہاں میں وکالت نہیں کرتا کیونکہ مقصود مانگنا ہے سو ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح دل چاہے مانگے خواہ ناز کے طریقے سے مانگے یا نیاز کے طریقہ سے میں یہ کہہ رہا تھا کہ صوفیہ نے تو بروں کو بھی برا نہیں کہا کیونکہ ان کو محبوب کی یاد سے ہی فرصت نہیں کہ اغیار میں مشغول ہوں ایک عارف نے کسی صوفی کو ایک جاہل سے جھگڑا کرتے دیکھا تو کہا۔

گرایں مدعی دوست بشناختے بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

اگر یہ مدعی محبوب کا عارف ہوتا تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا۔

احتیاط خطاب

کاندھلہ میں ایک بار مولویوں کے مجمع میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کافر کو کافر کہنا کیسا ہے ایک جماعت یہ کہہ رہی تھی کہ تہذیب کے خلاف ہے اور ایک جماعت کہہ رہی تھی کہ جائز ہے کیونکہ قرآن میں بکثرت کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے پہلی جماعت نے اس کا یہ جواب دیا کہ قرآن میں خطاب کے موقعہ میں کافروں کو کافر نہیں کہا گیا (بلکہ یایھاالناس سے خطاب کیا گیا ہے) اور گفتگو اس میں ہے کہ کافر کو کافر کہہ کر خطاب کرنا کیسا ہے پھر ایک مولوی صاحب کو حکم بنایا گیا کہ اس اختلاف کا فیصلہ کریں انہوں نے کہا کہ قرآن میں خطاب کے موقعہ پر بھی کافروں کو کافر کہا گیا ہے قُلْ یٰاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں کہ اے کافر تم جس کی عبادت کرتے ہو اسکی عبادت میں نہیں کروں گا۔ مگر میں اس محاکمہ کا بھی محاکمہ کرتا ہوں کہ قرآن میں کفار کو کافر کہہ کر بلا ضرورت خطاب نہیں کیا گیا اور جہاں اس لفظ سے خطاب کیا گیا ہے وہاں ضرورت تھی وہ یہ کہ ان ظالموں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بے ڈھنگی درخواست کی تھی کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کرلیا کریں ایک سال ہم آپ کے خدا کی

عبادت کرلیا کریں گے اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی کہ ان سے فرمادیجئے کہ اے کافرو! میں تمہارے معبودوں کی پرستش نہ کروں گا نہ تم میرے معبود کی عبادت کرو گے نہ اب نہ آئندہ تو یہاں ان لوگوں کی امیدیں قطع کرنے کے لئے سختی کے ساتھ کافر کہہ کر ان کو خطاب کیا گیا ہے باقی آیات میں اس لفظ سے خطاب نہیں کیا گیا کیونکہ ضرورت نہ تھی پس فیصلہ یہ ہوا کہ خشک خطاب بلاضرورت نہ کرنا چاہیے ہاں ضرورت سے ہو تو جائز ہے۔

ایک بات استطراداً یہاں اور سمجھ لیجئے وہ یہ کہ اس سورت کے متعلق بعض لوگوں نے ایک غلطی کی ہے کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ تمہارے واسطے تمہارا دین ہے ہمارے واسطے ہمارا دین ہے اور یہ تفسیر کر کے اسی آیت کے حکم کو باقی بھی سمجھا ہے چنانچہ بعض صوفیہ نے اس کو اپنا معمول بنالیا اور صلح کل اپنا مذہب بنالیا کہ موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود کسی سے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں مگر یہ استدلال اس لئے غلط ہے کہ اول تو یہاں دین بمعنی مذہب ہونا مسلم نہیں بلکہ بمعنی جزا ہونا محتمل ہے یعنی جیسا تم کرو گے ویسا بھرو گے پس لَكُمْ دِيْنُكُمْ ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہتے ہیں کما تدین تدان اور اس صورت منسوخ ماننے کی بھی ضرورت نہ ہوگی اور اگر یہی تفسیر کی جاوے تو اس صورت میں یہ آیت منسوخ ہوگی بہرحال اس سے صلح کل کی تائید نہیں ہوتی ہے اب تو آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن سے استدلال بدون معرفت غریب کے جائز نہیں ہے اس لئے محض ترجمہ ڈپٹیہ مہارت علوم شرعیہ کے لئے پڑھ لینا کافی نہیں۔

نہ ہر کہ آئینہ دار سکندری داند — نہ کہ چہرہ برا فروخت دلبری داند
نہ ہر کہ سر تبراشد قلندری داند — ہزار نکتہ باریکر زمو ایں جاست

''جو شخص بھی چہرہ کو برافروختہ کرتے لازم نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو جو شخص بھی آئینہ بناتا ہو لازم نہیں کہ وہ سکندری بھی جانتا ہو اس میں بال سے زیادہ باریک نکات ہیں جو شخص سر منڈواتا ہو ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو۔''

لوگ اس ترجمہ کی زبان کی تعریف کرتے ہیں مگر زبان بھی کچھ عمدہ نہیں چنانچہ يَعْمَهُوْنَ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ٹامک ٹوئیاں مارا کریں فصحاء دہلی ولکھنؤ کی زبان سے

ٹامک ٹوئیاں کبھی نہیں سنا گیا یہ محض بازاری زبان ہے اسی طرح اِنَّا ذَھَبْنَا نَسْتَبِقُ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہم کبڈی کھیل رہے تھے یہ بالکل غلط تفسیر ہے کیونکہ استباق کے معنی باہم دوڑنے کے ہیں کہ ایک شخص دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرے اور کبڈی میں ایسا نہیں ہوتا دوسرے کبڈی کا لفظ فصیح نہیں تیسرے کبڈی میں موضع لعب سے غیبت نہیں ہوتی پھر یہ برادران یوسف کا عذر کیونکر بن سکتا ہے بلکہ عذر کے موقع پر وہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے دوڑ رہے تھے اور یوسف علیہ السلام سامان پر تھے ہماری نگاہ سے اوجھل ہوگئے کہ بھیڑیا کھا گیا اور ہم کو خبر نہ ہوئی۔ بہرحال کبڈی کے ساتھ تفسیر کرنا عقل کے بھی خلاف لغت کے بھی خلاف فصاحت کے بھی خلاف ہے مگر لوگ ہیں کہ اس ترجمہ پر لٹو ہیں بہرحال اس سورت میں ضرورت کی وجہ سے کفار کو کفار کہا گیا ہے ورنہ بلاضرورت مخاطب کو سخت الفاظ سے خطاب کرنا ممنوع ہے تو ان مولوی صاحب نے دیہات کے بے نمازیوں کو بلاضرورت سور اور کتا بنایا تھا اس پر وہ بگڑ گئے اور ان پر مارنے کو چڑھ آئے میزبان نے یہ رنگ دیکھ کر مولوی صاحب کو اطلاع کی پوچھا آخر میں نے کیا قصور کیا؟ کہا تم نے بے نمازیوں کو سور اور کتا کہا ہے کہا پھر تم کو تو نہیں کہا دیہاتی بولے کہ ہم بھی تو بے نمازی ہیں کہا تم کدھر سے بے نمازی ہو کیا تم نے کبھی عید بقرعید کی بھی نماز نہیں پڑھی گاؤں والوں نے کہا ہاں عید بقرعید کی تو پڑھ لیتے ہیں کہا پھر تم تو نمازی ہو اب کیا تھا اب خوش ہو گئے اور لگے دعوتیں کرنے تو بدون مواظبت کے جو عمل ہوگا تو وہ ایسا ہوگا جیسا یہ دیہات والے نمازی تھے تو کیا ان کو کوئی نمازی کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں اسی طرح بدون مواظبت ذکر کے آدمی ذاکر نہیں ہوسکتا بدون مواظبت صبر کے صابر نہیں ہوسکتا ہے وعلیٰ ہذا القیاس

مداومت نماز

مگر مداومت ومواظبت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر وقت اسی میں لگا رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو وقت جس عمل کا مقرر ہے اس وقت میں وہ عمل بجالائے ورنہ نماز پر مواظبت دشوار ہو جائے گی کیونکہ نماز ہر وقت جائز نہیں اور یہی غلطی بعض صوفیہ کو پیش آئی ہے کہ صورت صلوۃ کی ضرورت کے منکر ہو گئے اور دلیل یہ بیان کی کہ سورہ معارج میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ ھُمْ

عَلٰی صَلوٰتِهِمْ دَآئِمُونَ جو اپنی نماز پر برابر توجہ رکھتے ہیں اور صورت صلوۃ کا دوام ہو نہیں سکتا اس سے معلوم ہوا کہ مراد روح صلوۃ ہے جس پر دوام ہو سکتا ہے مگر دلیل غلط ہے کیونکہ انہوں نے دوام کے معنی نہیں سمجھے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو حضورؐ کا ارشاد ہے **المرأ فی الصلوۃ دام ینتظر الصلوۃ فذالکم الرباط فذالکم**[1] آدمی ہمیشہ نماز میں ہے جب تک نماز کا انتظار کرتا ہے پس یعنی نماز کے انتظار میں رہنا بھی حکماً نماز ہی میں رہنا ہے جس شخص نے صبح کی نماز پڑھ لی اور نیت یہ ہے کہ ظہر کی نماز بھی پڑھوں گا وہ اسی وقت سے منتظر صلوۃ ہے اس پر شاید کہ کسی کو شبہ ہو کہ صبح کی نماز پڑھ کر تو ہم بہت سے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں کوئی تجارت وزراعت میں مشغول ہوتا ہے کوئی کھانے پکانے کے سامان میں اور قاعدہ ہے **النفس لا تتوجه الی شیئین فی آن واحد** کہ نفس ایک آن میں دو طرف توجہ نہیں کر سکتا تو صبح سے ظہر تک انتظار کا تحقق کہاں ہوا جبکہ درمیان میں بہت سا وقت اس حالت میں گذرا ہے کہ ظہر کی نماز کا خیال بھی نہیں آیا اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف توجہ محال نہیں محال عقلی نہیں گو مستبعد ہو مگر آجکل یہ بھی ایک حماقت ہے کہ محال عادی کو محال عقلی سمجھتے ہیں۔

علم سے مس

رامپور میں ایک صاحب سے معراج کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی وہ کہنے لگے کہ معراج کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا یہ تو محال ہے میں نے کہا آپ اس کے استحالہ پر دلیل قائم کیجئے کہنے لگے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی میں نے کہا عدم نظیر سے استحالہ پر استدلال نہیں ہو سکتا بہت سے بہت عدم وقوع پر استدلال ہوگا اور عدم وقوع سے استحالہ ثابت نہیں ہو سکتا اور اگر نظیر بتلا دی جائے تو وہ بھی ایک واقعہ ہوگا اگر وہ محتاج دلیل نہیں تو معراج ہی کے واقعہ کو بلا دلیل مان لیجئے اور اگر وہ بھی محتاج دلیل ہے تو تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اس لئے نظیر کا مطالبہ فضول ہے آج کل یہ بھی ایک غلطی ہے کہ نظیر کو دلیل سمجھتے ہیں لوگوں کو علم سے مس ہی نہیں رہا

---

[1] المعجم الکبیر للطبرانی ۱۷ : ۳۰۱

کہ دلیل کو تو دلیل نہیں سمجھتے غیر دلیل کو دلیل کہتے ہیں چنانچہ میرے اس جواب پر وہ صاحب کہنے لگے کہ تسلی نہیں ہوئی میں نے کہا آپ کی تسلی تو جب ہو کہ میں یہاں سے اڑوں اور آپ کے سامنے آسمان پر جاؤں مگر شاید اس وقت بھی تسلی نہ ہوتی بلکہ خود ان کو معراج ہوتی تو تسلی ہوتی اور ممکن ہے اس وقت بھی تردد رہتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی بابت فرمایا ہے۔ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ اور اگر ہم ان پر آسمان کے دروازے کھول دیں اور یہ سارا دن اس میں چڑھتے رہیں تو بھی یہی کہیں گے کہ ہماری نگاہوں کو باندھ دیا بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے کہ اگر یہ لوگ آسمان کے دروازوں میں بھی چڑھ جائیں جب بھی ان کو اپنے اوپر نظر بندی یا سحر کا شبہ ہوتا غرض مجھے اول تو اس قاعدہ ہی میں کلام ہے میں ایک آن میں دو طرف توجہ ہونے کا محال عقلی نہیں سمجھتا چنانچہ مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی کی نسبت سنا گیا ہے کہ وہ ایک وقت میں تین کام کرتے تھے درس بھی دیتے شطرنج بھی کھیلتے اور تصنیف بھی کرتے رہتے حالت یہ تھی کہ جب تک طالب علم پڑھتا رہتا تصنیف کرتے رہتے اور اسی درمیان میں شطرنج کا مہرہ بدل دیتے اور جب وہ عبارت سے فارغ ہوتا تصنیف بند کر کے اس کی تقریر کر دیتے شاید کوئی یہ کہے کہ یہ تو ایک آن میں تین کام نہ ہوئے بلکہ ایک آن میں ایک کام ہوا تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ گو ظہور عمل کا جدا آن میں ہوا مگر یہ کام ایسے ہیں کہ ایک آن کی توجہ میں نہیں ہو سکتے اس لئے لازم ہے کہ ان کی توجہ تینوں کاموں پر ساتھ ساتھ رہتی تھی اور یہ محال کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نماز کے اندر دکان کا حساب بھی کرتے ہیں تو جیسے یہ ہو سکتا ہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ تجارت کی حالت میں آپ نماز میں لگے رہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو تجارت اور بیع کے وقت بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ آپ کو نماز تجارت سے مشغول نہیں کرتی ان کو تجارت نماز اور ذکر اللہ سے مشغول نہیں کرتی۔ مگر شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو وہ کر سکتا ہے جو ایسا ذاکر شاغل ہو کہ ذکر اللہ اس کے دل میں

سرایت کر گیا ہو عوام سے تو ایسا نہیں ہوسکتا گویا ان کے نزدیک عوام انتظار صلوۃ سے اور دوام فی الصلوۃ کی فضیلت سے محروم ہیں مگر یہ دعوی بلا دلیل ہے۔

حقیقت ایمان

الحمدللہ اس اشکال کو رفع کرنا اللہ تعالیٰ نے مجھے سمجھا دیا اس طرح کہ اول یہ مقدمہ سمجھ لو کہ ایمان ہر وقت فرض ہے اور مومن ہر وقت مومن ہے اس کی کوئی ساعت ایمان سے خالی نہیں حالانکہ ایمان کی حقیقت تصدیق بالقلب ہے اب اگر دوام ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس تصدیق کا ہر وقت استحضار رہے تو ظاہر ہے کہ ہر وقت اس کا استحضار نہیں ہوتا معلوم ہوا کہ دوام کے کوئی اور معنی بھی ہیں پس سمجھو کہ دوام ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ایک بار تصدیق کا استحضار کر کے پھر اس کی ضد کا استحضار نہ ہو جب تک ضد کا استحضار نہ ہوگا اس وقت تک اس استحضار کو باقی سمجھا جائے گا اور یہ شخص ہر ساعت میں مومن ہے یہ تو شرعی مثال ہے جس سے دوام کے یہ معنی معلوم ہوئے اور محسوسات میں بھی اس کی چند مثالیں ہیں مثلاً مشی فعل اختیاری ہے اور ہر قدم کا اٹھانا فعل اختیاری ہے اور فعل اختیاری مسبوق بالقصد ہوتا ہے مگر کیا ہر قصد جدید ہوتا ہے ہرگز نہیں اگر ایسا ہو تو مشی دشوار ہو جائے لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ ابتداء میں جو ایک بار قصد کیا ہے وہی آخیر تک مستمر ہے علی ہذا ستار بجانے والے کا ہر نقرہ فعل اختیاری مسوق بالقصد ہے مگر یہاں بھی ہر نقرہ پر قصد جدید نہیں ہوسکتا ورنہ ستار بجانا دشوار ہو جائے گا اور یقیناً خراب بجے گا پس یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ ایک ہی قصد آخیر تک مستمر ہے غرض شرعیات سے اور محسوسات سے ہر طریقہ سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ ایک ہی مستمر ہوسکتا ہے اب سمجھئے کہ جس شخص نے صبح کی نماز پڑھی ہے اور اس وقت دل میں ارادہ ہے کہ ظہر بھی پڑھوں گا تو اس کا یہ قصد مستمر کیوں نہ ہوگا گو درمیان میں استحضار نہ رہے اب صوفی صاحب سن لیں کہ دوام صلوۃ صورت صلوۃ میں بھی ہوسکتا ہے یعنی صلوۃ کے ساتھ خاص نہیں۔

گوشہ نشینی

اب انصاف کیجئے کہ جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھ کر اپنے کو مجتہد سمجھتے ہیں ان کی حماقت

ہے یا نہیں اب تو آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ دین کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔

ہزار نکتہ باریک تر زموایں جاست   نہ ہرکہ سربتر اشد قلندری داند

"اس میں بال سے زیادہ باریک نکات ہیں جو شخص سر منڈواتا ہو لازم نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو"

آج کل جو لیڈر دین کے رہنما بنے ہوئے ہیں ان کی مثال ایسی ہے کہ۔

گربہ میر وسگ وزیر وموش رادیواں کنند   ایں چنیں ارکان دولت ملک راویراں کنند

"بلی اگر امیر کتا وزیر اور چوہا دیوان ہو جب ایسے ارکان سلطنت ہوں وہ ملک کو ویران کریں گے"

اور جو لوگ کام کے ہیں وہ حجرہ میں گمنام پڑے ہوئے ہیں اور خدا سے ان ظالموں کے ظلم کی جو وہ دین پر کر رہے ہیں فریاد کرتے ہیں۔

پری نہفتہ رخ ودیودر کرشمہ وناز   بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

بعض لوگ ان حجرہ نشینوں سے کہتے ہیں کہ تم بھی میدان میں نکلو حجرہ میں کیوں بیٹھے ہو مگر ان سے کوئی پوچھے کہ حجرہ والوں کو میدان میں آنے کون دیتا ہے ان سے کام کون لیتا ہے؟ اگر یہ میدان میں نکلیں گے تو شریعت کے اتباع کا حکم کریں گے جو آج کل لوگوں کے نزدیک تعصب اور تنگ خیالی ہے پھر تم خود ہی یہ کہو گے کہ یہ مولوی ہمارے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں ان کو حلال وحرام و جائز و ناجائز ہی کی پڑی رہتی ہے۔اب میدان میں نکل کر نہ ان سے میدان کا کام ہوگا نہ خلوت کا دونوں سے گئے گذرے ہوئے اس سے تو ان کا خلوت ہی میں رہنا اچھا۔اور تم کو خبر بھی ہے جو لوگ میدان میں نکلے ہوئے ہیں وہ حجرہ نشینوں ہی کی برکت سے کام کر رہے ہیں۔کیونکہ حجرہ والے ہر وقت مسلمانوں کی کامیابی اور صلاح کی دعا کرتے رہتے ہیں مولانا فرماتے ہیں۔

ہرکہ تنہا اوراایں رہ رابرید   ہم بعون ہمت مردان رسید

اتفاقاً جس شخص نے اس راہ سلوک کو اکیلے طے کیا ہے اس نے بھی اسے اہل اللہ کی توجہ سے طے کیا ہے۔

صاحبو! دین کا سمجھنا ان لیڈروں کا کام نہیں ہے بلکہ یہ انہی لوگوں کا کام ہے جنہوں نے حجرہ میں بیٹھ کر چراغوں کا دھواں پھانکا ہے اور پانی کی جگہ تیل پی لیا ہے بعض طلبہ کو ایسا پیش آیا ہے کہ مذاق میں کسی نے ان کو پانی کی جگہ تیل دے دیا اور وہ مطالعہ میں ایسے مصروف

تھے کہ ان کو اصلا اسکی خبر نہ ہوئی۔ ایک طالب علم کی حکایت کتابوں میں لکھی ہے کہ ایک رات ان کے گھر میں تیل نہ تھا بڑے پریشان ہوئے اتفاق سے بادشاہ کا جلوس سامنے سے گزرا جس کے ساتھ مشعلیں تھیں یہ اس کے ساتھ ہو لئے اور کتاب ہاتھ میں لے کر مطالعہ کرتے چلے گئے یہاں تک کہ جلوس محل شاہی میں داخل ہوا یہ بھی ساتھ ساتھ چلے گئے بادشاہ کی نظر ان پر پڑ گئی تھی اس نے خدام کو کہہ دیا تھا کہ ان کو نہ روکا جائے یہاں تک کہ جلوس خاص خلوت گاہ میں پہنچا یہ بھی وہیں پہنچ گئے اور برابر مطالعہ میں مشغول رہے بادشاہ ان کو دیکھتا رہا مگر ان کو کچھ خبر نہ ہوئی جب مطالعہ سے فارغ ہوئے اور اپنے کو خاص خلوت گاہ شاہی میں دیکھا تو قرائن سے سمجھ گئے کہ میں شاہی محل کے اندر ہوں اب یہ ڈرنے لگے بادشاہ نے تسلی دی کہ ڈرو نہیں مجھے تم سے بہت محبت ہوگئی ہے اور اب میں چاہتا ہوں کہ تمہارے لئے کافی وظیفہ مقرر کردوں تاکہ تم فراغ قلب سے تحصیل علم میں مشغول رہو کہا حضور یہ تو جھگڑا ہے میں تنخواہ لینے وغیرہ کا پابند نہیں ہوسکتا کہ آزادی میں خلل پڑتا ہے واقعی

آنکس کہ تراشناخت جان راچہ کند　　فرزند وعیال و خانماں راچہ کند

ہاں اگر آپ مجھے راحت دینا چاہتے ہیں تو کسی بنئے سے کہہ دیجئے کہ مجھے تیل دیدیا کرے اور ماہوار آپ کو حساب دکھلا کر تیل کے دام آپ سے لے لیا کرے مجھ سے کچھ نہ مانگا کرے چنانچہ بادشاہ نے ان کے واسطے تیل کا انتظام کردیا۔ تو تحقیق احکام اور تدقیق ان علماء کا کام ہے لیڈروں کا کام نہیں غضب یہ کہ لیڈر علماء کا کلام بھی تو نقل نہیں کرتے بلکہ اپنا کلام بیان کرتے ہیں اور اپنے کلام سے علماء کے کلام کو رد کرتے ہیں حالانکہ وہ اس بات کی بھی لیاقت نہیں رکھتے کہ علماء کے کلام کو سمجھ بھی سکیں اس پر ان کا حوصلہ یہ ہے کہ علماء کو میدان میں نکلنے کی تاکید کرتے اور ان کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ صاحبو! میرے نزدیک تو اس وقت میدان میں نکلنے کا وقت نہیں کیونکہ حدیث میں ہے **اذا رایت شحامطاعا و دنیا موثرة وھوی معتادا واعجاب کل ذی رای برایه فعلیک بخاصة نفسک ودع عنک امر العامة**[۱] اور جب تم دیکھو کہ زبان دراز لوگوں کی اطاعت کی جائے اور

---

[۱] التفسیر للطبری ۷:۶۳، اتحاف السادة المتقین ۸:۴۰۷، المغنی عن حمل الأسفار ۲:۳۰۴

خواہشات کی پیروی کی جائے اور ہر شخص اپنی رائے پر ناز کرنے لگے تو اس زمانہ پر تم پر لازم ہے کہ اپنی فکر کرو اور دوسروں کی۔ اور میرے نزدیک آج کل یہ سب علامات موجود ہیں اس لئے آج کل گوشہ نشینی لازم ہے مگر میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا اگر کسی عالی ہمت کے نزدیک ابھی ان علامات کے ظہور کا وقت نہ ہو تو بسم اللہ وہ میدان میں نکلیں مگر ا پاہجوں کو کیوں اپنے ساتھ کھینچتے ہیں آخر ایک کام یہ بھی تو ہے کہ خدا سے دعا کریں تو ان کو اس کام کے واسطے رہنے دیں ایک جماعت اس کے واسطے بھی تو ہونا چاہیے یہ تقسیم عمل اچھی ہے مگر افسوس آج کل دعا کو لوگ عمل ہی نہیں سمجھتے اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں یہ گفتگو درمیان میں اس بات پر آ گئی تھی کہ میں نے دوام عمل کے معنی کی تحقیق کر کے عرض کیا تھا کہ یہ علوم محض ترجمہ قرآن مجید پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے جیسا آج کل بعض لوگ اسی قدر علم سے اجتہاد کا دعوی کرتے ہیں۔

صبر و عمل

بہرحال یہاں صبر و مصابرت و مرابطت کا امر ہے اور تقوی اس کی تکمیل ہے۔ صبر کے معنی ہیں **حبس النفس علی ما تکرہ** یعنی نفس کو ناگوار امور پر جمانا اور مصابرت کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ناگوار امور پر نفس کو ثابت قدم رکھنا اور مرابطت کے معنی یہ ہیں کہ صبر و مصابرت پر مواظبت کی جائے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ عمل ان سب میں مشترک ہے مطلب یہ ہوا کہ عمل میں مستعد رہو اور اسی میں برابر لگے رہو۔ اب بعض اعمال تو اپنے کرنے سے ہیں جیسے نماز، روزہ، زکوۃ وغیرہ ان کو دیانات کہا جاتا ہے ان پر جمنا تو صبر ہے اور بعض اعمال میں دوسروں سے واسطہ ہے جیسے نکاح و بیع و جہاد وغیرہ یہ معاملات ہیں ان میں احکام شرعیہ پر جما رہنا مصابرت ہے۔ پھر دیانات میں تو صبر سہل ہے کیونکہ ان میں حظ نفس بھی ہے زکوۃ میں حظ یہ ہے کہ دوسروں پر احسان ہے حج میں حظ یہ ہے کہ سیر و تفریح ہوتی ہے (نماز میں حظ یہ ہے کہ اس سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے جو موجب راحت ہے روزہ میں طبیعت ہلکی ہلکی رہتی ہے اس سے بھی راحت حاصل ہوتی ہے ۱۲) مگر معاملات میں صبر دشوار ہے اس لئے وہاں بھی صاف طور سے مصابرت کا امر کیا گیا امر کیا گیا کہ نفس کو معاملات میں بھی شریعت کے موافق عمل کرنے پر مجبور کرو اور یہ حکم صبر و مصابرت

اعمال باطنیہ کو بھی شامل ہے کیونکہ وہ بھی اعمال کی ایک قسم ہیں عمل کہتے ہیں فعل اختیاری کو اس لئے اعمال باطنیہ بھی عمل میں داخل ہیں چنانچہ ایمان کو نصوص میں عمل کہا گیا ہے پھر جس طرح نماز روزہ کا شریعت میں امر ہے اسی طرح محبت وشکر وغیرہ کا امر ہے اور جیسے چوری زنا وغیرہ سے منع کیا گیا ہے اسی طرح ریا وحسد وکبر سے ممانعت ہے۔ پھر جس طرح اعمال ظاہرہ میں بعض اعمال اپنے متعلق ہیں بعض میں دوسروں سے واسطہ ہے اسی طرح اعمال باطنہ بھی دو قسم کے ہیں بعض اپنے کرنے کے ہیں بعض میں دوسروں سے واسطہ ہے پس وہاں بھی صبر ومصابرت دونوں کا امر ہے بلکہ اعمال باطن میں صبر ومصابرت کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ باطن میں بعض دفعہ ایسے مصائب ومصاعب پیش آتے ہیں جن کا تحمل اہل ظاہر ہرگز نہیں کر سکتے۔

دشنام محبت

بعض دفعہ قبض میں سالک یوں سمجھتا ہے کہ فرعون مجھ سے افضل ہے گو وہ کافر تھا مگر اس کو تو ایک دفعہ لا الہ الا اللہ کہنے سے نجات ہو جاتی ہے اور مجھے ہزار دفعہ بھی لا الہ الا اللہ کہنے سے اس مصیبت سے نجات نہیں ہوتی چنانچہ بعض نے اس حالت میں خودکشی بھی کر لی ہے ان کو مستہلکین کہا جاتا ہے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا ان کو عذاب ہوگا۔ فرمایا جا ظالم! وہ تو خدا کی محبت میں شمشیر عشق سے جان دے رہا ہے اور تجھے فتوے کی سوجھی ہے اس شعر میں اسی کا فیصلہ ہے۔

گر خطا گوید وراخاطی مگر　　　درشود پر خود شہیدا ورامشو
خود شہیدان راز آب ولی ترست　　　ایں خطا ازمد ھواب ولی ترست

''اگر کوئی غلطی کرے تو اس کو خطا وار نہ کہو اور شہید اگر خون میں نہا جائے تو اس کو غسل مت دو۔ شہداء کا خون آب حیات سے بہتر ہے اور یہ خطا سو ثوابوں سے بہتر ہے''

اس حالت میں جو شخص خودکشی سے مر جائے معذور ہے گو ماجور نہیں مگر مازور بھی نہیں یہ تین لفظ بھی میں نے مقفی اختیار کئے ہیں تین حالات کے اعتبار سے یعنی اگر کوئی شخص حدود شرعیہ سے باختیار خود نکلے وہ تو مازور ہے (گنہگار ہے) اگر بلا اختیار نکلے معذور اگر حدود کے اندر ہے ماجور ہے (اس کو ثواب ملے گا ترقی ہوگی) باطن کے مصائب میں سے ایک یہ صورت بھی ہے کہ ایک

سالک کو اثناء ذکر میں آواز آئی۔ جو چاہے کرتو تو کافر ہو کر مرے گا، اس آواز سے وہ سہم گیا شیخ کے پاس گیا اور سارا حال عرض کیا سبحان اللہ شیخ بھی کیسی دولت ہے جس کو میسر ہو فرمایا گھبراؤ نہیں یہ دشنام محبت ہے محبوبوں کی عادت ہے کہ عشاق کو یوں ہی تنگ کیا کرتے ہیں اس پر سوال ہوتا ہے کہ یہ بات جھوٹ تھی اگر ایسا ہے تو معاذ اللہ حضرت حق کی طرف کذب کی نسبت لازم آتی ہے علماء ظاہر تو امکان کذب ہی میں آج تک لڑ رہے ہیں اس میں تو وقوع کذب لازم آ گیا اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں کذب نہیں کیونکہ کافر باصطلاح صوفیہ بمعنی فانی ہے خسرو فرماتے ہیں

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

''میں عشق میں فانی ہوں بقا مجھے درکار نہیں ہے میری ہر رگ تار بن چکی ہے مجھے زنار کی ضرورت نہیں ہے''

اے فانی عشقم تو اس غیبی آواز کا مطلب یہ ہوا کہ جو چاہے عمل کر تو فانی ہو کر مرے گا اب یہ کلام ایسا ہو گیا جیسا حدیث میں آیا ہے **لعل الله اطلع الى اهل بدر فقال اعملوا ماشئتم فقد غفرت لكم**[۱] اور صوفیہ نے یہ اصطلاح لغت سے لی ہے کیونکہ لغت میں کفر بمعنی ستر ہے اور فانی بھی اپنی ہستی کا ساتر ہے صوفیہ کی اصطلاحات کہیں لغت سے ماخوذ ہیں کہیں عرف عام سے کہیں فلسفہ سے کہیں علم کلام سے کہیں کسی اور فن سے اور یہ خلط بحث انہوں نے اس لئے کیا تا کہ اسرار پر پردہ پڑا رہے نااہل تک نہ پہنچ جائیں کیونکہ

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

''ظاہر پرستوں کے سامنے اسرار عشق و مستی مت بیان کرو بلکہ ان کو اپنے رنج و مزے دو۔''

اسی لئے ان علوم و اسرار کو برسر منبر بیان کرنے کی ممانعت ہے یعنی بلاضرورت بیان نہ کرے اور میں اس وقت ضرورت سے بیان کر رہا ہوں۔ غرض یہ غیبی صدا صوفیہ کی اصطلاح میں تھی عام اصطلاح میں نہ تھی اور یہ عنوان مزاح کیلئے اختیار کیا گیا تا کہ ذرا تھوڑی دیر کو عاشق پریشان ہو جائے۔

حسن مزاح

مزاح حدیث سے بھی ثابت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض دفعہ فرمایا ہے

[۱] سنن ابی داؤد کتاب السنة باب: ۸

چنانچہ ایک بڑھیا نے حضور سے دعا کی درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں پہنچا دے حضور نے فرمایا لا تدخل العجوز الجنۃ[1] کہ بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی وہ لگی رونے تب آپ نے یہ آیت پڑھی۔ اِنَّآ اَنْشَاْنٰا هُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰاهُنَّ اَبْكَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ بے شک ہم نے ان عورتوں کو اچھی پیدائش پر پیدا کیا کنواریاں، انس ومحبت رکھنے والیاں، ہم عمر، داہنے والوں کیلئے۔ مطلب یہ تھا کہ بوڑھی عورت بڑھیا ہو کر جنت میں نہ جائے گی ایک بار حضرت ابوذر نے ایک مسئلہ کے متعلق بار بار سوال کیا آپ نے ہر دفعہ جواب دیا پھر آخیر میں فرمایا وان رغم انف ابی ذر[2] کہ ہاں یہی جواب ہے اگرچہ ابو ذر کی ناک رگڑ جائے یہ مزاح ہی تو تھا گو برنگ عتاب تھا مگر عاشق کو اس میں ایسا لطف آتا ہے کہ حضرت ابوذر جب اس حدیث کو بیان کرتے تو آخیر میں یہ بھی کہتے وان رغم انف ابی ذر وان زعم انف ابی ذر کیونکہ ان کو اس میں حظ آتا تھا۔ حضرت شیخ ابوالمعالی کا ایک مرید حج کو گیا تو آپ نے اس کے ہاتھ روضہ اقدس پر سلام کہلا کر بھیجا جب مرید نے شیخ کا سلام پہنچایا تو روضۂ اقدس سے آواز آئی اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔ شیخ کو یہ واقعہ مکشوف ہو گیا جب مرید واپس آیا اس سے پوچھا کہو تم نے ہمارا سلام پہنچایا تھا کہا ہاں حضور پہنچا دیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آپ کو سلام فرمایا ہے۔ فرمایا انہی لفظوں سے کہو جو حضورؐ نے فرمائے ہیں۔ کہا جب آپ کو وہ الفاظ معلوم ہیں تو مجھے آپ کیوں بے ادب بناتے ہیں فرمایا اس میں بے ادبی کیسی اس وقت تمہاری زبان سے وہ الفاظ ادا نہ ہوں گے بلکہ تمہاری زبان حضور کی زبان ہو گی تم تو محض سفیر ہو غرض اس نے وہی الفاظ کہے کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہنا، یہ سنتے ہی شیخ پر وجد طاری ہو گیا اور یہ شعر پڑھا

بدم گفتی وخورسندم خاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

تو نے مجھے برا کہا مگر میں خوش ہوں تیرے لب شیریں لعل کیلئے جواب تلخ ہی بہتر ہے

یہی راز تھا حضرت ابوذر کے بار بار رغم انف ابی ذر کہتے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں اگر یکبار بگوید بندہ من از عرش بگذرد خندہ من۔ (وہ اگر کہہ دے مجھے اپنا غلام۔ سب سے

---

[1] لم اجد الحدیث فی "موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف" [2] مسند احمد ۵:۱۶۶

پیارا نام ہو میرا بھی ۱۲) بلکہ حدیث سے حق تعالیٰ کا مزاح فرمانا بھی ثابت ہے کہ جہنم سے جو مسلمان نکالے جائیں گے ان کا لقب جہنمی ہوگا کیونکہ ان کو اسی میں حظ ہوگا جس کی مثال اوپر گذر چکی ہے ان میں ایک شخص جو سب سے اخیر میں نکالا جائے گا حق تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ مانگ کیا مانگتا ہے وہ عرض کرے گا کہ میرا منہ جہنم کی طرف سے پھیر دیا جائے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ بس اس کے بعد تو کچھ نہ مانگے گا وہ کہے گا نہیں اور کچھ نہ مانگوں گا چنانچہ جہنم کی طرف سے اس کا منہ پھیر دیا جائے اس وقت اس کو جنت کا ایک درخت نظر آئے گا عرض کرے گا اس درخت کے نیچے مجھ کو پہنچا دے۔ ارشاد ہوگا کہ تو نے تو ابھی وعدہ کیا تھا کہ اور کچھ نہ مانگوں گا وہ معذرت کرنے لگا کہ بس یہ درخواست اور پوری کر دیجئے پھر کچھ نہ مانگوں گا غرض اسی طرح رفتہ رفتہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا تو یہ بھی مزاح ہی ہے کہ مقصود تو اس کو د جنت میں پہنچانا تھا مگر اس طرح رگڑ کر پہنچایا جائے گا لہٰذا اب اس حکایت پر کوئی اشکال نہیں کیونکہ مزاح کا ثبوت احادیث میں بھی ہے

قرآن فہمی

دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کافر سے مراد صدائے غیبی میں کافر باللہ نہ تھا بلکہ کافر بالطاغوت ہے اور یہ استعمال نص میں بھی وارد ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى پس جو شخص گمراہ شیاطین کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے ایک مضبوط حلقہ پکڑا۔ غرض باطن میں ایسے ایسے مصائب ومصاعب پیش آتے ہیں کہ اگر امداد نہ ہو تو انسان تو انسان پہاڑ بھی پاش پاش ہو جائے وحی میں اس قدر ثقل تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ اور اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے وہ دب جاتا اور وہ پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔ گو انبیاء کے ساتھ حق تعالیٰ کی امداد ہوتی ہے وہ اس کے متحمل ہوتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں کہ جو شخص حضرت جبرئیل علیہ السلام کا دشمن ہو وہ جان لے کہ انہوں نے قرآن اتارا ہے آپ کے دل پر اللہ

کے حکم سے ۔ یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن حضور کے قلب پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ قلب معانی کا ادراک کرتا ہے اور الفاظ کا ادراک سمع کو ہوتا ہے پس اس سے لازم آتا ہے کہ منزل من اللہ صرف معانی ہوں الفاظ منزل من اللہ نہ ہوں اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے بہت سے بہت معانی کا منزل ہونا معلوم ہو الفاظ کا منزل نہ ہونا کیسے معلوم ہوا کیونکہ عدم ذکر دلیل ذکر عدم نہیں ہے ان کا منزل ہونا دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا بے شک ہم نے قرآن پاک کو عربی زبان میں نازل کیا۔ اور عربی ہونا صفت الفاظ ہی کی ہے مگر اس جواب سے عوام کو شفا نہیں ہوتی دوسرا جواب قاضی ثناء اللہ صاحب نے دیا ہے اور یہ جواب ان کے سوا کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا وہ فرماتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ زبان داں کو اپنی مادری زبان میں گفتگو سنتے ہوئے اول التفات معانی کی طرف ہوتا ہے اور الفاظ کی طرف بعد میں التفات ہوتا ہے اور غیر مادری زبان میں اول التفات الفاظ کی طرف ہوتا ہے ثانیاً معانی کی طرف ۔ جیسا کہ آپ لوگ اس وقت میرا بیان سن رہے ہیں چونکہ میں آپ کی مادری زبان میں بول رہا ہوں اس لئے معانی کی طرف آپ کو اول التفات ہوتا ہے اور الفاظ کی طرف اگر ہوتا ہے تو ثانیاً پس قرآن مجید چونکہ آپ کی زبان میں ہے اس لئے وحی کے اسماع کے وقت اول التفات آپ کو معانی کی طرف ہوتا ہے پھر الفاظ کی طرف اس لحاظ سے قرآن کو منزل علی القلب کہہ دیا گیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ الفاظ منزل نہیں اب میں وہ جملہ پھر دہراتا ہوں کہ فقط ترجمہ پڑھنے سے قرآن فہمی حاصل نہیں ہوسکتی ذرا ترجمہ پڑھنے والے تو یہ علوم بیان کریں اور وہ توان اشکالات کو حل کریں یقیناً اقرار کریں گے کہ یہ علوم ان کو حاصل ہوسکتے اسی لئے میں بھی کہا کرتا ہوں کہ بعض لوگوں کو ترجمہ قرآن دیکھنا حرام ہے کانپور میں ایک موذن میرے پاس قرآن کا ترجمہ لایا کہ آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وضو میں پیروں کا دھونا فرض نہیں بلکہ مسح کافی ہے کیونکہ ترجمہ میں وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ کا ترجمہ یوں لکھا تھا دھوو اپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور ملو اپنے سروں کو اور پیروں کو ٹخنوں تک تو اس کو یہ

ترجمہ کہ ملوا اپنے سروں کو اور پیروں کو دیکھ کر شبہ ہوا کہ پیروں کا بھی ملنا فرض ہے دھونا فرض نہیں میں بڑا پریشان ہوا کہ اس کو کس طرح سمجھاؤں کہ اَرْجُلَکُمْ کا عطف رُؤُسَکُمْ پر نہیں بلکہ وُجُوْهَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ پر ہے کیونکہ وہ عطف ومعطوف کو کیا جانے تو میں نے اس کو دوسری طرح سمجھایا کہ اس سے پوچھا تم کو قرآن کا کلام الٰہی ہونا کیسے معلوم ہوا کہا علماء کے کہنے سے میں نے کہا کیا تیرے نزدیک علماء ایسے دیندار ہیں کہ جس کلام کو وہ اللہ کا کلام کہدیں تم اس کا یقین کرلو گے کہا جی ہاں علماء دیندار نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا میں نے کہا کہ پھر انہی علماء کا یہ قول بھی ہے کہ وضو میں پیروں کا دھونا فرض ہے مسح جائز نہیں تو کیا وہ اس فتوے میں بے ایمان ہیں پس ان کی اس بات کو نہ ماننے کی کیا وجہ۔ اور خبردار جو تم نے آئندہ ترجمہ دیکھا اس طرح ایک اہل مد بوڑھے میاں مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا قرآن پڑھتے ہوئے راعنا نہ پڑھا کروں اس لفظ کو چھوڑ دیا کروں میں نے پوچھا یہ کیوں؟ کہا ترجمہ میں لکھا ہے کہ اے ایمان والو! راعنا مت کہو۔ وہ اس کا یہ مطلب سمجھے کہ تلاوت کے وقت بھی نہ کہو۔ میں نے کہا کہ تلاوت کے وقت راعنا ضرور کہو اور تم کو ترجمہ دیکھنا حرام بس تم اہل مد ہو اپنی مدوں کا حساب کیا کرو اور میں جو ایسے لوگوں کے لئے ترجمہ دیکھنا حرام کہتا ہوں تو اس میں ترجمہ قرآن کی (معاذ اللہ) توہین نہیں بلکہ مقصود ان لوگوں کی اہانت ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو یہ تو ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ حسین عورت کا دیکھنا نامحرم کو حرام ہے تو کیا اس سے حسین عورتوں کی توہین ہوگئی؟ جن میں حضرت عائشہ حضرت سارہ اور حضرت رابعہ بھی داخل ہیں تو کیا کوئی اس جملہ سے ان بزرگ عورتوں کی توہین نکال سکتا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہی کہا جائے گا کہ مقصود ان ناظرین کے دین کی حفاظت ہے اسی طرح یہاں سمجھو نیز اگر یوں کہا جائے کہ آشوب چشم والے کو آفتاب کی طرف دیکھنا حرام ہے کیونکہ اندھا ہونے کا اندیشہ ہے تو کیا اس سے آفتاب کی توہین مفہوم ہوسکتی ہے ہرگز نہیں۔

محکمہ تکفیر

اگر بریلوی اس جملہ کو سن لیں تو شاید کفر کا فتویٰ فوراً لگادیں کیونکہ ان کے یہاں تکفیر کے لئے اس کی بھی ضرورت نہیں کہ معنی کفر کا قصد کیا جائے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ اس سے کفر لازم

آ سکتا ہے اس لئے متکلم کافر ہے گووہ معنی جوانہوں نے سمجھے متکلم کے باپ دادوں نے بھی نہ سمجھے ہوں بس ان کی تکفیر کی ایسی مثال ہے جیسے کانے نے سامنے سے ایک شخص کو آتا دیکھ کر دور ہی سے کہنا شروع کیا تو حرام زادہ تیرا باپ حرام زادہ۔ اس نے کہا بھائی میں نے کیا قصور کیا جو مجھے حرام زادہ بناتا ہے کہا مثل مشہور ہے کانا حرام زادہ تو تم نے مجھے دیکھ کر اپنے دل میں ضرور مجھے حرام زادہ کہا ہوگا اس لئے میں نے بدلہ لے لیا۔ خواہ اس غریب نے کہا ہو یا نہ کہا ہو مگر ان کو بدلہ لینا ضرور تھا۔ یہی حال بریلی کے تکفیروں کا ہے کہ اپنی طرف سے کلام کے ایک معنی تراش کر متکلم کی تکفیر کرنے لگتے ہیں گواس کے وہم میں بھی یہ معنی نہ آئے ہوں۔ مگر یہ تکفیر کا محکمہ ہمارے یہاں نہیں ہے یہ انہی کو مبارک ہو ہمارے بزرگ تو ایسے تھے کہ میں نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے ایک صوفی کا مقولہ جو ایک رسالہ میں تازہ دیکھا تھا بیان کیا کہ شیخ نے اس سے پوچھا تو خدا کو جانتا ہے کہا میں خدا کو کیا جانوں میں تو آپ کو جانتا ہوں یہ مقولہ بیان کرتا ہوں میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ لوگ کیسے بیباک ہوتے ہیں کہ ایسا سخت کفر کا کلمہ کہہ دیا مولانا ہنسنے لگے اور فرمایا اس میں کفر کی کیا بات ہے اچھا تم بتلاؤ کیا تم خدا کو جانتے ہو؟ بتلاؤ اللہ میاں کیسے ہیں بس یہ سوال کرنا تھا کہ میں حقیقت کو سمجھ گیا کہ صوفی کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت بلا واسطہ مجھ کو نہیں ہے بلکہ مجھے شیخ کے ذریعہ سے حاصل ہوئی اس سے زیادہ میں نہیں جانتا تو دیکھئے مولانا نے ایسے سخت کلام کو کتنا ہلکا کر دیا یہ کلام ضمنی آ گیا تھا اصل میں اس کو بیان کر رہا تھا کہ باطن میں بھی صبر ومصابرت کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں بڑے بڑے مصاعب واقع ہوتے ہیں اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا میں اسی کا حکم ہے۔

قصد اور عمل

اب یہاں ایک سوال متحمل ہے وہ یہ کہ مقصود بیان تو ضرورت عمل ہے اور آیت میں ضرورت صبر کا ذکر ہے تو یہ مقصود پر کیسے منطبق ہوگی جواب یہ ہے کہ مقصود کی تمہید ہے اور مقصود رابطوا ہے جس کی ایک تفسیر عمل ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اب اس کے تمہید ہونے کو سمجھئے وہ یہ ہے کہ صبر ایک ایسا عمل ہے جس کے فوت ہونے سے ہمارے سب اعمال خراب ہو رہے ہیں چنانچہ نماز بھی اسی کے فوت ہونے سے گراں ہے ورنہ مظاہر میں نماز

بالکل معمولی چیز معلوم ہوتی ہے مگر پھر بھی مشاہدہ ہے کہ وہ گراں ہے اور ایسی گراں ہے کہ حق تعالیٰ بھی اس کو گراں بتلا رہے ہیں وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ جس چیز کو اللہ تعالیٰ گراں فرمائیں خود سمجھ لو وہ کیسی گراں ہوگی سو اس گرانی کی وجہ وہی عدم الصبر ہے جس کو قرآن مجید میں اس عنوان سے ارشاد فرمایا ہے کہ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ جس سے معلوم ہوا کہ نماز کی گرانی کا سبب ترک خشوع ہے مگر اس دلالت کے لئے خشوع کے معنی معلوم ہونے کی ضرورت ہے اور اس سے قطع نظر اس لئے بھی اس کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے کہ اس کے معلوم نہ ہونے سے بہت لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ خشوع کو دشوار سمجھتے ہیں پھر اس کے ساتھ یہ مقدمہ اور ملا لیا کہ نماز بدون خشوع کے بیکار ہے اور اس کی تائید میں یہ شعر یاد کر لیا

بر زبان تسبیح ودر دل گاوخر — ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

''زبان پر تسبیح اور دل میں گاوخر کا خیال ایسی تسبیح''

اس لئے وہ نماز ہی چھوڑ بیٹھے مگر میں نے اس شعر کا رد کیا ہے کیونکہ یہ شعر مثنوی رومی کا نہیں ہے بلکہ نان وحلوا کا شعر ہے میں نے اس کے جواب میں کہا ہے ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر مگر اس کے ساتھ ایک شرط ہے وہ یہ کہ نماز پڑھتے ہوئے یہ ارادہ ہو کہ ہم نماز اس واسطے پڑھتے ہیں تا کہ عبدیت پیدا ہو ذکر اللہ اس واسطے کرتے ہیں تا کہ محبت حق پیدا ہو تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ قصد اثر سے جو عمل کیا جائیگا وہ ضرور موثر و نافع ہوگا خواہ اس میں یکسوئی حاصل ہو یا نہ ہو دل لگے یا نہ لگے وساوس آئیں یا نہ آئیں البتہ اگر اثر کا قصد بھی نہ ہو تو پھر نان وحلوا کا شعر صحیح ہے افسوس یہ ہے کہ ہم لوگ عمل کرتے ہوئے اثر کا قصد بھی نہیں کرتے۔

نماز کی گرانی

بہرحال خشوع کی حقیقت یہ نہیں کہ وسوسہ بالکل نہ آئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے قصد سے نہ لاوے غرض آمدن مضر نہیں آوردن مضر ہے مگر آنا لانا ایسا نہ ہو کہ لانے کو آنا سمجھتا رہے جیسا ایک نیم ثرواعظ کی حکایت ہے کہ اس کے گھر میں کسی کی مرغی آ گئی بیوی نے نکالنا چاہا کہا نکالو نہیں بلکہ تین بار آواز دے کر پوچھ لو کس کی ہے مگر مرغی آہستہ کہنا کس کی ہے زور سے کہنا جب تین بار اس طرح پکار دیا گیا تو کہا اس کو ذبح کر لو لقطہ ہے جب وہ پک کر تیار ہوئی تو بیوی

سے کہا کہ بوٹیاں مت نکالنا کیونکہ وہ تو مشتبہ مال ہے شوربا نکال لینا کیونکہ اس میں نو پانی مصالحہ گھی وغیرہ سب ہمارا مال ہے (حالانکہ بوٹیوں کا ست بھی اسی میں تھا جو کہ مشتبہ کیا بلکہ حرام تھا ۱۲) بیوی نے چمچہ لے کر شوربا نکالنا چاہا واعظ صاحب بولے یوں نہیں بلکہ دیگچی سے انڈیل کر نکال، بیوی نے کہا اس طرح تو بوٹیاں بھی آئیں گی کہا جو اپنی خوشی سے آئے اس کو آنے دو تم مت لاؤ تو جس طرح اس جاہل نے لانے کو آنا سمجھا تھا ایسے ہی بعض لوگ نماز میں خود خیالات لاتے ہیں مگر اس دھوکہ میں رہتے ہیں کہ یہ تو خود آ رہے ہیں۔ پس از خود خیالات نہ لاؤ تو خشوع حاصل ہو جائے گا اور یہ فعل اختیاری ہے مگر ہر ایک کو آسان نہیں بلکہ اسی کو آسان ہے جو خیالات کے مجتمع رکھنے کا عادی ہے راز اس کا یہ ہے کہ نماز کی گرانی کا سبب قید ہے تو جو شخص قید کا پہلے سے عادی ہو اس کو نماز گراں نہیں اور جو آزادی کا عادی ہے اس کو گراں ہے اور یہی قید صبر ہے پس نماز بھی صبر کے فوت ہونے ہی سے گراں ہوئی اگر صبر کی عادت ہو جائے جس کی حقیقت حبس وقید نفس ہے تو نماز پھولوں سے ہلکی ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ آزادی کا طالب ہونا الحاد و زندقہ ہے دین تو نام ہی قید کا ہے چنانچہ نماز میں قیود ہیں روزہ میں قیود ہیں ہر کام میں قیود ہیں مگر خاشعین کے واسطے قیود ایسی ہیں۔

اسیرت نخواہد رہائی زبند — شکارت نجوید خلاص از کمند

''تیرا قیدی قید سے رہائی کا خواہش مند نہیں ہوتا تیرا شکار حال سے خلاصی کا خواہش مند نہیں۔''

مولانا فرماتے ہیں

گر دو صد زنجیر آری بگسلم — غیر زلف آں نگار مقبلم

''اگر دو سو زنجیریں ہوں تو توڑ دوں سوائے اپنے محبوبہ کے زلف کی بندش کے یعنی سوائے اپنے محبوب کے کسی اور کا گرفتار ہونا پسند نہیں۔''

حضرات انبیاء علیہم السلام کے جو مراتب بلند ہیں اس کی تو وجہ ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ قیود وحد کا حق ادا کیا ہے ان پر وہ بلائیں گزری ہیں جن کو دوسرا برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

زاں بلا ہا کا بینا برداشتند — سر بہ چرخ ہفمیں افراشتند

''ان بلاؤں کی وجہ سے جو حضرات انبیاء علیہم السلام نے برداشت کیں ان کے درجات

ومراتب تمام مخلوق سے بلند ہو گئے''

اور جب دین کا نام ہی قید کا ہے تو یہ ضروری بات ہے کہ اول اول جی نہ لگے گا کیونکہ نفس ابھی قید کا عادی نہیں ہے۔

حقیقت صبر

اس جواب کا تو حاصل یہ تھا کہ صبر عمل کی تمہید ہے اور ترقی کر کے یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ دین کا ہر عمل صبر ہی ہے کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ ہر عمل میں حدود و قیود ہیں اور صبر کی حقیقت بھی قید ہی ہے اس سے بھی وہ شبہ بالکل مرتفع ہو گیا کہ مقصود تو ضرورت عمل ہے اور آیت میں صبر کا امر ہے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اعمال شرعیہ کو اللہ تعالیٰ نے صبر کے عنوان سے بیان فرمایا ہے تا کہ سنتے ہی مخاطب کو معلوم ہو جائے کہ اس میں ہمت کی ضرورت ہوگی پس اب سالکین کو جی نہ لگنے کی شکایت کرنا فضول ہے کیونکہ تم کو تو صبر ہی کا امر ہے اور ہر عمل کی حقیقت صبر ہی ہے اور صبر میں جی لگنا کیسا؟ بلکہ جی نہ لگنے کی صورت میں زیادہ خوش ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ثواب زیادہ دینا چاہتے ہیں اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ پھر تو کاملین سے ہم ہی اچھے ہیں کہ ہم کو ثواب زیادہ ملتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں اچھے وہی ہیں کیونکہ انہوں نے اس قدر محنت کی ہے کہ اب ان کو قید میں بھی حظ آنے لگا تو صبر بھی ان ہی کا بڑھا ہوا ہے اور تم اس میں بھی ان کے برابر نہیں مگر جتنا صبر بھی تم سے ممکن ہے اختیار کرو تمہارے اختیار میں بھی ہے لذت کی طلب چھوڑ دو جس کو وصول سمجھا جاتا ہے کہ وہ تمہارے اختیار میں نہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کا ارشاد ہے کہ مقصود طلب ہے وصول مقصود نہیں کیونکہ وصول تمہارے اختیار میں نہیں بلکہ ان کے اختیار میں ہے تم سے تو مطلوب صرف وہ کام ہے جو تمہارے اختیار میں ہے اور وہ طلب و سعی کے سوا کچھ نہیں پس تم اپنا کام کرو اللہ میاں کے کام میں کیوں دخل دیتے ہو۔

کار خود کن کار بیگانہ مکن ''اپنا کام کرو دوسروں کا کام مت کرو''

ہاں اتنی اجازت ہے کہ وصول کی دعا کر لیا کرو مگر اس کے در پے نہ ہو مولانا فرماتے ہیں

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست

''تا کہ تمہارے پاس ندی ہوا سکے اوپر نیچے پانی ہو۔ پانی کی تلاش نہ کرو بلکہ اپنے اندر پیاس پیدا کرو''

مولانا بڑے محقق ہیں فرماتے ہیں کہ پانی کی تلاش نہ کرو بلکہ پیاس پیدا کرو پانی خود بخود آ جائیگا

تشنگاں گر آب جویند از جہاں   آب ہم جوید بعالم تشنگاں

''دنیا میں اگر پیاسے پانی تلاش کرتے ہیں وہاں دنیا میں پانی بھی پیاسوں کو تلاش کرتا ہے''

جب پیاس ہوگی پانی بھی پاس آ جائیگا یعنی تم طالب سے مطلوب ہو جاؤ گے آگے اس مضمون کو ذرا وضاحت سے بیان فرماتے ہیں

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں   کو بہ نسبت ہست ہم ایں وہم آں

''جس عاشق کو دیکھو اس کو معشوق مت سمجھو اگر نسبت دونوں طرف ہے''

مگر اتنا فرق ہے کہ عاشق کا عشق ببانگ دہل ہوتا ہے اور محبوب کا عشق مخفی ہوتا ہے

عشق معشوقاں نہاں ست وسیر   عشق عاشق بادو صد طبل ونفیر

''معشوق کا عشق پوشیدہ ہے، عاشق کا عشق ظاہر اور آشکار''

وحدۃ الوجود

یہی حقیقت ہے تصوف کی کہ طلب پیدا کرے اور عمل کا اہتمام کرے تصوف کوئی دشوار چیز نہیں متقدمین نے صوفی کی تفسیر عالم باعمل سے کی ہے۔ مگر آجکل لوگوں نے اس کو ہوا بلکہ بدنام بنا دیا ہے یہاں تک کہ ایک عیسائی انگریز بھی کہنے لگا کہ ہم تو تین ہی خدا کے قائل ہیں اور تمہارا ٹوپی (صوفی) تو ہر چیز کو خدا کہتا ہے۔ یہ وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو بگاڑا ہے اور غضب ہے کہ بہت سے جہلاء وحدۃ الوجود کے معنی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ ہر چیز خدا ہے حتی کہ میں نے فرنگی محل میں ایک مولوی صاحب کو درس میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ نعوذ باللہ واجب الوجود کلی طبعی ہے جزئی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ کلی طبعی کا وجود جداگانہ نہیں ہوتا بلکہ افراد کے ضمن میں ہوتا ہے تو نعوذ باللہ خدا کا وجود مستقل کوئی نہیں بلکہ موجودات کے ضمن ہی میں ہے یہ وحدۃ والوجود نہیں بلکہ کفر صریح ہے وحدۃ الوجود تو یہ ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا کر خدا کی ہستی کا مشاہدہ کرے نہ یہ کہ خدا کی ہستی کو مٹا کر اپنی ہستی کا مشاہدہ کرے۔ ایک بزرگ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ منصور نے بھی انا الحق میں خدا ہوں کہا اور فرعون نے بھی انا ربکم الاعلیٰ میں تمہارا بلند مرتبہ والا رب ہوں کہا جس کا حاصل انا الحق ہی ہے پھر وہ مقبول ہوئے

یہ مردود ہوا اس کی کیا وجہ الہام ہوا کہ منصور نے اپنے کو مٹانے کیلئے انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹانے کیلئے انا الحق کہا تھا اس لئے وہ مقبول ہوا یہ مردود ہوا مولانا اسی کو فرماتے ہیں

گفت منصورے انا الحق گشت مست　　　گفت فرعونے انا الحق گشت پست

رحمۃ اللہ آں انا را دروفا　　　لعنت اللہ ایں انا را در فقا

''منصور نے انا الحق (میں خدا ہوں) کہا مقبول ہوا فرعون نے انا الحق کہا مردود ہوا۔ راہ وفا میں انا (میں) کہنا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور راہ جفا میں انا کہنا اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے''

احوال واعمال

غرض متقدین نے صوفی کی تفسیر عالم باعمل کی ہے جس سے تصوف کی حقیقت علم باعمل حاصل ہوئی متقدمین کے علوم بڑے پختہ ہیں انہی سے تمسک کرنا چاہیے کیونکہ وہ اہل صحو تھے اور متاخیرین میں اہل سکر زیادہ ہیں رہا یہ کہ جب تصوف کی حقیقت علم مع العمل ہے تو خشک عالم کون ہوئے اس کا جواب یہ ہے کہ خشک عالم وہ ہے جو عمل کو ظاہر کے ساتھ خاص کرتا ہے اور عمل باطن کا اہتمام نہیں کرتا اور جس کو علم کے ساتھ عمل ظاہر و عمل باطن دونوں کا اہتمام ہے وہ عالم تر ہے پھر جو عالم باعمل ہوگا اور اعمال ظاہرہ باطنہ کا جامع ہوگا اللہ تعالیٰ اس کو بعض خاص نعمتیں عطا فرماتے ہیں پھر وہ نعمتیں دو قسم کی ہیں ایک موعود وہ تو رضا حق اور جنت ہے بس اور غیر موعود کیفیات باطنیہ ذوق شوق واحوال مواجید اور اسرار وغیرہ ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے باغ میں پانی تو دیتے ہیں درختوں کی پرورش کے لئے مگر پانی دینے سے گھاس بھی نکل آتی ہے جو دیکھنے میں درختوں سے زیادہ خوشنما ہوتی ہے اور مالی کی تراش وخراش سے اس میں خوبصورتی زیادہ آ جاتی ہے اب جو لوگ احوال وکیفیات واسرار کے طالب ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص باغ میں گھاس ہی گھاس چاہے اس کی خدمت کرے حتیٰ کہ درختوں کی جڑوں میں سے بھی گھاس کو صاف نہ کرے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہزاروں روپے کے قیمتی درخت برباد ہو جائیں گے۔ صرف گھاس رہ جائیگی جو ایک دو روپے سے زیادہ کی نہ ہوگی۔ عاقل وہ ہے جو درختوں کی خدمت کرے ان کی نگہداشت کرے گھاس کا کیا ہے وہ تو خودرو ہے اپنے آپ ہی پیدا ہو جائے گی۔ پس سمجھ لو کہ اعمال کی

مثال درختوں جیسی ہے اور احوال واسرار کی مثال گھاس کی سی ہے ان کی طلب میں نہ پڑو اعمال کا اہتمام کرو یہ خود بخود بلا وعدہ کے اکثر عطا ہو جاتے ہیں اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ تصوف کی حقیقت علم مع العمل ہے اس میں علم سے مراد خاص مولویت نہیں بلکہ اس قدر علم جس کی عمل میں ضرورت ہے خواہ عربی پڑھ کر حاصل ہو یا اردو کے رسائل سے یا علماء سے پوچھ پاچھ کر کے بس بقدر ضرورت علم حاصل کر کے خلوت اختیار کرنا اور عمل کا اہتمام کرنا چاہئے مگر ایسی خلوت ہو کہ جب کوئی اشکال پیش آئے تو خلوت کو توڑ کر محقق کے پاس جائے اور اشکال کو رفع کرے ورنہ بعض حالتوں میں شیطان اس کا ایمان تک سلب کر دیگا۔

اتباع وحی

محققین لکھتے ہیں کہ شیطان بعض دفعہ اپنی قوت خیالیہ سے سالک کی نظر میں آسمان اور انوار پیدا کر دیتا ہے اور اس وقت شیاطین بصورت ملائکہ اس سے کلام کرتے ہیں اور ایسے موقعہ پر جاہل دھوکہ کھا جاتا ہے اسی لئے محققین نے فرمایا ہے کہ اگر ملائکہ بھی اس سے ہمکلام ہوں تو اس کو شریعت پر پیش کرے اگر شریعت کے موافق ہو قبول کرے ورنہ رد کر دے کیونکہ ملائکہ کا کلام بلا واسطہ نبی کے حجت نہیں بلکہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اس سے کلام کریں تو کلام حق بھی بلا واسطہ نبی کے غیر نبی کے لئے حجت نہیں کیونکہ (اسکا اولا کلام حق ہونا یقینی نہیں دوسرے) اللہ تعالیٰ کبھی امتحان کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ اس سے جو کلام ہو اس سے امتحان مقصود ہو اور نبی امتحان نہیں کرتا اس لئے کلام حق وہی حجت ہے جو بواسطہ رسول اللہ کے ہو کہ اس میں امتحان وغیرہ کا احتمال نہیں تو خلوت میں بعض دفعہ سخت عقبات پیش آتے ہیں جن کو محقق ہی حل کر سکتا ہے اسی کو عارف فرماتے ہیں

در راہ عشق وسوسہ اہرمن بسے ست — بشدار وگوش را بہ پیام سروش دار

''راہ عشق میں شیطانی وسوسے بہت ہیں ہوشیار رہو اور اس کے احکام پر کان لگائے رہو''

پیام سروش سے مراد وحی ہے کہ وحی کا اتباع ہر وقت لازم ہے ورنہ شیطان ایمان تک سلب کر لیتا ہے اسی لئے جاہل کو خلوت محضہ جائز نہیں ہاں عالم محقق کو جائز ہے کیونکہ وہ اسرار کو صحیح طور سے سمجھے گا مگر ایک وقت اس پر بھی ترک خلوت لازم ہے یعنی افادہ کے لئے

کیونکہ شیخ کے ذمہ طالبین کے افادہ فرض ہے اس کے ذمہ ضروری ہے کہ ایک وقت افادہ کے لئے بھی مقرر کرے عارف اسی کو فرماتے ہیں

بنمائے رخ کہ خلقے لہ شوندوحیراں — بکشائے لب کہ فریاداز مردوزن برآمد

''مخلوق کو چہرہ انور دکھلا دیجئے کہ وہ دیدار کے لیے بے تاب وحیران ہیں لب مبارک کھولیے کہ تمام مردوزن آپ کا کلام سننے کے لیے التجا کرتے ہیں''

روح عمل

غرض بے وحدت کو تو وحدت جائز نہیں۔ باوحدت کو جائز ہے (بے وحدت نہ معلوم کیسا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔ اسی طرح بیہودہ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لفظ مرکب ہے یا بسیط۔ مجھے لاادری کہنے میں کچھ تامل نہیں بلکہ فخر ہے اور اپنے عدم علم کو اس لئے ظاہر کرتا ہوں کہ شاید کسی کو معلوم ہو تو ظاہر کردے) غرض تصوف کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہی نماز روزہ تصوف ہے اور یہی اعمال مقصود ہیں رہا یہ کہ پھر مجاہدہ وغیرہ کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نماز وروزہ کو نماز وروزہ بنانے کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ یہاں سے ان صوفیوں کی غلطی واضح ہوگئی جو عمل کو بیکار سمجھتے ہیں صرف روح عمل کو کافی سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر صورت عمل بیکار ہے تو بہت اچھا آج سے اگر تم پونڈا گنا مانگو گے تو تم کو گڑ دیا جائیگا اس وقت منہ نہ بنانا کیونکہ روح تو موجود ہے اس وقت یہ کیوں کہتے ہو کہ گڑ میں وہ بات کہاں جو پونڈے میں ہے پھر ہم کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ نری روح میں وہ بات کہاں جو نماز میں ہے دوسرے اگر روح عمل ہی مقصود ہوتی تو وہ عالم ارواح میں بھی حاصل ہوسکتی تھی عالم اجسام میں ہم کو کیوں بھیجا گیا؟ یقیناً اس لئے کہ روح مجرد سے صورت اعمال کا تحقق نہ ہوسکتا تھا یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ صورت بھی مطلوب ہے مگر نہ ایسی صورت جو روح سے خالی ہو بلکہ صورت اور روح دونوں کو جمع کرنا چاہیئے خلاصہ یہ کہ آدمی نہ تو ایسا خشک ہو کہ اعمال کی جان سے تعلق ہی نہ ہو نہ ایسا روح میں تر ہو کہ ڈوب ہی مرے۔ آجکل بعض جاہل صوفی محقق علماء کو عارضی جوش وخروش سے خالی دیکھ کر اسرار طریق سے بے خبر سمجھ کر یہ شعر پڑھ دیتے ہیں۔

شب تاریک وبیم موج وگردابے چنیں حائل　　　کجا دانند حال ماسبکساران ساحلہا

حیرت میں ہماری حالت ایسی ہے جیسے اندھیری رات ہواور موج کا خوف ہوبھنور میں کشتی آ گئی تو ہمارے اس حال کی ان لوگوں کو کیسے خبر ہوسکتی ہے جو ہلکے ہلکے کنارے پر کھڑے ہیں اور دریا میں بھی قدم نہیں رکھا کہ یہ لوگ ہماری حالت کو کیا جانیں ان کو خبر ہی نہیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے میں اس کا جواب دیا کرتا ہوں کہ ساحل دو ہیں ایک ادھر کا ایک ادھر کا تو کجادانند حال ما کا مصداق وہ شخص ہے جوادھر کے ساحل پر ہے جس نے دریا میں قدم ہی نہیں ڈالا اور جو شخص ادھر کے ساحل پر کھڑا ہے وہ ڈوبا بھی ہے پھر کامیاب ہوکر پار ہوکر ہنس رہے ہیں جاہلوں کوان کے تبسم سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ ان پر کچھ گزرا ہی نہیں ارے ان پرسب کچھ گزر چکا ہے وہ تمہاری حالت سے بھی واقف ہیں اوراس سے آگے کی حالت سے بھی واقف ہیں اور تم کوان کے تبسم سے جو یہ دھوکہ ہورہا ہے کہ ان کے دل میں کچھ نہیں یہ تمہاری حماقت ہے کہ دور ہی سے دیکھ کرتم نے فیصلہ کرلیا ان کے پاس جاؤ پاس رہو تو معلوم ہوگا کہ ان کا ہنسنا ایسا ہے جیسا توا چولہے سے اتارنے کے بعد ہنسا کرتا ہے۔ ذرا اس پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کیسا جلا بھنا ہے کہ تم کو بھی جلا پھونک دیگا اسی کو نواب صاحب شیفتہ فرماتے ہیں وہ نواب بھی تھے اور صوفی عارف بھی تھے کیونکہ تصوف کے لئے لنگوٹہ باندھنا شرط نہیں وہ فرماتے ہیں۔

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو　　　کہ بینی خندہ برلبہا وآتش پارہ در دلہا

اے افسردہ دل زاہد ایک دن رندوں کی مجلس میں جا کر بیٹھ کہ دل میں آگ لگی ہوئی ہے اور لب پر ہنسی چھارہی ہے

ہاں یہ ضرور ہے کہ منتہی کو جوش وخراش نہیں ہوتا یعنی اکثر نہیں ہوتا مگر کبھی کبھی ہو ہی جاتا ہے۔

بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حضرات انبیاء پر بھی بعض دفعہ غلبہ حال ہو جاتا ہے چنانچہ جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے غلبہ کے لئے بہت دیر تک دعا کی آخیر میں یہ بھی فرمایا **اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لم تعبد بعد الیوم**[1] اے اللہ اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو دنیا میں کوئی آپ کا نام نہ لے گا بھلا اگر کوئی اللہ کا

---

[1] الصحیح لمسلم: ۱۳۸۳، مسند احمد ۱: ۳۲، کنزل العمال: ۲۹۹۰

نام نہ لیتا تو خدا کا اس میں کیا نقصان تھا پس ظاہر میں یہ جملہ بہت سخت معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ سنا رہے ہیں کہ آپ کو کوئی نہ پوچھے گا اس کی تاویل قریب بجز اس کے کچھ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت خاص حالت کا غلبہ تھا اس لئے ناز میں یہ جملہ فرمادیا دوسرا واقعہ اسی غلبہ حال کا عبداللہ بن ابی منافق کی نماز پڑھنے کا ہے یہ شخص بڑا سخت منافق تھا مگر اس کے بیٹے مخلص مسلمان تھے انہوں نے حضور کو اپنے باپ کے مرنے کی اطلاع دی اور دعا کی درخواست کی چونکہ اس وقت تک منافقین کی نماز جنازہ سے صراحۃً ممانعت نازل نہ ہوئی تھی اس لئے حضور نے وعدہ فرمالیا کہ میں دعا کروں گا اور نماز بھی پڑھوں گا چنانچہ آپ نماز پڑھنے کو تیار ہو گئے اس وقت حضرت عمر نے آپ کو نماز سے روکنا چاہا اور اس کے کلمات اور واقعات شمار کرنا شروع کئے کہ یارسول اللہ یہ تو منافق تھا اس نے فلاں دن یوں کہا تھا فلاں وقت یوں کہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے لئے استغفار و دعا سے منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ ان منافقین کیلئے دعائے مغفرت کریں یا نہ کریں (اثر کے اعتبار سے یکساں ہے) حتیٰ کہ آپؐ اگر ان کیلئے ستر مرتبہ بھی دعائے مغفرت کریں تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ حضور نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ خواہ استغفار کروں یا نہ کروں اور اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستر دفعہ سے زیادہ استغفار کرنے پر اس کی مغفرت ہو جائے گی تو میں ستر سے زیادہ استغفار کرونگا غرض آپؐ نے نماز پڑھا دی نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ آیت نازل ہوئی

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ
اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ

ان منافقین میں سے جب بھی کوئی مر جائے تو آپ ان کیلئے دعا نہ کریں اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہوں، بیشک ان لوگوں نے اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار (کفر) کیا اور گناہگار ہو کر مرتے۔ جس میں آئندہ کیلئے صاف طور سے منافقین کے جنازہ کی نماز سے اور ان کی قبر پر جانے سے منع کر دیا گیا جب حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا کہ آیت میری رائے کے

موافق نازل ہوگئی تو ان پر بے انتہا خجلت کا غلبہ ہوا کہ یہ کیا ہوا کہ میری رائے کے موافق وحی نازل ہوئی اب ان کو حضورؐ کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی تھی سبحان اللہ یہ ہے محبت اور ادب اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضورؐ کی رائے سے حضرت عمرؓ کی رائے افضل ہوگئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی رائے بھی حضورؐ ہی کی رائے تھی وہ بھی حضورؐ ہی کا فیض تھا کیونکہ کفار ومنافقین پر غیظ اور ان سے نفرت حضرت عمرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے نصیب ہوئی ورنہ آپ کی صحبت سے پہلے تو وہ خود ہی خالی تھے اور قتل رسولؐ کا منصوبہ باندھ کر آئے تھے۔ حضور پر ایمان لانے کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو کفار ومنافقین سے نفر اور غیظ عطا فرمایا مگر حضرت عمرؓ صرف عمر ہی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسول بھی تھے اور عمر بھی تھے بلکہ یوں کہوں کہ آپ آدم بھی تھے نوح بھی تھے ابراہیم بھی تھے موسیٰ بھی تھے، عیسیٰ بھی تھے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری　　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن، دم عیسیٰ اور ید بیضا رکھتے ہیں جو اوصاف وکمالات دیگر جملہ انبیاء علیہم السلام میں ہیں وہ تنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں

حضورؐ میں تمام شانیں جمع تھیں غیظ وغضب علی الکفار بھی آپ کے اندر تھا اور رحمت ورافت بھی اعلیٰ درجہ کی آپ میں تھی۔

غلبہ رحمت

مگر آپ میں غلبہ رحمت ہی تو تھا اس لئے جب تک کوئی بہانہ بھی رحمت کا ملتا تھا آپ رحمت ہی کا برتاؤ کرتے تھے جب رحمت کا کوئی بہانہ نہ ہوتا اس وقت غضب فرماتے (عبداللہ بن ابی گو منافق تھا مگر کھلم کھلا کافر نہ تھا اور منافقوں کے احکام کفار معلنین کے احکام سے جدا تھے ان کے ساتھ احکام حیات میں وہی برتاؤ ہوتا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور موت کے احکام ہنوز نازل نہ ہوئے تھے اس لئے بوجہ غلبہ رحمت کے آپ نے احکام حیات پر قیاس کر کے اس کے ساتھ اموات مسلمین جیسا برتاؤ کیا اور حضرت عمر نے بوجہ غلبہ غیظ وشدت کے احکام حیات کو ضرورت ومصلحت پر مبنی سمجھ کر احکام ممات میں منافقین کو کفار معلنین پر قیاس کیا اور یہ بھی حضورؐ ہی کا فیض تھا اور یہ قیاس بھی آپ سے مخفی نہ تھا مگر حضورؐ نے غلبہ رحمت کی وجہ

سے پہلے قیاس کو ترجیح دی کیونکہ جب تک آپ کو موقعہ ملتا تھا آپ رحمت ہی کے پہلو کو اختیار فرماتے تھے اور حضور کی یہ شان ہم مسلمانوں کے لئے بہت کچھ موجب تسلی ہے کیونکہ

دوستانرا کجا کنی محروم تو کہ باد شمناں نظر داری

''دوستوں کو کب محروم کریں گے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنوں پر بھی نظر عنایت ہے۔''

اور

چہ غم دیوار امت کہ باشد جونتو پشتیبان چہ باک از موج بحر آنرا کہ دارد نوح کشتیان

''امتیوں کو کیا غم جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ان کا معاون و مددگار ہے سمندر کے طوفان سے اس کو کیا غم جس کا کشتی بان حضرت نوح علیہ السلام ہے۔''

اب اس مقام پر میں ایک سوال علماء ظاہر سے کرتا ہوں وہ یہ کہ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ آپ ان کیلئے استغفار کریں یا نہ کریں۔ سے حضور نے تخییر کس طرح سمجھی یہ تردید تو تسویہ کے لئے ہے کہ ان کے واسطے استغفار کرنا اور نہ کرنا برابر ہے۔ ان کو دعا استغفار سے کوئی نفع نہ ہوگا چنانچہ اہل عربیت پر یہ بات مخفی نہیں اسی طرح اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً اگر آپؐ ان کیلئے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں۔ میں عدد کا ذکر تحدید کے لئے تھوڑا ہی ہے اگر ستر دفعہ استغفار کرو گے تو مغفرت نہ ہوگی اس سے زیادہ کرو تو ہو جائے گی بلکہ یہاں عدد کا ذکر ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ سو دفعہ بھی کہے گا جب بھی نہ مانوں گا ہزار دفعہ کہے گا جب بھی کچھ نہ ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہزار دفعہ سے زیادہ کہا جائے تو مان لیں گے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ بات ہرگز نہ مانی جائے اور عدد کا ذکر صرف بیان کثرت کے لئے ہوتا ہے نہ تحدید کے لئے پھر حضورؐ نے خیرت فاخترت وسازید علیٰ لسبعین مجھے اختیار دیا گیا اور میں ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کروں گا۔ کیسے فرمایا۔ علماء ظاہر اس کا شافی جواب نہیں دے سکتے اور جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھ کر اجتہاد کے مدعی ہیں تو وہ تو کیا ہی جواب دیں گے لیجئے اب میں علماء باطن کا جواب عرض کرتا ہوں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حالت رحمت کے غلبہ کی وجہ سے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معانی کی طرف التفات نہیں فرمایا بلکہ محض نفس الفاظ سے تمسک فرمانے لگے اور نفس الفاظ میں تخییر وحصر کی گنجائش ضرور ہے گو محاورہ کے اعتبار سے گنجائش نہ

ہوا اس سے معلوم ہوا کہ غلبہ حال کاملین پر بھی کبھی ہو جاتا ہے اب میں پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ مقصود بیان تو اتنا طویل نہ تھا جتنا وقت گزر گیا مگر بات میں بات نکلتی آئی اس لئے زیادہ دیر ہوگئی اور یہ بلا ارادہ ہوا میرا ارادہ اتنی دیر بیان کرنے کا بھی نہ تھا مگر ان شاء اللہ یہ تطویل بھی نافع ہی ہوئی کہ بہت سی کام کی باتیں کان میں پڑ گئیں۔

علم با عمل

مقصود بیان یہ ہے کہ میں عمل کی ترغیب دے رہا ہوں اور میں نے بتلا دیا ہے کہ تصوف کا خلاصہ صرف علم مع العمل ہے اور علم بھی صرف عمل کے لئے مطلوب ہے تو یوں کہیے کہ اصل مقصود عمل ہے۔ اور اس میں آجکل بہت کوتاہی ہو رہی ہے کہ لوگ عمل کا اہتمام نہیں کرتے احوال ومقامات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں حالانکہ اصل چیز نماز روزہ اور معاملات ومعاشرت میں احکام شرعیہ کا اتباع ہے اسی کا ذکر اس آیت میں ہے اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو جو عمل کی تمہید ہے یا یہ بھی عمل کی تعبیر ہے آگے ارشاد ہے وَرَابِطُوْا جس کے معنی واطبوا وداموا علی الاعمال اور اطاعت کرو اور اعمال صالحہ میں استقامت اختیار کرو یعنی صرف بلکہ صبر ومصابرت یا صرف ایک دفعہ صبر ومصابرت کافی نہیں ہے بلکہ اس کے مقصود یا مدلول پر کہ عمل ہے مواظبت کی ضرورت ہے۔

اقسام نفس

اب سمجھئے کہ مرابطہ کے انواع بہت ہیں جس کی وجہ ہے کہ نفس کی اقسام مختلف ہیں کسی کا نفس امارہ ہے کسی کا لوامہ کسی کا مطمئنہ۔ مگر صوفیہ نے مرابطہ کی تفصیل زیادہ تر نفس امارہ کے متعلق بیان کی ہے میں نے نفس مطمئنہ اور نفس لوامہ کے اعتبار سے اس میں کچھ زیادات کی ہیں۔ جن سے صوفیہ نے تعرض نہیں کیا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ مرابطہ کی صورت کبھی بہلانے پھسلانے کی شکل میں ہوتی ہے کبھی ڈانٹ ڈپٹ کی شکل میں۔ تو جو نفس مطمئنہ ہے اس کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کا برتاؤ نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ اجر وفضائل یاد دلا کر بہلانے پھسلانے کا معاملہ ہوتا ہے جس کا نام مواعدہ ہے کیونکہ نفس مطمئنہ تو خود ہی عمل کا طالب ہے اور

مجاہدات سے اس کے اندر عمل کا شوق پیدا ہوگیا ہے مگر کبھی بشریت کی وجہ سے سستی کرنے لگتا ہے تو اس وقت اس کو ترغیب اور مواعدہ کی ضرورت ہوتی ہے اور نفس مطمئنہ کو کہا جاتا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ آتش محبت خالی ہے بلکہ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اندر اندر جلتے بھنتے رہتے ہیں گو ظاہر میں ہنستے پھرتے ہیں۔ نواب شیفتہ نے ان کی حالت کو خوب بیان کیا ہے۔

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رندان شو ۔۔۔ کہ بینی خندہ برلبہا و آتش پارہ در دلہا

تو اے افسردہ دل زاہد ایک دن رندوں کی مجلس میں جا کر بیٹھ کر دل میں آگ لگی ہوئی ہے اور لب پہ ہنسی جاری ہے

اور ایک نفس لوامہ ہے جو کبھی برے کام بھی کرتا ہے مگر پچھتاتا بھی ہے اس کے ساتھ مسامحت کا معاملہ کیا جاتا ہے یعنی اس کو نرمی سے تنبیہ کی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ تو خود ہی حرکات پر نادم ہے اور توبہ کر کے عمل کر رہا ہے اور ایک نفس ہے امارہ جو گناہوں سے رکتا ہی نہیں اس کی سختی کا معاملہ کیا جاتا ہے صوفیہ نے اسی کے معاملہ کو زیادہ بیان کیا ہے پس نفس امارہ کو دوام عمل اور مواظبت کا عادی بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اول تو اس سے ہر دن صبح ہی کو شرطیں کر لو کہ تجھ کو آج اس طرح عمل کرنا پڑیگا اس کا نام ہے مشارطہ پھر دن بھر اس کی نگہداشت رکھو کہ شرط کے موافق عمل کر رہا ہے یا نہیں اس کا نام ہے۔ مراقبہ پھر رات کو دن بھر کا اعمال کا حساب لو کہ آج کیا کیا کام کئے اور شرط پوری کی یا نہیں اس کا نام ہے محاسبہ اب حساب کرنے سے اگر یہ معلوم ہوا کہ شرط کی خلاف ورزی ہوئی ہے اس کو کسی ایسی مشقت کی سزا دو جس سے اس کی اصلاح ہو۔

اصلاح نفس

اس کا نام ہے معاقبہ پھر جو اس کی سستی سے اس نے کوتاہی کی ہے اس کے تدارک کے لئے اس پر کچھ جرمانہ مقرر کرو کبھی نفلیں زیادہ بڑھادو کبھی روزہ لازم کردو کبھی صدقہ خیرات بڑھادو اس کا نام ہے معاہدہ اس کے بعد اس کی نافرمانی پر اس پر ملامت کرو اور تدارک پر آمادہ کرو اس کا نام ہے معاتبہ اور اگر محاسبہ کے وقت یہ معلوم ہو کہ نفس نے بد پرہیزی اور خلاف ورزی نہیں کی بلکہ شرائط کو پوری طرح ادا کر دیا تو اب اس کو شاباشی دو اس کا صوفیہ نے ذکر نہیں کیا نہ اس کا نام تجویز کیا سو میں ان شاء اللہ اس کا نام بھی وعظ کے صاف ہونے

کے وقت تجویز کرلونگا۔ خلاصہ یہ کہ ہمیشہ نفس کو بد پرہیزی سے بچانا چاہیے کہ احکام الٰہیہ کی مخالفت نہ کرے اور صوفیہ نے یہ سب طریقے حدیثوں سے معلوم کر کے مقرر کئے ہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے حاسبوا قبل ان تحاسبوا[1] اس میں محاسبہ کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں ہے من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء[2] جو تم میں سے نکاح کی استطاعت رکھتا ہو اسے چاہئے کہ شادی کرلے اور جو استطاعت نہیں رکھتا اسے چاہیے کہ روزہ رکھے کیونکہ وہ اس کی رگ شہوت کو مل دے گا۔

اصلاح نفس بہ واسطہ روزہ

جو شادی کر سکے وہ نکاح کرے اور جس کو اس کی وسعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ اس کی رگ شہوت کو مل دیگا یہ مجاہدہ ہے اور ترک جمعہ پر تصدیق دینار کا امر ہے یہ معاقبہ ہے اسی طرح نصوص میں غور کرنے سے سب کی اصل مل سکتی ہے پس یہ باتیں گھڑی ہوئی نہیں ہیں۔ مگر اہل ظاہر کی نظر یہاں تک نہیں پہنچتی اس لئے ان کو یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں ایک غیر مقلد عالم میرے پاس آئے اور کئی روز تک مجلس میں بیٹھے ان کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی مجھ سے سوال کرتا تو وہ خود جواب دینے لگتے کہ حدیث میں اس کے متعلق یہ آیا ہے۔ میں خاموش رہتا۔ ایک دن ایک شخص نے یہ سوال کیا کہ مجھ پر شہوت کا غلبہ ہے وہ مولوی صاحب جلدی سے بولے کہ روزہ رکھو حدیث میں اس کا بھی علاج ہے فان الصوم لہ وجاء روزہ اس کی رگِ شہوت کو مل دے گا سائل نے کہا میں ۔نے روزہ بھی رکھا تھا مگر اس سے شہوت اور زیادہ ہوگئی اب وہ مولوی صاحب تو خاموش ہوگئے ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا میں نے بزرگوں کے طفیل سے اس کا بھی جواب دیا میں نے کہا کہ روزہ میں ابتداءً شہوت کا غلبہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے طبعیت میں لطافت پیدا ہوتی ہے اور لطافت سے شہوت بڑھتی ہے مگر زیادہ روزے رکھنے سے پھر شہوت کم ہوجاتی ہے اور حدیث میں لزوم صوم کو علاج فرمایا ہے نہ کہ مطلق صوم کو اور لزوم مقتضی ہے اقتیاد و تکرار کو (کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جیسے زیادہ کثافت طبع سے

---

[1] لم اجد الحدیث فی "موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی الشریف" [2] الصحیح للبخاری ۳:۳۳، الصحیح لمسلم کتاب النکاح: ۱، سنن ابی داؤد: ۱، سنن النسائی ۴:۰۷۱

شہوت کم ہوتی ہے اسی طرح زیادہ لطافت سے بھی کم ہوجاتی ہے رہا یہ سوال کہ پھر روزہ کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ یہ طریقہ بتلانا چاہیے کہ بہت پیٹ تن کے کھائے اناپ شناپ کھائے اس سے بھی شہوت کم ہوجائیگی تو یہ صورت خطرناک ہے کیونکہ بہت کھانے سے قسم قسم کے امراض پیدا ہوجائیں گے جن سے جان کا خطرہ ہے اور روزہ ان خطرات سے خالی ہے ۱۲) میں نے یہ حکایت اس لئے بیان کی تا کہ یہ معلوم ہوجائے کہ اہل ظاہر کی نظر حدیث میں وہاں تک نہیں پہنچتی جہاں تک اہل باطن کی پہنچتی ہے اس لئے صوفیہ پران کا یہ اعتراض لغو ہے کہ انہوں نے یہ طریقے کہاں سے گھڑ لئے تو خوب سمجھ لو کہ انہوں نے کہاں سے نہیں گھڑے بلکہ سب اصل حدیثوں میں موجود ہے گو آپ کو معلوم نہ ہو اور حدیث من استطاع منکم البائۃ فلیتزوج تم میں سے جو شخص وسعت رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ نکاح کر لے۔ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسہیل اعمال کے طریقے بھی بتلائے ہیں مگر یہ حضورؐ کے ذمہ لازم نہ تھا یہ محض رحمت وتبرع ہے اسی طرح شیوخ کے ذمہ بھی یہ امور لازم نہیں اگر وہ بتلا دیں تو ان کا احسان ہے اس لئے میں کبھی تو طرق تسہیل بتلا دیتا ہوں کبھی نہیں بتلاتا۔

غلبہ غضب

بعض لوگ غلبہ غضب کی شکایت کرتے ہیں تو ان سے یہ سوال کرتا ہوں کہ غضب اختیاری ہے یا غیر اختیاری وہ کہتے ہیں کہ غیر اختیاری ہے پھر سوال کرتا ہوں کہ اس کے مقتضا پر عمل کرنا اختیاری یا غیر اختیاری وہ کہتے ہیں کہ اختیاری ہے اس پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ اختیاری ہے تو بس غضب کے مقتضا پر عمل نہ کرو یہاں تک تو تبلیغ ہے اور یہی شیخ کے ذمہ ہے آگے طالب کا کام ہے کہ ہمت کر کے غضب کے مقتضا پر عمل نہ کرے مگر شفقت کے طور پر بعض کو سہولت کا طریقہ بھی بتلا دیتا ہوں مثلاً یہ کہ اس جگہ سے خود ہٹ جائے یا مخاطب کو الگ کر دے اگر قدرت ہو۔ اگر قدرت نہ ہو تو خود ہی الگ ہوجائے۔ اور بعض طریقے غصہ کم کرنے کے حدیث میں بھی آئے ہیں مثلاً یہ کہ پانی پی لے وضو کر لے یا اعوذ باللہ پڑھ لے مگر یہ طریق لطیف ہیں جو لطیف طبائع کے مناسب ہیں آج کل طبائع کثیف ہیں اس لئے سخت تدابیر کی ضرورت ہے جن میں سے ایک تدبیر وہ ہے جو میں نے بیان کی

کہ وہاں سے ہٹ جائے یا مخاطب کو الگ کردے اور یہ زیادت علی الحدیث نہیں ہے بلکہ اسی سے مستنبط ہے کیونکہ ان سب تدابیر کا راز یہ ہے کہ غصہ کے وقت توجہ کو ہٹانا اور دوسری طرف متوجہ کردینا غصہ کم کردیتا ہے پس توجہ کے ہٹانے کی جو صورت بھی ہوگی وہ حدیث ہی کے تحت میں ہوگی۔ رہا صورتوں کا بدلنا یہ تبدیل علاج بہ تبدیل مزاج میں داخل ہے آجکل کی طبائع ایسی کثیف ہیں کہ اعوذ باللہ تو کیا سارا قرآن بھی پڑھ دو جب بھی اثر نہ ہو کیونکہ لوگ آجکل محض زبان سے اعوذ باللہ پڑھتے ہیں دل سے نہیں پڑھتے ہماری تو حالت یہ ہے۔

اللہ اللہ می کنی بہر زبان   بے طمع پیش آ و اللہ را بخواں

اور اگر استحضار عظمت الٰہیہ کے ساتھ دل سے اعوذ باللہ پڑھی جائے تو ضرور اثر ہو ہم نے عرب میں اس اثر کا مشاہدہ کیا ہے کہ دو جماعتیں آپس میں غصہ کر رہی ہیں لڑنے کو آمادہ ہو گئے تلواریں نیام سے نکل آئی ہیں کہ ایک تیسرے شخص نے آکر کہہ دیا یا شیخ صلی علی النبی یہ کہنا تھا کہ فریقین کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور دونوں درود پڑھنے میں مشغول ہو گئے **اللھم صل وسلم وبارک علی سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین** پھر ایک ادھر کو چل دیا ایک ادھر کو چل دیا۔ یہاں تو لاکھ دفعہ بھی صل علی النبی کہو تو غصہ ٹھنڈا نہ ہو اس لئے میں یہ بتلاتا ہوں کہ مخاطب کو سامنے سے الگ کر دو یا خود الگ ہو جاؤ تو توجہ ہٹ جائے گی غصہ جاتا رہیگا۔

خوف وحزن

یہی صرف توجہ بڑا علاج ہے۔ غم کا جس وقت کسی کے یہاں موت ہو جاتی ہے تو میں یہی علاج بتلاتا ہوں کہ اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرو غم کو تازہ نہ کرو واقعہ کو سوچو نہیں اس سے بہت جلد غم زائل ہو جاتا ہے اور یہی مطلب ہے **لا تخافی ولا تحزنی** (نہ ڈرو نہ اندیشہ کرو) کا ورنہ بظاہر اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ خوف وحزن تو امر غیر اختیاری ہے اور اوامر ونواہی کا تعلق امور اختیاری سے ہوتا ہے پھر یہاں خوف وحزن سے نہی کیونکر متعلق ہوتی۔ ترجمہ قرآن دیکھنے والے اس اشکال کا جواب دیں؟ یقیناً وہ اس کا جواب نہ دے سکیں گے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا جواب سمجھایا ہے وہ یہ کہ خوف وحزن کی ایک ابتدا ہے ایک بقاء۔ ابتداء تو غیر

اختیاری ہے اور بقاء میں انسان کے اختیار کو بھی دخل ہے کہ واقعہ کو سوچتا رہے اس کا تذکرہ کرتا رہے اس سے حزن بڑھ جاتا ہے پس ولا تحزنی کا مطلب یہ ہے کہ خوف وحزن کو ترقی مت دینا یعنی اس کا تذکرہ نہ کرنا نہ اس کی سوچ میں پڑ جانا اس طرح طبعی حزن بھی خود کمزور ہوجائے گا۔ مگر آجکل تو یہ حالت ہے کہ تعزیت کرنے جو آتا ہے وہ سارا قصہ پوچھتا ہے خصوص عورتیں غمزدہ عورت سے گلے مل کر روتی ہیں اب یہ غریب تو ایک ہے اور گلے لگنے والیاں سو ہیں اس کے دل پر تو تو سو دفعہ نشتر لگتا ہے اور آنے والیوں کے دل پر ایک ہی دفعہ لگتا ہے اگر بناوٹ نہ ہو اس لئے یہ طریقہ تعزیت کا واہیات ہے۔ بس میں تو اس طرح تعزیت کرتا ہوں کہ بھائی جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا اب رونے دھونے سے مردہ تو زندہ ہونے سے رہا نہ اس کا اس میں کچھ نفع؟ تم وہ کام کرو کہ اس کو بھی نفع ہو اور تم کو بھی وہ یہ کہ قرآن لے کر بیٹھ جاؤ اور پڑھ پڑھ کر اسے بخشو نفلیں پڑھو اور ان کا ثواب اس کو بخشو اللہ اللہ کرو اور اس کا ثواب اس کو پہنچاؤ اس کے لئے دعائے مغفرت کرو اور یہ سوچو کہ وہ جنت میں گیا جہاں یہاں سے زیادہ راحت ہے اور کچھ دنوں میں ہم بھی وہیں پہنچ کر اس سے مل لیں گے حدیثوں میں یہی طریقہ بتلایا گیا ہے اور فقہاء نے بھی بے ضرورت تذکرہ کرنے سے منع کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ تین دن کے بعد بستی والے تعزیت نہ کریں ہاں باہر سے آنے والوں کو اجازت ہے۔

اصلاح بدعت

اس کا راز وہی ہے کہ زیادہ تذکرہ سے غم بڑھتا ہے اس کے متعلق نظام الدین بیرسٹر کی حکایت بڑے مزہ کی ہے واقعی انہوں نے دانائی سے کام لیا کہ ان کے والد کا انتقال ہوا تو اول تو انہوں نے اپنے معمولات کو ترک نہیں کیا جو کام جس وقت کرتے تھے سب اپنے اپنے وقت پر کرتے رہے جب کھانے کا وقت آیا باورچی سے کھانا منگایا اس نے کہا حضور میں نے تو یہ سوچ کر کہ آج والد صاحب کا انتقال ہوا ہے آپ کھانا نہ کھائیں گے کچھ نہیں پکایا کہا سبحان اللہ! وہ تو اپنی موت سے مرے تو ہم کو زندہ مارنا چاہتا ہے کچھ مختصری سزا دی اور کھانا پکوایا اس کے بعد انہوں نے والد کی تعزیت کے لئے ایک مسل بنائی اور اس کے لئے ایک میعاد مقرر کی جو شخص اس میعاد میں تعزیت کو آتا رہا اس کی باتیں سنتے رہے اور مسل میں درج

کرتے رہے ان کے یہاں ہر بات کے لئے مسل تیار ہوتی تھی جب میعاد گزر گئی تو مسل داخل دفتر کر دیا اس کے بعد کوئی شخص آیا اور تعزیت کے الفاظ شروع کئے اس کو پہلے ہی روک دیا کہ شاید آپ والد صاحب کی تعزیت کرنا چاہتے ہیں اس نے کہا ہاں! کہنے لگے کہ تعزیت کی مسل داخل دفتر ہو چکی ہے اب میں اس کو نہیں سننا چاہتا کوئی اور بات کیجئے وہ غریب اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ خیر یہ طریقہ اچھا ہو یا نہ ہو مگر اس کا منشا ضرور اچھا تھا کہ غم کا تذکرہ ہمیشہ نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کے لئے میعاد مقرر ہونا چاہیے۔ اور میعاد کے اندر بھی تعزیت اس طرح کرنا چاہیے جس سے غمزدہ کو تسلی ہو نہ یہ کہ اور غم تازہ ہو مگر بدتہذیبی کے ساتھ بھی تعزیت نہ کرے جیسے ایک صاحب نے بیٹے کی وفات پر کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا خدا آپ کو نعم البدل دے اس نے یہی جملہ یاد کر لیا پھر کسی کا باپ مرا تو آپ نے اس کو بھی اسی جملہ سے تعزیت کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نعم البدل عطا فرمائے وہ جھلا گیا کہ میری ماں کو خصم کرانے آیا ہے اسی طرح ایک اہلکار کی ماں مر گئی اس کو بہت غم تھا ایک دیہاتی آیا لوگوں سے پوچھا آدمی کیوں جمع ہیں ایک مسخرہ تھا کہنے لگا امیروں کے چوچلے ہیں میاں کی اونٹنی مر گئی اس کا ایک بکھیڑ بنا لیا کہنے لگا دیکھو میں ٹھیک کر دوں گا آپ آئے اور اس طرح تعزیت کی کہ میاں سسری مر گئی مر گئی غم کا ہے کا تو جس طرح اس نے بے تحقیق بدتہذیبی کی۔ ایسی بدتہذیبی اچھی نہیں۔ غرض صوفیہ نے تمام امراض باطنہ کے علاج کا سہل طریقہ تجویز کیا ہے جو علم اخلاق کی کتابوں میں مدون ہے۔ اخلاق میں صوفیہ نے بہت کتابیں لکھی ہیں امام غزالی کی کتابیں سب سے زیادہ اس کی حامل ہیں مگر احیاء العلوم طویل بہت ہے اب الحمدللہ انہی علوم کے طفیل سے چھوٹے رسالے چھپ گئے ہیں وہ اس کے لئے کافی ہیں یہ تو رابطوا کے متعلق بیان تھا۔

تقویٰ شرعی

آگے ارشاد ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی خدا سے ڈرو یہ تکمیل ہے مضمون سابق کی کیونکہ اگر خدا کا خوف نہ ہو تو نہ مرابطہ ہوگا نہ مشارطہ نہ معاتبہ نہ محاسبہ۔ ان سب کی بنیاد خدا کا خوف ہی ہے پس وَاتَّقُوا اللّٰهَ اس لئے بڑھایا کہ مدار ان سب اعمال کا اسی پر ہے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب تقویٰ سب اعمال کی بنیاد ہے تو پھر وَاتَّقُوا اللّٰهَ کو مقدم کرنا

چاہیے تھا۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تقویٰ شرعی مراد ہے اور تقویٰ شرعی وہ ہے کہ خوف خدا کے ساتھ عمل بھی ہو اگر عمل نہ ہو محض خوف ہی ہو وہ تقویٰ شرعی نہ ہوگا اور قاعدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ایسی عظمت ان اعمال ہی سے قلب میں پیدا ہوتی ہے پس یہ تقویٰ اعمال کا اثر ہوا اس لئے وَاتَّقُوا اللّٰهَ کو موخر کیا گیا حاصل یہ ہوا کہ ان اعمال سے جو عظمت حق تمہارے قلب میں پیدا ہوگی اس کا استحضار رکھو تو یہ اعمال سہل ہو جائیں گے پس تقویٰ ان اعمال کا نتیجہ بھی ہے اور ان کو سہل کرنے والا بھی ہے اب میں یہاں بمناسبت مقام تقویٰ کے متعلق ایک اشکال کا جواب دینا چاہتا ہوں ترجمہ دیکھنے والے ذرا اس کا حل کریں وہ یہ کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ہدایت ہے پرہیزگاروں کیلئے۔ پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں تو تحصیل حاصل ہے جو لوگ پہلے سے متقی ہیں ان کو تو ہدایت حاصل ہے پھر ان کے واسطے ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں تقویٰ لغوی مراد ہے یعنی قرآن ان لوگوں کے واسطے ہدایت ہے جن کے دل میں خدا کا خوف ہو دوسرا جواب یہ ہے کہ مان لیا کہ تقویٰ شرعی ہی مراد ہے اور یہی مدار تھا اشکال کا کہ تقویٰ شرعی کے بعد ہدایت کے کیا معنی ہدایت تو ایسے شخص کو پہلے ہی سے حاصل ہے پس اس معنی کو تسلیم کر کے دوسرا جواب دیا جا سکتا ہے ایک بار ہردوئی میں ایک مولوی صاحب کو چند جنٹلمینوں نے اس اشکال سے پریشان کر رکھا تھا اور وہ اس کو تسلیم کر رہے تھے کہ مراد تقویٰ شرعی ہی ہے مگر اشکال کو حل نہ کر سکے تھے میں بھی اس جلسہ میں آ گیا اور میں نے اسی کی تائید کی تاکہ مولوی صاحب کی بات نیچی نہ ہو مگر اس اشکال کو سہل عنوان سے حل کر دیا جس سے سامعین کا شبہ زائل ہو گیا وہ عنوان یہ تھا کہ میں نے ان سے کہا کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ایسا ہے جیسے آپ لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ کورس بی اے کا ہے۔تو آپ بتلائیے کہ اس قول کے کیا معنی ہیں کیا یہ مطلب ہے کہ اس کو وہ پڑھتا ہے جو بی اے ہو چکا کہنے لگے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ کورس ایسا ہے کہ جو اس کو پڑھ لے گا وہ بی اے ہو جائے گا میں نے کہا پس یہی مطلب اس کا ہے کہ یہ قرآن متقین کے واسطے ہدایت ہے یعنی جو اس پر عمل کرے گا وہ متقی بن جائے گا۔اس تقریر سے وہ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ اس مضمون کی تعبیر کرنا چاہتے تھے مگر قادر نہ

تھے میری تعبیر سن کران کی خوشی کی کچھ حد نہ رہی اور یہ جواب میرا گھڑا ہوا نہیں بلکہ منقول ہے جلالین میں للصائرین الی التقوی سے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے لوگ تقویٰ کے درجہ کو پہنچ جاتے ہیں مگر لوگ جلالین پڑھتے پڑھاتے تو ہیں سمجھتے نہیں ہیں۔

ترغیب فلاح

اس کے بعد ارشاد ہے لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اس میں ترغیب ہے کیونکہ سہولت عمل میں دو ہی چیزوں کو زیادہ دخل ہے ایک ترہیب کو دوسرے ترغیب کو وَاتَّقُوا اللّٰهَ میں ترعیب تھی۔ اس جملہ میں ترغیب ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے تمام اعمال مذکورہ کو سہل فرما دیا ہے اور اس کی اس واسطے ضرورت تھی کہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ سے دو طرح کا ہے ایک محکومیت کا ایک محبت کا محکومیت کا مقتضا تو یہ ہے کہ تسہیل اعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے کیونکہ خود محکوم ہونا وجوب امتثال کے لئے کافی ہے مگر محبت کا مقتضا یہ ہے کہ تمہیں کا طریقہ بھی بتلا دیا جائے کیونکہ سب میں رعایت کو مقتضی ہوتی ہے خواہ حاکم کی جانب میں محبت ہو خواہ محکوم کی جانب میں اور دونوں طرف ہو تو نور علی نور۔ پھر اس کی دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ ترغیب کے لئے اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے کسی وصف کی طرف متوجہ فرماتے مثلاً یوں فرماتے کہ میں تم سے راضی ہو جاؤں گا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم کو ہمارے وصف کی طرف متوجہ کیا جائے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے دوسری صورت اختیار فرمائی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف تو ہم سے غائب ہیں اور اپنے اوصاف کو ہم زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔

فلاح وترقی

ترغیب کے موقعہ پر یہ فرمایا کہ تم کو ان اعمال سے یہ وصف حاصل ہو جائیگا۔ زیادہ موثر ہے اس لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ امید ہے تم کو ان اعمال سے فلاح حاصل ہو جائیگی۔ اس کو ہم جلدی سمجھ لیں گے کیونکہ فلاح ہمارا وصف ہے۔ پھر یہاں فلاح مطلق ہے جو فلاح دنیا وآخرت دونوں کو شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی فلاح کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اعمال شرعیہ کا اہتمام کیا جائے مگر آج کل لیڈروں نے فلاح دنیا کے طریقے کچھ اور سوچے ہیں یہ وہ صورت اختیار کرتے

ہیں جو یورپ نے اور غیر اقوام نے اختیار کی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ تدبیریں فلاح دنیا میں موثر نہیں مگر یہ ضرور کہونگا کہ مسلمانوں کے واسطے مفید نہیں کیونکہ مسلمانوں میں ان تدابیر کی تاثیر سے ایک مانع موجود ہے وہ کیا معصیت؟ خدا کی نافرمانی۔ اور یہ مانع کفار میں نہیں کیونکہ وہ مکلّف بالفروع نہیں وہ تو صرف ایمان کے مکلّف ہیں ان کو کفر ہی کا عذاب ایسا سخت ہوگا جس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں بقیہ اعمال کی بابت نہ ان سے باز پرس ہے نہ ان پر کوئی سزا ہے اور مسلمانوں سے کفر کا عذاب تو ہٹا ہوا ہے کیونکہ بحمداللہ وہ دولت ایمان سے مشرف ہیں اسلئے ان کے اعمال پر باز پرس وگرفت ہوتی ہے جب یہ ایسے طریقے فلاح دنیا کے لئے اختیار کرتے ہیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہیں تو ان کو کامیابی نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ ان تدابیر کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں تا کہ دنیا ہی میں مخالفت کی سزا بھگت لیں پس ان کی اور کفار کی ایسی مثال ہے جیسے ٹوپی اور جوتہ کی ٹوپی میں نجاست لگ جائے تو فوراً پھینک دی جاتی ہے اور اچھی طرح پاک کرنے کے بعد اس کو استعمال کیا جاتا ہے اور جوتہ میں ناپاکی لگ جائے تو اس کو پھینکتے نہیں ہیں بلکہ رگڑ کر کام لے آتے ہیں جس طرح ہر چیز کے پاک کرنے کا طریقہ مختلف ہے اسی طرح ہر قوم کی فلاح وترقی کا طریقہ الگ ہے۔

اندھا دھند تقلید

یہ ضروری نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو نافع ہو وہ سب کو نافع ہو۔ اور اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ تدابیر ہم کو بھی نافع ہیں تب بھی ہم کو تو احکام الٰہیہ کا اتباع لازم ہے اور ان تدابیر غیر مشروعہ کا اختیار کرنا جائز نہیں۔ کیا شراب اور قمار وسود میں نفع نہیں؟ ضرور ہے خود نص میں ارشاد ہے قُلْ فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں کہ ان میں گناہ بڑا ہے اور لوگوں کیلئے (دنیوی) نفع بھی ہے۔ مگر اس نفع کو لے کر کیا کریں جس کے ساتھ خدا کا غضب بھی ملا ہوا ہے اس لئے مسلمانوں کو وہی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں جو شریعت کے موافق ہوں اس کی یہی صورت ہے کہ عمل کا اہتمام کیا جائے۔ اب لیڈر تدابیر تو خلاف شرع کرتے ہیں اور علماء کی شکایت کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ مل کر کام نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ اعمال غیر مشروعہ میں تو شرکت کر ہی نہیں سکتے اگر یہ اعمال مشروعہ بھی ہو تب بھی ان کی یہ شکایت صحیح نہ تھی کیونکہ مل کر کام کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سب کے سب ایک ہی کام کو لپٹ جائیں بلکہ اس

کے معنی یہ ہیں کہ کام تقسیم کر دیئے جائیں جیسے لوہار بڑھئی معمار مزدور سب مل کر مکان بناتے ہیں اس کے یہ معنی تھوڑا ہی ہیں کہ ہر اینٹ کو لوہار بھی ہاتھ لگائے بڑھئی بھی ہاتھ لگائے بلکہ اپنے اپنے کام کو ہر ایک الگ کر رہا ہے۔ پھر نتیجہ مجموعہ پر مرتب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر لیڈر شریعت کے موافق بھی تدابیر کریں تب بھی علماء کا یہ کام نہیں کہ وہ ان تدابیر میں عملی حصہ لیں بلکہ یہ کام عوام کا ہے یا لیڈروں کا علماء کا کام یہ ہے کہ جو تدبیر تم کرنا چاہو اول علماء سے استفتاء کر لو کہ یہ جائز بھی ہے یا نہیں وہ اس کے متعلق حکم شرعی بتلا دیں گے تم اس پر عمل کرو تمام متمدن اقوام کا یہی طریقہ ہے کہ ان کے یہاں عملی محکمہ الگ ہوتا ہے علمی محکمہ الگ ہوتا ہے یہ نہیں کیا جاتا کہ ایک کام کے لئے طلبہ اور اساتذہ بھی اپنا پڑھانا چھوڑ دیں اور سب آ کر اس کام میں لگ جائیں بلکہ یہ لوگ علمی ترقی میں بدستور لگے رہتے ہیں کام کرنے والی جماعت دوسری ہوتی ہے بہرحال اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہر قسم کی فلاح اطاعت وعمل ہی سے حاصل ہوگی دنیا میں بھی آخرت میں بھی اب چونکہ مسلمانوں نے عمل صالح کو ترک کر رکھا ہے تو دیکھ لیجئے کیسی فلاح ہو رہی ہے کہ ہر روز پہلے سے بدتر ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عمل کی تاکید بھی فرمائی ہے اور تسہیل بھی ساتھ ساتھ ہے تکمیل و تتمیم بھی ساتھ ہے پس یہ آیت عمل کے مکمل بیان کو حاصل ہے اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا تھا پھر لطف یہ ہے کہ آیت کے سب اجزاء ایک ہی شے کے متعلق ہیں یعنی عمل کے اور اسی کو دل چاہا کرتا ہے کہ ایک مجلس میں ایک ہی مضمون کا بیان ہو چنانچہ الحمدللہ اس وقت ایک ہی مضمون کے متعلق بیان ہوا ہے گو درمیان میں استطراداً دوسرے مضامین بھی آ گئے مگر وہ سب تابع تھے اصل مضمون ایک ہی تھا۔

اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو علم وعمل کا جامع بنائے اور ہمارے اعمال ظاہرہ وباطنہ کی اصلاح وتکمیل فرمائے مشائخ کی بھی اور طالبین کی بھی نیز مشائخ کو طالبین پر شفقت عطا ہو اور طالبین کو استفادہ واعتماد کی توفیق ہو اور سب کا خاتمہ بالخیر ہو آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

تم بحمد اللہ الذی بنعمتہ وجلالہ تتم الصالحات

المجاھدہ

مجاہدہ کی ضرورت کے متعلق یہ وعظ مورخہ ۲ صفر ۳۴ھ بوقت شب بعد عشاء
مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں کھڑے ہوئے بیان فرمایا
مولانا ظفر احمد صاحب نے قلمبند فرمایا حاضرین کی تعداد ۵۰۰ کے قریب تھی۔
یہ وعظ پونے تین گھنٹوں میں ختم ہوا۔

مجاہدہ کی ضرورت اور اس کا بیان کہ صرف اصلاح عقائد اصلاح عمل کیلئے کافی نہیں، بلکہ مجاہدہ کی بھی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر عمل سہل نہیں ہوتا۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّم اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ وَّھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَمَنْ جَاھَدَ فَاِنَّمَا یُجَاھِدُ لِنَفْسِہٖ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (العنکبوت آیت نمبر ۵ تا ۷)

ترجمہ:۔ جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو پس وہ اللہ تعالیٰ سے معین وقت ضرور آنے والا ہے اور جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی (نفع کیلئے) محنت کرتا ہے (ورنہ) حق تعالیٰ کو تمام جہانوں میں سے کسی کی حاجت نہیں۔ اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ہم ان کے گناہ ان سے دور کردیں گے اور ان کو زیادہ اچھا بدلہ دیں گے ان کے اعمال (ایمان وعمل صالحہ)

تمہید: اس وقت ایک ضروری مسئلہ اصلاح عمل اور طرز عمل کے متعلق بیان کرنے کا قصد ہے اور وہ مسئلہ ایسا بدیہی ہے کہ اس کے ثبوت کے لئے مشاہدہ ہی کافی دلیل ہے کسی نص کی ضرورت نہیں کیونکہ نص کی ضرورت تو اثبات احکام یا اخبار عن الغیب کے لئے ہوا کرتی ہے۔ اور جو امور مشاہدہ کے متعلق ہوں ان کے لئے مشاہدہ کے سوا اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی ہاں اگر کوئی تبرعاً دلیل بھی بیان کردے تو اس سے مدعی اور موکد ہو جائے گا چنانچہ وہ مسئلہ جو

اس وقت بیان ہوگا اسی قسم کا ہے کہ مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت و معلوم ہے مگر میں نے اس وقت حسب معمول آیات کی تلاوت تبرعا کر دی ہے کیونکہ ان آیات کو اس مسئلہ سے ایک ظاہر علاقہ ہے۔ اب وہ مسئلہ سننا چاہیے اور اس کی ضرورت بھی اس کے سننے سے معلوم ہو جائے گی کیونکہ جی یہ چاہا کرتا ہے کہ جو کچھ بیان ہو کسی ضروری مسئلہ کے متعلق ہو ورنہ یوں تو بیان کرنے کو بہت سی باتیں ہیں مگر بلا ضرورت کے لوگوں کا وقت صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

اصلاح عمل

اب غور سے سنئے کہ ہم لوگوں سے اپنے عمل کے بارہ میں ایک غلطی ہو رہی ہے جس کی تفصیل یہ ہے باب عمل میں آج کل دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں جن کو صرف اعتقاد کی درستی کا خیال ہے وہ عمل کو مہتم بالشان ہی نہیں سمجھتے اس لئے ان کو اصلاح عمل اور تکثیر اعمال کا اہتمام ہی نہیں۔ اگر یہ لوگ یوں کہتے کہ عقیدہ کا درجہ عمل سے زیادہ ہے تو ہم کو ان سے منازعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کا ہم کو بھی انکار نہیں واقعی یہ درست ہے کہ عمل کا درجہ عقیدہ سے موخرہ ہے مگر اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ عمل فضول و بیکار ہے کیا جو چیز کسی سے موخر ہو وہ بیکار ہوا کرتی ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ شاخوں کا مرتبہ جڑ سے موخر ہے مگر بایں ہمہ کوئی بھی شاخوں کو بیکار نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ درخت بارآور نہیں ہو سکتا جس کی شاخیں نہ ہوں اگرچہ اس کی جڑ کیسی ہی مضبوط ہو ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ خالی عقیدہ جس میں عمل نہ ہو بارآور نہ ہوگا مجرد عقائد سے بغیر عمل کے وہ فائدہ حاصل ہو جائیں مگر کیفیات خود مطلوب نہیں باقی جو ثمرہ شارع کے نزدیک مقصود ہے وہ بغیر اعمال کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم کو اخبار شارع سے یہی معلوم ہوا کہ بدون عقیدہ و عمل دونوں کی درستی کے ثمرہ مقصود کے حصول کا یقین نہیں ہو سکتا گو یہ ممکن ہے کہ بعض کو صرف اصل کی درستی سے بھی حاصل ہو جائے مگر بوجہ وعدہ یہ ہونے کے اس کا یقین نہیں۔ ان لوگوں نے قرآن کی صرف ایک آیت یاد کر لی ہے۔ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ کیا جاننے والے اور جو لوگ نہیں جانتے برابر ہیں۔ جس سے یہ سمجھ لیا کہ محض علم کافی ہے یعنی اصلاح عقیدہ اور یہ نہ دیکھا کہ قرآن میں بہت جگہ یہ بات بھی مصرح ہے کہ عمل کرنے

والے اور عمل نہ کرنے والے بھی برابر نہیں ہو سکتے سنئیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ یہ لوگ جو برے برے کام کرتے ہیں کیا خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جنہوں نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ ان سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے یہ بُرا حکم لگاتے ہیں۔ ایک مقام پر ارشاد ہے اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ ہاں تو کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان کے برابر کر دیں گے جو (کفر وغیرہ کر کے) دنیا میں فساد کرتے پھرتے ہیں کیا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں کے برابر کر دیں گے۔ ایک جگہ ارشاد ہے اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا یَسْتَوٗنَ تو کیا جو شخص مؤمن ہو گیا وہ اس شخص جیسا ہو جائے گا جو بے حکم ہو وہ آپس میں برابر نہیں ہو سکتے۔ بہر حال ثابت ہو گیا کہ عادۃ اللہ یہ ہے کہ دین سے جو خاص ثمرہ مطلوب ہے وہ بغیر عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک غلطی تو یہ تھی۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ بعض لوگ اعمال کی ضرورت تو سمجھتے ہیں مگر اعمال کے ساتھ کسی اور شئے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ظاہر میں ان کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے عقیدہ اور عمل دونوں کو ضروری سمجھا مگر اس میں بھی ایک نقص ہے وہ یہ کہ انہوں نے تصحیح عقائد کے بعد اصلاح اعمال اور تکمیل اعمال و مواظبت اعمال کیلئے صرف ارادہ کو کافی سمجھا حالانکہ تجربہ اور مشاہدہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اصلاح اعمال کی سہولت کے لئے ایک اور شے کی بھی ضرورت ہے اگرچہ نفس اصلاح ممکن ہے یعنی وہ امر اصلاح کا موقوف علیہ عقلاً نہیں ہے اور عادۃً اس معنی کو موقوف علیہ ہے کہ اس کے بغیر کسی طرح بھی عمل نہ ہو سکے لیکن معنی کو ضرور موقوف علیہ ہے کہ بدون اس کے عمل بسہولت نہیں ہو سکتا پس وہ سہولت میں موقوف علیہ ہے۔

صدور عمل

صدور عمل بغیر اس کے ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال ریل کی سی ہے کہ جیسے مسافت طویلہ بدون ریل کے بسہولت طے نہیں ہو سکتی اگرچہ بدقت طے ہو سکتی ہے ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ اصلاح عقائد کے بعد گو صدور عمل بتکلف بدون اس خاص شے کے ہو سکتا ہے مگر سہولت

نہیں ہوسکتا بلکہ سہولت اعمال کے لئے اس خاص شے کی ضرورت ہے مجھے اس وقت اسی کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جس کے معلوم نہ ہونے سے باب عمل میں بہت لوگ غلطی کررہے ہیں حاصل اس شے کا یہ ہے کہ صدور اعمال بعد اصلاح قائد کے گو ارادہ سے ہوسکتا ہے لیکن اس ارادہ کے کچھ معاوقات وموانع مزاحم ہوجاتے ہیں جس سے صدور اعمال دشوار ہوجاتا ہے اور اس دشوار سے بعض اوقات عدم صدور اعمال کی نوبت آ جاتی ہے تو سہولت کے لئے اس شے کی ضرورت ہوئی اس شے کے حصول کے بعد صدور اعمال بالکل سہل ہوجاتا ہے۔ اور میں اس کو تجربہ سے ثابت کرنا چاہتا ہوں ابھی آیت سے استدلال نہیں کرتا کیونکہ آیت میں دوسرے معانی بھی متحمل ہیں اس لئے اول میں تجربہ سے اس کا ثبوت دیتا ہوں پھر بعد میں تبرعاً آیات سے تائید کردوں گا۔

مجاہدہ نفس

سنیئے اس شے کا نام ہے مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس یہ بات بہت قابل قدر ہے اس کو معمولی نہ سمجھئے۔ اب تجربہ سے اس کی ضرورت کو معلوم کیجئے کہ یہ تو سب مسلمان جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور نماز پڑھنے کو بہت لوگوں کا جی بھی چاہتا ہے ترک صلوۃ سے ان کا دل بھی برا ہوتا ہے مگر پھر بھی بہت لوگ نماز نہیں پڑھتے باوجودیکہ سب کو عقیدہ فرضیت صلوۃ کا حاصل ہے۔ اسی طرح بعضے ارادہ کرکے پڑھتے بھی ہیں مگر وہ ارادہ بعض عوائق سے مضمحل ہوکر موثر نہیں رہتا اور اس وجہ سے نماز پر دوام نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صدور ودوام اعمال کے لئے صرف اصلاح عقائد یا ارادہ ضعیفہ کافی نہیں ہے بلکہ کسی اور شے کی ضرورت ہے جس کے بعد صدور ودوام ورسوخ اعمال ضروری ہے اور وہ تکمیل اعمال کا موقوف علیہ ہے اور وہ شے مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس ہے چنانچہ بے نمازی اسی واسطے بے نمازی ہے کہ وہ اپنے نفس کا اتباع کرتا ہے اور اس کو آرام دیتا ہے۔ اگر وہ مجاہدہ نفس کرتا تو بے نمازی نہ ہوتا۔ یہاں شاید کوئی یہ سوال کرلے کہ جو لوگ نماز پڑھتے وہ کون سا مجاہدہ کرتے ہیں ان کے نفس کو کون سی مشقت ہے بلکہ الٹا ہم تو یہ دیکھتے ہی کہ ان کو نماز فوت ہونے سے رنج ہوتا ہے تو فوت میں مشقت ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو مشقت تو ہے مگر شوق کی وجہ سے وہ

مشقت باقی نہیں رہی اور شوق ہی کی وجہ سے ان کو اس میں لذت آنے لگی جس کا اعلیٰ مرتبہ وہ ہے جو حدیث میں وارد ہے **جعلت قرة عینی فی الصلوة**[1] میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے اور یہ درجہ تو کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے کہ نماز سے لذت اور راحت حاصل ہو تو کم وبیش مشقت رہتی ہی ہے مگر جس کو یہ درجہ حاصل ہے اس کو بھی اول مشقت ومجاہدہ کرنا پڑا ہے پھر مجاہدہ کرتے کرتے یہ حال ہو گیا کہ مشقت مغلوب اور شوق ولذت غالب ہو گئی یہ تو خواص کی حالت ہے اور عام طور پر تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ نمازی آدمی بھی بعض دفعہ نماز میں کسل کرنے لگتے ہیں مگر حق تعالیٰ کی توفیق سے وہ کسل دور ہو جاتا ہے اور یہ توفیق عادۃ ان کے مجاہدہ پر مرتب ہوتی ہے کیونکہ ان کا ارادہ نفس کی مخالفت ہی کا ہوتا ہے نفس کی موافقت میں ترک صلوۃ کا ارادہ وہ نہیں کرتے ارادہ کے بعد ذرا وہ ہمت سے کام لیتے ہیں کہ توفیق حق شامل حال ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے حدیث میں **اسباغ الوضوء علی المکارہ** ناگواری کے موقع پر وضو کامل کرنا کا ثواب زیادہ وارد ہے اور اسی واسطے حدیث میں آیا ہے۔ **حجبت النار بالشھوات وحفت الجنة بالمکارہ**[2] کہ جہنم شہوتوں سے محجوب ہے اور بہشت مشقتوں سے گھری ہوئی ہے یعنی جیسے باغوں کے گرد کانٹوں کی باڑھ ہوتی ہے ایسے ہی جنت کے گرد مکارہ ہیں جس سے مراد اعمال شاقہ ہیں تو جو شخص جنت کے اعمال کر رہا ہے یعنی وہ اعمال جو موجب دخول جنت ہیں یقیناً وہ مکارہ کو پھاند کر آیا ہے اگر وہ مکارہ کو پھاند کر نہیں آیا تو جان لے کہ یہ رستہ جنت کا نہیں ہے بس بات یہ ہے کہ مکارہ کو پھاند کر تو آیا ہے مگر اس کے شوق اور غلبہ حال سے وہ مکارہ لذیذ ہو گئے جیسے کوئی عاشق محبوب سے ملنے کو دس پانچ کوس طے کر کے آیا ہو تو مشقت تو اس نے ضرور کی گو عشق کی وجہ سے اس کو اس میں لذت ہی آئی ہو۔ اگر ایسے نہ ہوتے تو یہ اہل جنت نہ ہوتے کیونکہ اہل جنت کی تو شان یہ ہے کہ وہ جنت میں جا کر یوں کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ان کے ساتھ غم لازم تھا گو

---

1. فتح الباری لابن حجر ۱۱:۳۴۵، کنز العمال:۱۸۹۱۲، المعجم الصغیر للطبرانی: ۱:۲۶۲
2. الصحیح للبخاری ۸:۱۲۷، مشکوۃ المصابیح: ۵۲۶۰، کنز العمال: ۶۸۰۳

جسمانی ہی تھا بہرحال وہ شبہ بالکل رفع ہوگیا کہ نمازی کون سا مجاہدہ کرتے ہیں حاصل جواب یہ ہے کہ شوق کی وجہ سے مشقت نہاں ہوجاتی ہے اور یہی خاص خاص لوگوں میں ہے ورنہ غالب طبائع میں تو شوق ومحبت کم ہے کہ الشاذ کالمعدوم اگر کوئی نمازی ایسا بھی ہو جس کو اصلا مشقت نہ ہوئی ہو اور نہ ہوتی ہو مادرزاد ولی ہو تو یہ شاذ ہے اس سے گفتگو نہیں۔ غرض غالب حالت یہی ہے کہ نماز وروزہ وغیرہ میں مشقت ہوتی ہے اور اس مشقت میں بعض اوقات مانعیت کی نوبت پہنچ جاتی ہے اور اس مشقت کی مانعیت کا علاج مجاہدہ ہے۔

اصلاح عقیدہ

پس ترتیب صحیح یہ ہے کہ اول تو عقیدہ صحیح کرے اور عقائد وعلوم صحیحہ حاصل کرے کہ اس سے اعمال کی تحریک ہوتی ہے۔ مثلاً یہ عقیدہ حاصل کیا کہ اللہ تعالیٰ خالق ورازق ہیں اس سے خدا تعالیٰ کے احسانات اپنے اوپر معلوم ہوں گے اور ذکر وفکر احسانات سے محبت واطاعت کی تحریک ہوتی ہے۔ اور یہ تحریک باعث عمل ہے مگر اس باعث کے ساتھ بعض اشیاء مانع بھی ہوتی ہیں اور وہ موانع غالباً دو ہیں ایک اسباب تنعم دوسرے ضعف نفس۔ یعنی باوجود عقیدہ صحیح ہونے کے اور تحریک طاعت پیدا ہونے کے بھی بعض دفعہ نفس ضعف وکم ہمتی کی وجہ سے یا اسباب تنعم اور سامان راحت میں منہمک ہونے کے سبب سے نماز روزہ وغیرہ سے سستی کرتا ہے۔

عقیدہ صحیحہ

بعض دفعہ نفس اپنی تسویل سے ان موانع کے ساتھ عقیدہ صحیحہ سے بھی مانعیت کا کام لیتا ہے اور یہ نہایت حیرت کا مقام ہے یعنی عقائد وعلوم صحیحہ سے تو طاعات واعمال صالحہ کی تحریک ہوتی ہے مگر نفس کبھی ایسی شرارت کرتا ہے کہ عقیدہ صحیحہ سے ترک اعمال میں کام لیتا ہے مثلاً کسی وقت گناہ کا تقاضا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا کہ گناہ سے جہنم میں جائے گا اس وقت نفس عقائد صحیحہ میں سے ایک عقیدہ سامنے کرکے پہلے عقیدہ پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے یعنی یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں اور اس عقیدہ کی اس طرح تقریر کرتا ہے کہ واقعی گناہ کرکے جہنم میں جانے کا اندیشہ ہے مگر یہ جب ہے کہ گناہ

سے توبہ نہ کی جائے اور اگر توبہ کر لی جائے تو سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور میں عزم کرتا ہوں کہ فوراً توبہ کرلوں گا اور ایک دفعہ کے بعد پھر یہ گناہ نہ کروں گا تو دیکھئے نفس کیسا شریر ہے کہ عقیدہ صحیحہ معصیت میں مدد لیتا ہے حالانکہ اس عقیدہ کی تعلیم کا حاصل صرف یہ ہے کہ جس شخص سے پہلے گناہ ہو چکے ہوں اور اب وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا چاہے تو اس کی تسلی کے لئے یہ عقیدہ بتلایا گیا ہے تا کہ گنہگاروں کی ہمت شکستہ نہ ہو اور وہ مایوس ہو کر خدا سے بے تعلقی ہی کو اپنے لئے تجویز نہ کرلیں دوسرے یہ کہ بجز انبیاء علیہم السلام کے اتقیاء وصلحاء بھی معصوم نہیں بعض دفعہ ان سے بھی جہالت کی وجہ سے خطا سرزد ہو جاتی ہے اب اگر یہ عقیدہ نہ بتلایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے تو وہ ہرگز اپنے تقویٰ وصلاح ماضی کی طرف غور وفکر کر سکتے بلکہ یہ سمجھ لیتے کہ اب تو ہم گنہگار ہو ہی چکے ہیں جہنم میں جائیں ہی گے پھر نفس کی لذات میں بھی کیوں کمی کی۔ خطا اور لغزش کے بعد اتقیا وصلحاء کو تقویٰ وصلاح کی طرف واپس لانے والا یہی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اس سے ان کو توبہ واستغفار کی ہمت ہوتی ہے اور چندروز تک بار بار توبہ واستغفار کرنے سے ان کی تسلی ہو جاتی ہے کہ ان شاء اللہ وہ گناہ معاف ہو گیا خوب سمجھ لو اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ مخالفین اسلام نے جو اس تعلیم پر اعتراض کیا ہے کہ یہ تعلیم جرائم پر جری کرنے والی ہے یہ ان کی غلطی ہے جس کا منشا قلت تدبر ہے اگر وہ غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ تعلیم نہ ہوتی تو ایک دفعہ جس سے گناہ ہو جاتا وہ عمر بھر جرائم ہی میں گرفتار رہتا ایک دفعہ یا چند دفعہ خطا ہو جانے کے بعد نیکی اور تقویٰ وصلاح کی طرف واپس لانے والا یہی عقیدہ ہے جس پر وہ اعتراض کر رہے ہیں۔ پس یہ عقیدہ تو مخلوق کے دلوں میں خدا کی محبت بڑھانے والا ہے جس سے مخلوق کو اپنے خالق سے تعلق پیدا کرنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور جرائم کو کم کرنے والا ہے اور استیصال جرائم کے لئے اس کے ساتھ دوسرا عقیدہ یہ ہے اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ کہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے اسی لئے قرآن میں جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کا ذکر ہے وہاں ساتھ ہی سطوت وشدت انتقام کا بھی ذکر ہے جس کا ایک نمونہ یہ ارشاد ہے۔ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝ اے نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم آپ میرے بندوں کو اطلاع دے دیجئے کہ میں بڑا مغفرت اور رحمت والا ہوں اور (نیز) یہ کہ میری سزا دردناک سزا ہے۔ اسی طرح کثیر مواقع ہیں (مخالفین کی فہم پر ہم کو تعجب ہے کہ وہ زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جس سے ان کا دل خود راضی نہیں وہ انصاف کے ساتھ اپنے دل کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے یقیناً وہ یہی کہے گا کہ میں ایسا پروردگار چاہتا ہوں جو رحیم و کریم ہو کہ اپنے جان نثاروں کی تقصیر و خطا سے درگذر کرتا ہو باغیوں اور دشمنوں کو سخت سزا دیتا ہو۔ یقیناً نظام عالم کا قیام ایسے ہی بادشاہ سے ہوسکتا ہے جو نہ محض سخت ہو کہ دوست بھی اس سے مطمئن نہ ہوں نہ محض نرم ہو کہ دشمن بھی بے فکر ہو جائیں جب یہ عقلی قاعدہ اور مسلم مسئلہ تو اسلام اسی کے موافق تعلیم کرتا ہے تو اعتراض کیوں کیا جاتا ہے ۱۲ جامع) غرض نفس کی شہوت وغیرہ بعض دفعہ عقائد صحیحہ سے مخالف کام لینے لگتی ہے اس لئے ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جو اس مانع کا مقابلہ کرے اور وہ مجاہدہ ہے کیونکہ ان سب موانع کا حاصل یہ ہے کہ نفس لذت و آرام چاہتا ہے والعلاج بالضد پس اس کا علاج یہی ہے کہ نفس کو مشقت و تعب کا عادی بنایا جائے۔ اور یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے اب لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو محض اصلاح عقائد کو اصلاح عمل کے لئے کافی سمجھتے ہیں انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ عقیدہ کے مزاحم بعض موانع ہوتے ہیں اس لئے ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جس سے یہ موانع دور ہوں ورنہ وہ حالت ہوگی۔

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

علمی مشقت

تو دیکھئے ایسی ضروری چیز اور لوگ اس سے بالکل غافل ہیں جو لوگ اعمال میں کوشاں بھی ہیں وہ بھی یوں چاہتے ہیں کہ بدون مشقت کے کام ہو جائے یعنی جن کو دین کا شوق بھی ہے وہ بھی مشقت سے گھبراتے ہیں تو یہ لوگ حقیقت میں طالب نہیں بلکہ ہوسناک ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ طالب دنیا کو تحصیل دنیا میں جس قدر مشقت ہوتی ہے اتنی مشقت و پریشانی دین میں نہیں ہوتی دوڑ دھوپ اور جسمانی تکالیف تو الگ رہیں طالب دنیا کو قلبی تشویش اور پریشانی بھی بہت ہوتی ہے اور طالب دین کو جسمانی مشقت بھی طالب دنیا کے

برابر ہرگز نہیں ہوتی باقی قلبی تشویش و پریشانی تو اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتی یہ اور بات ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے آخرت و جہنم کی اس کو دہشت ہوتی ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی۔ پس طالب دنیا اور طالب دین کے اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اب دونوں کی طلب کو دیکھو تو دنیا والے باوجود اس قدر دوڑ دھوپ اور پریشانی کے یوں کہتے ہیں

دست از طلب ندارم تا کام من برآید　　　یاتن رسد بہ جاناں یا جان زتن برآید

میں طلب سے اس وقت تک ہاتھ نہیں ہٹاؤں گا جب تک میری مراد نہ پوری ہو جائے یا تو بدن محبوب تک پہنچ جائے یا جان بدن سے نکل جائے۔

جب وہ دنیا کے کام میں اس قدر مشقت برداشت کرتے ہیں تو خدا کے کام میں اگر کسی کو خدا کی محبت ہے یہ درخواست کیوں ہے کہ سارا کام بدون مشقت کے ہو جائے۔

نظر بد

مثلاً بعض لوگ نظر بد کے گناہ میں مبتلا ہیں جب ان سے کہا جاتا ہے کہ نگاہ نیچی رکھو اور مت دیکھو کیوں کہ دیکھنا اختیاری امر ہے اس کا ترک بھی اختیاری ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نظر کے روکنے پر قادر نہیں مگر واللہ یہ جواب بالکل غلط ہے یہ شخص قادر ضرور ہے مگر وہ مشقت سے گھبراتا ہے اور یوں چاہتا ہے کہ بدون مشقت کے قادر ہو جاؤں اس کے نزدیک قدرت کے معنی یہی ہیں کہ بدون مشقت کے آسانی سے کام ہو جائے سو اس معنی کو واقعی قادر نہیں مگر ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی یوں چاہے کہ بدون منہ میں لقمہ دیئے کھانا کھالوں اور جب اس طرح پیٹ نہ بھرے تو کہنے لگے کہ کھانا بہت مشکل ہے ہاتھ ہلاؤ روٹی تک لے جاؤ اس کو توڑو پھر لقمہ بناؤ منہ میں دو پھر چباؤ پھر نگلو۔ اگر اسی کا نام دشواری ہے کہ کچھ بھی نہ کرنا پڑے تو واقعی نظر بد سے بچنا دشوار ہے اور تم اس کے روکنے پر قادر نہیں مگر اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے کوئی عاقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ قدرت علی العمل کے معنی یہ ہیں کہ اس میں اصلاً مشقت نہ ہو اور عجز عن العمل کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کسی قدر مشقت ہو جب یہ معنی مسلم نہیں تو وہ لوگ جو اپنے کو غض بصر سے عاجز کہتے ہیں غور کریں کہ ایسی حماقت میں مبتلا ہیں انہوں نے قدرت و عجز کی حقیقت ہی غلط سمجھ رکھی ہے ورنہ یہ لفظ کبھی زبان پر نہ لاتے کہ ہم غض بصر پر قادر نہیں۔

غرض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ بغیر مشقت کے نظر بد کو روک لیں سو قرآن میں اس کا ذمہ کہاں ہے وہاں تو مطلق حکم ہے قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ (مسلمانوں کو حکم دید یجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں) یعنی خواہ تکلیف ہو یا نہ ہو مشقت ہو یا نہ ہو کچھ پرواہ نہیں ان کو ہر حال میں غض بصر کرنا چاہیئے بلکہ اگر غور کیا جائے تو خود اس آیت کا مطلب یہی ہے کہ باوجود مشقت کے غض بصر کرنا چاہیئے۔ اور اس مشقت کو برداشت کرنا چاہیئے۔

طبعی تقاضا

یہ بات اہل علم کے سمجھنے کی ہے کہ قرآن کی تعلیم کا اکثر طرز یہ ہے کہ ممنوعات میں انہی چیزوں سے صراحۃً منع کیا گیا ہے جن سے تقاضا طبیعت انسانیہ کو خود نفرت ہے اس سے صراحۃً منع نہیں کیا گیا چنانچہ اکل ربوا سے شراب پینے سے منع کیا گیا ہے مگر پیشاب پاخانہ کھانے سے منع نہیں کیا گیا کیونکہ اس کا تقاضا تھا اس کا تقاضا نہ تھا ایک مقدمہ تو یہ ہوا اب دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ یہ ملاؤ کہ جس چیز کا تقاضا طبیعت میں ہو اس سے رکنا مشقت ودشواری کا سبب ہے یہ مقدمہ عقلی اور بدیہی ہے اب سمجھئے کہ جب قرآن میں نظر بد سے منع کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ طبائع میں اس کا تقاضا ہے اور جس کا طبیعت میں ہو اس سے روکنا سبب مشقت ہے تو آیت کا تو خود یہی مطلب ہوا کہ باوجود مشقت کے اس گناہ سے بچو مگر آجکل کے دیندار یوں چاہتے ہیں کہ بغیر مشقت کے سب کچھ ہو جائے اسی کی میں شکایت کر رہا تھا کہ یہ کیسی طلبِ دین ہے جس میں راحت کی طلب ہے حالانکہ طالب دنیا ذرا سی مردار دنیا کے لئے جان ودل سے مرتے کھپتے رہتے ہیں اور طالب دین کو بغیر مشقت کے حصول دین واصلاح اعمال کا انتظار ہو رہا ہے افسوس

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

اس راہ کا فرق تو دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے۔

بلا مشقت اصلاح

صاحبو! اگر آپ اسی انتظار میں رہیں گے کہ بدون مشقت کے اعمال کی اصلاح ہو تو یہ

شہوات نفسانیہ دل میں اپنی جڑیں ایسی مضبوط کرلیں گی کہ پھر واقعی اس کی اصلاح میں سخت مشقت کی ضرورت ہوگی کیونکہ اس شہوات سے جس قدر مسامحت و مساہلت کی جاتی ہے اسی قدر ان کی جڑیں مضبوط ہوجاتی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت لوگ اسی کے منتظر ہیں کہ کسی بزرگ کی توجہ سے ہماری اصلاح ہوجائے یا وظیفہ سے یا تعویذ سے نفس مہذب ہوجائے حاصل یہ کہ خود کچھ کرنا نہ پڑے۔ یادرکھو یہ سخت غلطی ہے نفس تمہارا راہ ماررہا ہے اور یہ شیطان کی بڑی رہ زنی ہے نفس کی اصلاح بدون مجاہدہ کے نہیں ہوسکتی توجہ اور وظیفہ سے اصلاح شدہ نفس کی اصلاح بدون مجاہدہ کے نہیں ہوسکتی توجہ اور وظیفہ سے اصلاح شدہ نفس کی نورانیت میں ترقی ہوجاتی ہے۔ آگے کو راہ مفتوح ہوجاتا ہے رذائل کی اصلاح تھوڑا ہی ہوتی ہے الا نادراً والنادر کالمعدوم اور اس سے بڑھ کر ایک نہایت دقیق اور نہایت عمیق شیطان کی رہ زنی یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ مشقت سے ترک معصیت میں کام لیتا خود معصیت کو ترک معصیت کا ذریعہ بناتا ہے یعنی جب کسی متقی کو بار بار نگاہ نیچی کرنے سے مشقت ہوتی ہے تو شیطان اس کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ میاں ایک دفعہ اس کو خوب جی بھر کر دیکھ لو اس سے ہوس پوری ہوجائے گی پھر نہ دیکھنا تو یہ روز روز کا آرہ چلنا تو موقوف ہوجائے گا مگر واللہ اس جی بھر کے گناہ کرنے سے سو اس کی رگیں اور مضبوط ہوجائیں گی۔ پھر اس کا اس گناہ سے نکلنا بہت دشوار ہوجاوے گا کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ شہوت کو نظر سے ترقی ہوتی ہے پھر جب جی بھر کے دیکھنے سے بھی آگ نہیں بجھتی تو شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ ایک دفعہ جی بھر کے اس سے منہ کالا کرلو پھر توبہ کرلینا۔ اس کے بعد پھر ہر روز یہی ہوتا رہتا ہے کہ آج توبہ کروں کل توبہ کروں ابھی جی نہیں بھرا اگر اب توبہ کرونگا تو پھر تقاضا ہوگا چنانچہ بعض تو اسی انتظار میں ختم ہوگئے اور توبہ نصیب نہ ہوئی اور بعض کو سالہا سال کے بعد عنایت حق نے سنبھالا تو توبہ کی توفیق ہوئی مگر ذخیرہ گناہوں کا کتنا جمع ہوگیا یہ تو عملی خرابی ہوئی اور اعتقادی خرابی یہ ہے کہ یہ شخص ترک معصیت کا مقدمہ خیال کرکے معصیت کو طاعت سمجھنے لگتا ہے پس یادرکھو کہ ترک معصیت کے لئے بھی معصیت کا اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں بلکہ ابتداء ہی سے اس معصیت کے تقاضے کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

درختے کہ اکنوں گرفت ست پائے　　بہ نیروی شخصے بر آیدز جائے
دگر ہمچناں روز گارے ہلی　　بگردونش از بیخ برنگسلی
سر چشمہ باید گرفتن بہ میل　　جو پرشد نہ شاید گزشتن بہ پیل

''جو درخت ابھی لگایا گیا ہو اور جڑیں کمزور ہو رہی ہوں کسی بھی آدمی کے کھینچنے سے اپنی جڑ سے اکھڑ جائے گا اگر کچھ زمانے تک چھوڑ دیا جائے تو گردوں سے بھی جڑ سے اکھڑ نہیں سکتا کسی چشمہ کی ابتداء کو سرمہ کی سلائی سے بھی بند کر سکتے ہو لیکن اگر وہ پانی سے پر ہو گیا تو ہاتھی کے گزرنے سے بھی فائدہ نہ ہو گا''

اور جو شخص ترک معصیت کے لئے اختیار معصیت کو ذریعہ بناتا ہے اس سے بھی یہی غلطی ہوئی کہ اس نے مشقت سے بچنا چاہا مگر

سخن شناس نہ دلبر اخطا اینجاست

''دوست کی خطا یہی ہے کہ تو سخن شناش نہیں''

مرد کون ہے؟

خوب سمجھ لو کہ مشقت سے بچنا ہی غلطی ہے۔ مرد ہو کر رہو نامرد نہ بنو۔ اور مرد اسی کا نام ہے جو شیطان کا مقابلہ کرے پھر گناہوں سے بچنے میں مشقت اول اول ہی ہوتی ہے پھر ذرا مشقت نہیں ہوتی جو اس سے بھی گھبراتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ گلستاں پڑھنے سے گھبرائے اس کو سب عقلاً بھی جواب دیتے ہیں کہ یہ مشقت چندروزہ ہے پھر تم کو گلستاں میں وہ لطف آئے گا کہ تم اس کو خود نہ چھوڑو گے اور اگر آج ذراسی مشقت سے گھبراؤ گے تو پھر جاہل رہو گے اور اس سے زیادہ مشقت کرنا پڑے گی یعنی پھاوڑہ چلانا پڑے گا۔ اسی طرح گناہ کے چھوڑنے میں جو ذراسی مشقت ہے اگر اس سے گھبراؤ گے تو اس سے بڑھ کر مشقت کا سامنا ہو گا ایک تو اس وقت جبکہ گناہ کا ارتکاب کرو گے کیونکہ گناہ کرنے میں علاوہ عذاب آخرت کے دنیا میں بھی عذاب ہوتا ہے گناہ سے دونوں جہان میں تکلیف ہوتی ہے۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ گناہ کرنے میں کیا مشقت ہے تو صاحب! واللہ جو لوگ گناہوں میں مبتلا ہیں وہ سخت مصیبت میں گرفتار ہیں سکون قلب واطمینان کا ان کو خواب بھی نہیں آتا

ہر وقت ان کا دل وحشت زدہ رہتا ہے اور گناہ کر کے اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا کہیں ٹھکانا نہیں وہ خود اپنی نظر میں بہت ذلیل ہو جاتا ہے اور جب اس کو کوئی مصیبت پیش آ جاتی ہے اس وقت تو اس کو ایسی پریشانی ہوتی ہے کہ بدحواس ہو جاتا ہے تو واللہ گناہ کرنے والے بڑی غلطی میں ہیں کہ گناہ سے جو غرض تھی یعنی مسرت وہ بھی ان کو حاصل نہیں ہوتی یہ تو دنیا کی تکلیف ہے اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے جو بہت سخت ہے مگر بعض لوگ سیر بھر بوجھ اٹھانے کا تجربہ کر کے من بوجھ اٹھانے کو تیار ہو جاتے ہیں یہ ان کی حماقت ہے ان کی یہ پہلوانی اسی وقت تک ہے جب تک کئی من کا بوجھ سر پر رکھا نہیں گیا جس دن بڑا بوجھ سر پر رکھا جائیگا ان کا کوبچ ہی نکل جائیگا ایسے ہی بعض لوگ جہنم کے پہلوان معلوم ہوتے ہیں مگر اسکو دیکھا نہیں اسلئے ساری پہلوانی ہے اور جس دن دیکھ لیں گے اس دن یہ حالت ہوگی۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ۞ يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ۞ لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ۗ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنسَانِ خَذُولًا

علاج امراض باطنہ

بس امراض باطنہ کے بھی علاج کا وہی طریقہ ہے جو امراض جسمانیہ کا ہے کہ جب مرض لاحق ہو اسی وقت اس سے دور رہنے اور بچنے کی تدبیر کرو اور اس کو لپٹانے کا بھی نام نہ لو اور گو گناہ سے بچنے میں کسی قدر مشقت ہوتی ہے مگر وہ تھوڑی دیر کی مشقت ہے پھر راحت ہی راحت ہوگی مثلاً کسی کو حسن پرستی کا مرض ہو تو اس کو چاہیے کہ حسین سے باتیں کرنا ملنا بلانا اس کو گھورنا بالکل چھوڑ دے کہ یہ سخت مضر ہے گو اس وقت ٹھنڈک پہنچتی ہے مگر اس کے بعد جڑ مضبوط ہو جاتی ہے اور عمر بھر کی مصیبت جان کو لگ جاتی ہے چونکہ اس وقت مجھے زیادہ تر فروع ہی کا بیان مدنظر ہے اس لئے چند فروع مجاہدہ کی اور بھی بیان کرتا ہوں مثلاً غضب کے روکنے میں بعض وقت تکلیف ہوتی ہے اور یہ مجاہدہ ہے مگر اس کے بعد ایک خاص فرحت وراحت ہوتی ہے اور اگر غصہ کو نہ روکا گیا بلکہ جو زبان پر آیا کہتا گیا تو اس وقت تو نفس خوش ہوتا ہے مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد دل میں کدورت ہوتی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہی نفس جو پہلے بہکا رہا تھا بعد میں ملامت کرتا ہے اور اس کے بعد غصہ کے نتائج بد دیکھ کر تو

بہت ہی قلق ہوتی ہے گو نفس ان کی تاویلات بھی کرے مگر پھر بھی اس کو کدورت ضرور ہوتی ہے تجربہ کر کے دیکھا گیا کہ غصہ روکنا ہمیشہ اچھا ہوا اور جب اس کو جاری کیا گیا تو اس کا انجام ہمیشہ برا ہوا اور دل کو قلق بھی ہمیشہ ہوا جیسے مریض کو طبیب کہتا ہے کہ پرہیز کرو دوا پیو تو اس کو بد پرہیزی سے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے کیونکہ بد پرہیزی کا برا انجام بہت دنوں تک رہتا ہے اسی طرح گناہ کر کے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ گناہ کے بعد نفس خود اپنے کو ملامت نہ کرے پھر بعضے اس ندامت کے بعد ہمیشہ کے لئے گناہ سے توبہ کر لیتے ہیں اور بعضے ایک بار توبہ کر کے پھر گناہ کرتے ہیں توبہ کرتے ہیں تو یہ تو دل لگی ہوئی اگرچہ یہ ثابت ہے کہ توبہ اگر سو بار بھی ٹوٹ جائے تب بھی قبول ہو جاتی ہے مگر یہ شرط تو ضروری ہے کہ توبہ کی حقیقت تو پائی جائے مگر اکثر حالت تو یہ ہے کہ جو لوگ ایک گناہ سے بار بار توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ صرف زبانی ہوتی ہے ورنہ عین توبہ کے وقت بھی ان کا یہ عزم ہوتا ہے کہ یہ گناہ پھر بھی کریں گے میں اسی کو دل لگی کہہ رہا ہوں۔ اس لئے جب کوئی شخص اعمال صالحہ کا قصد کرے یا اصلاح نفس کا ارادہ کرے تو وہ اپنے کو اس کام کے لئے پہلے تیار کر لے کہ اول اول مشقت برداشت کرنا اور نفس کی مخالفت کرنا پڑے گی پھر مجاہدہ و مخالفت نفس کے مراتب مختلف ہیں ایک مرتبہ مبتدی کے مجاہدہ کا ہے ایک منتہی کے مجاہدہ کا ہے۔ مبتدی کو تو مجاہدہ میں اول اول دشواری زیادہ ہوتی ہے اور منتہی چونکہ اپنے نفس کو مہذب کر چکا ہے اس سے اعمال صالحہ بلا تکلف صادر ہونے لگتے ہیں۔

نگرانی نفس

مگر ایک مجاہدہ کی ان کو بھی ضرورت ہے یعنی نفس کی نگہداشت کی کہ ہر وقت اس کے افعال وحرکات پر نگاہ رکھے غافل نہ ہو اور یہ مجاہدہ کچھ زیادہ دشوار نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو وہ سوار ہے جس کے نیچے ایسا گھوڑا ہے جس پر ابھی سواری شروع کی گئی ہے اس کو زیادہ ہوشیاری کی بھی ضرورت ہے اور زیادہ مشقت کا بھی سامنا ہے کیونکہ نیا گھوڑا بہت شرارت کرتا ہے اور قابو سے باہر ہو جاتا ہے دوسرا وہ شخص ہے جو ایسے گھوڑے پر سوار ہے جو سواری میں شائستہ ہو چکا ہے اس کو زیادہ مشقت کا تو سامنا نہیں مگر ہوشیار بیٹھنے کی اس کو بھی ضرورت ہے کیونکہ شائستہ

گھوڑا بھی کبھی کبھی بمقتضائے حیوانیت شوخی کرنے لگتا ہے مگر وہ شوخی ایسی ہوتی ہے کہ سوار کی ذرا سی دھمکی اس کے دفع کرنے کو کافی ہے لیکن اگر سوار بالکل غافل رہا تو کسی وقت یہ شائستہ گھوڑے کے اوپر سے بھی ضرور گرے گا۔ پس نفس کی نگہداشت کا مجاہدہ منتہی کو بھی لازم ہے۔

فطرت نفس

اب یہاں سے میں سالکین کی ایک غلطی پر تنبیہ کرتا ہوں وہ یہ کہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ بعض دفعہ مہذب نفس بھی شوخی شرارت کرنے لگتا ہے سو بعض لوگوں کو یہ حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے نفس میں کوئی برا میلان دیکھ کر بڑے گھبراتے ہیں کیونکہ ان کے ذہن میں یہ جم گیا ہے کہ مجاہدہ سے اخلاق رذیلہ بالکل زائل ہو جاتے ہیں اور منشا اس خیال کا یہ ہے کہ اکثر وسط طریق میں وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ تقاضائے معاصی گویا بالکل نہیں رہا حالانکہ اخلاق طبعیہ مجاہدہ سے زائل نہیں ہوتے بلکہ مغلوب و مضمحل ہو جاتے ہیں اور اکثر سلوک کے وسط میں غلبہ حالات و کیفیات کی وجہ سے بہت زیادہ مغلوب و مضمحل ہو جاتے ہیں اس طرح کو زائل معلوم ہونے لگتے ہیں پھر انتہا میں جب غلبہ حالات کم ہو جاتا ہے اور تمکین حاصل ہوتی ہے تو اخلاق طبعیہ پھر ابھرتے ہیں اس وقت سالک گھبراتا ہے اور رنج کرتا ہے کہ افسوس ہنوز روز اول ہی ہے میرا تو سارا مجاہدہ ہی بیکار گیا نفس تو اسی حالت میں ہے جس حالت میں پہلے تھا اور یہ رنج اس لئے مضر ہے کہ اس کے اس رنج و غم سے شیطان کو راہ ملتا ہے کہ وہ اس کو تعطل کی طرف لے جاتا ہے اور اس حالت میں اس شخص میں شکستگی بھی بے حد ہو جاتی ہے کہ بات بات میں کہتا ہے کہ میں کسی قابل نہیں ہوں اور ظاہر میں تو یہ تواضع ہے مگر اس میں رنگ شکایت کا ہے۔ گویا خدا تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو بھلا کر یہ سمجھتا ہے کہ جب میرے اندر گناہ کا تقاضا موجود ہے تو اب میرے پاس کوئی نعمت نہیں حالانکہ یہ سخت ناشکری ہے پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ شخص اپنی تمام ریاضات گذشتہ کو یاد کر کے اپنے دل میں یوں کہتا ہے کہ میں بڑا بدقسمت ہوں کہ اتنی محنت کے بعد بھی مجھے ناکامی ہی رہی بس اب میرے واسطے کیا رہا کچھ نہیں۔ اور بعض اوقات یہ شخص اپنی کامیابی سے مایوس ہو کر نفس کو

بالکل آزادی دے دیتا ہے کہ جب مجاہدات کے بعد یہی ناکامی ہی ہے تو نفس کو مصیبت میں کیوں ڈالا یہ شخص اس غلطی میں اس لئے مبتلا ہوا کہ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں مجاہدہ کر کے تقاضائے گناہ سے بھی معصوم ہوگیا اور اب میرے اندر سے اخلاق رذیلہ بالکل نکل گئے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کشاکشی ہمیشہ رہتی ہے ہاں مبتدی جیسی نہیں رہتی اس لئے میں کہتا ہوں کہ اعمال صالحہ کا جب قصد کرے تو اول ہی سے نفس کو یہ سمجھا لے کہ ان اعمال میں مشقت ہمیشہ رہے گی اور عمر بھر مجاہدہ کرنا ہوگا اور یہاں سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ شیخ کتنی بڑی نعمت ہے کہ وہ کیسے کیسے عقبات سے سالک کو نکالتا ہے اور اس کا عقبات سے نکالنا یہی ہے کہ وہ حقائق صحیحہ پر مطلع کرتا اور غلط اعتقادات سے بچاتا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

گر ہوائے ایں سفر داریؔ دلا　　دامن رہبر بگیر وپس برآ
بے رفیقے ہرکہ شددر راہ عشق　　عمر بگذشت ونشد آگاہ عشق

''اگر اس سفرِ عشق پر روانہ ہونے کی خواہش رکھتا ہے تو مرشد کا دامن پکڑ لے اور آجا بلا مرشد کے جس نے طریق عشق میں قدم رکھا اس نے عمر ضائع کی ہے اور عشق سے آگاہ نہ ہوا''

اور فرماتے ہیں۔

صد ہزاران دام ودانہ ست اے خدا　　ماچو مرغان حریص بے نوا
بے عنایات حق وخاصان حق　　گر ملک باشدسیہ ہستش ورق

''اے خدا لاکھوں دام اور دانے والے موجود ہیں اور ہماری حالت مرغان حریص کی ہے بغیر حق سبحانہ تعالیٰ اور خاصان حق کی مہربانی کے اگر فرشتہ بھی ہوگا تو اس کا نامہ اعمال سیاہ رہے گا''

خدا کے خاص بندوں کی کسی پر عنایت ہو جائے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ بہر حال خوب سمجھ لو کہ اعمال صالحہ میں مشقت ہمیشہ رہتی ہے کیونکہ وہ اعمال نفس کی خواہش کے خلاف ہیں نفس ان میں منازعت ضرور کرتا ہے قلیل یا کثیر اس لئے مخالفت نفس کی عمر بھر ضرورت ہے اور یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے۔

کسل نماز

یہاں سے بعض واعظین کی غلطی معلوم ہوگئی کہ وہ آیت یعنی وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ

قَامُوْا کُسَالٰی. اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کو مسلمانوں کے حق میں پڑھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو نماز میں کسل کرے وہ منافق ہے بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو قرآن کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ کسل کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ عمل میں مشقت کا سامنا ہو مگر عقیدہ میں ضعف یا شک نہ ہو تو وہ کسل نہیں ہے جو منافقین کی شان تھی یہ تو کسل طبعی ہے اور طبعی کسل اعمال شرعیہ میں مخلصین کو بھی ہوسکتا ہے کیونکہ یہ اعمال نفس پر گراں ہیں نفس ان میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے اور اعمال شرعیہ میں مشقت کا سامنا ہونا آیت وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ. اور تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔ کے خلاف نہیں کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین فی نفسہ آسان ہے دشوار نہیں یہ اور بات ہے کہ منازعت نفس کی وجہ سے اس میں دشواری آجائے کیونکہ یہ ضرور ہے کہ اعمال شرعیہ میں نفس کی خواہشوں کو پامال کیا جاتا اور اس کی مخالفت کی جاتی ہے اور یہ نفس کو ضرور گراں ہے تو اس منازعت و کشاکشی کی وجہ سے دشواری آجانا یسر فی نفسہ کے خلاف نہیں اسی لئے قرآن میں وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ. اور تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔ سے پہلے وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ دین میں مجاہدہ کی بھی ضرورت ہے پس ایک جزو ہی کو مت دیکھو دونوں جزوں کو ملاؤ تو حاصل وہی نکلے گا جو میں نے عرض کیا ہے۔

کسل کی قسمیں

اب سنئیے ایک تو طبعی کسل ہے جس کا منشا منازعت نفس ہے یہ منافقین کے ساتھ خاص نہیں اور دوسری اعتقادی کسل ہے کہ اس شخص کو نماز کی فرضیت پر اور خدا اور رسولؐ پر ہی ایمان نہیں ہے محض کسی مصلحت کی وجہ سے نماز پڑھ رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دل سے نہ پڑھے گا بلکہ بے گارسی ٹالے گا اور کسل کے ساتھ نماز ادا کرے گا یہ کسل منافقین کی شان ہے اور خدا نہ کرے کہ کسی مسلمان کی شان ہو۔ بہر حال اعمال شرعیہ میں مجاہدہ کی ضرورت عمر بھر کے لئے ہے مبتدی کو بھی اور منتہی کو بھی اور دونوں کو کبھی نہ کبھی اعمال میں منازعت نفس کی وجہ سے کسل بھی پیش آتا ہے مبتدی کو زیادہ منتہی کو کم اس کسل ہی کے رفع کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے

نیز کسی وقت دونوں کا نفس معاصی کا تقاضا کرتا ہے اس کے مقابلہ کے لئے بھی مجاہدہ کی دونوں کو ضرورت ہے۔ تو ایک غلطی تو مبتدی کرتا ہے کہ وہ اپنے کو مشقت سے بچانا چاہتا ہے اور مجاہدہ کرتا ہی نہیں بلکہ اسی انتظار میں ہے کہ سارا کام بدون مشقت کے ہو جائے اور ایک غلطی منتہی کرتا ہے کہ وہ ابتداء میں مجاہدہ کر کے آئندہ کے لئے مجاہدہ سے اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے اور یہ سخت غلطی ہے کیونکہ طبائع بشریہ پھر عود کرتے ہیں اور اس وقت منتہی کو بھی معاصی کا تقاضا ہوتا ہے اور اس کا نفس بھی طاعات میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے اس وقت اس کو بھی مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے مگر مبتدی اور منتہی کے مجاہدہ میں بڑا فرق ہے جس کی مثال اوپر گذر چکی ہے کہ جیسے ایک شخص تو شائستہ گھوڑے پر سوار ہو اور ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس پر آج ہی سواری کی گئی ہے شائستہ گھوڑے کے سوار کو بھی ہوشیار بیٹھنے کی ضرورت ہے کیونکہ شائستہ گھوڑا بھی کبھی شوخی شرارت کرنے لگتا ہے مگر اس کے دبانے میں اس قدر مشقت نہیں ہوتی جس قدر نئے گھوڑے کے دبانے میں ہوتی ہے اس لئے منتہی کا اپنے گذشتہ مجاہدہ وریاضت کو بیکار و بے سود سمجھنا بھی غلط ہے اور آئندہ کے لئے بھی وہ مجاہدہ سے مستغنی نہیں اور اعمال صالحہ کا کرنا کسی وقت بھی مشقت سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ فروع میں اس کی ایک اور مثال یاد آئی مثلاً کسی شخص کے اندر کبر ہے تو اس کے دو علاج ہیں ایک علمی اور ایک عملی۔ علاج تو مثلاً یہ ہے کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور یوں سمجھے کہ مجھے اپنے عیوب کا یقین کے ساتھ علم ہے اور دوسروں کے عیوب کا ظن کے ساتھ علم ہے اور جو شخص یقینی معیوب ہو وہ معیوب ظنی سے بدتر ہے اس لئے مجھے اپنے کو سب سے کم تر سمجھنا چاہیے اور عملی علاج یہ ہے کہ جس کو تم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہو اس کے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آ ؤ اور یہ عملی علاج جزو اعظم ہے بدوں اس کے علمی علاج تنہا کافی نہیں مگر اس کا بجالانا دشوار ضرور ہے۔ ہر شخص سے آسان نہیں مگر تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جب تک یہ عملی علاج نہ کیا جائے گا تکبر دور نہ ہوگا۔ ایسے ہی حسد کا علاج یہ ہے کہ جس سے حسد ہو اس کے لئے ترقی خیر کی خوب دعا کیا کرے اور اس کے ساتھ احسان بھی کرتا رہے چند دن میں حسد دور ہو جائے گا مگر یہ بات آسان نہیں گو فی نفسہ یہ سب اعمال آسان ہیں مگر نفس کی منازعت کی وجہ سے دشوار ہو رہے ہیں۔ مگر ان میں دشواری اوّل اوّل ہی ہے کیونکہ نفس کی کشاکشی ابتدا میں زیادہ ہوتی ہے پھر زیادہ منازعت نہیں رہتی مگر ایک

دومرتبہ عملی علاج کر کے بے فکر نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کو مدت دراز تک جس کو شیخ محقق تجویز کرے کرنا چاہیے کیونکہ ایک دودفعہ سے مرض کی جڑ نہیں جاتی اسی کوایک عارف فرماتے ہیں۔

صوفی نشود صافی تادر نکشد جامے بسیار سفر باید تاپختہ شود خامے

صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

غرض یہ طریقہ ہے اعمال کااور باطن کی اصلاح کا کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے اور اس کو مشقت کا عادی بنایا جائے مگر آج کل لوگوں سے مشقت تو ہوتی نہیں یوں چاہتے ہیں کہ ہمارے آرام میں بھی خلل نہ آوے اور اعمال کی بھی اصلاح ہوجائے باطن کی بھی اصلاح ہوجائے۔

اصلاح نفس

ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے ایسا وظیفہ بتلادو جس سے نماز قضا نہ ہو میں نے کہا کہ اگر وظیفہ قضا ہونے لگا تو اس کے واسطے دوسرا وظیفہ پڑھو گے پھر اس کے واسطے تیسرا یہ تو سلسلہ غیر متناہی چلے گا اس کا علاج تو یہ ہے کہ جس دن نماز قضا ہو اس دن بھوکے رہو یا ۴، ۸ صدقہ کرواور یہ صدقہ نہ تو اتنا زیادہ ہو جس کا تحمل نہ ہو نہ اتنا کم ہو جس کی نفس کو خبر بھی نہ ہو بلکہ درمیانی درجہ کا ہو جس سے نفس پر کسی قدر گرانی ہو اور اس سے کہہ دو کہ جب تو نماز قضا کرے گا میں تجھ کو یہی سزا دوں گا۔ اور یہ علاج میں نے یا صوفیہ نے اپنی طرف سے اختراع نہیں کیا بلکہ نصوص سنت میں اس کی اصل موجود ہے حدیث میں ہے **من قال تعال اقا مرک فلیتصدق** یعنی جس کی زبان سے یہ کلمہ نکل جائے کہ آ ؤجوا کھیلیں وہ صدقہ کرے اسی طرح حیض کے زمانہ میں غلطی سے جماع ہوجائے تو وہاں بھی صدقہ کا حکم ہے ابتدائے حیض میں ایک دینار اور آخر میں نصف دینار۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ صدقہ کرنے سے نفس پر زیادہ مشقت پڑتی ہے وہ اس سے بچنے کے لئے تھوڑی مشقت کو برداشت کر لیتا ہے اور یہ کام اس سے چھوٹ جاتے ہیں تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مواقع کے لئے کوئی وظیفہ نہیں بتلایا بلکہ ایسا علاج بتلایا جس میں نفس کو مشقت ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصلاح نفس کا طریقہ مجاہدہ ہی سے وظیفوں سے اصل نہیں ہوا کرتی۔ شاید طلبہ کو یہاں یہ شبہ ہو کہ امام ابو

حنیفہ تو غرامت مالیہ کو ناجائز فرماتے ہیں پھر تم یہ جرمانہ کیونکر بتلاتے ہو۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اپنے اوپر جرمانہ کرنا جائز ہے دوسروں پر جائز نہیں اور ہم یہی تو تعلیم کرتے ہیں کہ جب عمل میں کوتاہی ہو تم خود اپنے اوپر جرمانہ کیا کرو یہ تو نہیں کہتے کہ مریدوں سے کوتاہی ہو تو ان پر جرمانہ کر کے تم وصول کیا کرو اگر کوئی شیخ ایسا کرے تو بے شک ناجائز کا مرتکب ہوگا۔

فضولیات مستورات

یہ تو وہ امراض تھے جو مردوں اور عورتوں میں مشترک تھے اب میں بعض ان امراض کا علاج بتلاتا ہوں جو مستورات کے ساتھ خاص ہیں کیونکہ اس وقت مستورات کا مجمع بھی موجود ہے سو مستورات میں ایک مرض یہ ہے کہ جب چند عورتیں جمع ہونگی تو ہمیشہ دنیا کی باتیں کریں گی مرد کبھی جمع ہوتے ہیں تو کبھی خدا اور رسول کی باتیں بھی کر لیتے ہیں مگر عورتوں کے مجمع میں خدا اور رسول کی باتیں کبھی سننے میں نہیں آتیں بلکہ ان کی تمام تر گفتگو زیور کپڑے روپے پیسے کے متعلق ہوتی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان میں زیور کی محبت اور لباس کی محبت زیادہ ہے اس کا علاج یہ ہے کہ زیور کا استعمال کم کر دیا جائے یہ مطلب نہیں کہ اپنے گھر میں استعمال کم کر دو کیونکہ اپنے گھر میں تو عموماً عورتیں زیور پہنتی ہی نہیں اور لباس بھی معمولی ہی پہنتی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کسی دوسرے کے جاؤ تو زیور کم پہن کر جاؤ اور لباس بھی معمولی پہن کر جاؤ باقی سارے زیور کو اور قیمتی جوڑوں کو اپنے گھر میں پہنو کیونکہ شریعت نے عورتوں کو چاندی سونے کا زیور اور ریشم کا کپڑا صرف اسی لئے حلال کیا ہے تا کہ وہ شوہر کے سامنے اس سے زینت کر سکیں تو ان کے استعمال کا اصلی محل اپنا ہی گھر ہے مگر اب عورتوں نے اس تعلیم کے خلاف یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ شوہر کے سامنے تو معمولی حالت میں رہیں گے اور دوسرے گھر بن ٹھن کر جائیں گی تو یہ عمل خلاف شریعت بھی ہے اور اس سے زیور ولباس کی محبت بھی بڑھتی ہے اس لئے عورتوں کو شریعت کی اصل تعلیم پر عمل کرنا چاہیے کہ اپنے گھر میں سب زیور لباس پہنا کریں اور دوسرے گھر میں معمولی زیور ولباس پہن کر جایا کریں اس سے زیور ولباس کی محبت ان کے دل سے کم ہو جاؤ گے گی اور سب سے بڑا مجاہدہ یہ ہے کہ شادی اور دوسری تقریبات کے موقعہ پر سادے کپڑے اور سادا زیور پہن کر جایا کریں۔ اصلاح تو اسی طرح

ہوگی بغیر اس کے کتابیں پڑھنے اور وعظ سننے سے کچھ نہ ہوگا۔ رہا یہ کہ یہ تو بہت دشوار ہے دل پر آرا چل جائے گا کہ بھری برادری میں سب تو اچھے زیور عمدہ لباس سے آئیں اور ہم سادے لباس معمولی زیور میں ہوں تو صاحب! دنیا کا بھی تو کوئی کام بدون محنت کے نہیں ہوتا اے اللہ دینداری ایسی سستی کیوں ہے کہ لوگ دیندار بدون محنت کے بننا چاہتے ہیں۔

ناز پروردہ تنعم نہ بر دراہ بدوست عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد

ناز ونعمت میں پلا ہوا مشقت کی راہ میں ہمراہ نہیں رہ سکتا عاشقی تو مصائب سہنے والے رندوں کا شیوہ ہے۔

میرا یہ مطلب بھی نہیں کہ اتنی محنت کرو جس سے نفس تھک جائے بعض اہل مجاہدہ ایسے بھی ہیں چنانچہ ہمارے ساتھ سفر حج میں جہاز میں ایک شخص تھے وہ کئی کئی دن تک کچھ نہ کھاتے اور جب کھانے بیٹھتے تو کئی دن کی خوراک ایک ہی وقت میں کھا جاتے لوگوں نے ان سے کہا کہ یہ کیا واہیات ہے کہ ایک وقت میں تم کئی دن کی خوراک کھا جاتے ہو کہا میں مجاہدہ کرتا ہوں کیونکہ مجاہدہ کی ایک قسم تو ترک اکل ہے اور ایک قسم اکثار اکل یہی ہے کہ اتنا کھائے کہ نفس پریشان ہو جائے کیونکہ مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان کرنا ہے اور وہ جس طرح ترک طعام سے پریشان ہوتا ہے بہت کھانے سے بھی پریشان ہوتا ہے سو یہ قول غلط ہے مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے بلکہ نفس کو مشقت کا خوگر بنانا اور راحت وتنعم کی عادت سے نکالنا ہے اور اس کے لئے اتنا مجاہدہ کافی ہے جس سے نفس پر کسی قدر مشقت پڑے بہت زیادہ نفس کو پریشان کرنا اچھا نہیں ورنہ وہ بالکل معطل ہو جائے گا تو خوب سمجھ لو کہ محنت ہمیشہ مستحسن نہیں بلکہ جب اعتدال سے ہو اور اس پر نتیجہ اچھا مرتب ہو۔ اس پر مجھے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ یاد آیا کہ آپ نے ایک مدرس کو مدرسہ سے الگ کرنا چاہا اور مہتمم صاحب نے ان کی سفارش کی کہ یہ محنتی بہت ہیں تو مولانا نے فرمایا کہ اگر محنت ہی مطلوب ہے تو مجھے چالیس روپے تنخواہ دے کر مدرس اول کیوں بنایا بلکہ ایک پسنہاری کو چکی دے کر درسگاہ میں بٹھلا دو وہ مجھ سے زیادہ محنت کرے گی اور مزدوری صرف دو آنہ لیگی۔ پس مجاہدہ میں افراط بھی مذموم ہے بلکہ اعتدال کی رعایت لازم ہے اسی کو شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

نہ چنداں بخور کز دہانت برآید — نہ چنداں کہ از ضعف جانت برآید

نہ اتنا زیادہ کھاؤ کہ منہ سے باہر نکلنے لگے نہ اتنا کم کھاؤ کہ کمزوری سے جان نکلنے لگے

اعتدال مجاہدہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا یعنی خدا کے خاص بندے وہ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ وہ خرچ کے درمیان میں معتدل ہوتا ہے پس مجاہدہ میں بھی اعتدال کی رعایت کرنا چاہیے۔ مگر اس اعتدال کو بھی آپ اپنی رائے سے تجویز نہ کیجئے کیونکہ بیمار کی رائے بیمار ہوتی ہے اس طریق میں اپنی رائے سے کامیابی نہیں ہوتی۔

فکر خود ورائے خود رز عالم رندی نیست — کفر ست دریں مذہب خود بینی وخود رائی

''اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس راہ میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے''

بلکہ کسی محقق سے درجہ اعتدال معلوم کیجئے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں علمائے قوانین ظاہرہ وباطنہ پیدا کئے ہیں ان سے رجوع کرو اور ان سے طریق مجاہدہ معلوم کرو۔ پھر جیسے طالبان عمل میں دو فرقے ہیں ایک وہ جو محنت سے بچنا چاہتے ہیں دوسرے وہ جو محنت میں غلو کرتے ہیں اسی طرح طالبان علم میں بھی دو فرقے ہیں ایک وہ جو یوں چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا بھی نہ پڑے اور عالم ہو جائیں اس کی ترکیب انہوں نے یہ نکالی کہ مدرسہ میں داخل ہو کر کسی جماعت میں شریک ہو گئے اور کبھی کبھی درس میں بھی شریک ہو گئے پھر دس دن بارہ دن کو غائب ہو گئے نہ مطالعہ ہے نہ تکرار ہے نہ سبق کے وقت توجہ ہے۔ جماعت نے کتاب ختم کر لی تو ان کی بھی ختم ہو گئی وہ درسیات سے فارغ ہو گئی تو یہ بھی فارغ کہلانے لگے گو واقع میں بالکل ہی فارغ ہوں یعنی کورے تو یاد رکھو اس طرح علم نہیں آیا کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسوں ہی کے واسطے فرمایا ہے۔

لوکان ہذا العلم یدرک بالمنی — ماکان یبقی فی البریۃ جاہل

فاجہد ولاتکسل ولاتک غافلا — فندامۃ العقبیٰ لمن یتکاسل

''اگر یہ علم صرف تمنا سے حاصل ہوتا تو دنیا میں کوئی جاہل باقی نہ رہتا پس محنت کر اور سستی نہ کر اور نہ غفلت کر کیونکہ جو سستی کرتا ہے انجام کار اسے ندامت حاصل ہوتی ہے۔''

اور بعضے محنت میں افراط کرتے ہیں کہ اتنی محنت کرتے ہیں کہ دماغ بھی خراب ہو جائے۔ افراط وتفریط دونوں برے ہیں۔ شریعت کو ہر شے میں اعتدال مطلوب ہے، اہل مجاہدہ کا ایک افراط یہ بھی ہے کہ بعضے تقلیل غذا میں غلو کرتے ہیں بعضے ہاتھ کو سکھاتے ہیں۔ بعضے لباس نہیں پہنتے بلکہ آگ سلگا کر سردی گذارتے ہیں۔ یہ وہ مجاہدے ہیں جو آجکل جوگیوں میں رائج ہیں اور غضب یہ ہے کہ بعضے مسلمان بھی ان مجاہدات کو کمال اور جوگیوں کو باکمال سمجھتے اور ان کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ کچھ کمال نہیں کیونکہ بدن کو مارنے سے کیا ہوتا ہے مطلوب تو وہ مشقت ہے، جس سے نفس پر مشقت ہو یہ ضرور ہے کہ مشقت نفس میں بعض دفعہ مشقت جسم کو بھی دخل ہوتا ہے مگر اس میں اعتدال ضروری ہے۔ مثلاً اگر روزہ رکھ لیا جائے اعتکاف کر لیا جائے بس یہ مشقت کافی ہے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ صاحبو! جس طرح طبیب دوا تجویز کر کے اس کی مقدار بھی خود ہی تجویز کرتا ہے اسی طرح آپ کو مجاہدہ کی مقدار بھی شریعت ہی سے معلوم کرنا چاہیے جبکہ اصل مجاہدہ کو آپ نے شریعت ہی سے معلوم کیا ہے

مخالفت نفس

اب یہاں ایک بات اور سمجھئے کہ مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں ایک مجاہدہ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی کیا جائے مثلاً نوافل کی تکثیر سے نماز کا عادی کرنا اور روزہ کی کثرت سے حرص طعام وغیرہ کم کرنا اور ایک مجاہدہ بمعنی مخالفت نفس ہے کہ جس وقت نفس معصیت پر داعی ہو اس وقت اس کے تقاضے کی مخالفت کرنا اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے اور پہلا مجاہدہ بھی اسی کی تحصیل کے واسطے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہوگا تو اس کو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہوگی۔ لیکن اگر کسی کو بدون مجاہدہ جسمانیہ کی مخالفت نفس پر قدرت ہو جائے تو اس کو مجاہدہ جسمانیہ کی ضرورت نہیں مگر ایسے لوگ شاذ و نادر ہیں اسی واسطے صوفیہ نے مجاہدہ جسمانیہ کا بھی اہتمام کیا ہے اور ان کے نزدیک اسی کے چار ارکان ہیں ترک طعام، ترک کلام، ترک منام، وترک اختلاط مع الانام اور ترک سے مراد تقلیل ہے ترک کلی مراد نہیں۔ جو شخص ان ارکان اربعہ کا عادی ہو جائے گا واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائے گا کہ تقاضائے معصیت کو ضبط کر سکے گا مگر

میرا مقصود اس وقت مجاہدہ جسمانیہ کا بیان کرنا نہیں ہے بلکہ مجاہدہ نفسانی کا بیان مقصود ہے کہ گناہ کے وقت نفس کو روکو اور اس میں جو مشقت لاحق ہوتی ہے اس کو برداشت کرنا چاہیے کیونکہ بدون مشقت کے کوئی کام نہیں ہوسکتا نہ دنیا کا نہ دین کا۔ یہ ہے وہ مسئلہ جس کی ضرورت تھی اور لوگ اس سے غافل ہیں یعنی مخالفت نفس کہ جب نفس گناہ کا تقاضا کرے اس کی مخالفت کرو۔ اور یہ بات اس وقت آپ کو حاصل ہوگی جبکہ نفس کی جائز خواہشوں کی بھی مخالفت کیا کرو۔ مثلاً کسی لذیذ چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش کو پورا نہ کیا جائے بلکہ اس کی درخواست کو رد کر دیا جائے دس دفعہ میں سے ایک دفعہ اس کی جائز خواہش پوری کر دی اور نو دفعہ ٹال دی جب مباحات میں تم مخالفت نفس کے عادی ہو گے اس وقت معاصی کے تقاضے کی مخالفت پر آسانی سے قادر ہو گئے اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکل آزاد رکھتا ہے وہ بعض اوقات تقاضائے معصیت کے وقت اس کو نہیں دبا سکتا تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے یہاں سے معلوم ہوا کہ صوفیہ نے جو ارکان اربعہ مجاہدہ کے تجویز کئے ہیں اس میں انہوں نے ابتداع نہیں کیا اول تو احادیث میں غور کرنے سے ہر رکن کی اصل مل سکتی ہے دوسرے انہوں نے تسہیل مخالفت نفس عند ارادۃ المعصیۃ کے لئے یہ نوع مجاہدہ کی بطور تدبیر کے تجویز کی ہے تدبیر میں نصوص کی بھی حاجت نہیں البتہ نصوص کے خلاف نہ ہونا چاہیے خلاصہ یہ کہ لوگوں نے جو یہ سمجھ لیا ہے کہ دین کے کاموں میں مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں غلط ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ دین سارا مجاہدہ ہی ہے کیونکہ دین نام ہے۔ پابندی کا اور پابندی نفس کو گراں ہے۔ پس بدون مجاہدہ کے دین کامل نہیں ہوسکتا۔

رجاء وامکان

اب میں اس مسئلہ کو ان آیات پر منطبق کرنا چاہتا ہوں جو میں نے شروع میں تلاوت کی ہیں۔ میں نے تین آیتیں تلاوت کی ہیں ایک مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یہ آیت راجع الی العقیدہ ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں تو اللہ کا وہ وقت معین ضرور آنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ (ان کے اقوال کو) خوب سنتے اور (ان کے افعال واحوال کو) خوب جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے

کہ اوپر بعض مسلمانوں کو جو کفار کی ایذاء سے گھبراتے ہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ان کو صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائیگا کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی حالانکہ ہم ان سے پہلے مسلمانوں کو بھی آزمائش سے پرکھ چکے ہیں اس کے بعد جملہ معترضہ کے طور پر کفار کو یہ مضمون سنایا گیا ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ وہ ہم سے بچ کر بھاگ جائیں گے سو ان کی یہ تجویز بہت بیہودہ ہے اس جملہ معترضہ کفار کی تنبیہ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک گونہ تسلی بھی کر دی گئی کہ کفار کی یہ ایذائیں چندروزہ ہیں پھر ہم ان کو اچھی طرح پکڑنے والے ہیں اس کے بعد پھر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں ان کو تو ایسے واقعات سے پریشان نہ ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کا وہ وقت مقرر ضرور آنے والا ہے (اس وقت سارا غم غلط ہو جائے گا) اور اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں (تو وہ ان کی باتوں کو سنتے اور کاموں کو جانتے ہیں اس وقت ان کی طاعات قولیہ اور طاعات فعلیہ سب کا اجر دے کر ان کو خوش کریں گے) اس آیت میں رجاء سے مراد اعتقاد جازم ہے مگر اس میں ایک لطیفہ ہے جس کی وجہ سے اعتقاد کو بعنوان رجاء بیان فرمایا وہ یہ کہ آیت مکی ہے جس کے مخاطب کفار بھی ہیں جو قیامت کے معتقد نہ تھے منکر تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آیت کو رجاء و امکان سے شروع فرمایا جس سے کفار کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ استحالہ کی تو اس میں کوئی بات ہی نہیں اور جب ممکن ہے تو ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کو لقاء اللہ کا امکان بھی معلوم ہو۔

ہم اس کو بتلاتے ہیں کہ اس کا وقوع بھی ضرور ہونے والا ہے پس ہماری خبر کے بعد اس کے وقوع میں شک نہ کرنا چاہیے۔

صفات خداوندی

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اور وہ سننے والے (دلوں کا حال) جاننے والے ہیں۔ یہ صفات یہاں بہت ہی مناسب ہیں کیونکہ ایمان کے دو جزو ہیں ایک تصدیق بالقلب دوسرے اقرار باللسان کیونکہ قدرت کے وقت اقرار باللسان بھی فرض ہے تو ایمان کے بیان میں ان صفات کا ذکر بہت ہی خوشنما ہے تاکہ بندوں کو اطمینان ہو جائے کہ ہمارا ایمان خدا تعالیٰ سے مخفی نہیں رہ سکتا ان کو ضرور اس کا

علم ہوتا ہے تصدیق قلبی کو بھی جانتے ہیں اور اقرار لسانی کو بھی سنتے ہیں یہ آیت تو باب العقائد کے متعلق تھی۔ اس کے بعد دوسری منزل مجاہدہ ہے جو تصحیح عقائد سے موخر ہے اور تکمیل اعمال سے مقدم ہے یعنی اعمال کی تحریک تو عقائد ہی سے ہو جاتی ہے مگر تکمیل اور رسوخ مجاہدہ سے ہوتا ہے اس کا ذکر دوسری آیت میں ہے وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ یعنی جو شخص کچھ محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی واسطے محنت کرتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ تمام اہل عالم سے بے نیاز ہے (اسکو کسی کی محنت ومجاہدہ کی ضرورت نہیں) میرا مقصود اس جگہ یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اول عقائد کا ذکر فرمایا پھر مجاہدہ کا ذکر اعمال کے ذکر سے جو آئندہ تیسری آیت میں آتا ہے پہلے فرمایا اس کے کچھ تو معنی ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں اور کوئی وجہ ہو میرے ذہن میں اس کی وجہ یہ آئی ہے کہ اس ترتیب سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ عقائد مذکورہ آیت اولیٰ کے صدور اعمال مذکورہ آیت ثالثہ ہیں موثر ضرور ہیں مگر وہ تاثیر بلا واسطہ کمزور ہوتی ہے اور بواسطہ مجاہدہ کے قوی ہو جاتی ہے اسلئے مجاہدہ کے توسط بین العقائد والاعمال ظاہر کرنے کیلئے یہ ترتیب اختیار کی گئی ہے۔

نصیحت ناصح

اب آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی مجاہدہ کرتا ہے وہ اپنے واسطے مجاہدہ کرتا ہے یہ جملہ اس واسطے فرمایا کہ نصیحت کا اثر کامل ہو کیونکہ جب نصیحت میں ناصح کی کوئی غرض ہوتی ہے اثر کم ہوتا ہے اور دنیا میں بے غرض نصیحت کرنے والا بجز انبیاء علیہم السلام کے کوئی نہیں مگر انبیاء کی نصیحت تو خدا ہی کی نصیحت ہے وہ تو محض مبلغ سفیر ہیں باقی سب کی کچھ نہ کچھ غرض ہوتی ہے اسی لئے امام غزالی نے لکھا ہے کہ جیسا شاگرد کو استاد کا ممنون ہونا چاہیے۔ ایسا ہی استاد کو بھی شاگردوں کا ممنون ہونا چاہیے کیونکہ شاگرد اگر نہ ہوتے تو استاد کے علوم میں ترقی نہ ہوتی کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ بہت سے علوم استاد کے قلب پر درس کے وقت القا ہوتے ہیں اور یہ شاگرد کی کشش سے ہوتا ہے جیسے بچہ ماں کے پستان چوستا ہے تو دودھ اتر آتا ہے اگر بچہ دودھ پینا چھوڑ دے تو چار دن میں اس کے پستان خشک ہو جائیں۔ اسی طرح ترقی فی

العلوم میں شاگردوں کا استاد پر احسان ہے۔ پس دنیا میں جس پر بھی کوئی احسان کرتا ہے محسن الیہ کی طرف سے بھی اس پر کوئی نہ کوئی احسان ضرور ہے۔ بجز حضرت حق کے کہ ان کو کوئی کچھ نفع نہیں پہنچا سکتا نہ ان کے افعال معلل بالاغراض ہیں وہ جس پر جو احسان کرتے ہیں بالکل بے غرض اور سراسر عنایت و کرم ہی ہے مولانا فرماتے ہیں۔

من نکردم خلق تا سودے کنم　　بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

میں نے مخلوق کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ ان سے نفع حاصل کرو بلکہ اس لئے پیدا کرلیا کہ انہیں اپنی نعمتوں سے نوازوں۔

اسی لئے یہاں فَاِنَّمَا یُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ بڑھایا گیا تا کہ نصیحت کا اثر کامل ہوجائے کہ ہم کو تمہارے اعمال و مجاہدات سے ذرا بھی نفع نہیں جو کچھ نفع ہے سراسر تمہارا ہی ہے پھر مجاہدہ کر کے اپنی ہی ذات پر احسان کرو کسی دوسرے پر احسان نہ کرو اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ بیشک اللہ تعالیٰ کی ذات اہل عالم سے بے نیاز ہے یہ لفظ ہمارے محاورہ میں خدا تعالیٰ کے متعلق چند مقام پر استعمال کیا جاتا ہے بعض جگہ اس کا استعمال بری طرح کیا جاتا ہے اس سے احتراز کرنا چاہیے یعنی جب کوئی جوان موت ہوجاتی ہے جو چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر گیا ہو تو اس وقت برادری والے تعزیت کو جمع ہوتے ہیں اور میت کی موت کا ذکر ہوتا ہے تو ایک کہتا ہے ہائے ہائے کیسا جوان تھا جوانی چڑھ رہی تھی دوسرا کہتا ہے اجی ابھی اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا عمر نے وفا نہ کی تیسرا کہتا ہے کہ کیسی بے وقت موت ہوئی بچے کیسے ذرا ذرا سے چھوڑ گیا ان کی پرورش کی بڑی دقت ہوگئی چوتھے بوجھ بجھکڑ سب کے جواب میں کہتے ہیں میاں اس کی ذات بڑی بے نیاز ہے وہ بے پرواذات اس موقع پر اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ نعوذ باللہ نعوذ باللہ کارخانہ خداوندی میں بڑا اندھیرا ہے مصالح عباد پر مطلق نظر نہیں بس جو جی میں آیا کر دیا جو چاہا حکم دیدیا تو خدائی کیا ہوئی اودھ کی سلطنت یا ان نیا ونگر کا راج ہو سو یہ کلمہ اس موقع پر تو بہت سخت ہے اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ خدا کو کسی پر رحم نہیں حالانکہ قرآن خدا کی رحمت کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ غرض یہ معنی میں نے اس لئے بیان کر دیئے تا کہ کوئی آیت میں لفظ غنی کو اس معنی پر محمول نہ کرے بلکہ قرآن میں غنی کو دو معنی میں استعمال کیا گیا ہے ایک یہ کہ خدا کو تمہارے عمل صالح سے کوئی نفع نہیں یہاں

یہی معنی ہیں دوسرے یہ کہ خدا کا تمہارے کفر و معاصی سے کچھ ضرر نہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ کہ اگر تم کفر کرو تو خدا تعالیٰ کو اس سے ضرر نہ ہوگا۔ تیسری آیت اعمال کے متعلق ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ہم ان کے گناہ ان سے دور کر دیں گے اور ان کے اعمال کا اچھا بدلہ دیں گے۔ یہاں ایمان کا مکرر ذکر اس لئے فرمایا تا کہ معلوم ہو جائے کہ عمل بدون ایمان مقبول نہیں۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرما دیں گے یعنی جہنم سے ان کو نجات دیں گے اور ان کو جزاء حسن دیں گے میرا مقصود جو کچھ تھا وہ بحمد اللہ حاصل ہو گیا کہ ایمان و عمل صالح مقصود اصلی ہے اور مجاہدہ اسی کی تکمیل کے واسطے ہے کہ بدون مجاہدہ کے عمل صالح علی سبیل الکمال حاصل نہیں ہوتا چنانچہ برادری کی رسمیں بھی لوگوں سے اسی واسطے نہیں چھوٹتی ہیں کہ وہ مجاہدہ سے کام نہیں لیتے۔ رسوم قدیمہ کے چھوڑنے میں نفس کو کلفت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اگر نفس مجاہدہ کا عادی ہو تو اس سے گھبرائے گا نہیں نہ ذلت کی پرواہ کرے گا نہ کسی کے طعن کی پروا کرے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ذلت اور طعن کی پروا کرنا محض اس وجہ سے ہے کہ دین کی وقعت نہیں یا دیندار بننے کی خواہش نہیں کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ جس چیز کی وقعت انسان کی نظر میں ہو یا اس سے محبت ہو تو اس کی تحصیل میں ذلت و طعن کی ہرگز پرواہ نہیں۔ چنانچہ بہت سے شرفاء کو آپ دیکھیں گے کہ وہ بازاری عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں کیا اس سے برادری میں ان کی ذلت نہیں ہوتی یا لوگ طعن نہیں کرتے مگر چونکہ اس کو اس سے محبت ہے اس لئے کسی کی بات کی پرواہ نہیں کرتا اسی طرح بعض لوگ اپنی لڑکی کو ایسے لڑکے سے بیاہ دیتے ہیں جو ذات میں یا نسب میں کم ہے مگر مالدار بہت بڑا ہے اس موقعہ پر بھی برادری کی طرف سے بہت کچھ لعنت ملامت ہوتی ہے مگر نفع کے سامنے کسی بات کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اے اللہ! دین ہی اس واسطے رہ گیا ہے کہ یہاں ہر مانع کی پرواہ کی جاتی ہے کوئی کہتا ہے کہ اس میں چھوڑنے میں ذلت ہے کوئی کہتا ہے کہ برادری طعن دے گی کہ خرچ کرتے ہوئے جان نکلتی تھی اس لئے شریعت کی آڑ لے لی کوئی کہے گا کہ ان کو دوسروں کے یہاں کھانا

ہی آتا ہے کھلانا نہیں آتا میں تسلیم کرتا ہوں کہ برادری سب کچھ کہے گی لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ سب باتوں میں برادری کے کہنے کی پرواہ نہیں کی جاتی بعض لوگ کسی غریب کی زمین یا گھر کا کوئی حصہ دبا لیتے ہیں برادری تو وہاں بھی برا بھلا کہتی ہے کوئی چماری سے یا لونڈوں سے منہ کالا کرتا ہے وہاں بھی تو لوگ اس کو ذلیل کرتے اور گلی کوچوں میں برا بھلا کہتے پھرتے ہیں اگر تم برادری کی باتوں کو ایسا ہی ماننے والے ہو تو براہ کرم ان باتوں میں بھی برادری کی طعن وملامت کی پرواہ کرلیا کرو۔ کچھ نہیں تو محض بہانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا خود اس میں کرنے کو جی چاہتا ہے اگر تمہارا جی نہ چاہتا تو تم کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے جیسا دوسرے کاموں میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ پھر جو لوگ برادری کی ملامت کا بہانہ کرتے ہیں ان کے واسطے ٹھیک اور جواب ہے وہ یہ کہ جیسے تمہاری دنیا کی ایک برادری ہے دین کی بھی ایک برادری ہے یعنی علماء وصلحاء، ہم نے مانا کہ اس میں چھوڑنے میں دنیا کی برادری تم کو برا کہے گی مگر دینی برادری تم کو اچھا کہے گی اور شاباشی دے گی اور تمہارے حق میں دعا کرے گی اور اس سے بڑھ کر ایک اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہونگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کتنی بڑی چیز ہے افسوس خدا کے مقابلہ میں برادری کی رضا مندی کی پرواہ کرنا کتنی سخت بات ہے یہ تو وہی بات ہوئی جو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی حالت کے متعلق فرمائی تھی قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ حضرت شعیب علیہ السلام نے جواب میں فرمایا اے میری قوم کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک (نعوذ باللہ) اللہ سے بھی زیادہ باتوقیر ہے۔ اور اس کو (اللہ تعالیٰ) تم نے پس پشت ڈال دیا ہے یقیناً میرا رب تمہارے سب اعمال کو (اپنے علم میں) احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بعض لوگ آپس میں نااتفاقی رکھتے ہیں اور مصالحت نہیں کرتے وہ بھی اسی واسطے کہ مشقت سے گھبراتے ہیں اگر وہ نفس کو مجاہدہ کا عادی کر لیتے تو کسی کو ایک دوسرے سے معافی چاہنے میں پس وپیش نہ ہوتا گو معافی چاہنا ابتداء بہت مشکل ہے مگر جو شخص مجاہدہ سے نفس کو پامال کر چکتا ہے اس کے لئے ایک بھنگی سے بھی معافی چاہنا دشوار نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ آجکل جو لوگ نفاق واتحاد کا لکچر دیتے ہیں یہ کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی

ہے کہ یہ لکچرار بھی اور لکچر سننے والے بھی اول مجاہدہ سے نفس کی اصلاح کریں بدون اس کے ہرگز اتفاق واتحاد قائم نہیں ہوسکتا چنانچہ اگر اس لکچرار ہی کی رائے سے کوئی دوسرا شخص کسی میں مخالفت ظاہر کردے تو یہ اتحاد واتفاق کا سب لکچر بھول جائیں گے اور دوسرے شخص کی مخالفت وتذلیل وتحقیر کے درپے ہوجائیں گے پھر دونوں میں ایسی بری طرح مخالفت چلتی ہے کہ اخبار کے کالم کے کالم دونوں کی طرف سے گالیوں میں بھرے ہوئے شائع ہوتے ہیں جس سے دونوں کی تہذیب اور اتفاق واتحاد واتفاق کے لئے تقریریں تو کرتے ہیں مگر اس کی جڑ کو کوئی مضبوط نہیں کرتا اتحاد واتفاق کی جڑ تواضع ہے۔ متکبرین میں کبھی اتفاق نہیں ہوسکتا اگر ہوگا تو اسی طرح کہ ایک شخص اپنے تکبر کو چھوڑ کر تواضع اختیار کرے۔ سبحان اللہ! یہ معقول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور یہ ایسے حجرہ نشین کا مقولہ ہے جس نے سیاسی میدان میں قدم بھی نہیں رکھا مگر واللہ سب سیاست داں ان کے سامنے بچے ہیں کوئی شخص بھی اتحاد واتفاق کے لئے اس سے بہتر نسخہ نہیں بتلاسکتا پس اتحاد واتفاق کی جڑ تواضع ہے۔

تواضع کی اصل

تواضع کی اصل مجاہدہ نفس ہے کیونکہ تواضع اس کا نام نہیں کہ زبان سے اپنے کو خاکسار نیاز مند ذرہ بے مقدار کہہ دیا بلکہ تواضع یہ ہے کہ اگر کوئی تم کو واقعی ذرہ بے مقدار اور خاکسار سمجھ کر برا بھلا کہے اور حقیر وذلیل کرے تو تم کو انتقام کا جوش پیدا نہ ہو اور نفس کو یوں سمجھا لو کہ واقعی تو تو ایسا ہی ہے پھر برا کیوں مانتا ہے اور اگر کسی کی برائی سے کچھ رنج واثر بھی نہ ہو تو یہ تواضع کا اعلیٰ درجہ ہے کہ مدح وذم برابر ہوجائے مطلب یہ کہ عقلاً برابر ہوجائے کیونکہ طبعاً تو مساوات نہیں ہوسکتی ہاں کوئی مغلوب الحال ہو تو اور بات ہے اسی طرح طلبہ اور مدرسین میں ایک مرض ہے کہ اپنی غلطی کا کبھی اقرار نہیں کرتے اگر کوئی بات زبان سے غلط نکل جائے یا کتاب کے کسی مقام کی غلط تقریر ہوجائے اور کوئی طالب علم اس کی صحیح تقریر کرے تو مدرس اس کو ہرگز تسلیم نہ کرے گا جہاں تک ممکن ہوگا اپنی بات کو بنانے کی کوشش کرے گا اس کا منشا بھی یہی ہے کہ یہ شخص نفس کو مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا مشقت سے بچانا چاہتا ہے کیونکہ غلطی کا اقرار کر لینا نفس پر بہت گراں ہے اور گرانی کی وجہ یہ ہے کہ نفس اس کو سبب ذلت سمجھتا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ بخدا اقرار خطا سے اور عزت بڑھ جاتی ہے ہم نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو

بارہا دیکھا ہے کہ جب درس کے وقت کتاب کے کسی مقام شبہ ہوجاتا تو کتاب ہاتھ میں لے کر اپنے ماتحت مدرس کے پاس چلے جاتے اور فرماتے کہ مجھے اس مقام پر شرح صدر نہیں ہوا ذرا آپ اس کی تقریر فرمادیں بھلا مدرس اول ہو کہ ماتحت مدرس سے ایسی درخواست کرنا کوئی معمولی بات تھی بہت بڑی بات تھی مگر کیا اس سے نعوذ باللہ مولانا کی عزت ووقعت کم ہوگئی بخدا ہر گز نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ ہوگئی چنانچہ آج یہ بات مولانا کے محاسن میں بیان ہورہی ہے اور ان کے دیکھنے والے آج ان صورتوں کو ترستے ہیں کہ ہائے وہ لوگ کہاں گئے جن کو باوجود کمال کے اپنے نقص کے اقرار میں ذرا بھی پس وپیش نہ تھا اور اب ایسا زمانہ آ گیا کہ ناقصوں کو بھی اپنے نقص کے اقرار سے عار ہے۔ بلکہ وہ اپنے لئے کمال کے مدعی ہیں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بھی عادت تھی کہ درس کے وقت اگر کسی مقام کی تقریر میں آپ سے لغزش ہوجاتی اور کوئی ادنیٰ طالب علم پھر عرض کر دیتا کہ حضرت اس مقام کا مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے تو مولانا فوراً اس کی بات کو ہاں کر کے صاف فرمادیتے کہ میں نے غلطی کی صحیح مطلب وہ ہے جو تم نے بیان کیا پھر ایک دفعہ پر بس نہ ہوتا تھا بلکہ بار بار اس جملہ کو دہراتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی میں نے غلط مطلب بیان کیا تھا۔ وہ طالب علم شرمندہ ہوجاتا کہ میں نے ناحق تقریر کی مگر مولانا اپنی غلطی کے اقرار سے نہ رکتے تھے اور واللہ اس سے مولانا کی عزت ومحبت وعظمت پہلے سے زیادہ بڑھتی تھی پس نفس کا یہ خیال غلط ہے کہ اقرار خطا سے ذلت ہوتی ہے اور بالفرض اگر ذلت ہوتی بھی ہے تو کیا تم کوئی کام ذلت کا نہیں کرتے ہو اگر ایسا ہی ذلت سے بچنا ہے تو کسی شخص کے مکان سے طلبہ کھانا بھی نہ لایا کریں اور کوئی مولوی صاحب چندہ کے واسطے بھی نہ جایا کریں کیا اس میں ذلت نہیں ہوتی بخدا جب مولوی چندہ کے لئے دورہ کرتے ہیں عوام اس کو بہت ذلت سے دیکھتے ہیں خصوصاً جس چندہ میں خطاب خاص ہو اس میں تو بہت ہی ذلت ہوتی ہے اور دوسرے پر جبر بھی ہوتا ہے اسی لئے مجھے ایسے چندہ کے جواز میں کلام ہے۔ جو خطاب خاص سے وصول کیا جاتا ہے مگر طلبہ وعلماء اس کے جواز کی کوشش کرتے ہیں اور ذلت کی پرواہ نہیں کرتے پھر اقرار خطا ہی میں ذلت کی پراوہ کیوں ہے بس وجہ یہ ہے کہ چندہ وغیرہ میں گو ذلت ہے مگر روپیہ تو ملتا ہے اور اقرار خطا میں روپیہ نہیں ملتا سو آپ تو اہل علم ہیں آپ کی نظر نفع عاجل پر نہ ہونا چاہیے بلکہ نفع آجل پر ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ اقرار خطا میں خدا کی رضا ضرور ہے حدیث میں من ترک الجدال والمراء بنی له بیت فی الجنة او کما قال جس شخص نے لڑائی جھگڑا ترک کر دیا اس کا گھر

جنت میں بنایا گیا۔ اور کہاں تک فروع بیان کروں آپ غور کر کے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم جتنے گناہوں میں مبتلا ہیں سب کی اصل یہ ہے کہ ہم نفس کو مشقت سے بچانا چاہتے ہیں اور جتنے اوامر کو ہم ترک کر رہے ہیں اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے۔

مستقل مجاہدہ

پس معلوم ہوا کہ اصلاح اعمال نفس کا مدار عادی مجاہدہ پر ہے اسی مسئلہ کو بتلانے کے واسطے اس وقت یہ بیان اختیار کیا تھا جو الحمدللہ بقدر ضرورت بیان ہو گیا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ شانہ گناہوں کے چھوڑنے کی ہم کو ہمت عطا فرمائیں کہ یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے پھر اس پر دو کامیابیاں مرتب ہونگی ایک تو بڑی کامیابی خود گناہوں کا چھوٹ جانا ہے کیونکہ جرائم کا نہ ہونا یا کم ہونا بھی بڑی کامیابی ہے دوسرے رزق میں وسعت ہوگی کیونکہ اعمال صالحہ کو اور گناہوں کے چھوڑنے کو رزق کی وسعت میں بہت بڑا دخل ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی تو ہم نے بھی ان کے اعمال (بد) کی وجہ سے انہیں پکڑ لیا۔ اسی طرح معاصی کو تنگی رزق و نزول بلا میں بڑا دخل ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس قوم میں سود کی کثرت ہوگی اللہ تعالیٰ اس پر قحط مسلط کر دیں گے اور جس قوم میں زنا کی کثرت ہوگی اس پر طاعون وغیرہ ایسے امراض مسلط ہونگے جو پہلے لوگوں نے دیکھے بھی نہ تھے پس مجاہدہ میں ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی کامیابی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ دینی اور دنیوی اور تمدنی اور سیاسی تمام مصالح کی بنیاد اور جڑ یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کی مخالفت کا عادی بنے اور نفس کو مشقت کا عادی بنائے اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق شامل حال ہو۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ
وبارک وسلم واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین.

ل سنن الترمذی: ۱۹۹۳، اتحاف السادة المتقین ۹: ۲۶ بلفظ آخر

آج کل عام طور پر اہل سلوک سہولت کے طالب ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنی قوت اختیاریہ سے کام لینا نہیں چاہتے، اور اس امانت الٰہیہ کو برباد کرتے ہیں۔ بس تم خود سہولت کے طالب نہ بنو بلکہ اختیار سے کام لو۔

التحصیل و التسهیل
مع التکمیل والتعدیل

اہل سلوک کے متعلق یہ وعظ ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ بروز آخری جمعہ
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔
پونے چار گھنٹوں میں ختم ہوا۔ حاضرین کی تعداد ۳۰۰ کے قریب تھی۔
مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ
وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ
فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ
وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ
وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ
اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ
اَنْفُسِھِمْ کَمَثَلِ جَنَّتٍ بِرَبْوَۃٍ اَصَابَھَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُکُلَھَا ضِعْفَیْنِ فَاِنْ لَّمْ
یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ. (البقرہ آیت نمبر ۲۶۵)

ترجمہ: (اوران لوگوں کے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان میں پختگی پیدا کریں۔ مثل حالت اس باغ کے ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو کہ اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ دونا (چوگنا) پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کو کافی ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں۔)

تمہید: جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے غالباً موقعہ و وقت کے لحاظ سے وہ سامعین کو غیر مرتبط معلوم ہوئی ہوگی کیونکہ اس میں احکام رمضان کا پتہ بھی نہیں مگر مجھے جزئیات سے زیادہ کلیات کا اہتمام ہے کیونکہ کلیات سننے میں کم آتے ہیں اور جزئیات کو اکثر لوگ بیان کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے کلیات جامع بھی ہوتے ہیں' جزئیات کو اوران کا یاد رکھنا بہت سے جزئیات کو یاد رکھنے سے مغنی ہوتا ہے اس وجہ سے میں نے اس وقت ایک مضمون کلی

اختیار کیا ہے جو کلیت وعموم کی وجہ سے احکام رمضان کو بھی شامل ہے چنانچہ تقریر سے معلوم ہو جائے گا کہ اس مضمون کو ہر عمل سے تعلق ہے اور روایات حدیثیہ کو بھی ملا لیا جائے تو اس آیت کا تعلق احکام رمضان سے اور زیادہ معلوم ہوگا نہ اس لیے کہ اس میں انفاق کا ثواب مذکور ہے اور رمضان میں انفاق کا ثواب زیادہ ہوتا ہے بلکہ دوسری وجہ سے جس کو میں آخر بیان کروں گا گو انفاق کو بھی اس مہینہ سے خاص خصوصیت ہے اور یہ بھی رمضان کے ساتھ اس آیت کی مناسبت کی وجہ ہو سکتی ہے اس لیے حدیث میں اس کو شہر المواساۃ (ہمدردی کا مہینہ) کہا گیا ہے جس کا استعمال اکثر اعانت مالیہ میں ہوتا ہے۔

رمضان وحسنات

اس مہینہ میں باہم ایک دوسرے سے ہمدردی کرنا چاہیے۔ نیز اس مہینہ میں تضاعف حسنات ہوتا ہے جو انفاق وصلوۃ سب کو عام ہے تو ایک تعلق عام اس آیت کا رمضان سے یہ بھی ہے یعنی اس مہینہ میں فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ہے اور نفل کا ثواب فرض کے برابر ہے مگر اس تضاعف حسنات کے معاملہ میں لوگ ایک غلطی میں مبتلا ہیں جس کو میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے مگر شاید بعض لوگ اس وقت حاضر نہ ہوں اس لیے دوبارہ بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض حضرات نے یہ سن کر رمضان میں تضاعف حسنات ہوتا ہے اس سے یہ اثر لیا کہ رمضان کے لیے طاعات صدقہ کو ملتوی اور مؤخر کرنے لگے، زکوٰۃ تو عموماً اسی مہینہ میں ادا کی جاتی ہے گو وجوب زکوٰۃ اس سے پہلے ہو گیا ہو اور اس کے سوا بھی دیگر صدقات کو اس ماہ پر موقوف رکھا جاتا ہے یہ غلطی ہے جس کا منشاء مقصد نصوص سے بعد ہے اور مقصد نصوص کا سمجھ لینا ہی فقہ ہے جس کی فضیلت حدیث میں یوں آئی ہے۔ "مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ" (جس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ بھلائی چاہتے ہیں اسے دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں) جس کی بنا پر علماء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت حق کیا ہے بجز فقیہ کے کہ اس کو معلوم ہے کہ خدا نے اس کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا ہے بوجہ اس حدیث کے تو یہ فضیلت محض اس بات سے حاصل نہیں ہوئی کہ حدیث وقرآن کا ترجمہ لیا جائے اور کچھ علمی نکات بیان کر دیئے جائیں بلکہ یہ فضیلت اس سے حاصل ہوتی

ہے کہ شارع کا مقصد سمجھ لیا جائے اسی کا نام فقہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جس میں ہمارے اکابر سلف ممتاز تھے۔ گو وسعت نظر میں متاخرین بڑھے ہوئے ہیں مگر عمق نظر میں متقدمین بدرجہا افضل ہیں یہاں تک کہ صحابہ کی نظر سب سے زیادہ عمیق ہے۔ ان سے بڑھ کر شارع کے مقصد کو کون سمجھ سکتا ہے ان کے برابر نور ایمان وتقویٰ کس کو نصیب ہے اور علوم قرآنیہ میں عمق نظر اسی نور کی برکت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس مضمون پر کسی کو اس حدیث سے شبہ نہ ہو۔ "قال رسول اللّٰه علیه وسلم ای الخلق اعجب الیکم ایماناً قالوا الملئکۃ الی اخر الحدیث"[1] یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ایک دن دریافت فرمایا کہ بتلاؤ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے صحابہ نے عرض کیا فرشتوں کا' آپ نے فرمایا کہ فرشتوں کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ وہ تو ہر وقت اپنے رب کے قرب میں ہیں' صحابہؓ نے عرض کیا کہ پھر انبیاء علیہ السلام کا فرمایا' ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ وہ تو وحی کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا پھر ہمارا ایمان عجیب تر ہے' فرمایا تمہارے ایمان نہ لانے کی کونسی وجہ ہو سکتی ہے میں تمہارے درمیان موجود ہوں یعنی تم نے مجھے دیکھا' نزول وحی کو دیکھا' میرے معجزات دیکھے پھر آپؐ نے فرمایا ان لوگوں کا ایمان عجیب تر ہے جو میرے بعد آئیں گے اور صرف چند اوراق دیکھیں گے جن میں قرآن ہوگا اور ان پر ایمان لائیں گے تو اس سے یہ وسوسہ نہ ہو کہ تم صحابہ کو متاخرین سے افضل بتلاتے ہو اور اس حدیث کی رو سے صحابہ سے متاخرین کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلوں کے ایمان کو اعجب ہی تو فرمایا ہے' اکمل واقویٰ وافضل تو نہیں فرمایا اور اعجب ہونے سے اکمل وافضل ہونا لازم نہیں آتا' پس اس حدیث کی بنا پر یہ مسلّم کہ متاخرین کا ایمان سب سے عجیب تر ہے مگر صحابہؓ کے ایمان سے افضل واقویٰ نہیں کیونکہ دوسرے دلائل سے یہ طے ہو چکا ہے کہ سب سے زیادہ کامل ایمان انبیاء علیہم السلام کا ہے پھر ملائکہ کا پھر صحابہؓ کا پھر جو صحابہؓ کے مشابہ ہو' اسی طرح ہر زمانہ میں دیکھتے جاؤ جو شخص صحابہؓ کے ساتھ اخلاق وعادات وطرز معاملات میں مشابہ تر ہوگا اس کا ایمان قوی تر ہوگا اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اعجب ہونا قوی واکمل ہونے کو مستلزم نہیں اس کی ایک نظیر میرے پاس ہے میں پوچھتا ہوں کہ کیا حق تعالیٰ کا علیم وقدیر وسمیع ہونا عجیب تر ہے ہر گز نہیں بلکہ انسان کا

---

[1] مشکوۃ المصابیح :۶۲۷۹' مجمع الزوائد ۱۰:۶۵

علیم و حکیم ہونا عجیب ہے کیونکہ حادث ممکن کا صفات کمالیہ سے متصف ہونا واقعی تعجب کی بات ہے اور واجب قدیم کا صفات کمال سے موصوف ہونا کیا عجیب ہے وہ بھی صفات کمال سے موصوف نہ ہوتو اور کون ہوگا مگر انسان کے علم وحکمت کے عجیب ہونے سے اس کے علم وحکمت کا اکمل ہونا لازم نہیں بلکہ اکمل و افضل واقوی اللہ تعالیٰ ہی کا علم وحکمت ہے۔ یہ گفتگو درمیان میں ایک شبہ کے رفع کرنے کو شروع ہوگئی تھی کہ حضرات صحابہ کے ایمان کی قوت وفضیلت پر حدیث ای الخلق اعجب ایماناً سے شبہ نہ کیا جاوے میں یہ کہہ رہا تھا کہ مقاصد نصوص کا سمجھنا فقہ ہے جس میں حق تعالیٰ نے متقدمین کو فضیلت دی ہے امام ابوحنیفہ امام شافعی وغیرہ اسی عمق فہم کی وجہ سے امام ہیں اس خاص صفت میں آئمہ مجتہدین سب ممتاز ہیں اور کوئی ان کی برابری نہیں کرسکتا' رہا یہ کہ پھر باہم مجتہدین میں کون افضل ہیں سو اس کے بیان کرنے کو ہمارا منہ نہیں ہم اس قابل نہیں کہ فقہاء میں تفاضل کریں کیونکہ اول تو ہمارا یہ درجہ نہیں' دوسرے ہمارے اندر احتیاط نہیں ہم تفاضل کے وقت دوسرے کی تنقیص کردیتے ہیں۔

فضیلت انبیاء

اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جڑ ہی کاٹ دی فرماتے ہیں: "لاتفضلوا بین الانبیاء"[1] کہ انبیاء علیہم السلام میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو اور فرماتے ہیں "لاینبغی لعبد ان یقول انی خیر من یونس ابن متی" اس میں انا سے مراد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ہر متکلم مراد نہیں (کما قیل ۱۲) یعنی کسی کو میری نسبت یہ کہنا لائق نہیں کہ میں یونس علیہ السلام سے افضل ہوں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام انبیاء پر قطعی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں تفضیلی گفتگو سے منع فرمادیا (نیز اس سے بھی منع فرمادیا کہ کسی نبی کا نام لے کر یہ کہا جائے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فلاں نبی سے افضل ہیں' بس اجمالاً ہی کہنا چاہیے کہ آپ سب سے افضل ہیں ۱۲) کیونکہ تفضیل سے دوسرے نبی کی تنقیص ہوجاتی ہے اور ایسے بہت کم لوگ ہیں جو تفضیلی کلام کے مقابلہ میں تنقیص سے بچ سکیں۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ غایت رحمت ہے کہ آپ نے ہم

---

[1] الصحیح للبخاری ۴:۱۹۴' الصحیح لمسلم الفضائل' ب ۴۲' رقم: ۱۵۹' کنز العمال: ۳۲۲۷۳

کو اس بات میں تفضیلی گفتگو سے بالکل منع فرمادیا اور اگر کسی کا اس باب میں تفضیلی گفتگو کر کے یہ خیال ہو کہ میرے کلام سے کسی نبی کی تنقیص لازم نہیں آتی تو میں اس کے سامنے ایک معیار بیان کرتا ہوں اس پر اپنی تقریر کو پرکھ لیا جائے وہ یہ کہ تفاضل انبیاء پر تقریر کرنے کے قبل یہ سوچ لے کہ اس مجلس میں سارے انبیاء علیہم السلام مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہیں اور میں سب کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ظاہر کر رہا ہوں۔ اس وقت معلوم ہو جاوے گا کہ کس مضمون کے بیان کی جرأت ہوتی ہے اور کس کی نہیں ہوتی۔ اس معیار سے اپنی اکثر تقریروں کا حدود سے متجاوز ہونا معلوم ہو جاوے گا اور اس کی فکر ہوگی کہ کسی لفظ سے ایہاماً بھی کسی دوسرے نبی کی تنقیص لازم نہ آ جائے ورنہ وہ حضرات تو شاید خفا نہ ہوں مگر سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو جائیں گے کیونکہ حدیث میں ہے: "الانبياء اخوة من علات وامهاتهم شتى ودينهم واحد"[۱] یعنی انبیاء میں باہم علاتی بھائیوں جیسا تعلق ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حضرات کیسے بھائی ہیں دنیا داروں کی طرح نہیں بلکہ ان میں باہم پورا اتحاد و اتفاق و محبت ہے تو ایسے بھائیوں میں سے ایک کو اپنے دوسرے بھائی کی تنقیص کب گوارہ ہو سکتی ہے ہرگز نہیں، حضرت اس معیار کو پیش نظر رکھ کر تم اپنی تمام تقریروں اور تحریروں کو جو باب تفاضل میں لکھی ہوں یا کی ہوں جانچو کہ ان میں سے کوئی بھی ایسی ہے جس کو بے تکلف تمام انبیاء کے سامنے پڑھ کر سنا سکو، یقیناً ایسی تقریریں بہت کم ملیں گی، زیادہ حصہ وہی ہوگا جس کو سب کے سامنے پڑھنے کی تم کبھی جرأت نہیں کر سکتے (یہ بہت سچی ترازو ہے جو ایک رتی پر بھی جھک جائے گی اس کی قدر کرو) ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں فتویٰ دیتے ہوئے یہ مراقبہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دے رہا ہوں، اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے تو میں فتویٰ نہیں دیتا۔ حضرت یہ وہ باتیں ہیں جن میں صوفیاء دوسروں سے ممتاز ہیں گو اس مضمون کا عقیدہ تو سب کو ہے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے خدا کے سامنے کرتا ہے مگر اس کا مراقبہ اور استحضار دوسرا اثر رکھتا ہے بس اسی مراقبہ سے تفاضل انبیاء کے وقت کام لو۔ انشاء

---

[۱] الصحیح للبخاری ۴:۲۰۳، مسند احمد ۲:۴۰۶، کنز العمال: ۳۸۸۵۶

اللہ کلام میں اعتدال پیدا ہو جائے گا' ہمارے حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ سلاسل صوفیاء میں بھی ایک سلسلہ والوں کو دوسرے سلسلہ پر اپنی فضیلت ثابت نہ کرنا چاہیے کیونکہ ہر سلسلہ والے کے لیے دوسرے سلسلے کے بزرگ چچا ہیں اور چچا بمنزلہ باپ کے ہے۔ حدیث میں بھی ہے "عم الرجل صنو ابیه"[1] یعنی عظمت وادب میں دونوں برابر ہیں' گو بعض حقوق میں باپ مقدم ہیں لیکن تمہارا باپ یہ کبھی گوارہ نہیں کر سکتا کہ تم اپنے چچا کی یعنی باپ کے بھائی کی تنقیص وتوہین کرو۔ جب سلاسل ولایت میں بھی تفاضل سے اکابر نے منع کیا ہے تو تفاضل انبیاء تو یقیناً اشد ہے اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق پر نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنے فضائل احادیث میں بیان فرمائے ہیں اس سے آپ کا مقصود یہ ہے کہ ان کے معلوم ہو جانے سے متبعین کو تسلی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایسا متبوع دیا اور اتباع پر زیادہ رغبت ہوگی۔ گو یہ علوم خود بھی مقصود ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ترغیب اتباع ہی معلوم ہوتا ہے۔ (اویتحمل ان یکون امتثالا لامرہ تعالیٰ واما بنعمة ربک فحدث ۱۲) کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق یہ تھا کہ آپ کو اتباع احکام کا سب سے بڑھ کر اہتمام تھا اور جس چیز کو اس میں دخل ہوتا آپ اس کو اختیار کرنے کی کوشش فرماتے' اس کے متعلق کہ آپ کو اتباع کا زیادہ اہتمام ہے۔ بہ نسبت بیان فضائل کے ایک مرد صالح کا خواب بھی ہے جو بعض رسائل میں طبع بھی کرا دیا ہے ان کو مولود وغیرہ کا بہت شوق تھا' محض غلبہ محبت نبویہ کی وجہ سے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں ہم زیادہ تعریف سے خوش نہیں بلکہ ہم اس سے خوش ہوتے ہیں جو ہمارے احکام کا اتباع کرے مگر آج کل حالت یہ ہے کہ شعراء ایک نعتیہ دیوان لکھ کر اپنے کو سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرب سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ عمل کی یہ حالت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل خلاف ہے۔ یقیناً ایسی تعریف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش نہیں ہو سکتے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق پر نظر کرنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل کو زیادہ تر ترغیب اتباع کی

[1] سنن النسائی ۳:۳۳۳' المعجم الکبیر للطبرانی ۱۰:۳۵۳' کنز العمال:۳۳۹۴

نیت سے بیان فرمایا ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ فضائل تو عقائد کی قبیل سے ہیں جو خود مقصود ہوتے ہیں اور تم ان کو مقصود بغیرہ بتاتے ہو میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ حرج نہیں کہ ایک شی مقصود بالذات بھی ہو اور دوسری مقصود میں معین بھی ہو آپ کو خبر نہیں مقاصد شرعیہ کی ایسی حالت ہے جیسے مقناطیس کی حالت ہے کہ ہر مقصود دوسرے کا جاذب اور اس میں معین ہے۔ پس عقائد کا مقصود بالذات ہونا اوروں کے مقصود للاعمال ہونے کے منافی نہیں اور میں نے اس مسئلہ کو قرآن سے سمجھا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡـرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۚ لِّـكَيۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰٮكُمۡ‌ؕ

(کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب (لوح محفوظ) میں لکھی ہے قبل اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم رنج (اتنا) نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں) بتلایئے۔ اس آیت میں لام غایت کا متعلق کون ہے مذکور تو ہے نہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی جزو اس کا صالح نہیں لامحالہ مقدر ماننا پڑے گا اب یہ بھی سمجھ لو کہ مقدر کیا ہے تو اس لام سے اوپر اللہ تعالیٰ نے مسئلہ تقدیر بیان فرمایا ہے یعنی تم کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے خواہ آفاقی ہو یا نفسی وہ ایک کتاب میں اپنے ظہور سے پہلے لکھی ہوئی تھی چونکہ یہ عجیب بات تھی اس لیے فرماتے ہیں کہ تعجب نہ کرو اللہ کو یہ سب آسان ہے اب اس مسئلہ کے بتلانے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو یہ مسئلہ اس لیے کیوں بتلایا تاکہ تم فائت پر غم نہ کرو اور عطا کی ہوئی چیز پر اتراؤ نہیں پس وہ مقدمہ اخبرنا کم بہ ہے۔

اصلاح اعمال میں تقدیر کا دخل

اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کو اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے کیونکہ اس سے حزن و بطر رفع ہو جاتا ہے اور حزن جڑ ہے تعطل ظاہر کی اور تکبر و بطر اصل ہے تعطل باطن کی یعنی غمگین و پریشان آدمی ظاہر میں تمام دین و دنیا کے کاموں سے معطل ہو جاتا ہے اور متکبر آدمی کا دل خدا

کے تعلق سے معطل ہوجاتا ہے جب تک تکبر نہ نکلے خدا کے ساتھ دل کو لگاؤ نہیں ہوسکتا یہ تو تقدیر کو دخل تھا اعمال میں۔ اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ توحید جو اعظم العقائد واساس العقائد ہے اس کو بھی اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے۔ چنانچہ سعدی فرماتے ہیں:

موحد چہ بر پائے ریزی زرش — چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس — ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیر دیں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں۔ امید اور خوف اس کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی سے نہیں ہوتا۔ توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے)

یعنی توحید سے مخلوق کا خوف وطمع زائل ہوجاتا ہے جب اتنا بڑا عقیدہ بھی اصلاح اعمال میں دخیل ہے تو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے اعتقاد کو آپ کے اتباع میں دخیل مانا جاوے تو کیا اشکال ہے اور یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصود ہے۔ (گو وہ فضائل ایک درجہ میں مقصود بالذات بھی ہیں)

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں زیادہ کاوش سے منع فرمایا کیونکہ جو مقصود ہے اس اعتقاد فضیلت سے وہ بدون تفصیل کے بھی صرف اجمالی اعتقاد سے حاصل ہوسکتا ہے اسی طرح ہمارے اکابر نے اولیاء و مجتہدین میں بھی تفاضل سے منع فرمایا ہے غرض متقدمین کو فقہ اور تعمق نظر کی وجہ سے متاخرین پر فضیلت ضرور ہے لیکن باہم متقدمین میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے اس سے بحث نہ کرنا چاہیے۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ لوگوں نے حدیث تضاعف ثواب فی رمضان کے باب میں شارع کا مقصد نہیں سمجھا اور فقہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر یہ عمل کیا کہ تفاضل حسنات کے لیے طاعات کو مؤخر کرنے لگے کہ اگر کسی کا زکوٰۃ کا سال ۲۸ شعبان کو پورا ہوتا ہے تو وہ ۲۸ کو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا بلکہ رمضان کے لیے اس کو ملتوی کرتا ہے چاہے غریب مسکینوں کا (جن کا یہ مال زکوٰۃ شرعی حق ہے) خاتمہ ہی ہوجائے ارے تم کو کیا خبر ہے کہ مساکین پر کیا گزر رہی ہے تم کو یکم رمضان کا انتظار ہے اور اس غریب کی روح کو ایک ایک گھڑی کا انتظار ہے۔ بس وہ حال ہوگا۔ ”تاتو بمن می رسی من بخدامی رسم“ (جب تک تو مجھ تک پہنچے گا میں خدا تک پہنچ جاؤں گا) صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ حدیث کا مطلب یہ نہیں جو آپ نے سمجھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

مقصود یہ نہیں کہ رمضان تک طاعات کو مؤخر کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ رمضان میں طاعات کے اندر جلدی کی جائے یعنی جس طاعت کی ہمت ہو سکے اور جس عمل صالح کی توفیق ہو سکے اس کو جلدی رمضان ہی میں کر دو' رمضان کے بعد کے لیے مؤخر نہ کرو کیونکہ رمضان میں ثواب زیادہ ہے' پس تضاعف حسنات کا مقصود تو تعجیل اعمال فی رمضان تھا' لوگوں نے اس سے تاخیر اعمال الی رمضان سمجھ لیا۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(اس فرق کہ دیکھو کر کہاں سے کہاں تک ہے)

اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ جس شخص کا سال زکوٰۃ ۲۸ شعبان کو پورا ہو تو کیا وہ شعبان ہی میں صدقہ کر دے اس کے جواب میں میں تو یہی کہوں گا کہ ہاں دیر نہ کرے' رمضان کا انتظار نہ کرے' رہا یہ سوال کہ کیا شعبان میں وہی ثواب ہوگا جو رمضان میں ہوتا تم اس کا ٹھیکہ لیتے ہو اس کا جواب یہ ہے کہ میں ٹھیکیدار تو نہیں ہوں ہاں ٹیکہ دار ہوں کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ قواعد پر ٹیک لگا کر کہتا ہوں کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تاخیر طاعت مطلوب نہیں بلکہ تسارع وتسابق الی الخیر مقصود ہے۔ چنانچہ "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (نیکیوں میں سبقت کرو) يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ" (وہ نیکیوں میں سبقت لے جاتے ہیں) نص میں وارد ہے اس لیے میں جزم کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تاخیر فی الخیر شارع کو ہرگز مطلوب نہیں اور میں قواعد سے کہتا ہوں کہ جس کو شعبان میں صرف کا موقع ملے وہ ہرگز تاخیر نہ کرے اس کو شعبان ہی میں اتنا ثواب ملے گا جو شاید رمضان کے ثواب سے بھی بڑھ جائے کیونکہ انفاق فی رمضان سے کمیتہ ثواب بڑھتا ہے اور تعجیل وسبقت فی الخیر سے کیفیتہ ثواب زیادہ ہوتا ہے اور کیفیت میں کمیت سے زیادہ مطلوبیت ہے۔ صاحبو! میں اس کی نظیر علماء کے کلام سے اپنے پاس رکھتا ہوں' حدیث میں ہے کہ مسجد محلہ میں نماز پڑھنے سے ۲۵ نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور جامع مسجد میں ۵۰۰ نمازوں کا مگر محلہ والوں کو یہ جائز نہیں کہ محلہ کی مسجد چھوڑ چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنے جایا کریں اگر ایسا کرو گے تو گناہ ہوگا۔ اس مقام پر علماء نے لکھا ہے کہ جامع مسجد کی نماز اس شخص کے حق میں کمیتہ زیادہ ہے اور مسجد محلہ کی نماز کیفیتہ زیادہ ہے (کیونکہ اس کے ذمہ اس مسجد کی آبادی واجب ہے تو یہ شخص مسجد میں

نماز بھی پڑھتا ہے اور واجب عمارت کو بھی ادا کرتا ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے واجب عمارت ادا نہ ہوگا کیونکہ اس کے ذمہ اس کی عمارت وآبادی واجب نہیں بلکہ یہ واجب جامع مسجد کے محلّہ والوں کے ذمہ ہے۱۲) ہاں اگر کوئی جامع مسجد کے محلّہ میں جا بسے تو اور بات ہے پھر اس کو کیفیت وکمیت دونوں میں ترقی ہو جائے گی۔ گو قرب سے بعد اقدام کا بھی خسارہ ہو جائے گا۔ بس تم اپنے حساب اور قواعد کو رہنے دو اس میں پانچ کو جانے دو جو حکم ہو جائے اس کو مان لو اپنی طرف سے حساب نہ لگاؤ کہ اس وقت جمع کرنے میں ثواب کم ہوگا رمضان میں زیادہ ہوگا۔ صاحبو! یہ تسلیم کہ رمضان میں زیادہ ہوگا مگر یہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ اس وقت کم ہوگا ممکن ہے اس وقت ہی زیادہ مل جائے کیونکہ اس وقت خرچ کروں گا تو ادا ہوگا اور رمضان تک تاخیر کرو گے تو قضا ہو جائے گا اور ادا میں جو لطف ہے وہ بات قضا میں کہاں، تم کو آخرت کے حقائق وخواص کی کیا خبر۔ تم ان کے متعلق قیاس سے کام نہ لو اہل سائنس کو اقرار ہے کہ اب تک خواص اشیاء کا ان کو اتنا بھی علم نہیں ہوا جتنا سمندر میں سے ایک قطرہ حالانکہ حیرت در حیرت انگریز ایجادات ہو رہی ہیں۔ اخبار میں دیکھا ہے کہ امریکہ نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے کہ اس کو پرانے کھنڈروں اور ویرانوں میں لگایا جائے تو پہلے زمانہ کی تمام باتیں جو اس گھر کے آدمیوں نے اس گھر میں کی تھیں اس آلہ کے ذریعے سے سنائی دیں گی اب بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ یہ آوازیں کرہ ہوا میں اب تک موجود ہیں مگر ان کے ادراک کے لیے لطیف آلہ کی ضرورت تھی وہ اب ایجاد ہو گیا پہلے ایجاد نہ ہوا تھا اس لیے کوئی ان باتوں کو نہ سن سکا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ روحوں کی آواز سے ارواح بولتی ہیں اب میں اس خبر کو بیان کر کے کہتا ہوں کہ قرآن نے کہا تھا کہ قیامت کو زمین بولے گی "یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا" (اس روز وہ اپنی خبریں بیان کرے گی) تو اس کا سب نے انکار کیا اور کہا بھلا یہ کس طرح ہوگا، زمین کیونکر بولے گی کیا اس کے بھی زبان ہے قرآن نے اس کا بڑا زبردست جواب دیا ہے "بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا" یعنی زمین اس لیے بولے گی کہ خدا کا اس کو یہی حکم ہوگا اس جواب نے سب سائنس والوں کی گردنیں توڑ دیں کیونکہ اسباب ظاہرہ میں تو وہ شبہات نکال سکتے تھے اس میں کیا شبہ نکال سکتے ہیں کیونکہ یہ تو حقیقی سبب ہے اگر اس میں کلام کریں گے کہ کیا زمین کے زبان ہے تو ہم سوال کریں گے تو

اچھا بتلاؤ یہ زبان کیونکر بولتی ہے کیا اس کے بھی زبان ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب عالم اسباب کے حقائق کا اب تک احاطہ نہیں ہو سکا تو عالم آخرت کے حقائق کا تو کون احاطہ کر سکتا ہے۔ پھر آپ وہاں کے ثواب وغیرہ کے بارے میں اپنا حساب اور قاعدہ رہنے دیجئے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے حقوق العباد کے بارے میں ایک حساب لگایا ہے کہ زید کا ہمارے ذمہ حق ہے اور عمرو کے ذمہ ہمارا حق ہے تو اب ہم کو زید کے حق کی فکر کرنا کیا ضرور' قیامت میں اگر زید ہم سے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا تو ہم عمرو پر حوالہ کر دیں گے کہ اس کے ذمہ ہمارا حق ہے اس سے وصول کر لو' اس طرح مقاصہ ہو جائے گا۔ مگر اول تو کیا ضرور ہے کہ دوسروں کے ذمہ آپ کے حقوق اتنے ہی ہوں جتنے دوسروں کے آپ کے ذمہ ہیں' دوسرے فرض کر لیا جائے کہ برابر ہی ہو گئے مگر ممکن ہے کہ پھر بھی مقاصہ نہ ہو کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرا تو تمہارا حقوق کی ادائیگی کی فکر میں عمر بھر لگا رہا ہو مگر افلاس یا کسی عذر کی وجہ سے مجبور رہا ہو (اور اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ہم خود حقوق کو ادا کر دیں گے اور اس شخص پر اصلاً مواخذہ نہ ہوگا ۱۲) اور تم اس مقاصد کے حساب سے بے فکر ہو گئے ہو تم نے ابھی سے دوسرے کا حق مارنے کی ٹھان لی ہے تو تم اور وہ برابر کہاں ہوئے تم پر ظلم وغصب وخیانت وغیرہ متعدد دفعات قائم ہیں اور اس پر صرف ایک دفعہ تھی کہ قرض لے کر ادا نہیں کیا۔ تیسرے ممکن ہے کہ حقوق کے مکافات مکسوب اعمال سے ہو سکے اور موروث اعمال سے نہ ہو سکے اس لیے دوسرے شخص کی جو نیکیاں تم کو ملی ہیں وہ معاوضہ ان حقوق کا نہ ہو سکیں جو تمہارے ذمہ ہیں تو یہ حساب محض لغو ہے خدا سے ڈرنا چاہیے کہیں بنیے کے حساب کی طرح نہ ہو جائے کہ لیکھا جوں کا توں' کنبہ ڈوبا کیوں۔ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ جس عورت کے کئی نکاح ہوئے ہوں وہ کس کو ملے گی یہ سوال بھی محض فضول ہے کیونکہ یہ تو یقینی ہے کہ وہاں کسی کو قلق نہ ہوگا سب کے سب خوش وخرم رہیں گے' یہ نہ ہوگا کہ شوہروں میں باہم لڑائی جھگڑا ہو' وہ کہے میں لوں وہ کہے میں لوں' ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس کے پہلے خاوند کو دنیا ہی کی عورتوں میں سے کوئی عورت ایسی ہی حسین یا اس سے بہتر دے دے کیونکہ دنیا میں بہت لڑکیاں بغیر شادی کے بھی تو مر جاتی ہے یا حوریں زیادہ دیدیں' غرض اللہ تعالیٰ سب کو خوش کر دیں گے' جنت میں کوئی غمگین نہ ہوگا اس لیے یہ سوال محض فضول غرض یہ کہ تم خدا کے

ساتھ حساب نہ لگاؤ حساب وہاں کیا کرتے ہیں جہاں مساوات ہو دیکھو دکاندار ہم سے اور آپ سے تو حساب کرتے ہیں اور بادشاہوں سے بھاؤ تاؤ نہیں کرتے وہاں تجارتی مال کو بھی ہدیہ کہہ کر پیش کرتے ہیں اور جب وہاں سے قیمت پوچھی جاتی ہے تو قیمت نہیں بتلاتے بس یہی کہتے ہیں کہ اس کی کچھ قیمت نہیں صرف حضور کی خوشنودی ہی سب کچھ قیمت ہے اس کے بعد ان کو قیمت سے بھی بہت زیادہ مل جاتا ہے پھر غضب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ حساب کتاب کرتے ہو جن کا حق یہ ہے کہ

نیاوردم از خانہ چیزے نخست　　　تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

(ہم اپنے گھر سے کچھ نہیں لائے ہیں جو کچھ بھی ہے وہ سب آپ ہی کا عطیہ ہے)

کیونکہ سب چیزیں تو ان ہی کی ملک ہیں اور حساب وہاں ہوتا ہے ایک عوض ایک عاقد کا ہو دوسرا عوض دوسرے عاقد کا اور یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جنت کے بدلہ میں ان کے جان و مال کو خرید لیا ہے جس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ جان و مال ہماری ملک ہے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے تم بچہ کو بلا تملیک پیسہ دے دیتے ہو اور انفاق کی عادت ڈالنے کے لیے اس کے ہاتھ سے مدرسہ میں دلواتے ہو اب مدرسہ کی کارروائی میں بچہ کا نام چھپے گا کہ فلاں بچہ نے مدرسہ میں چندہ دیا تھا' کارروائی میں اپنا نام دیکھ کر بچہ خوش ہوتا ہے تو کیا حقیقت میں چندہ دینے والا وہ بچہ ہے یا آپ ہیں اس کو خود سمجھ لیجئے اور یہاں استطراداً اس کے متعلق چند باتیں یاد آ گئیں وہ بھی بتلا دوں' ایک یہ کہ باپ کو مناسب ہے کہ بچہ کے ہاتھ سے بھی کبھی کبھی خرچ کرایا کرے کبھی اس کے ہاتھ سے فقیر کو دلوا دیا کبھی مدرسہ میں دلوا دیا تا کہ اس کا حوصلہ بڑھے اور مال کی حرص نہ پیدا ہو دوسرے یہ کہ جب بچوں کے ہاتھ سے کسی دوسرے کو رقم دلواؤ خواہ فقیر کو یا مدرسہ کو تو اس وقت یہ رقم بچہ کو ہبہ نہ کرو بلکہ اباحت کے طور پر دو ورنہ وہ اس کی ملک ہو جائے گی پھر ہبہ صبی حرام ہوگا اور اگر غلطی سے ایسا ہو جائے تو فقیر سے یا مدرسہ والوں سے رقم واپس نہ لو بلکہ خود بچہ کو اس کے عوض اور رقم دیدو جس میں نیت عوض کی قید ضروری ہے ورنہ یہ مستقل ہبہ ہوگا' پہلے کا عوض نہ ہوگا اور مدرسہ والوں کو چندہ

کرنے والوں کو بھی چندہ لیتے ہوئے ان مسائل کا لحاظ رکھنا چاہیے یہ چندہ جمع کرنے والے ہر شخص کی رقم کے لیے ہیں خواہ کوئی بچہ دے یا عورت اور ان مسائل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے چنانچہ پانی پت میں ایک مدرسہ کے سفیر جو واعظ النساء تھے کہ ہمیشہ عورتوں ہی میں وعظ کہا کرتے تھے' تشریف لائے اور چندہ کا وعظ کہا ان کو ایک ہی حدیث یاد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے عورتو میں نے تم کو جہنم میں سب سے زیادہ دیکھا ہے' پس صدقہ کر کے اپنے کو جہنم سے بچاؤ' اگر چہ زیور ہی میں سے ہو اسی حدیث کا ہمیشہ بیان کرتے تھے' عورتیں مردوں کے اعتبار سے زیادہ مالدار ہیں کیونکہ تھوڑا بہت زیور ہر عورت کے ہاتھ کان میں ہر وقت ہوتا ہے نیز یہ مردوں سے زیادہ سخی بھی ہیں کیونکہ زیور میں ان کو کونسی مشقت پڑی تھی یا تو شوہر نے کما کر بنا دیا' ماں باپ نے جوڑ جاڑ کر چڑھا دیا ان کو تو ہر حال میں مفت ہی پڑتا ہے اس لیے چندہ کے وعظ میں ان کے ہاتھ کان سے بہت جلدی زیور نکلنے لگتا ہے وہ سفیر صاحب غالباً اسی لیے عورتوں میں زیادہ وعظ کہتے تھے کہ یہ مالدار بھی ہیں اور عقل سے کوری بھی ہیں ہر شخص کی باتوں سے متاثر ہو جاتی ہیں ان سے چندہ خوب ملے گا۔ چنانچہ ہر وعظ کے بعد ان کے پاس بہت سا زیور جمع ہو جاتا تھا ایک دن ایک کسی عورت نے اپنے کان کی سونے کی بالیاں چندہ میں دیدیں' سفیر صاحب بڑے خوش ہوئے مگر تھوڑی ہی دیر میں ان کی خوشی کرکری ہوگئی کیونکہ اس عورت کا خاوند جو گھر میں آیا اس نے بیوی کے کان ننگے دیکھے' پوچھا بالیاں کیا ہوئیں کہا مدرسہ کے چندہ میں دیدیں کہا بیوقوف تو کون تھی دینے والی تجھے پہننے کو دی تھیں یا تیری ملکیت بنا دی تھی اس کے بعد وہ سفیر صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کو میری بیوی نے سونے کی بالیاں چندہ میں دی تھیں وہ واپس کر دیجئے کیونکہ وہ اس کی ملک نہیں ہیں میری ملک ہیں اور اس نے میری بغیر اجازت دی ہیں۔

سیدھی اور معقول بات تھی مگر سفیر صاحب کسی طرح واپس دینے کو تیار نہ ہوئے اور اس سے جھگڑا کرنے لگے' ان دنوں میں بھی وہاں گیا ہوا تھا' سفیر صاحب میرے پاس آئے' میں نے ان سے کہا کہ آپ معقول بات کو کیوں نہیں مانتے اور بالیاں واپس کیوں نہیں دیتے تو انہوں نے بڑا عذر یہ کیا کہ میں تو سو روپیہ کی رسید کاٹ کر دے چکا ہوں اب اگر بالیاں واپس

دے دوں تو مدرسہ والے تو مجھ سے سو روپے وصول کرلیں گے کیونکہ رسید کٹی ہوئی ہے' میں نے کہا اس کی تدبیر یوں کیجئے کہ ان سے وہ رسید منگوا لیجئے اور اس پر ان کے قلم سے لکھوا لیجئے کہ ہم نے یہ چندہ واپس لے لیا اور دستخط کرا کے ایک دو گواہیاں بھی کرا لیجئے' اسی طرح منشی رسید پر جو آپ کی بھی ہیں واپسی مع دستخط اور گواہوں کے لکھوا لیجئے پھر مدرسہ والے آپ سے کچھ نہ کہیں گے' یہ تدبیر سن کر مولوی صاحب کے حواس درست ہوئے ان کا بال بال بچا اور اس غریب کی بالی بچی۔ پس عورتوں سے چندہ لینے والوں کو بڑی احتیاط کرنا چاہیے کیونکہ یہ اکثر بدوں شوہر سے پوچھے بغیر شوہر ہی کے مال میں سخاوت کیا کرتی ہیں یہ مسائل درمیان میں استطر اداً مذکور ہو گئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس طرح آپ بچہ کے ہاتھ رقم دلوا کر بچہ کا نام کر دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ کا نام کر رہے ہیں ورنہ بتلایئے کہ جان آپ کی کدھر سے ہوگئی' مال آپ کا کدھر سے ہو گیا' یہ تو سب کچھ حق تعالیٰ کا ہے آپ کا نام برائے نام ہے اب بتلاؤ اس کے عوض میں جو کچھ جنت کی نعمتیں ملیں گی وہ عوض ہے ہرگز نہیں بلکہ سراسر فضل و رحمت ہے مگر اس برائے نام ملک کا شریعت نے اعتبار کیا ہے اور اس کو ملک حقیقی ہی کے احکام دیئے ہیں یہ شریعت کا بڑا احسان ہے ورنہ اگر یہ نہ ہوا اور حقیقت کا مسئلہ عملاً بھی مان لیا جائے کہ

در حقیقت مالک ہر شے خداست　　　　ایں امانت چند روزہ نزد ماست

(در حقیقت ہر چیز کے مالک حق سبحانہ وتعالیٰ ہی ہیں' یہ امانت صرف چند روز کیلئے ہمارے پاس ہے)

تو عالم میں فساد برپا ہو جائے کوئی کسی کی بیوی کو لے بھاگے کوئی کسی کی نقدی اور زیور پر قبضہ کر لے اور جب مالک کہے کہ یہ تو میری چیز ہے اس کو یہی کہہ کر دھمکا دے کہ تیری کہاں سے آئی تھی' سب چیزیں خدا کی ہیں' ہم بھی خدا کے ہیں آج تک تو نے برتا اب ہم برتیں گے' اس مسئلہ پر عمل ہونے لگے تو پھر شیخ صاحب بھی پٹھانوں جیسے کام کرنے لگیں' اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

سر پنہاں ست اندر زیر و بم　　　　فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(ہر نشیب و فراز میں ایک ایسا راز پوشیدہ ہے جس کو اگر صاف صاف کہوں تو دنیا تہہ و بالا ہو جائے)

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اس کا یہی مطلب بیان فرمایا تھا کہ اگر توحید کو ظاہر کر دوں تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا اس کی وجہ یہی ہے کہ توحید کا تو یہی مقتضا

ہے کہ خدا تعالیٰ کے روبرو کسی کی ملک ملک نہیں ایک مقام پر مولانا نے اس کے مناسب ایک حکایت بیان فرمائی ہے کہ ایک ایسا ہی شخص ایک شخص کے باغ میں گھس کر انگور کھانے لگا' باغبان آ گیا تو اس کو دیکھ کر بھی آپ ڈرے نہیں بے تکلف کھاتے رہے' اس نے دھمکایا کہ نامعقول یہ کیا کر رہا ہے' بدون اجازت کے میرا پھل کھا رہا ہے تو وہ صاحب حقیقت بولے بس خاموش رہ بک بک نہ لگا' باغ بھی خدا کا پھل بھی خدا کا ہاتھ بھی خدا کا میں بھی خدا کا پھر تو روکنے والا کون ہے اس نے نوکر کو آواز دی کہ ایک رسا اور ڈنڈا لانا اور اس میں اس کو جکڑ کر ڈنڈے سے مارنا شروع کیا اب وہ لگا چلانے تو باغ والا کہتا ہے کہ بس خاموش رہو رسا بھی خدا کا' ختکا بھی خدا کا پھر چلانے کی کیا بات ہے۔ غرض خوب مارا آخر اس نے عقیدہ سے توبہ کی اور کہا:

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار   اختیارست اختیارست اختیارست

(اے عیار میں نے جبر سے توبہ کر لی' اختیار ہے' اختیار ہے' اختیار ہے)

اہل جبر وہی لوگ ہیں جو حقیقت کے قائل ہیں اور اختیار کے انکار سے شریعت کے منکر ہیں انہوں نے کہا کہ درحقیقت مالک ہر شی خداست میں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ فاعل ہر شی نیز خداست کہ ہر کام کرنے والا بھی انسان نہیں بلکہ خدا ہی ہے اور صفت اختیار سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے انکار کر بیٹھے ہیں' میں کہتا ہوں بہت اچھا اگر انسان کو اختیار کچھ نہیں ہے تو پھر سب کو اعمال صالحہ کے بعد بھی جہنم کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ آپ نے یہ اعمال تھوڑا ہی کیے ہیں آپ تو مجبور تھے جیسے یہاں مجبور ہو' آخرت میں بھی مجبور ہو' اللہ تعالیٰ جہاں بھیج دیں چلے جانا صاحبو! انسان میں صفت اختیار کا ہونا دلیل کا محتاج نہیں بلکہ یہ وجدانی امر ہے ہر شخص وجدان سے اس کو محسوس کرتا ہے کہ ہاں میرے اندر اختیار ہے۔ دیکھئے مرتعش (جس کے ہاتھ میں رعشہ ہو) اور کاتب کی حرکت ید میں فرق بین ہے پہلا شخص حرکت میں مجبور ہے دوسرا مجبور نہیں (ایک شخص کو ڈھا کر زبردستی اس کا منہ کھول کر کسی نے شراب پلا دی اور ایک نے روپیہ ہاتھ میں لیا اور شراب کی بھٹی پر گیا' بھاؤ تاؤ کیا اور بوتل خرید کر پی لی' کیا دونوں برابر ہیں ہرگز نہیں بلکہ مجبور پہلا شخص ہے دوسرے کو مجبور کوئی نہیں کہہ سکتا ۱۲) اور یہ ایسا فرق ہے جس کو حیوانات بھی جانتے ہیں اگر آپ کتے یا بھیڑیئے کے ڈھیلا یا لاٹھی ماریں تو وہ

لاٹھی ڈھیلے پر حملہ نہ کرے گا بلکہ آپ پر حملہ کرے گا وہ بھی جانتا ہے کہ لاٹھی اور ڈھیلے کی خطا نہیں وہ تو مجبور ہے خطا آدمی کی ہے جو اختیار سے ہم کو ستا رہا ہے۔ بہر حال اگر شریعت نہ ہوتو حقیقت سے تو سارے عالم میں فساد ہو جائے لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ شریعت نے جو انسان کے برائے نام ملک اور اختیار کو تسلیم کر کے اس کے احکام مقرر کیے ہیں اس سے یہ تو مقصود نہیں کہ تم حق تعالیٰ کے سامنے بھی اپنی ملک جتلایا کرو بس انسان کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حقیقت پر نظر رکھے کہ اپنی جان کو اپنی جان نہ سمجھے نہ مال کو اپنا مال سمجھے نہ اپنے کمالات کو اپنے کمالات سمجھے بلکہ سب کو عطایائے حق سمجھتا رہے اور بندوں سے معاملہ کرنے میں شریعت پر نظر رکھے' یہ ایک اشکال تھا جس کو میں نے درمیان میں حل کر دیا۔

اہتمام حسنات واجتناب سیئات

اب اصل بات کی طرف عود کرتا ہوں کہ تم حق تعالیٰ سے حساب نہ کرو اور شعبان و رمضان میں تفاوت نہ کرو جب موقع ہو فوراً خرچ کر دو تم کو کیا خبر کہ اس وقت کتنا ثواب ملا' رمضان سے کم ملا یا زیادہ کیا عجب ہے کہ اس وقت ضرورت کے وقت جو مسکین کو سہارا مل گیا ہے اس کی دعا عرش سے کتنی اوپر گئی ہوگی اور اس دعا سے تم کو کیا کچھ ملا ہوگا اور مان لو کہ اس وقت رمضان سے کم ہی ثواب ملا تو تم کو یہ کیا خبر ہے کہ رمضان تک تم زندہ رہو یا نہ رہو اور یوں امید تو پہلے زمانہ میں بھی کسی کو نہ تھی کہ ایک دن یقیناً زندہ رہیں گے مگر پہلے زندگی کی ایسی ناامیدی بھی نہ تھی جیسی آج کل ہوگئی ہے کیونکہ آئے دن نئی نئی وبائیں' قسم قسم کی بلائیں آتی رہتی ہیں اب تو ایک دن کا بھی بھروسہ نہیں' اگر کہو کہ ہم وصیت کر جائیں گے کہ رمضان میں اتنی رقم دیدی جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وصیت کا ثواب اپنے ہاتھ سے دینے کے برابر نہیں' دوسرے کیا بھروسہ ہے کہ ورثہ ادا کریں گے یا نہیں یہ غلطی تو ان لوگوں کو ہوتی ہے جو راغب الی الخیر ہیں اور جو راغب الی الخیر نہیں ہیں ان کے یہاں تو رمضان کا مہینہ آتا ہی نہیں جیسا ایک جنٹلمین کا قصہ ہے کہ رمضان میں ایک دوست ان سے ملنے گئے تو دیکھا کہ بے تکلف ناشتہ کر رہے' سگریٹ پی رہے ہیں کہا کیا آپ رمضان میں ایسا کرتے ہیں' کہنے لگے رمضان کیا ہوتا ہے کہا ایک مہینہ کا نام ہے تو جنٹلمین نے مہینوں کی گنتی شروع کی جنوری'

فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی الخ کہاں ان میں تو رمضان کا نام کہیں بھی نہیں یہ تو نمبر اول کے جنٹلمین تھے اور جو نمبر دوم کے جنٹلمین ہیں ان کے یہاں رمضان آتا تو ہے مگر بلائے بے درماں کی طرح آتا ہے کیونکہ وہ سارے سال تو مشغول رہتے ہیں جنوری فروری میں رمضان کی خبران کوایک دم ہو جاتی ہے کہ آج رمضان آ گیا تو وہ گھبرا کر کہتے ہیں کہ ابھی ابھی تو گیا تھا ابھی پھر آ گیا۔ صاحبو! مسلمانوں کو تو شمسی حساب میں ایسا غلو نہ چاہیے کہ سال بھر بھی اسلامی مہینوں کی خبر نہ ہو یہ میں نے مانا کہ تجارتی ضرورتیں شمسی حساب پر مجبور کرتی ہیں تو میں اس سے منع نہیں کرتا آپ تجارتی کاغذات میں اسی سے حساب رکھئے مگر نجی معاملات میں کونسی مجبوری ہے دوستوں کو جو رات دن خطوط لکھے جاتے ہیں ان میں شمسی حساب کی کیا ضرورت ہے اس کو چھوڑ واور اپنی نجی خط و کتاب میں قمری حساب کو استعمال کرو۔ غرض اس میں شک نہیں کہ رمضان میں تضاعف حسنات ہوتا ہے اور اس لیے تمام سال میں رمضان کا مہینہ سب مہینوں سے افضل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں جو لوگوں نے سمجھا ہے کہ اس کی وجہ سے طاعات کو دوسرے مہینوں پر ملتوی رکھتے ہیں کہ رمضان میں کریں گے۔ یادرکھو کہ شارع کا یہ مطلب ہرگز نہیں ایک تو یہ غلطی تھی ایک دوسری غلطی پر اور متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ لوگوں نے رمضان کے فضائل میں سے بس یہی یاد کر لیا ہے کہ اس میں حسنات کا تضاعف ہوتا ہے اور یہ نہیں یاد رکھا کہ گناہ کا بھی تضاعف ہوتا ہے کیونکہ مبارک مکان و مبارک زمان میں جس طرح نیکی بڑھتی ہے گناہ بھی بڑھتا ہے جیسا کہ زنا کرنا ہر جگہ برا ہے مگر مسجد میں کرنا بہت برا ہے اسی طرح رمضان کا گناہ اور دنوں کے گناہ سے سخت ہوگا، پس رمضان میں جبکہ طاعات وحسنات کا اہتمام ضروری ہے ایسا ہی سیئات سے اجتناب بھی سخت ضروری ہے مگر یار لوگوں نے گناہوں میں بھی وہی خانہ ساز حساب لگایا ہے جو حسنات میں لگایا تھا یعنی اللہ تعالیٰ سے ضابطہ کرنا چاہتے ہیں چنانچہ علماء سے پوچھتے ہیں کہ یہ کام کرنا کیسا ہے وہ بتلاتے ہیں کہ گناہ ہے تو اس کے بعد سوال ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا ہی سا گناہ ہے یا بڑا گناہ ہے میں ایسے نامعقولوں کو یہ جواب دیتا ہوں کہ کیوں صاحب اگر چھوٹا گناہ ہوا تو آپ کا ارادہ کرنے کا ہے اگر کہے ہاں تو میں کہتا ہوں کہ پھر مجھے بھی اجازت دو کہ تمہارے گھر کے چھپر میں ایک چھوٹی سی چنگاری رکھ دوں اور اگر کوئی ایسا کرے اور یہ کہے کہ یہ تو ذرا

سی چنگاری ہے اس کا کیا حرج ہے تو تم گوارہ کرلو گے اس کا جواب سب یہی دیتے ہیں کہ نہیں کیونکہ ذراسی چنگاری کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے' خدا بری گھڑی نہ لائے تو حضرت ایسی ہی ہر چیز کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے خصوصاً گناہ کا اور ایک گناہ تو ایسا ہے جس کا بڑھنا بڑے ہی غضب کا ہے، اور اسی سے لوگ بہت بے فکر ہیں یعنی نگاہ بد۔ کانپور میں ایک صاحب بوڑھے ثقہ پابند صوم وصلوٰۃ تہجد گزار تھے مگر اس مرض بدنظری کی بدولت ایک یہودن کے عشق میں گرفتار تھے اور یہ حال ہوا کہ ایک دن میرے سامنے رونے لگے اور کہا کہ اس عشق نے تو میرا ایمان بھی برباد کر دیا نہ میرا اسلام کچھ رہا نہ ایمان' بس اگر وہ یہودن ہے تو میں یہودی ہوں اور وہ مسلمان ہے تو میں مسلمان ہوں' میں نے کہا توبہ کرو توبہ یہ کیا بکتے ہو مگر وہ ایسے بیخود تھے کہ باوجود میرا ادب کرنے کے میرے سامنے بھی ایسے کلمات کفر کہہ گئے' حضرت یہ نظر بد سخت خطرناک ہے۔ حدیث میں ہے کہ "**النظر سهم من سهام ابليس**" کہ یہ شیطان کا تیر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے:

درون سینہ من زخم بے نشاں زدہ   بحیرتم چہ عجب تیر بے کماں زدہ

(تو نے میرے سینہ میں بے نشان زخم مارا ہے حیرت ہے کہ کیا عجیب تیر کمان مارا ہے)

واقعی یہ تیر بے کمان ہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اس لیے رمضان میں تمام گناہوں سے عموماً اور نظر بد سے خصوصاً نہایت اہتمام کے ساتھ بچنا چاہیے۔ یہ مضمون صرف استطراداً بیان ہوگیا کیونکہ اس وقت جو آیت میں نے پڑھی ہے اور اس سے جو مضمون بیان کرنے کا ارادہ ہے اس کو رمضان سے صرف اسی وجہ سے تعلق نہیں ہے کہ آیت میں انفاق کا ذکر ہے اور رمضان میں انفاق کی فضیلت وارد ہے بلکہ زیادہ تعلق دوسری وجہ سے ہے مگر استطراداً کچھ مضمون انفاق بھی بیان کر دیا گیا کیونکہ آیت میں تو انفاق کا بھی ذکر ہے گو مجھ کو مقصود بالذات دوسرا مضمون ہے۔

پختگی نفس رضائے الٰہی ہے

اب میں اصل مقصود کو شروع کرنا چاہتا ہوں جس کے لیے اول ترجمہ آیت کا سننا ضروری ہے تاکہ ترجمہ نہ جاننے والوں کو بھی ربط کا عجیب ہونا معلوم ہوجائے' اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں (تا کہ آیندہ انفاق بھی اور دوسرے اعمال صالحہ بھی سہولت سے صادر ہوا کریں) ان لوگوں کے صدقات ونفقات کی حالت مثل ایک باغ کی حالت کے ہے جو بلند زمین پر ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ زمین تو نشیب کی اچھی ہوتی ہے جس میں پانی ٹھہرے بلند زمین میں پانی کیونکر ٹھہرے گا۔ جواب یہ ہے کہ زمین بلند سے یہ کیونکر سمجھ لیا گیا کہ وہ گنبد ہے بلکہ بلند بھی ہے اور مسطح بھی ہے کیونکہ بلندی پر ہوا لطیف ہوتی ہے اس کے بعد ارشاد ہے: "اَصَابَهَا وَابِلٌ" اس کو موسلا دھار بارش نصیب ہوگئی تو وہ اپنا پھل دو چند لایا یا چار چند۔ دو باتیں اس لیے کہیں کہ ضعف کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ضعف کہتے ہیں مجموعہ مثلین کو تو ضعفین تثنیہ ہے اس کے معنی چار مثل یعنی چار چند کے ہوگئے اور بعض نے کہا ہے کہ ان مثلین میں سے ہر مثل کو ضعف کہتے ہیں ان کے نزدیک ضعفین کا ترجمہ دو چند ہوگا جیسے زوج کبھی ہر فرد کو کہتے ہیں جس کا تثنیہ زوجین بمعنی ضعفین آتا ہے اور کبھی مجموعہ فردین کو کہتے ہیں جیسے دو کے عدد کو زوج کہتے ہیں بمعنی مجموعہ عددین آگے فرماتے ہیں: "فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ" اور اگر اس کو موسلا دھار بارش نہ پہنچے تو پھوار بھی کافی ہے ای فطل یکفیہ طل یا تو طل مبتدا ہے خبر محذوف ہے یا فاعل ہے جس کا فعل مقدر ہے اور نکرہ کا مبتدا ہونا جو ممنوع ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ مفید نہیں ہوتا اور اگر مفید ہو تو مبتدا ہونا جائز ہے اور یہاں مفید ہے وجہ افادہ کی یہ ہے کہ یہ صورۃ نکرہ ہے اور معنی نکرہ موصوفہ ہے کیونکہ طل سے مراد مطلق طل نہیں بلکہ وہ طل ہے جو اس باغ سے لگے اس کو پہنچے اس کے بعد ارشاد ہے: "وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ" (اور جو بھی تم عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے جانتے ہیں) اس کا ربط آیت کے اجزاء کی تحلیل سے معلوم ہوگا بدون اس کے معلوم نہ ہوگا اور تحلیل اجزاء میں طول ہے اس لیے اس کو ترک کرتا ہوں اگر موقع ہوا تو اخیر میں اس پر بھی تنبیہ کردوں گا' خدا کرے یاد رہے اب میں اپنا مقصود جو اس آیت سے مجھے استنباط کرنا ہے بیان کرتا ہوں اور وہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو میں اپنے احباب سے اکثر خاص خطاب سے عرض کیا کرتا ہوں اور آج عام خطاب سے سب کے سامنے عرض کرتا ہوں پس مسئلہ تو جدید نہیں مگر شاید تقریر میں کچھ جدت آجائے اور قدیم بھی

ہوتو ہر قدیم فرسودہ نہیں ہوتا آسمان کتنا پرانا ہے مگر حالت یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ

کہ ذرا دیکھو تو آسمان کہیں سے کچھ پھٹا ہوا نظر آتا ہے پھر بار بار دیکھو تو نگاہ تھک کر لوٹ آئے گی (اور کوئی شقاق یا فطور نظر نہ آئے گا) شمس و قمر کتنے پرانے ہیں مگر دیکھو ویسے ہی آب و تاب کے ساتھ اب تک موجود ہیں اور بعضے پرانے بڈھے نئے بڈھوں سے اچھے ہیں بہر حال مضمون کا جدید ہونا کچھ ضرور نہیں مگر آج کل لوگوں کو جدت کا ہیضہ ہے ہیضہ مردوں کو بھی ہوتا ہے گو حیض عورتوں ہی کو ہوتا ہے مگر ہیضہ اور حیض قریب ہی قریب ہے تجوید و قرأت سے کون بولتا ہے عام تکلم و تلفظ میں تو حیض و ہیضہ برابر ہے قرأت پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک قاری صاحب نے اپنے شاگردوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ہر بات قرأت سے کیا کرو تو ایک دفعہ حقہ پیتے ہوئے قاری صاحب کے عمامہ پر چنگاری گر پڑی' شاگرد نے قاری صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ کر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرأت کے ساتھ پڑھ کر نہایت ترتیل سے کہا جناب قاری صاحب جناب قاری صاحب آپ کے عمامہ شریف پر آگ کی ایک چنگاری گر پڑی ہے اور ہر جگہ خوب مد کھینچا اتنی دیر میں عمامہ کئی انگل جل گیا۔

راحت کی جگہ عالم آخرت ہے

وہ مسئلہ یہ ہے کہ آج کل بعض سالکین کو سہولت کی بہت تلاش ہے جس کی وجہ صرف راحت طلبی ہے جیسے ایک طبیب ماہر کہتا ہے کہ کوئی صورت ایسی ہوتی کہ سارا کھانا ایک دم سے پیٹ میں اتر جایا کرے' لقمہ لقمہ نہ کھانا پڑے تا کہ تداخل طعام نہ ہو' خیر اس شخص کی اس رائے کی بنا تو ایک مصلحت بھی ہے لیکن آج کل تو ایسا ممکن بھی ہوتا تو اس کی بنا راحت طلبی ہی ہوتی۔ افسوس آج کل سالکین بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے خود بخود سارا کام ایک دن میں ہو جائے یہ سخت غلطی ہے۔ صاحبو! راحت کی جگہ تو عالم آخرت ہے اور وہاں بھی جو راحت حاصل ہو گی وہ بھی دنیا کی جہد کا ثمرہ ہے۔

چند روزے جہد کن باقی بخند

(چند روز محنت کر بقیہ ایام راحت سے بسر کر)

بدون مشقت و مجاہدہ کے راحت نصیب نہیں ہوسکتی ہاں اگر حق تعالیٰ خود ہی دنیا میں راحت دیدیں تو اور بات ہے تم کو طلب راحت کا کیا حق ہے تمہارا مذاق تو یہ ہونا چاہیے:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں، دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں)

مولانا ایسے ہی لوگوں کی بابت فرماتے ہیں:

پس زبون وسوسہ باشی دلا　　گر طرب را باز دانی از بلا

(تم بالکل مغلوب وساوس سمجھے جاؤ گے اگر محبوب کے طرب و بلا میں فرق سمجھو گے)

اور فرماتے ہیں:

تو بیک زخمی گریزانی زعشق　　تو بجز نامی چہ می دانی زعشق

(تو ایک ہی زخم سے عشق سے گریز کرتا ہے تو سوائے نام کے عشق کے اس کی حقیقت سے ناواقف ہے)

پس آج کل سالکین کی محبت و طلب کی یہ حالت ہے جیسے ایک شخص ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کہا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ کسی ظریف نے سن لیا اس نے اس کے ساتھ دل لگی کی کہ اگلے دن اندھیرے سے اس درخت پر ایک رسی ساتھ لے کر جا بیٹھا، جب رات کو وہ شخص آیا اور وہی دعا شروع کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ لے تو اس ظریف نے دبی زبان سے کہا کہ اے میرے بندے آج میں تجھے کھینچتا ہوں یہ رسی اپنے گلے میں ڈال لے وہ بڑا خوش ہوا کہ اب مجھے معراج ہوگی، رسی کا پھندا فوراً گلے میں ڈال لیا اور ظریف نے کھینچنا شروع کیا جب ایک بالشت زمین سے اٹھا اور پھندے سے گلا گھٹنے لگا تو فوراً کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے چھوڑ میں نہیں کھنچتا اس نے رسی چھوڑ دی اور اس نے فوراً پھندا گلے سے نکال کر اپنے گھر کا رستہ لیا پھر ساری عمر اس درخت کے نیچے جانے کا نام نہیں لیا، بس یہی حالت آج کل کے

طالبوں کی ہے کہ جب تک تکلیف نہ ہوتی کے عمل میں بھی کچھ مشقت نہ ہو اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت و عشق کا دعویٰ ہے اور جہاں کچھ تکلیف یا مشقت، ہوئی سارا عشق رخصت ہوا حالانکہ ان کو تو جان دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے ہمارے حاجی صاحب کا شعر ہے:

متاع جان جاناں دینے پر بھی سستی ہے الی آخرہ

مگر اب سالک نہیں ہونا چاہتے بلکہ مالک ہونا چاہتے ہیں اسی لیے سہولت کے طالب ہیں چنانچہ میرے پاس کثرت سے خطوط میں یہ فرمائش آتی ہے کہ کوئی سہل سا طریقہ آسان سا عمل کوئی سہل سا نسخہ بتلا دیجئے ایسی درخواست کا جواب ایک بزرگ نے خوب دیا ان سے ایک پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر نے یہی درخواست کی تھی کہ کوئی سہل سا طریق بتلا دیجئے جس سے بہت جلدی کامیابی ہو جائے' بزرگ نے بھی ابھی اس کا جواب نہیں دیا بلکہ باتوں میں لگایا اور باتوں باتوں میں ان سے دریافت کیا کہ ڈپٹی صاحب ذرا اپنی سوانح عمری تو بیان فرمائیے کہ آپ نے کیا کیا پڑھا اور کس طرح ڈپٹی کلکٹر ہوئے' انہوں نے اپنی سرگذشت بیان کی کہ بارہ سال تک انگریزی پڑھی' بی اے کا امتحان دیا' پھر قانون کا امتحان دیا پھر سال بھر تک ملازمت کے لیے سفارشیں حاصل کیں' درخواستیں دیں تو نائب تحصیلدار ہوا پھر کئی سال کے بعد تحصیل دار ہوا پھر کئی سال کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہوا اور سالہا سال کی ملازمت کے بعد اب پنشن ملی ہے، جب یہ اپنی سرگزشت بیان کر چکے تو بزرگ نے فرمایا کہ آپ کو شرم تو نہیں آتی کہ دنیا مردار کے لیے تو اتنی عمر برباد کی اور مشقتیں برداشت کیں اور طلب خدا کے لیے یہ درخواست ہے کہ تھوڑی سی مدت میں کامیابی ہو جائے۔ڈپٹی صاحب کم از کم طلب خدا کے لیے اس سے دگنی مدت تو صرف کرو کیونکہ آخرت دنیا سے افضل ہے۔(تو افضل کے لیے مفضول سے دگنی مدت تو چاہیے ورنہ مساوی تو ضرور چاہیے) واقعی عقل کا مقتضی تو یہی ہے جو ان بزرگ نے فرمایا' اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ جو لوگ طلب خدا میں سہولت کے طالب ہیں وہ کیسی سخت غلطی میں مبتلا ہیں ہم کو تو وہ کام کرنا چاہیے جس کا ہم کو حکم ہوا ہے۔ وصول و حصول کا تقاضا نہ کرنا چاہیے کیونکہ ہماری برائے نام کوشش پر وصول و حصول کا مرتب ہو جانا خود خلاف قاعدہ ہے تو اس برائے نام کوشش پر حصول ثمرات کا اپنے کو مستحق سمجھنا اور عدم حصول پر شکایت کرنا سخت ناانصافی ہے۔

تحصیل عمل بالاختیار

وہ کام کیا ہے جس کا ہم کو حکم ہوا ہے وہ تحصیل عمل بالاختیار ہے کہ اپنے اختیار کو صرف کر کے اعمال کو بجالائیں اور اسی استعمال اختیار کا دوسرا لقب امانت ہے جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ علی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ" کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین و جبال پر پیش کی کہ اس کا تحمل کرتے ہو تو سب نے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا اس امانت سے مراد کیا ہے۔ محققین علماء فرماتے ہیں کہ اس سے تکلیف تشریعی مراد ہے اور تکلیف کے معنی تحصیل عمل بالاختیار کیونکہ مطلق عبادت واطاعت سے تو کوئی شی خالی نہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ اِئْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْهًا قَالَتَا اَتَیْنَا طَائِعِیْنَ" کہ ہم نے زمین و آسمان سے کہا کہ ہمارے احکام (تکوینیہ) کے لیے تیار ہو جاؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے سب نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے تیار ہیں اور لفظ طائعین سے صاف رد ہو رہا ہے ان لوگوں کا جو سموات وارض و جمادات کی عبادت کو حالیہ یا قسر یہ کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کیا قسر و حال میں طوع بھی ہوا کرتا ہے ہرگز نہیں بہر حال عابد و مطیع تو تمام مخلوقات ہیں لیکن مکلّف سب نہیں بجز انسان کے اس سے معلوم ہوا کہ تکلیف واطاعت میں فرق ہے اور جس امانت سے تمام عالم گھبرا گیا وہ تکلیف ہی ہے جس سے مراد عمل مع الاختیار ہے حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق سے یہ فرمایا تھا کہ ہمارے کچھ احکام تشریعیہ ہیں ان کا مکلّف بالاختیار کون ہوتا ہے یعنی جو شخص ان کا تحمل کرے گا اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کی جاوے گی یعنی اس کی قوت ارادیہ ان احکام پر عمل کرنے کے لیے مجبور نہ ہوگی بلکہ عمل و عدم عملی دونوں پر قدرت دی جائے گی پھر جو اپنے اختیار سے احکام کو بجالائے اس کو مقرب بنا لیا جائے گا اور جو اپنے اختیار سے احکام میں کوتاہی کرے گا اس کو مطرود کر دیا جائے گا اس سے سموات و ارض و جبال اور تمام مخلوق ڈر گئی انسان اس کے لیے آمادہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مکلّف بنا دیا یعنی اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کر دی گئی باقی مخلوقات میں یہ صفت اختیار اور

عقل نہیں ہے (وہ جن احکام تکوینیہ کو یا عبادت کو بجالاتے ہیں وہ ان کے لیے طبعی ہیں یعنی ان کی قوت ارادیہ اس کے خلاف کی طرف مائل ہی نہیں ہوتی بخلاف انسان کے کہ جن احکام کا یہ مکلّف ہے وہ اس کے لیے طبعی نہیں بلکہ اس کی قوت ارادیہ عمل وعدم عمل دونوں کی طرف مائل ہوتی ہے اب اس کی تکلیف کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ اپنے اختیار سے ایک جانب کو ترجیح دے یعنی جانب عمل کو مامورات اور جانب عدم عمل کو منہیات میں اسی کا نام تحصیل عمل ہے اور اس سے یہ لازم نہیں کہ غیر انسان عاقل نہ ہو ممکن ہے کہ دوسری مخلوقات بھی عاقل ہوں مگر عاقل کامل نہیں یعنی ان کو عقل کا وہ درجہ حاصل نہیں جو تکلیف احکام کے لیے کافی ہو۔ آخر صبی مراہق بھی تو عاقل ہے مگر باوجود عقل کے مکلّف نہیں کیونکہ اس کی عقل کامل نہیں جو تکلیف کے لیے کافی ہو اور چونکہ اس پر کوئی شرعی اشکال لازم نہیں آتا اس لیے میں اس کا قائل ہوں کہ تمام مخلوقات حیوانات ونباتات حتیٰ کہ جمادات بھی عاقل ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ انسان کے سوا سب غیر عاقل ہے ہاں یہ مسلم ہے کہ ان میں اتنی عقل نہیں جو تکلیف کے لیے کافی ہو پس وہ مثل مراہق کے عاقل ہو سکتے ہیں اس کی کسی نص سے نفی نہیں ہوتی بلکہ تائید ہوتی ہے آخر ہد ہد کی گفتگو حضرت سلیمان کے ساتھ جو قرآن میں مذکور ہے کیا یہ سب طبعی کلام ہے ہرگز نہیں بلکہ عاقلانہ کلام ہے اور اگر اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے ان کی خدمت کے لیے بعض حیوانات کو عقل دیدی تھی تو میں کہوں گا کہ اب بھی بعض حیوانات کی حرکات ایسی ہوتی ہیں کہ خالی عقل کہنا دشوار ہے چنانچہ جس کی حکایت میں اب بیان کرتا ہوں وہ مرحوم مرگیا یعنی ہمارے گھر میں ایک طوطا تھا' اس نے ایک دن بیبیوں کو پان کھاتے دیکھ کر خود بھی پنجرہ سے نکل کر اس ترتیب سے پان کھایا کہ اول تو پان کا ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا پھر چونا کی ڈبیہ میں سے چونچ پر ذرا سا چونا لیا پھر کتھ کی ڈبیہ میں سے کتھ لیا اور دو دانہ چھالیہ کے اٹھائے اور سب کو ملا کر کھا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہاں ہی تمبا کو کی ڈبیہ تھی مگر تمبا کو نہیں کھایا سب کو اس حرکت پر حیرت ہوگئی کہ اس نے کیونکر باقاعدہ سارا کام کیا اور جب حیوانات میں بھی ایک درجہ عقل کا ہو سکتا ہے اور اس کے بعد بھی وہ مکلّف نہیں تو یہاں سے سمجھ لو کہ اگر مجاذیب میں بھی ایک

درجہ عقل کا ہو تو کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے اور یہ نہ کہنا چاہیے کہ ان کو تو کھانے پینے کا پورا ہوش ہے پھر یہ مجذوب کدھر سے ہوئے اسی لیے شیخ ابن عربی فرماتے ہیں کہ مجاذیب پر اعتراض نہ کرو گو ظاہر میں وہ صحیح الحواس معلوم ہوں کیونکہ صحت حواس تو بہائم میں بھی ہے جانور بھی اپنے نفع ونقصان کو سمجھتا ہے مگر اتنے ادراک سے وہ مکلّف نہیں ہوا تو مجذوب بھی باوجود عقل قلیل کے غیر مکلّف ہوسکتا ہے جس کی مثال واضح وہی ہے' صبی مراہق کی مگر اس کے لیے ایک معیار بھی ہے کہیں تم کافروں کو بھی مجذوب نہ کہنے لگو وہ معیار یہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

جملہ دانا یاں ہمیں گفتہ ہمیں ہست داناں رحمتہ للعالمین

(سب عقلمندوں نے یہی کہا ہے اور سب سے بڑھ کر دانا رحمتہ اللعالمین سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں)

یہ دوسرا مصرعہ جملہ معترضہ ہے جو بطور مدح کے درمیان میں لایا گیا ہے کہ واقعی محقق بھی عالم کے لیے سراپا رحمت ہے یہ گفت کا مقولہ نہیں اس کا مقولہ اگلے شعر میں ہے:

گر انارے می خرمی خنداں بخر کہ دہد خندہ اش زدانہ اوخبر

کہ اگر ایک انار خریدو تو کھلا ہوا خریدو کیونکہ کھلے ہوئے انار کا اندرونی حال ظاہر ہوجاتا ہے بند انار مت لو کہیں اندر سے کچا اور خراب نہ نکلے۔

نامبارک خندہ آن لالہ بود کہ زخنداں او سواد دل نمود

مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی صحبت اختیار کرو اور اس سے فیض لینا چاہو تو پہلے علامات وآثار کو دیکھ کر اسے جانچ لو اور اگر وہ سالک ہو تو آثار سلوک کو دیکھو اور اگر مجذوب ہو تو یہ دیکھو کہ اس زمانہ کے صلحاء اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں' اگر وہ اس کو مجذوب کہیں اچھا سمجھیں تو وہ اچھا ہے گو نماز روزہ کا پابند نہ ہو' اگر صلحاء زمانہ اس کو مجذوب نہ سمجھیں اور ظاہری حالت اس کی خلاف شرع ہو تو اس کے پاس نہ جاؤ تو امانت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات سے فرمایا کہ یہ صفت اختیار ہے اور یہ عقل ہے ان کو کون لیتا ہے جو ان کو لے گا وہ مکلّف احکام بنایا جائے گا اس سے سب ڈر گئے اور انسان تیار ہوگیا' پس مکلّف بجز انسان وجنات کے کوئی نہیں اور شمس وقمر واحجار جو جہنم میں جائیں گے تو معذب ہوکر نہ جائیں گے

تا کہ تکلف کا شبہ ہو بلکہ آلہ تعذیب ہو کر جائیں گے تا کہ کفار کو ان کو دیکھ کر حسرت ہو کہ افسوس ہم نے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا جو ہماری تو کیا اپنی بھی امداد نہیں کر سکتے اور گو عدم امداد کا علم غیبت میں بھی ہو سکتا تھا مگر اس صورت میں کفار کو یہ وسوسہ ہوتا کہ نا معلوم خدا تعالیٰ نے ہمارے معبودوں کو کہاں مقید کر دیا جو ہماری امداد نہ کر سکے' اس لیے سب کو پاس پاس کر دیں گے کہ لو یہ تمہارے معبود ہیں اگر ان میں کچھ طاقت ہے تو ان سے امداد طلب کر لو اس صورت میں ان کو حسرت زیادہ ہوگی اب یہاں ایک سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ انسان کو کیا سوجھی تھی جو اس امانت کے لیے تیار ہو گیا کیا یہی سب سے بڑا تمیں مار خان تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان میں عشق کا مادہ بہت زیادہ ہے اسی لیے میں ابتداء طالب علمی میں کہا کرتا تھا کہ انسان کی حقیقت حیوان عاشق ہے اس کی فصل عاشق ہے کیونکہ ناطق تو جنات وملائکہ بھی ہیں عاشق انسان کے سوا کوئی نہیں (اور عشق ومحبت میں فرق ہے اس لیے محبت کا وجود ملائکہ وجنات میں بھی ہو سکتا ہے میں محبت کی ان سے نفی نہیں کرتا عشق کی نفی کرتا ہوں جس کے لیے جوش اور شوق اور ہیجان وولولہ لازم ہے ۱۲) غرض انسان میں عشق بہت زیادہ تھا اور اس وقت بھی تھا جبکہ اس کو عقل کامل بھی عطا نہ ہوئی تھی (کیونکہ عقل کامل تو بعد حمل امانت کے عطا ہوئی اور غلبہ عشق تو قلت عقل ہی میں زیادہ ہوتا ہے اسی لیے کیفیات باطنہ کا غلبہ قلیل العقل پر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ غلبہ کیفیات کے لیے یکسوئی شرط ہے جو غیر عاقل کو زیادہ میسر ہوتی ہے اور عاقل کو تو سوئی کے برابر بھی یکسوئی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس کا دماغ برابر کام کرتا رہتا ہے اور یہ گفتگو قاعدہ کی بناء پر ہے ورنہ باب جذب الٰہی ہر شخص پر مفتوح ہو سکتا ہے وہ کسی قاعدہ سے مقید نہیں' بہرحال انسان کے حمل امانت کا منشاء عشق تھا اور اس کو میں نے عارف شیرازی کے کلام سے سمجھا ہے۔ فرماتے ہیں:

آسماں بار امانت نتوانست کشید   قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(جس بار امانت کو آسماں نہ اٹھا سکا اس کا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام نکلا)

اس میں لفظ دیوانہ سے منشاء حمل امانت پر اشارہ ہے (اور اسی سے معلوم ہو گیا کہ عشق دیوانگی کا نام ہے جو محبت کے علاوہ درجہ ہے ۱۲) جب یہ معلوم ہو گیا کہ امانت اختیار وعقل کا

نام ہے تو جولوگ تسہیل کے طالب ہیں وہ اس امانت اختیار کو برباد کرنا چاہتے ہیں کہ بس ہم کو اپنے ارادہ اور اختیار سے کچھ نہ کرنا پڑے مفت سہولت سے کام ہوجایا کرے' کوئی ایسا حال غالب ہوجائے کہ گناہ خود بخود چھوٹ جائیں ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے' ایسا استغراق ہوجائے کہ نماز میں خود بخود دل لگنے لگے ہم کو احضار قلب کی ضرورت نہ ہو' گویا یہ شخص صفت اختیار کو معطل کرنا چاہتا ہے اور جو شخص امانت الٰہیہ کو اور ایسی بڑی نعمت کو ضائع کرے جس میں انسان تمام مخلوق سے ممتاز ہے اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا' بزرگوں نے تو اللہ تعالیٰ کے تجلیات کی اس قدر عظمت کی ہے کہ ایک بزرگ نے کسی صوفی کے متعلق سنا کہ وہ کھانا کھاتے ہوئے لذیذ شوربے میں پانی کا پیالہ بھر کر ڈال دیتا ہے تاکہ نفس کو لذت نہ آئے' فرمایا طفل طریقت ہے یہ اس تجلی الٰہی کو برباد کرتا ہے جو لذیذ طعام کے ساتھ متعلق ہے اور اس حکمت کو برباد کرتا ہے جو لذائذ دنیا میں رکھی گئی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ یہ نمونہ ہیں لذائذ آخرت کا مگر اس تجلی کا انکشاف اور اس حکمت کی معرفت محض نیت کرنے اور "نویت ان اکل اللذیذ لیکون انموذجاللاخرۃ" کہنے سے حاصل نہیں ہوتی کہیں آپ آج ہی سے نفس پرستی اور لذات میں انہماک شروع کردیں بلکہ اس کی معرفت بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

صوفی نشود صافی تا درنہ کشد جامی بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(صوفی جب تک مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے' پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

اس لیے بسیار سفر کی ضرورت ہے اور بسیار سفر کو تو آپ کیا سمجھیں گے میں اس وقت دو سفر بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ سالک کا ایک سفر توالی الاحوال ہے کہ اس پر حالات طاری ہوتے ہیں ایک دوسرا سفر من الاحوال ہے جس میں وہ سب احوال سلب ہوجاتے ہیں پھر اس کے بعد دوسرے نوع کے احوال عطا ہوتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے باغ میں درختوں پر دو قسم کے پھول آتے ہیں ایک چھوٹا پھول ہوتا ہے وہ چند روز کے بعد جھڑ جاتا ہے اس وقت ناواقف روتا ہے کہ ہائے میرا باغ برباد ہوگیا مگر محقق خوش ہے کہ الحمدللہ سفر اول ختم ہوکر سفر ثانی شروع ہوا (اول عروج ہے دوسرا نزول ہے ۱۲ ظ) پھر سچا پھول آتا ہے وہ باقی رہتا ہے اب اس پر پھل لگنے شروع ہوتے ہیں یا جیسے صبح دو ہوتی ہیں کاذب جس کا

نور جلدی ہی زائل ہو جاتا ہے دوسری صادق جس کا نور بڑھتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

اے شدہ تو صبح کاذب رارہین صبح صادق راز کاذب ہم بہین

مولانا نے سفر اول کاذب سے تشبیہ دی اور سفر ثانی کو صبح صادق سے کہ جیسے اول صبح کاذب کی روشنی آتی ہے جس کی روشنی بڑھتی چلی جاتی ہے اسی طرح سالک پر دو حالتیں گزرتی ہیں ایک میں احوال ناقصہ عطا ہوتے ہیں اور دوسری منزل میں احوال ناقصہ سلب ہو کر احوال کاملہ عطا ہوتے ہیں۔اب یہ شخص پختہ ہو گیا اس کو حق ہے کہ لذائذ بھی کھائے اور عمدہ لباس بھی پہنے کیونکہ اب یہ ہر شی میں تجلی حق کا مشاہدہ کرتا اور اس کا حق ادا کرتا ہے۔صوفی خام کو حق نہیں کہ مرغ مسلم کھایا کرے لیکن اگر بلا تکلف مل جائے تو انکار بھی نہ کرے کھالے بشرطیکہ حلال ہو اور حلال بھی خالص ہونا ضرور نہیں بلکہ نخالص بھی کافی ہے یعنی جو فتویٰ سے حلال ہو بس وہ حلال ہے' زیادہ کاوش اور تقویٰ بھگارنے کی ضرورت نہیں جیسے ایک شخص کی ہمارے قصبہ کے پولیس افسر نے دعوت کی تھی آپ نے دعوت قبول کر کے عین وقت پر کھود کرید شروع کی کہ یہ دودھ کہاں سے آیا' گوشت کس طرح آیا' غلہ کیسے داموں سے آیا' تنخواہ کے روپیہ سے یا رشوت سے' غرض بھرے مجمع میں داعی کو ذلیل کیا' یہ تقویٰ کا ہیضہ ہے اگر کسی شخص پر اطمینان نہ ہو تو یا تو اس کی دعوت ہی منظور نہ کرے' لطیف پیرایہ سے عذر کر دے یا نہ کہے کہ آپ کی آمدنی حرام ہے اس لیے دعوت قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس عنوان سے اس کی دل شکنی ہوگی' باقی امر بالمعروف کے لیے اور بھی بہت وقت ہے اسی طرح امر بالمعروف ضرور نہیں کیونکہ امر بالمعروف میں یہ بھی شرط ہے کہ ایسا وقت اور موقعہ تجویز کرے جس میں مخاطب کے قبول کی امید ہو پس یا تو عذر کر دے یا یہ کر دے جیسا میں نے ایک تھانیدار سے معاملہ کیا' انہوں نے میری دعوت کی' میں نے مجمع کے سامنے تو بلا شرط قبول کر لی پھر تنہائی میں لیجا کر ان سے کہہ دیا کہ ذرا کھانے میں اس کی رعایت رکھی جائے کہ تمام سامان تنخواہ کی رقم سے کیا جائے وہ کہنے لگے صاحب بھلا یہ کب ہو سکتا ہے کہ آپ کو بھی ناپاک مال کھلاؤں۔اس طرح اپنا بھی بچاؤ ہو گیا اور داعی کی دل شکنی بھی نہ ہوئی۔غرض یہ کہ جو مال فتویٰ سے حلال ہو اس میں تامل نہ کرو مولانا فضل الرحمٰن خان صاحب گنج مراد آبادی کے ایک خلیفہ تھے جو حاضر خدمت رہتے تھے' ایک بار مولانا کے یہاں کہیں سے کھانا آیا' حضرت نے ان کے پاس بھیج دیا وہ کہنے لگے کہ آپ نے کچھ تفتیش بھی کر لیا ہے کہ حلال ہے یا حرام تو مولانا نے فرمایا ارے کھالے بڑا حلال

کھانے والا آیا' زیادہ تحقیق کرے گا تو بھوکوں مر جائے گا۔ مولانا کا مطلب بھی یہی تھا کہ جو مال فتویٰ سے حلال ہو وہی کافی ہے گو اہل ورع کے نزدیک حلال نہ ہو۔ میں کہہ رہا تھا کہ اہل اللہ کو تو عطاء حق کی اتنی قدر ہے کہ ان بزرگ نے شوربہ میں پانی ملانے والے صوفی کو طفل طریقت فرمایا کہ تجلی الٰہی کو برباد کرتا ہے اور وہ تجلی مذکر ہے نعماء آخرت کی اور اس کو فقہاء نے بھی سمجھا ہے میں ان کو بھی حکماء اُمت سمجھتا ہوں جیسا کہ صوفیاء کو سمجھتا ہوں اور حیرت ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں بڑا جھگڑا ہے مگر یہ جھگڑا غیر محققین میں ہے محقق دونوں کا جامع ہوتا ہے تو ہدایہ میں جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ چار انگشت تک ریشم مردوں کو بھی جائز ہے وہاں ایک دلیل تو نقلی لکھی ہے اور ایک دلیل عقلی لکھی ہے۔ ''لتكون انموذ جالحرير الجنة''یعنی تھوڑا سا ریشم مردوں کے لیے اس واسطے جائز کر دیا گیا تا کہ حریر جنت کا نمونہ سامنے ہو جائے پھر یہ حکمت دیگر لذائذ و نعم کو بھی عام ہے اس لیے اس کے ابطال کو محقق نے ناپسند کیا اور مبطل کو طفل طریقت کہا اسی طرح جو شخص سہولت کا طالب ہے وہ امانت الٰہیہ اختیار کو باطل کر رہا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے اہل اللہ نے بہت سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک بار حضرت غوث اعظم وعظ فرما رہے تھے کہ درمیان میں دفعتہً ساکت ہو گئے اور کچھ دیر تک ساکت رہ کر پھر بیان شروع فرمایا اور کہا کہ اس وقت میرے سکوت کی یہ وجہ ہوئی کہ ایک بزرگ ابھی شام سے بغداد ایک قدم میں بطور کرامت کے آئے تھے' میں نے ان کو متنبہ کیا ہے کہ اس تصرف میں حکمت عطائے قدم کا ابطال ہے اللہ تعالیٰ نے قدم اس لیے دیئے ہیں تا کہ ان سے مشی کا کام لیا جائے جب بطور کرامت کے راستہ طے کیا جائے گا تو اس میں یہ حکمت باطل ہو گی وہ بزرگ اس سے توبہ کر کے واپس ہو گئے (مطلب یہ ہے کہ از خود ایسا تصرف نہ کرنا چاہیے اور اگر بلا قصد کے کبھی حق تعالیٰ طویل راستہ کو قصیر کر دیں تو وہ کرامت غیر اختیاریہ ہے جو نعمت ہے۔

نیز طے طریق کی دعا کا بھی مضائقہ نہیں جیسا حدیث میں ہے: ''اللهم اطوعنا البعد'' (لم اجد الحديث بهذا اللفظ فى موسوعة اطراف الحديث النبوى الشريف) (صرف تصرف بالقصد کی ممانعت ہے ۱۲) اسی طرح ایک بار ہمارے حضرت حاجی صاحب کے یہاں بے وقت بہت سے مہمان آ گئے' گھر والوں کو فکر ہوئی تو حضرت نے اپنا رومال گھر میں بھیج دیا کہ اس کو آٹے پر ڈھک دو اور پکانا شروع کرو' انشاء اللہ برکت ہو گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایسی برکت ہوئی کہ سب مہمانوں نے فراغت سے کھانا کھا لیا

اور بہت بچ رہا۔ اس کی اطلاع حضرت حافظ محمد ضامن صاحب (شہید رحمتہ اللہ علیہ) کو ہوئی تو آپ حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کرامت مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا تصرف عطا فرمایا' بس آپ کا رومال سلامت رہے پھر دنیا میں قحط تو کیوں آئے گا اور قحط میں جو حکمتیں ہیں وہ باقی رہیں گی۔ حضرت حاجی صاحب کو متنبہ ہوا اور فرمایا حافظ صاحب میں اس سے توبہ کرتا ہوں' انشاء اللہ پھر کبھی ایسا نہ ہوگا تو حضرت جب اہل اللہ نے حق تعالیٰ کی ذرا ذرا سی تجلیات کی اس قدر عظمت کی ہے اور انکی حکمتوں کے ابطال کو ممنوع قرار دیا ہے تو بتلائیے اتنی بڑی امانت کا ابطال جس پر تکلیف کا مدار ہے کیونکر ممنوع ہوگا۔ اب میں ان لوگوں کو متنبہ کرتا ہوں جو طریق میں سہولت کے طالب ہیں کہ وہ اس بے ادبی سے توبہ کریں جس کا بے ادبی ہونا بھی شاید ان کو اب تک معلوم نہ ہوا ہوگا بلکہ وہ اب تک اس طلب سہولت کو دینداری سمجھتے ہوں گے مگر وہ کان کھول کر سن لیں کہ اس طلب میں وہ امانت الٰہیہ کا ابطال کر رہے ہیں۔ پس سہل یہ ہے کہ وہ بجائے تسہیل کے اسہال لے لیں جس سے ضعف ہو جائے گا تو پھر یہ معذور ہو جائیں گے اس وقت مولانا ان کے لیے عذر کا فتویٰ دیدیں گے پھر وضو کی جگہ تیمم ہو جائے گا اور زیادہ ضعف ہوا تو بجائے قیام کے قعود رہ جائے گا اور اس سے بھی زیادہ ضعف ہوا تو صوم وصلوٰۃ سب ساقط ہو جائیں گے جو کامل سہولت ہے اور جب تک معذور نہیں ہوئے اس وقت تک سہولت کی طلب کے کیا معنی جو کہ معذورین کے لیے خاص ہے بلکہ غور کیا جائے تو وہاں بھی ان کو سہولت مزعومہ نہیں ہے کیونکہ اس عذر کے سبب وہ سہل عمل بھی ان کو دشوار ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ تم تحصیل عمل کے مکلّف ہو کہ اپنے اختیار کو صرف کر کے عمل کرو تم کو طلب تسہیل کا کوئی حق نہیں' ہاں صرف اتنا حق ہے کہ عمل تمہارے اختیار وقدرت سے خارج نہ ہو سو اس کا شریعت میں پورا لحاظ ہے کہ امور غیر اختیاریہ کا تم کو مکلّف نہیں کیا بلکہ اختیارات کا مکلّف بنایا ہے اب تم یہ چاہتے ہو کہ اختیارات میں ارادہ واختیار وقدرت کے استعمال کی بھی ضرورت نہ رہے اس کا تم کو کیا حق ہے بلکہ اس میں سراسر ابطال امانت اختیار ہے جس کا جرم ہونا اوپر واضح ہو گیا۔ پس تم کو تو طلب تسہیل کا کوئی حق نہیں ہاں اگر شریعت کسی جگہ خود تسہیل کا لحاظ کرے تو یہ اس کی عنایت ہے مگر تم کو اس کے مطالبہ کا حق نہیں اور نصوص میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے بعض مقامات پر تحصیل وتسہیل دونوں کو جمع بھی کر دیا ہے مگر اس کا التزام نہیں کیا

بعض جگہ محض تحصیل عمل کا امر ہے۔ تحصیل مجوث عنہ کی رعایت نہیں کہ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شریعت میں کہیں تو صرف امر و نہی ہے کہ اس کام کو کرو اور اس کو نہ کرو یہ تو تحصیل کا عنوان ہے اور کہیں امر و نہی کے ساتھ سہولت عمل کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے جس میں تکلیف و عنایت دونوں کو جمع کر دیا ہے مگر اس سے یہ سمجھ لینا کہ شارع کے ذمہ تسہیل بھی ہے سخت نادانی ہے شارع کو حق ہے کہ امور اختیاریہ کی تحصیل کا امر کرے اور سہولت عمل کا طریق نہ بتلائے اور اگر چاہے تو بتلا بھی دے اس حقیقت کو ملحوظ رکھ کر اب سنئے کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے انفاق کا امر فرمایا ہے یہ تو تحصیل ہے مگر اس میں تکلیف کے ساتھ عنایت کو بھی جمع کر دیا ہے۔ بعبارت دیگر یوں کہئے کہ طلب تحصیل کے ساتھ تسہیل کی بھی رعایت کی ہے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ انفاق فعل اختیاری ہے اور فعل اختیاری کے لیے عادۃً تصور غایت ضروری ہے جس کے بغیر صدور نہیں ہوسکتا پس صدور فعل کے لیے تصور غایت کا شرط عادی ہونا تو ضروری ہے اور وہ بھی اکثری لیکن اس میں مجھ کو کلام ہے کہ تصور غایت عقلاً بھی لازم ہے یا نہیں، حکماء اس کو عقلاً لازم کہتے ہیں اسی لیے تصور غایت کو علت شمار کیا ہے جس کو علت غایہ سے موسوم کرتے ہیں مگر اس کے لزوم عقلی میں کلام ہے۔ آپ مدرسہ میں جا کر طلبہ سے پوچھئے کہ وہ کس لیے پڑھ رہے ہیں تو سو میں سے ساٹھ بھی غایت نہ بتلا سکیں گے اور جو بتلائیں گے بھی ان میں بہت سے اسی وقت گھڑیں گے اور لیجئے کھانا تو سب کھاتے ہیں اور یہ فعل اختیاری ہے ذرا بتلا دو کہ کھانے کے وقت کیا غایت ذہن میں ہوتی ہے اور کیا سوچ کر کھاتے ہو یقیناً بہت سے آدمی کچھ بھی نہیں سوچتے اور کوئی غایت ان کے ذہن میں نہیں ہوتی ہاں جوان پڑھ ہیں ان کی تو البتہ اس میں ایک غایت ہوتی ہے وہ کیا ہے یہی کہ کھائیں اور ہگیں اور وہ بھی لازم التصور نہیں بلکہ لازم الترتب آپ، تعجب نہ کریں کہ یہ کیسی غایت ہے ایک بڑے فلسفی نے یعنی صاحب شمس بازغہ نے ہی شمس بازغہ میں غایت کی یہ بھی ایک قسم لکھی ہے کالتغوط للاکل بندہ خدا کو مثال بھی ایسی ہی ملی مگر اعتراض کرنے کی کچھ ضرورت نہیں، ہر شخص کا اپنا اپنا مذاق ہے ان فلسفیوں کی طبیعت ایسی ہی ہوگی جیسے ایک بادشاہ نے چار سمت کی چار عورتیں جمع کی تھیں۔ ایک دفعہ اس نے سب کی طبائع کا امتحان کرنا چاہا اور رات کے آخیر حصہ میں سب سے پوچھا کہ اب کیا وقت ہے سب نے بالاتفاق کہا کہ صبح ہوگئی اس نے دلیل پوچھی تو ایک نے کہا کہ میری نتھ کا موتی ٹھنڈا ہوگیا ہے یہ

بہت لطیف وجہ بیان کی کیونکہ صبح کی ہوا میں خنکی زیادہ ہوتی ہے اس نے موتی کی ٹھنڈک سے اس پر استدلال کیا' دوسری نے کہا کہ پان کا مزا منہ میں بدل گیا ہے' تیسری نے کہا کہ شمع کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے' یہ دلائل تو لطافت ادراک پر مبنی تھے۔ چوتھی نے کہا کہ میرا گوہ آ رہا ہے' بادشاہ نے اس بیوی کو الگ کر دیا کیونکہ اس کے جواب سے کثافت فہم مترشح تھی تو جیسے ان جوابات کی بنا اختلاف مذاق پر تھی ایسے ہی شمس بازغہ کی مثال ان فلسفیوں کے مذاق کی خبر دے رہی ہے' غرض مجھے افعال اختیاریہ میں تصور غایہ کا لزوم عقلی مسلم نہیں ورنہ تخالف نہ ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعادۃ اکثریہ بدوں تصور غایۃ کے افعال اختیاریہ کا صدور دشوار ہے۔ خصوصاً افعال شاقہ کا اور انفاق فعل شاق ہے تو اس کے قبل اس کی غایت کا تصور ضروری ہوگا۔ سو یہاں دو غایتیں مذکور ہیں اول غایۃ تو یہ بیان فرمائی ''ابتغاء مرضاۃ اللہ'' کہ وہ لوگ اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنے کے لیے اس غایۃ کا اثر تو تحصیل ہے کہ اس کے تصور کے بغیر اس فعل اختیاری کا صدور عادۃ دشوار تھا اس کے بعد ایک اور غایۃ بیان فرماتے ہیں: ''وتثبیتا من انفسھم'' مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں من بمعنی لام ہے ای تثبیتا لانفسھم یعنی دوسری غرض انفاق میں یہ ہوتی ہے کہ اپنے نفسوں میں اعمال کے اندر) پختگی پیدا کریں اس کا حاصل یہ ہے کہ بعض بخیلوں کو انفاق میں بہت دشواری ہوتی ہے جن کا مذاق یہ ہوتا ہے۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ۔۔۔ ورزر طلبی سخن دریں است

(اگر جان طلب کرو اس میں مضائقہ نہیں اور اگر دولت طلب کرو کلام اسی میں ہے)

جیسا مولانا نے ایک بدوی کا قصہ لکھا ہے کہ سفر میں ایک کتا اس کا رفیق تھا' وہ مرنے لگا تو بدوی اس کی مفارقت کے غم میں رونے لگا' کسی مسافر نے پوچھا کہ تو کیوں روتا ہے کہا یہ کتا میرا رفیق سفر تھا' اب یہ مر رہا ہے میں اس کے غم میں رو رہا ہوں' پوچھا اس کو تکلیف کیا ہے' کہا بھوکا ہے فاقہ سے مر رہا ہے' اس نے دیکھا کہ ایک طرف ایک پوٹلا بندھا ہوا رکھا ہے بدوی سے پوچھا کہ اس پوٹلہ میں کیا ہے کہا سوکھی ہوئی روٹیاں ہیں' کہا ظالم جب تجھے اپنے کتے سے اس قدر محبت ہے کہ اس کے غم میں رو رہا ہے تو اس میں سے ایک روٹی نکال کر کیوں نہیں کھلا دیتا تو وہ کہتا ہے:

گفت ناید بے درم در راہ ناں ۔۔۔ لیک ہست آب دو دیدہ رائیگاں

کہ مجھے اتنی محبت نہیں جو اسے روٹیاں کھلا دوں، روٹی کے تو دام لگے ہیں اور آنسو مفت کے ہیں، بس میں اتنی ہی محبت رکھتا ہوں کہ اس کو رو لوں تو حق تعالیٰ **"وتثبیتا من انفسھم"** میں ایسے بخیلوں کے لیے انفاق کی دشواری اور تنگی رفع کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ تم انفاق اسی نیت سے کرو کہ اس سے نفس میں قوت پیدا ہوگی اور انفاق سہل ہو جائے گا بار بار اسی نیت سے انفاق کرو تو یہ مادہ راسخ ہو جائے گا اس غایت کا اثر تسہیل ہے اور جو طریقہ سہولت انفاق کا یہاں بتلایا گیا ہے یہ تمام اعمال میں جاری ہے کہ تکرار عمل سے ہر عمل صعب سہل ہو جاتا ہے، گو فطری خلق کی برابر سہولت نہ ہو یعنی جیسے فطری سخی کو انفاق میں سہولت ہوتی ہے ویسی آسانی گو نہ ہو مگر تکرار سے بھی بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جبکہ تکرار اسی غرض سے ہو تا کہ عمل سہل ہو جائے اور یہ غرض گو بالذات مقصود نہیں بلکہ غرض اول اصل ہے مگر چونکہ اس بخیل کو انفاق دشوار تھا اس لیے دوسری غرض کو تسہیل کے لیے بیان فرما دیا، اسی طرح ایک حدیث میں ہے: **"یامعشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء متفق علیہ"**[1] (اے نوجوانوں کی جماعت جو گھر گرہستی کی استطاعت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ شادی کر لے کیونکہ یہ نگاہ کو پست رکھنے والا ہے اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والا ہے اور جو اس کی استطاعت نہیں رکھتا اسے چاہیے کہ وہ روزہ رکھے وہ اس کی رگ شہوت کو مل دے گا) یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی ایک غرض بیان فرما دی کہ اس سے عفت فرج وحفاظت نگاہ سہل ہو جاتی ہے اصل مطلوب تو تحصین فرج وغض بصر ہے جو کہ بدون نکاح بھی قدرت واختیار میں ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا بھی امر فرما دیا کیونکہ وہ اس مطلوب کی تسہیل کا وسیلہ ہے اسی لیے اغض واحصن صیغہ تفضیل سے فرمایا یعنی یہ غض وتحصین میں زیادہ معین ہے اور اسی لیے نکاح کو غض بصر وحصن فرج کی غایۃ تسہیل کہا ہے کیونکہ نگاہ وشرمگاہ کی حفاظت بدوں نکاح کے بھی ممکن ہے کیونکہ نگاہ کا اٹھانا امر اختیاری ہے کوئی دوسرا تو سر نہیں اٹھا دیتا اور یہ امر مشاہد ہے لیکن اس شخص کو اس میں

---

[1] الصحیح للبخاری ۳:۳۴، الصحیح لمسلم کتاب النکاح: ۱ سنن ابی داؤد ب: ۱

دھوکہ ہو جاتا ہے کہ یہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نظر میں مضطر ہوں اور دھوکہ اضطرار کا اس لیے ہوتا ہے کہ آج کل لوگ عموماً نگاہ نیچی رکھنے کے عادی نہیں، اونٹ کی طرح سر اٹھا کر ہی چلنے کے عادی ہیں اس لیے نگاہ میں اپنے کو مضطر سمجھتے ہیں پھر نگاہ ڈال کر ہٹانے میں اس کو نفس کے ساتھ کشاکشی سخت ہوتی ہے جس کی مقاومت دشوار ہوتی ہے اس دشواری کو وہ اضطرار سمجھنے لگتا ہے حالانکہ وہ اضطرار نہیں ہے کیونکہ وہ اس حالت میں بھی غض بصر پر قادر رہتا ہے پس وہ مختار ہے اگر اس پر کسی کو شبہ ہو کہ جس اضطرار میں میتہ حلال ہو جاتا ہے اضطرار تو وہ بھی نہیں کیونکہ عدم تناول پھر بھی اختیار میں رہتا ہے پھر سخت تکلیف کو شریعت نے اضطرار قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ''فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ'' تو معلوم ہوا کہ سخت تکلیف بھی اضطرار میں داخل ہے تو غض بصر میں بھی جب سخت بے چینی ہونے لگے وہ اضطرار کیوں نہیں اور اگر اضطرار اصلاحی کا ذکر نہیں بلکہ اضطرار لغوی کا ذکر ہے اور یہ اضطرار لغوی اکل میتہ میں عذر ہے اور نظر بالشہوۃ میں عذر نہیں اگر کوئی کہے کہ اس فرق کا کیا سبب اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی قسمت خدا کی یہی مرضی یہ جواب تو ضابطہ کا تھا، اب میں تبرعاً دونوں میں فرق بھی بتلاتا ہوں کہ اضطرار مخمصہ میں موت کا اندیشہ ہے اور حیات کا بقاء مطلوب ہے کیونکہ وہ معراج ترقی ہے، حیات ناسوتیہ ہی سے روح کو ترقی ہوتی ہے کیونکہ مدار ترقی اعمال ہیں اور روح مجرد سے صدور بعض اعمال کا نہیں ہو سکتا تھا اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو پھر جنت سے دنیا میں ہمارے بھیجے جانے کی کیا ضرورت تھی اور نظر الی الاجنبیہ سے بچنے میں موت کا خوف نہیں بلکہ غض بصر میں زیادہ حیات ہے حدیث میں وعدہ ہے کہ جو شخص تقاضائے نظر کے وقت نگاہ نیچی کر لے اس کو حلاوت ایمان نصیب ہوتی ہے۔

اور اس کے ساتھ ایک طبعی حلاوت بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ جب غض بصر کے بعد اس کا دل یہ کہتا ہے کہ شاباش آج شیطان کو خوب زیر کیا اور یہ فخر اہل اللہ نے بھی کیا ہے مگر اشر و بطر کے ساتھ نہیں بلکہ تحدث بالنعمہ کے طور پر اور اس قسم کا فرح محمود ہے چنانچہ نص ہے: ''قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا'' (آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرما دیجئے کہ خدا تعالیٰ کے انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے) غرض غض بصر میں باطنی حیات بھی ہے

اور حیات ظاہرہ کا القاء بھی ہے کیونکہ بعض دفعہ یہ نگاہ بد جان وایمان تک لے لیتی ہے۔ ابن القیم نے ایک قصہ لکھا ہے کہ کوئی شخص کسی امرد پر عاشق تھا اور وہ اس سے نفور یہاں تک کہ یہ عشق میں گھل کر مرنے کے قریب ہوگیا اور آثار نزع شروع ہوگئے' اس امرد کو اطلاع ہوئی تو اس کے دل میں رحم آیا کہ لاؤ ایک دفعہ اس سے مل لوں اب تو مر ہی رہا ہے وہ اس ارادہ سے گھر سے چلا اور اس کی اطلاع کسی نے عاشق کو دی تو فوراً جسم میں قوت آ گئی اور اٹھ بیٹھا پھر امرد کو اپنی بدنامی کا خیال ہوا اور راستہ ہی سے لوٹ گیا اور مومن کے قول پر عمل پیرا ہوا۔

کہا اس بت سے مرتا ہے وہ مومن کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

اس امرد نے اس وقت اسی شعر پر عمل کیا اس کی اطلاع بھی عاشق کو ہوئی تو پھر گر پڑا اور نزع شروع ہوگیا' لوگوں نے اس کو کلمہ کی تلقین شروع کی تو بجائے کلمہ کے اس نے امرد کو خطاب کر کے اشعار پڑھنا شروع کیے جن میں ایک شعر یہ تھا:

رضاک اشھی الی فوادی من رحمۃ الخالق الجلیل

(نعوذ باللہ نعوذ باللہ) اور اسی کلمہ کفر پر جان دے دی اور یہ خطرہ نظر عمد میں ہے اور وہی حرام بھی ہے باقی اور نظر فجاءۃ میں یہ اثر نہیں ہوتا کیونکہ فوراً غض بصر کرنے سے وہ اثر قوی نہیں ہونے پاتا اگر اس پر کسی کو شبہ ہو کہ ممکن ہے اس میں بھی ہلاکت ہو جائے تو میں کہوں گا کہ یہ امکان ایسا ہے جیسا امام ابو یوسف کے شاگرد نے مجلس امالی میں سوال کیا تھا کہ آپ نے ابھی جو یہ فرمایا ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی روزہ افطار کر لینا چاہیے تو بھلا اگر کسی دن آفتاب ہی غروب نہ ہو تو کیا کرے اور وجہ فرق کی یہی ہے کہ نظر فجاءۃ میں بوجہ عدم التفات کے دقائق حسن کا ادراک نہیں ہوتا یوں ہی سرسری طور پر صورت سامنے ہو جاتی ہے اب اس کو حکم ہے صرف نظر کا اگر فوراً نگاہ کو ہٹا لے تو کچھ خطرہ نہیں اور اگر اس کے بعد عمداً دیکھنے لگا تو اب اس کو اس کے ساتھ تعلق ہو جانے کا احتمال ہے اور تعلق کے بعد اگر وصال نہ ہوا تو موت کا خطرہ ہے اور ایک دو بار وصال ہو گیا تو اس سے پیاس بجھے گی نہیں بلکہ زیادہ بھڑکے گی۔

کنار و بوس سے دونا ہوا عشق مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور اگر کسی کو ہمیشہ وصال میسر ہو سکتا ہے تو اس کمبخت کو نکاح سے کون چیز مانع ہے ایسی

حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ "لم یر للمتحابین مثل النکاح" یعنی جن میں باہم محبت ہو جائے ان کو نکاح کر لینا چاہیے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر اس کا علاج نظر و وصال سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی طرف سے خیال کو ہٹاؤ جس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی بدصورت بدشکل کا مراقبہ کرو چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو دیکھو میں اس کا مراقبہ بھی بتلاتا ہوں مراقبہ موت و رویت تو سب بتلاتے ہیں میں بدشکل کافر کا مراقبہ بھی بتلاتا ہوں کیونکہ طب میں کبھی طیبات سے علاج ہوتا ہے کبھی خبیثات سے (اور اگر کوئی شکل قابل نفرت مراقبہ کے لیے نہ ملے تو پھر اس محبوب ہی کو بدشکل تصور کرو یعنی یوں خیال کرو کہ یہ ایک دن مرے گا اور اس کا چہرہ خاک میں مل جائے گا اس میں سے خون پیپ' ناک اور آنکھ کے راستہ سے بہے گا اس کے بدن میں کیڑے پڑ جائیں گے' تھوڑی دیر اس کی اس حالت کا مراقبہ کرو اس سے بھی نفع ہوگا) اور خیال ہٹانے کی یہ صورت نافع نہیں کہ تم براہ راست اس کے حسن کے تصور دفع کرنے کا قصد کرو کیونکہ اس میں پھر استحضار ہوگا حسن کا سلب بھی جلب ہو جائے گا۔ میں نے مولانا سید احمد صاحب دہلوی سے ایک حکایت اسی قبیل کی سنی ہے کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کی شادی میں دولہا کے لیے کسی کا دوشالہ مانگ کر مجلس نکاح میں اوڑھا دیا وہ اوچھا آدمی تھا اس نے دوشالہ تو دے، امگر اب جو شخص مجلس میں سے آ کر پوچھتا کہ دولہا کہاں ہے وہ کہتا ہے کہ دولہا تو وہ ہے مگر دوشالہ میرا ہے' لڑکے کے باپ نے کہا تو بڑا اوچھا آدمی ہے بھلا اس کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ دوشالہ میرا ہے اس نے کہا کہ بہت اچھا اب نہ کہوں گا' اس کے بعد کسی نے پوچھا کہ دولہا کونسا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ دولہا تو وہ ہے اور دوشالہ میرا نہیں ہے۔ بارات والوں نے پھر ملامت کی کہ کمبخت تجھے دوشالہ کے ذکر ہی کی کیا ضرورت ہے اس نے کہا بہت اچھا اب سے ذکر نہ کروں گا' اس کے بعد کسی نے پوچھا تو کہا کہ دولہا تو وہ ہے اور دوشالہ کا ذکر ہی نہیں کہ کس کا ہے اس پر دولہا نے دوشالہ اتار کر پھینک دیا تو دیکھئے اس نے دوشالہ کی نفی کی تھی مگر وہ بھی اثبات تھا اسی طرح محبوب کے تصور کو بلاواسطہ دفع کرنا یہ بھی جلب تصور ہے بلکہ اس کا صحیح قاعدہ وہ ہے جس کو فلاسفہ اور صوفیاء نے بیان کیا ہے۔ "النفس لاتتوجه الی شیئین فی آن واحد" کہ ایک آن میں دو چیزوں کی طرف نفس متوجہ نہیں ہو سکتا اور گو اس کو قاعدہ عقلیہ کہا جاتا ہے مگر

میرے نزدیک یہ بھی قاعدہ عقلیہ نہیں بلکہ قاعدہ عادیہ ہے مگر عادۃ اس میں لزوم ایسا ہے جس سے لزوم عقلی کا شبہ ہو جاتا ہے اور اس قاعدہ کے استعمال کا طریقہ وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کسی دوسری شے کی طرف توجہ کو منعطف کرو کیونکہ عشق بطالت سے ہوتا ہے اطباء نے اس کی تصریح کی ہے اسی لیے طلبہ کو عشق زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ بہت بے فکر ہیں (پہلے زمانہ کے طلبہ ایسے بے فکر نہ تھے اس لیے ان میں یہ مرض نہ تھا اور آج کل بے فکری زیادہ ہے) کیونکہ جو کام ان کے ذمہ ہے مطالعہ وتکرار وغیرہ اختیاری ہے کہ جب چاہیں الگ کر دیں اور بے فکر ہو جاویں باقی جو شخص کسی فکر میں لگا ہوا ہو اس کو عشق نہیں ہوتا چنانچہ گھس کہہ دے مزدور کو تصور حسینان کی کہاں مہلت ہے پس تم بطالت و بے فکری کو دور کرو اور کوئی شغل اپنے ذمہ لگاؤ اور کسی شی کی طرف اپنی توجہ کو منعطف کرو۔ حدیث میں اسی علاج کی تعلیم ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر اجنبیہ پر نظر پڑ جائے تو اسی وقت اپنی بیوی سے جا کر مشغول ہو جاؤ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "**فان الذی معها مثل الذی معها**" (کہ جو چیز اس کے پاس ہے ویسی ہی اس کے پاس ہے) ظاہر میں یہ جملہ معمولی بات ہے مگر حقیقت میں یہ ایک قاعدہ عظیمہ پر تنبیہ ہے جس کی تقریر حضرت استاذ علیہ الرحمتہ نے فرمائی ہے جو کسی کے کلام میں میری نظر سے نہیں گزری اس کو بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو ہمارے اکابر کے کمال علوم کا اندازہ ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ متناولات میں چار قسم کی چیزیں ہیں بعض میں محض لذت مقصود ہے جیسے فواکہ بعض میں دفع حاجت مقصود ہے بعض میں دونوں مقصود ہیں مگر غالب حاجت ہے جیسے اغذیہ یومیہ بعض میں دونوں مقصود ہیں مگر غالب لذت ہے اور عادۃ قرب نساء ایسی ہی چیز ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ میں ہم کو اس امر کی تعلیم فرمائی ہے کہ تم اس میں بھی حاجت ہی کو غالب رکھو اور دفع حاجت میں اجنبیہ اور منکوحہ دونوں مساوی ہیں۔ یہ مطلب ہے: "**ان الذی معها مثل الذی معها**" (**ای انهما مساویان فی قضاء الحاجة**) سبحان اللہ بے نظیر علم ہے۔ بہرحال شارع نے اس حدیث "**معشر الشباب تزوجوا الخ**" میں نکاح کی ترغیب اس لیے دی ہے تاکہ غض بصر سہل ہو جاوے اور یہ شارع کے ذمہ نہ تھا بلکہ محض عنایت تسہیل کی وجہ سے ارشاد فرمایا کہ جس کو غض بصر دشوار ہو وہ نکاح کر لے

گوشارع کو یہ بھی حق تھا کہ بدون اس کے بھی غض بصر کا امر فرما دیں کیونکہ نظر اختیاری ہے جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہوا اور اس سے معلوم ہوا کہ کبھی شارع بھی تسہیل کا لحاظ فرماتے ہیں پس صوفیاء اہل بدعت نہیں جو اعمال شرعیہ میں سہولت کا طریق بتلاتے ہیں اور اسی میں مشائخ علماء ظاہر سے ممتاز ہیں کیونکہ علماء اس کو نہیں جانتے۔ پس صوفیاء پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے یہ بدعت کہاں سے نکالی کہ اعمال شرعیہ کی تسہیل کے طرق بتلاتے ہیں۔ میں نے بتلا دیا کہ شارع نے بھی کبھی اس کا لحاظ فرمایا ہے چنانچہ اول تو شارع نے تسہیل غض بصر کے لیے نکاح کو تجویز کیا اور جو نکاح پر قادر نہ ہو اس کے لیے اسی تسہیل کے لیے ارشاد ہے: ”**ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فانه له وجاء**“ کہ جو نکاح نہ کرسکے وہ روزے رکھا کرے کیونکہ روزہ بمنزلہ اختصاء کے ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ اختصاء کے بعد بھی بعض دفعہ شہوت کم نہیں ہوتی چنانچہ تجربہ ہے کہ ایسے لوگ باندیاں خریدتے ہیں اور ان سے مجامعت کرتے ہیں ہاں ان کو انزال نہیں ہوتا اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قطع عضو کے بعد بھی شہوت باقی رہتی ہے ایسا مرد مساحقہ کا طالب ہوتا ہے۔ ایک بزرگ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو شہوت باقی رہتی ہے وہ حکایت یہ ہے ایک شخص کو خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تمنا بے حد تھی چنانچہ ایک بار ملاقات ہوئی اور حضرت خضر نے دریافت فرمایا کہ بتلاؤ مجھ سے کیا کام ہے' کہاں میرے لیے دعا کر دیجئے' کہ بے فکری کی زندگی نصیب ہو' فرمایا دنیا میں بے فکری دشوار ہے کیونکہ یہ دار ابتلاء ہے یہاں چین نہیں ہوسکتا ہاں یہ ممکن ہے کہ تم دنیا میں مختلف لوگوں کی حالت دیکھ کر کسی ایک کو تجویز کر لو' میں دعا کروں گا کہ تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ' اس نے کہا بہت اچھا' یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی تو بے فکر ملے گا چنانچہ اس نے سیاحت شروع کی اور امراء و سلاطین کا امتحان شروع کیا' معلوم ہوا کہ ہر شخص کوئی نہ کوئی فکر ضرور کرتا ہے بے فکر کوئی نہیں' پھر ایک جوہری کو دیکھا کہ وہ بڑا بے فکر ہے صبح کو دکان کھولتا ہے دس بارہ لڑکے جوان اس کے پاس دکان میں رہتے ہیں جو اس کے بیٹے معلوم ہوتے تھے اور نوکر چاکر انکے علاوہ تھے۔ وہ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھتا اور خوب خیرات کرتا اور تجارت بھی کرتا۔ ظاہر میں اس کو کوئی فکر معلوم نہ ہوتا تھا یہ اس کے پاس تین دن ٹھہرا اور اس کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا کہ بس

میں بھی اسی کے مثل ہونے کی دعا کراؤں گا' پھر خیال ہوا کہ اس سے بھی دریافت تو کرنا چاہیے' مبادا اس کو کوئی ایسا فکر ہو جس کی مجھے اطلاع نہ ہو۔ چنانچہ اس سے دریافت کیا اور وجہ بھی بتلا دی کہ میں نے حضرت خضر سے یہ درخواست کی تھی انہوں نے یہ جواب دیا اور اب تجھ کو دیکھ کر مجھے خیال ہوتا ہے کہ تیرے جیسی زندگی کی دعا کراؤں' یہ سن کر وہ جوہری سانس بھر کر آبدیدہ ہوا اور کہا خدا میرے جیسی مصیبت تو کسی دشمن کو بھی نہ دے' پھر قصہ بیان کیا کہ میری بیوی بہت حسین ہے ایک دفعہ وہ بیمار ہوئی اور مرنے کے قریب ہوگئی' میں رونے لگا تو اس نے کہا کیوں روتے ہو تم تو چار دن کے بعد دوسرا نکاح کرلو گے پھر مجھے بھول بھال جاؤ گے' میں نے کہا یہ ہرگز مجھ سے نہ ہوگا' کہا سب یونہی کہا کرتے ہیں تو میں نے استرہ نکال کر اپنا عضو کاٹ ڈالا کہ اب تو اطمینان ہوگیا' اس نے کہا ہاں واقعی اطمینان ہوگیا' اس کے بعد وہ کم بخت اچھی ہوگئی اور میں بیکار ہو چکا تھا تو اس نے نوکروں سے تعلق پیدا کرلیا اور یہ جتنے لڑکے آپ کے سامنے ہیں سب انہی نوکروں کی عنایت مگر میں خاموش ہوں کیا کہوں کیونکہ یہ بلا میں نے اپنے ہاتھوں خریدی ہے اب یہ شخص اپنے گھر واپس آیا اور حضرت خضر سے ملاقات ہوئی' پوچھا کہو تم نے کسی کو تجویز کیا' کہا واقعی دنیا میں کوئی بھی فکر سے خالی نہیں' حضرت خضر نے فرمایا بس تم یہ خیال چھوڑ دو اور اس کی درخواست کرو کہ حق تعالیٰ تم کو اپنی محبت عطا فرمائیں اور آخرت کی بےفکری نصیب ہو' کہا ہاں بس اسی کی دعا کر دیجئے واقعی یہی بات ہے پھر اگر کچھ بےفکری ہے تو تعلق مع اللہ ہی میں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بغیر دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق کے کہیں آرام نہیں ہے)

خلوت گاہ حق سے مراد تعلق مع اللہ ہی ہے تو اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اس شخص کو اپنی حالت پر حسرت تھی اس حسرت میں خواہش کو بھی دخل تھا کہ تمتع کی خواہش موجود مگر فقدان اسباب و آلات سے معذور اس لیے غم زدہ تھا اور روزہ ان سب سے بڑھ کر ہے کہ شہوت بھی کم ہو جاتی ہے اور انسان بھی بےکار نہیں ہوتا۔ مگر ایک بات سمجھ لینا چاہیے کہ بعض دفعہ روزہ سے ابتداء صوم میں شہوت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے اس سے دھوکہ نہ کھایا جائے کہ شریعت نے کیسا علاج تجویز کیا' بات یہ ہے کہ بعض دفعہ قلت شہوت کا منشاء کثافت

اخلاط ہوتا ہے ایسی حالت میں چونکہ روزے سے اخلاط میں لطافت پیدا ہوگی تو اول اول شہوت بڑھے گی مگر یہ برابر روزہ رکھتا ہے تو کثرت صوم کا انجام ضعف شہوت ہی ہوگا اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ قلت شہوت کا منشاء کبھی کثافت اخلاط ہوتا ہے اس کو میں بہت دعوے کے ساتھ کہتا ہوں اور بیانگ دہل کہتا ہوں کہ جس پر شہوت کا زیادہ غلبہ ہو وہ اس وقت خوب پیٹ تن کر کھانا کھالے تو شہوت افسردہ ہو جائے گی مگر شارع نے یہ علاج اس لیے تجویز نہیں کیا کہ اس سے لحوق امراض کا اندیشہ ہے۔

بہرحال کثرت صوم کا انجام ضعف شہوت ہی ہے گو ابتداء میں ضعف کا احساس نہ ہو چنانچہ اخیر حصہ رمضان میں ہر شخص کو ضعف معلوم ہوتا ہے گو افطار وسحر میں اس نے کتنا ہی پیٹ بھر کر کھایا ہو کیونکہ میرے نزدیک سبب ضعف تبدیل وقت ہے، تقلیل غذا سے ضعف نہیں ہوتا' پس جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روح صوم تقلیل غذا ہے جب افطار وسحر میں خوب پیٹ بھر کر کھالیا تو اس روزہ سے فائدہ ہی کیا ہوا' ان کا قول میرے نزدیک صحیح نہیں بلکہ صرف تبدیل وقت ہی ضعف بہیمیت کے لیے کافی ہے' غرض یہ حدیث صاف بتلا رہی ہے کہ شارع نے جس طرح تحصیل اعمال کا اہتمام کیا ہے اسی طرح تسہیل اعمال کا بھی کہیں کہیں لحاظ فرمایا ہے۔

چنانچہ یہ حدیث تو رعایت تسہیل میں صریح تھی اب آیت میں غور کیجئے تو یہاں بھی حق تعالیٰ نے اول ایک غایت تحصیل عمل کے لیے بیان فرمائی اس کے بعد دوسری غایت تحصیل عمل کے لیے ذکر فرمائی کہ تکرار انفاق سے انفاق سہل ہو جاتا ہے پس انفاق میں یہ غرض بھی ملحوظ رکھنا چاہیے اور یہ طریقہ تمام اعمال کی تسہیل میں مفید ہے تکرار عمل سے ہر عمل شاق سہل ہو جاتا ہے جیسا اوپر بھی مذکور ہو چکا ہے مگر طریقہ تسہیل کا بتلانا شارع کے ذمہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احکام میں اس کی رعایت نہیں کی گئی اور ہر عمل کی سہولت کا طریقہ شارع نے نہیں بتلایا۔

نیز علماء کے ذمہ بھی طرق سہولت بتلانا لازم نہیں اور اسی کی فرع یہ بھی ہے کہ علماء کے ذمہ یہ بھی نہیں کہ مسائل کے جواب میں ایسی تقریر کریں کہ مخاطب کی سمجھ ہی میں آجائے جبکہ وہ مسئلہ ان کی فہم سے عالی ہو۔ ہاں مسئلہ کی تقریر کر دینا جبکہ وہ ضروری سمجھیں ان کے ذمہ ہے خواہ مخاطب سمجھے یا نہ سمجھے اور اگر مخاطب سے فہم کی امید نہ ہو تو علماء کے ذمہ تقریر کرنا بھی لازم نہیں' ان کو یہ کہہ دینے کا حق ہے کہ تم اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ رام پور میں ایک شخص نے مجھ

سے کہا کہ معراج کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آیا' مجھے اس پر کچھ اشکالات ہیں' میں نے کہا بیان کیجئے کہا یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان زمین سے آسمان پر پہنچ جائے کیونکہ درمیان میں کرہ زمہریر ہے کرہ نار ہے نیز حکماء کا قول ہے کہ چند میل اوپر ہوا نہیں ہے وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ سانس کے لیے ہوا کی ضرورت ہے پھر معراج کیونکر ہوئی' میں نے کہا بدون نفس کے زندہ رہنا محال ہے یا مستبعد ہے۔ اسی طرح زمہریر و نار میں زندہ رہنا محال یا مستبعد ہے۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت محال و مستبعد میں فرق ہی نہ سمجھتے تھے' میں نے ان دونوں میں فرق ظاہر کیا اور کہا اب آپ کے اشکالات کا حاصل یہ ہوا کہ معراج کا واقعہ مستبعد ہے سو اس سے ہم کو انکار نہیں' معجزات مستبعد تو ہوتے ہی ہیں ورنہ معجزہ ہی کیوں کہا جاوے لیکن محال ہرگز نہیں کیونکہ اس میں عقلی استحالہ کچھ نہیں وہ کہنے لگے کہ یہ دقائق میں نہیں سمجھتا' مجھے اس کی کوئی نظیر مشاہدات میں بتلائیے' میں نے کہا کہ نظیر پر ثبوت دعویٰ موقوف نہیں ہوتا کیونکہ نظیر بھی تو ایک واقعہ ہے اگر ہر واقعہ کو دوسرے واقعہ کے واسطہ سے مانا جائے گا تو یا تو تسلسل لازم آئے گا اور وہ محال ہے یا کہیں سلسلہ کو قطع کرو گے تو یہ آخیر کا واقعہ بدون نظیر کے مانا گیا' پھر واقعہ معراج ہی کو اولاً بدوں نظیر کے کیونکر نہیں مانا جاتا مگر وہ پھر بھی وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتے رہے کہ سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا بس اتنی کسر رہ گئی کہ میں آپ کے سامنے آسمان پر اڑوں کہ دیکھو معراج یوں ہوا کرتی ہے اس کے بعد ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ تنفس کی ضرورت مکث طویل میں ہوتی ہے اور مکث طویل ہی سے خورد برد کا اثر بھی لازم آتا ہے سرعت سیر میں نہ تنفس کی ضرورت ہے نہ مرور فی النار سے احتراق لازم آتا ہے۔ چنانچہ چراغ کی لو میں جلدی جلدی انگلی چلائی جائے تو آگ کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا' پس اگر مان لیا جائے کہ اوپر ہوا نہیں ہے تو اس سے واقعہ معراج پر کیا اشکال ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طبقہ کو جو نہایت سرعت سے طے کیا ہے جس میں آپ کو تنفس کی ضرورت ہی نہیں ہوئی اور ضرورت ہوئی بھی تو پندرہ بیس منٹ حبس دم کرنے سے ہلاکت نہیں ہوتی اور اسی سرعت کی وجہ سے آپ کے جسم پر نار و زمہریر کا اثر نہیں ہوا مجھے یہ جواب پسند آیا اور خیال ہوا کہ اس وقت یہ بات معلوم ہو جاتی تو سائل کی تسلی ہو جاتی مگر مجھے زیادہ خیال نہیں ہوا کیونکہ تسلی کرنا ہمارے ذمہ نہیں ہے۔ علی گڑھ میں ایک پروفیسر میرے پاس آئے جو علوم عربیہ کے استاد وہاں مشہور

تھے انہوں نے ایک حدیث حاکم کا متن پڑھا "**ولا ظهرت الفاحشة في قوم الا سلط عليهم الموت**[1]" یعنی وبا اور طاعون کثرت زنا سے ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا طاعون وزناء میں ارتباط سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا پھر اس کے نہ سمجھنے سے ضرر ہی کیا ہوا' کہنے لگے ضرر تو کچھ نہیں ہوا لیکن معلوم ہونے سے نفع ہوتا' میں نے کہا کہ وہ نفع کیا ہے کہنے لگے اطمینان' میں نے کہا اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل' کہا اگر یہ مطلوب نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کو طلب نہ فرماتے' میں نے کہا کہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے نافع ہو وہ آپ کے لیے بھی نافع ہو' بس اس پر وہ خاموش ہو گئے' میں نے اس کے بعد ان سے کہا کہ مولانا آپ یہ نہ سمجھیں کہ ملانوں کو اس کا ارتباط معلوم نہیں' الحمدللہ کہ ہم کو بعض اسرار کا علم بھی بزرگوں کے طفیل سے حاصل ہے مگر بتلانا مصلحت نہیں سمجھتے اور میں نے یہ شعر پڑھا:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ۔۔۔ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ تو مجلس عارفین میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی خبر نہ ہو)

ہمیں خبر ہے مگر آپ کو نہیں بتلاتے کیونکہ اسرار کا بتلانا ہمارا ذمہ نہیں صرف احکام کا بتلانا ہمارے ذمہ ہے' پھر میں نے احباب کے جلسہ خاص میں اس ارتباط کی تقریر کر دی۔ غرض اسی طرح طرق تسہیل کا بتلانا ہمارے ذمہ نہیں بلکہ مشائخ کے بھی ذمہ نہیں گو مشائخ مشائخ بنے اسی سے ہیں کہ وہ فن تسہیل سے واقف ہیں مگر یہ ان کے ذمہ نہیں' محض ان کی عنایت و رحمت ہے' مخلوق پر کہ وہ طرق تسہیل بتلا دیتے ہیں اور وہ بھی اس طرق کو اس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جو تحصیل میں ساعی ہو اور جو شخص تحصیل اعمال میں کوتاہی کر کے تسہیل کا طالب ہو وہ اس کے ساتھ تسہیل کا معاملہ نہیں کرتے بلکہ تکلیف کا معاملہ کرتے ہیں (یہاں پہنچ کر اذان عصر ہوگئی تو فرمایا کہ بس میں اب ختم ہی کرنے والا ہوں یہ فرما کر خاموش ہو گئے اور اذان کے بعد فرمایا) کہ اب میں مقصود کی توضیح کر کے چند باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کر کے ختم کرتا ہوں' میرا مقصود اس آیت کی تلاوت سے یہ تھا کہ

---

[1] المستدرک للحاکم ۲:۱۲۶' الدر المنثور للسیوطی ۴:۱۸۰

شارع نے اصل میں ہم کو اعمال اختیاریہ کی تحصیل کا مکلف کیا ہے اور شارع کے ذمہ تسہیل کی رعایت نہیں مگر محض عنایت کی وجہ سے بعض دفعہ تسہیل کی بھی رعایت فرما لیتے ہیں جیسا کہ اس آیت میں کیا گیا ہے پس سالکین کی یہ بڑی غلطی ہے کہ وہ سہولت کے طالب ہیں اور طلب تحصیل میں کوتاہی کرتے ہیں۔ اس میں مقصود بالذات کو تابع اور مقصود بالغرض کو اصل قرار دینا ہے۔ نیز صفت اختیار کا ابطال ہے جو امانت الٰہیہ ہے اب میں مختصراً تشبیہ کے متعلق جو اس آیت میں مذکور ہے کچھ عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ نے یہاں نفقات کو جنات سے تشبیہ دی ہے۔ وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح باغ میں پھل کو ترقی ہوتی ہے اسی طرح نفقات میں زیادت ہوتی ہے اور وابل سے اخلاص کی تشبیہ مقصود ہے جس کی دلیل اوپر کی آیات ہیں کیونکہ اوپر ریاء فی الانفاق کی مذمت ہے: ''کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ الآیہ'' (جس طرح جو شخص لوگوں کو دکھلانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتا) اس کے بعد اخلاص فی انفاق کی فضیلت بیان فرمائی گئی اور جب وابل سے مراد اخلاص ہے اور اس کے مقابلہ میں طل مذکور ہے اور وابل کہتے ہیں موسلا دھار بارش کو طل کہتے ہیں پھوار کو تو اس تقابل سے معلوم ہوا کہ وابل سے اخلاص کامل مراد ہے اور طل سے اخلاص قلیل مراد ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ اگر اخلاص کامل ہوا تو نفقات میں ترقی زیادہ ہوگی اور اگر اخلاص قلیل ہوا تو وہ بھی ترقی کے لیے کافی ہے۔ گو زیادہ ترقی نہ ہو اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل بھی مطلوب ہے بلکہ اس سے وہمیوں کا علاج کیا گیا ہے کیونکہ اگر اخلاص کامل کا مطلوب ہونا ان کے ذہن نشین ہو جائے تو ان سے کوئی عمل نہ ہو سکے گا کیونکہ پہلے ہی دن اخلاص کامل میسر نہیں ہو سکتا جیسے ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے سامنے ایک جنازہ کی نماز شروع ہوئی اور وہ شریک نہ ہوئے، کسی نے پوچھا کہ آپ نے نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھی، فرمایا کہ میں نیت کی تصحیح میں مشغول رہا یہی سوچتا رہا کہ اس وقت اس میت کی نماز پڑھنے میں کیا نیت ہے کیونکہ نماز جنازہ میں مختلف نیتیں ہوتی ہیں کبھی اعزہ واقرباء کی خاطر سے پڑھی جاتی ہے کبھی میت کی وجاہت کا اثر ہوتا ہے کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ میت محلہ دار ہے اگر نماز نہ

پڑھیں گے تو اہل محلّہ ملامت کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ رئیس یا عالم کے جنازہ کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے' غریبوں کے جنازہ کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا' اگر اخلاص منشا ہوتا تو یہ فرق کیوں ہوتا۔ اسی طرح حافظ اگر تراویح میں سوچتا رہے کہ میں تراویح میں جو بنا سنوار کر قرآن پڑھ رہا ہوں اس میں کیا نیت ہے کیونکہ تنہا نماز پڑھتے ہوئے ایسا اہتمام نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ تراویح ہرگز نہیں پڑھا سکے گا۔ پس اس وہم کا علاج کر دیا گیا کہ تم کس وہم میں پڑے ہمارے یہاں اخلاص قلیل بھی کافی ہے بس تم اپنی طرف سے برا قصد نہ کرو اس کے بعد بے فکر ہو کر کام میں لگو اور اخلاص کامل کے لیے سعی کرتے رہو' اسی طرح سے ایک دن اخلاص کامل بھی میسر ہو جائے گا اور اگر پہلے ہی دن اخلاص کامل پر عمل کو موقوف رکھا تو تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ یہ مطلب ہے: "فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ" (اگر اس کو موسلا دھار بارش نہ پہنچے تو پھوار بھی کافی ہے) کا کہ ابتداء میں اخلاص قلیل ہی کو کافی سمجھو اور عمل شروع کردو' یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل ہی مطلوب ہے بلکہ مطلوب تو اخلاص کامل ہے مگر اس کے حصول کا طریقہ یہی ہے کہ اول قلیل ہی سے عمل شروع کردو۔ طل پر مجھے ایک لطیفہ ہارون رشید کی باندی کا یاد آ گیا' گو مضمون سے اس کو تعلق نہیں مگر لفظ طل سے تعلق ہے۔ ہارون الرشید نے اپنی ایک جاریہ کو کسی غلام سے ہنستے بولتے دیکھ لیا جس کا نام تھا طل (غلام لونڈیوں کے ایسے ہی نام ہمارے عرف میں رکھتے ہیں جیسے بہار وغیرہ) ہارون الرشید نے اس جاریہ کو ڈانٹا اور کہا کہ خبردار جو کبھی اس سے بات کی بلکہ کبھی زبان سے اس کا نام بھی مت لینا' ایک بار وہ لونڈی قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھی کہ یہی آیت آئی اس کو معلوم ہوا کہ امیر المومنین ایسے موقع پر موجود ہیں جہاں اس کی آواز جا رہی تھی تو اس نے کیا مزہ کیا کہ آیت کو اس طرح پڑھا "فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فالذی نهانی عنه امیر المومنین" (تلاوت میں لفظ طل کی جگہ پڑھا کہ امیر المومنین نے طل کا نام لینے سے روکا ہے) امیر المومنین ہنسنے لگے اور خطا معاف کردی اور نام لینے کی اجازت دیدی۔ پس اصل مقصود تو اخلاص کامل ہے اور اسی کا امر ہے وہی مطلوب ہے اور اس سے تکمیل عمل کی مقصودیت پر دلالت ہو گئی مگر چونکہ اس میں بعض وہمیوں کو غلو ہو جاتا ہے اس لیے فطل میں اس کی تعدیل کر دی گئی۔ گویا "فاصابها وابل" میں تکمیل کی تعلیم تھی اور فطل میں تعدیل

کر دی گئی تو اس آیت میں چار چیزیں مذکور ہوئیں۔ تحصیل، تسہیل، تکمیل، تعدیل اور اسی مناسبت سے میں اس بیان کا نام "التحصیل والتسهیل مع التکمیل والتعدیل" تجویز کرتا ہوں اور اس مضمون کو خاص رمضان سے یہ تعلق ہے کہ طاعات رمضان کو بھی مثل تکرار انفاق کے تسہیل اعمال میں بڑا دخل ہے یعنی رمضان میں یہ خاصیت ہے کہ اس ماہ میں جن طاعات پر مداومت کر لے سال بھر ان پر مداومت سہل رہتی ہے اور جن گناہوں سے بچنے کا اہتمام کر لے سال بھر ان سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔ ابن حبان نے ایک حدیث مرفوع روایت کی ہے:

"سلم له الجمعة سلم ا ما بينه وبين الجمعة الاخرى ومن سلم له رمضان سلم له السنة كلها قلت اخرجه السيوطى فى الجامع الصغير وعزاه الى الدارقطنى وابن على واحمد عن عائشة بلفظ اذا سلمت الجمعة سلمت الايام واذا سلم رمضان سلمت السنة وقال العزيزى وهو حديث ضعيف ۱۳۵ . ا ج)[1]

رہا یہ کہ رمضان میں یہ خاصیت بالکیفیت ہے یا بالخاصہ ہے دونوں احتمال ہیں۔ اگر بالخاصہ ہے تو تب تو وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور بالکیفیت ہے تو یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ مہینہ بھر کسی عمل سے رکنے میں اس سے اجتناب کی عادت ہوجاتی ہے اب سال بھر اس سے بچنا سہل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح کسی عمل کے کرنے میں بھی ایسا ہی سمجھو مگر سہولت کے معنی یہ ہیں کہ اگر اب اس عادت سے کام لو تو سہولت ہوجائے گی۔ یہ معنی نہیں کہ عادت سے کام لینے کی بھی ضرورت نہ رہے گی جیسے کسی شخص کی آنکھیں بنائی گئیں اور ان میں روشنی آ گئی تو آنکھ کے درست ہوجانے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اس سے کام لے گا آنکھیں کھولے گا تو نظر آئے گا اگر کوئی احمق یہ کہے کہ میں تو آنکھ نہ کھولوں گا، کھولنے سے نظر آیا تو فائدہ ہی کیا ہوا، آنکھ بننے کے تو یہ معنی ہیں کہ بدون کھولے بھی نظر آئے تو ایسی تیسی اس احمق کی پس یہ مطلب نہیں کہ رمضان لاٹھی لے کر تم کو گناہوں سے روکے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی ایسی برکت ہے کہ اس میں گناہوں کو اہتمام سے چھوڑ کر بعد میں اس برکت سے کام لینا

---

[1] لم اجد الحديث فى موسوعة اطراف الحديث النبوى الشريف

چاہوتو گناہوں کا چھوڑنا آسان ہوگا ورنہ پھر یہ عالم ابتلا ہی کیا ہوا اگر جبراً تم سے گناہ چھڑا دیئے جائیں۔ پس اب بقیہ رمضان میں اہتمام کے ساتھ گناہوں سے بچو' خصوصاً نگاہ بد اور غیبت سے اور اعمال صالحہ کا اہتمام کرو' تلاوت قرآن و نماز و ذکر میں مشغول رہو اور دوسرے دنوں سے آج کل کچھ کام بڑھا دو اور ایک عمل جس کو رمضان سے خصوصیت ہے ابھی باقی ہے یعنی شب قدر کی تلاش کرنا اس کا بھی خاص اہتمام کرو' ابھی کچھ لیالی قدر باقی ہیں ان کو غنیمت سمجھو دو راتیں تو گزر گئی ہیں اگر ان میں اہتمام نے کیا ہو تو بقیہ ہی کا اہتمام کرلو تاکہ "فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ "(اگر اس کو موسلا دھار بارش نہ پہنچے تو پھوار ہی کافی ہے) ہی کا مصداق ہو جائے اور کل رات میں نہ جاگ سکو تو زیادہ حصہ جاگ لو یہ بھی نہ ہوسکے تو دوسری راتوں سے کچھ زیادہ جاگ لو یہ بھی "فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ" (اگر اس کو موسلا دھار بارش نہ پہنچے تو پھوار ہی کافی ہے) میں داخل ہے۔ غرض نہ سب راتیں ضروری ہیں نہ پوری رات ضروری ہے جتنا ہو جائے غنیمت ہے اس سے دریغ نہ کرو۔

مرا ززلف تو موئے بسند ست ہوس راہ مدہ بوئے بسند ست

زلف محبوب کی خوشبو ہی کافی ہے یہ شعر شیخ عبدالحق نے اس موقع پر لکھا ہے جہاں حدیث میں یہ قصہ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع میں حلق راس کے بعد اپنے موئے مبارک تقسیم فرمائے تھے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال دنیا میں موجود ہیں' گو سند صحیح کے ساتھ ہم کو نہ ملیں مگر ہم کو یہ خبر ہی کافی ہے۔ شیخ میں عشق کا غلبہ ہے' اشعار محبت بڑے موقع سے ذکر کرتے ہیں' چنانچہ اس حدیث کی شرح میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کے وصال کا واقعہ مذکور ہے کہ ایک دن صحابہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے حضرت صدیق امام تھے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرہ کا پردہ اٹھا کر صحابہ کی جماعت کو دیکھا اور تبسم فرمایا۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہم کو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ دیکھ کر ایسی حالت ہوئی کہ قریب تھے کہ نماز توڑ دیں' شیخ اس واقعہ کو بیان کرکے یہ شعر لکھتے ہیں:

در نماز خم ابروئے تو چوں یاد آمد حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

خیر یہ تو استطراداً ذکر ہوگیا اصل مقصود پہلا شعر تھا کہ:

مرا ززلف تو موئے بسند ست ہوس راہ مدہ بوئے بسند ست

(میری تسلی کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کے بال دنیا میں موجود ہیں، گو سند کا علم نہیں، عاشق کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس کی خوشبو دنیا میں موجود ہے)

تم اگر ساری رات نہ جاگ سکو تو جتنا ہو سکے اور دنوں سے کچھ زیادہ شب قدر جاگ لو ہمارے حاجی صاحب کا شعر ہے:

گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ وفریاد ہم　　　بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں

میں عالی ہمتوں کی ہمت کم نہیں کرتا بلکہ کم ہمتوں کی ہمت بڑھا رہا ہوں کہ وہ زیادہ نہ کر سکیں تو قلیل ہی سے دریغ نہ کریں اور جو زیادہ کر سکتے ہیں وہ زیادہ میں کمی نہ کریں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرما دیں اور عمل کی توفیق ہو۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین.

تکمیل الاعمال بتبدیل الاحوال

تبدیل احوال سالکین کے متعلق یہ وعظ اہلیہ منشی محمد خلیل الرحمٰن خان صاحب کانپوری کی فرمائش پر شب جمعہ شوال ۱۳۳۸ھ کو چھوٹی بیگم صاحبہ کے مکان پر تھانہ بھون میں ہوا

خواجہ عزیز الحسن صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدراس نے قلمبند کیا

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰه نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّم

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (الفرقان آیت نمبر۷۰)

ترجمہ: مگر جو (شرک و معاصی سے) توبہ کرے اور ایمان (بھی) لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بے حد مہربان ہیں۔

وجہ بیان

اس وقت مجھ کو ایک ضروری مضمون بیان کرنا ہے۔ اصلاح اعمال کے متعلق اور اصلاح احوال کے متعلق اور اس مضمون کے ضمن میں ان کوتاہیوں اور غلطیوں کو بھی بقدر ضرورت بیان کرنا چاہتا ہوں جو سالکین کو اثنائے سلوک میں پیش آتی ہیں اور غلطیاں بعض عامیانہ ہیں اور بعض خاصیانہ۔ یعنی بعض تو وہ ہیں جو عوام کو واقع ہوتی ہیں اور بعض وہ ہیں جو خواص کو پیش آتی ہیں اور اس مضمون کے سننے کے بعد معلوم ہوگا کہ یہ مضمون نہایت ضروری ہے اور مشترک ہے عوام اور خواص سب کے درمیان کہ جس پر سب کو متنبہ ہونا ضروری ہے۔ گو یہ مضمون ذرا دقیق اور غامض ہے لیکن ان شاء اللہ اس کا اہتمام کیا جاوے گا اور کوشش کی جاوے گی کہ مستورات بھی سمجھ لیں۔ ہر

چنداس مضمون کے یہاں بیان کرنے کی رائے نہ ہوتی تھی کیونکہ شاید مستورات کے ذہن میں یہ نہ آوے مگر ضروری ہونے نے مجبور کیا۔ لہٰذا اسی کو اختیار کرتا ہوں لیکن ان شاء اللہ اپنی طرف سے اہتمام کیا جاوے گا' سمجھانے کا آگے حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے اسی پر بھروسہ ہے۔

توبہ کا طریق

حق تعالیٰ نے اس سے قبل کی آیت میں بعض اعمال منہی عنہا یعنی بعض معاصی کا بیان کیا ہے اور اس پر وعیدیں فرمائی ہیں کہ جو شرک کرے گا یا بدکاری کرے گا یا قتل کرے گا اس کو اس طرح عذاب ہوگا' پھر اس عذاب سے استثناء فرماتے ہیں۔ اس آیت میں جس کا یہ حاصل ہے کہ سب کو عذاب ہوگا مگر ان کو نہ ہوگا جن کی یہ شان ہے کہ انہوں نے جملہ معاصی سے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کیے بغیر کفر سے بھی توبہ کی اور کفر سے توبہ یہ ہے کہ کفر چھوڑ کر ایمان لے آئے اور چونکہ او پر ذکر کفر و شرک کا بھی تھا اس کے متعلق تو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ آمن یعنی ایمان لے آئے اور چونکہ بعض اور معاصی بھی مذکور تھے' گو ان کا وقوع بھی کافروں ہی سے مذکور ہے۔ مگر فی نفسہ ان کی خصوصیت خاص کفار ہی سے نہیں بلکہ جو بھی مبتلا ہو اسی کے لیے تدارک اور اصلاح کا طریقہ بھی بتلانا ہے اس لیے آمن کے ساتھ تاب کو فرمایا۔ گو تاب کو مقدم فرمایا جس سے مطلب یہ ہے کہ توبہ تو جملہ معاصی سے ضروری ہے ہی مگر بالتخصیص کفر سے توبہ نہایت ہی ضروری ہے یعنی ایمان بھی ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جتنے معاصی ہیں ان سے توبہ کرنا چاہیے اور ان میں سے کفر و شرک بھی ہیں اور توبہ کا طریق یہ ہے یعنی بعض معاصی سے توبہ یہ ہے کہ ایمان بھی لاوے' گویا یہ تخصیص بعد تعمیم ہے ورنہ ظاہر یہ تھا کہ ایمان مقدم ہوتا مگر اس میں یہ نکتہ ہے جو میں نے بیان کیا اور یہ بات عکس میں حاصل نہ ہوتی۔ پھر فرماتے ہیں **وعمل عملاً صالحا** یہ نہیں کہ توبہ کر کے بیٹھ رہے بلکہ آئندہ کے لیے بھی اہتمام کرے اور نیک کام کیا کرے' نیک کام میں دونوں امر آ گئے' معاصی کا چھوڑنا بھی اور طاعات کا اختیار کرنا بھی جو شخص ایسا کرے گا وہ البتہ عذاب سے بچے گا' آگے اس کی صورت بتلاتے ہیں کہ کیا طریق ہوگا عذاب سے بچنے کا اور کیا خاصیت ہوگی اس طرز عمل کی لیکن اس خاصیت کے ذکر کو میں ذرا مؤخر کروں گا' گو

مقصود زیادہ اسی کو بیان کرنا ہے مگر چونکہ توبہ کا مضمون بھی جو اس مقام پر مذکور ہے ضروری ہے اس لیے میں اس طرف بھی متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

عادت احساس مٹادیتی ہے

حق تعالیٰ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں کا تدارک ضروری ہے چونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہم لوگوں سے کوتاہی ضرور ہورہی ہے اور وہ کوتاہی ظاہر ہے۔ یعنی حالت یہ ہے کہ عام طور سے سب ہی ارتکاب کررہے ہیں معاصی کا' سب ہی مبتلا ہیں پڑھے لکھے بھی ان پڑھ بھی' مرد بھی عورتیں بھی اور کسی کو اس طرف توجہ نہیں کہ ہاں میں گناہ کررہا ہوں' چاہے وہ گناہ چھوٹا ہی ہو بلکہ بعض حیثیتوں سے چھوٹا گناہ بھی بڑا بن جاتا ہے اس واسطے کہ جب گناہ کو چھوٹا سمجھا تو یہ گناہ کا چھوٹا سمجھنا خود بڑا گناہ ہے۔ یوں تو اعتقاداً چھوٹے گناہ کو چھوٹا سمجھے کیونکہ خود شریعت نے صغیرہ وکبیرہ کی طرف تقسیم کی ہے لیکن عملاً چھوٹا سمجھنے سے یعنی ہلکا سمجھنے سے اس پر اصرار ہوگا۔ اب وہ گناہ بڑا ہوگیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس مرض میں سب ہی مبتلا ہیں' دور کیوں جایئے اب غیبت ہی ہے۔ کون اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا لیکن ساتھ ہی جیسا کہ گناہوں سے کراہت ہونا چاہیے وہ کراہت اس سے نہیں' ٹٹول کر دیکھ لو عوام بھی' خواص بھی' مرد بھی عورت بھی کہ غیبت کو اتنا برا نہیں سمجھتے جیسا کہ اور گناہوں کو بلکہ دل بھی برا نہیں ہوتا جیسا کہ گناہ کرنے سے ہوتا ہے۔ دیکھئے اگر کسی مسلمان کو بھولے سے شراب پینے کے بعد یہ معلوم ہوجائے کہ میں نے دھوکے سے شراب پی لی ہے تو گو اس کو گناہ نہیں ہوا اس لیے کہ اس کو خبر ہی نہیں ہوئی کہ یہ شراب ہے لیکن ٹٹول کر دیکھ لیجئے کہ کتنی متلی ہوگی کہ کتنا جی برا ہوگا کتنا غصہ آئے گا پلانے والے پر اگر خود ہی دھوکہ میں پی گیا تو اپنے اوپر کتنا غصہ آئے گا اور کتنی نفریں کرے گا کہ **لاحول ولاقوۃ** کیا حماقت ہوئی' دوڑا دوڑا پھرے گا' بے چین ہوکر فتوے پوچھنے پہنچے گا کہ مولوی صاحب غضب ہوگیا' میں سمجھا کہ دوا ہے برتن میں حالانکہ تھی شراب' میں دوا کے دھوکہ میں پی گیا' بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تو شراب تھی' اجی میرا ایمان رہا گیا۔ اجی اب کس طرح اس کا تدارک کروں اب مولوی صاحب بہتیرا کہہ رہے ہیں کہ ارے بھائی غلطی میں گناہ نہیں ہوتا تم بے فکر رہو لیکن اس کا دل کسی طرح صاف نہیں ہوتا۔ کیوں صاحب شراب پینا بلاقصد حالانکہ گناہ نہ تھا صرف گناہ کے مشابہ تھا مگر اس سے کتنا جی برا ہوا لیکن ٹٹول کر دیکھئے کہ باوجود جاننے کے کہ غیبت

گناہ ہے‘غیبت کر کے کبھی اس سے آدھا‘ تہائی‘ چوتھائی بھی جی براہوتا ہے ہرگز نہیں۔ بس معلوم ہوا کہ عادت جو غیبت کرنے کی پڑگئی ہے کرتے کرتے مساوات ہوگئی ہے اور یہی حالت ہر گناہ کی ہے کہ عادت سے مساوات ہوجاتی ہے۔ ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ انہوں نے کہیں راستہ چلتے کسی کو کوئی گناہ کرتے ہوئے دیکھ لیا چونکہ اس سے پہلے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا‘ اس لیے اس قدر ناگوار ہوا اور اس قدر تکلیف پہنچی کہ مارے غصہ کے جب گھر گئے ہیں اور استنجے کی حاجت ہوئی تو پیشاب جو کیا تو بجائے پیشاب کے خالص خون نکلا‘ کیا ٹھکانا ہے اثر کا۔ اگلے دن پھر ایسا ہی اتفاق ہوا لیکن پیشاب ہی ہوا گو گرم ہوا پھر ایسا ہی اتفاق ہوا تو گرمی بھی نہ رہی اچھے خاصے ہوگئے جیسے تھے۔ تو دیکھئے عادت کو کتنا بڑا دخل ہے مگر گناہ دیکھنے کی عادت میں تو تھے مجبور اس لیے یہاں ملامت نہیں ہے اب کیا آنکھیں بند کر کے چلیں‘ کیا آنکھیں پھوڑ لیں‘ ایک شخص راستہ میں گناہ کرتا ہے اور پہلے سے خبر نہیں تو اگر اس پر بلا قصد نظر پڑ جائے تو مجبوری ہے اس پر اگر کراہت طبعی میں تفاوت ہوجائے تو کچھ غم نہیں کیونکہ یہ دیکھنا بقصد نہیں تھا لیکن گناہ کا صادر کرنا یہ تو اختیاری امر تھا۔ یہ گویا بقصد تھا اس سے جو تفاوت ہوا۔ یہ البتہ ہے قابل ملامت‘ تو یہ حالت ہوگئی ہے عادت کی وجہ سے کہ گناہ کر کے جی بھی برا نہیں ہوتا مگر تب بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایمان نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ عقلی واعتقادی ناگواری تو اب بھی ہوتی ہے چنانچہ کوئی متنبہ کرتا ہے تو نادم ہوتے ہیں‘ کہتے ہیں کہ بھائی دعا کرو ہم سے یہ گناہ چھوٹ جائیں اور ہم ان بری عادتوں سے نجات پائیں۔ بہرحال عقلی ناگواری کافی ہے بقاء ایمان کے لیے‘ اس واسطے میں نے عرض کیا تھا کہ معاصی سے بوجہ عادت کے اگر طبعی ناگواری نہ رہے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایمان نہیں رہا۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ جب نیکی کر کے جی خوش ہو اور گناہ کر کے رنج ہو تب تم مومن ہو تو بعض دفعہ یہ شبہ ہوجاتا ہے کہ یہ حالت تو ہماری نہیں۔ پس ہمارا کیا ایمان رہا اس میں بھی محقق کہتے ہیں کہ یہاں خوش ہونا اور جی براہونا طبعی مراد نہیں۔ اگر طبعی نہ ہو عقلی ہی ہو تب بھی کافی ہے بقائے ایمان کے لیے۔ ہاں اگر عقلاً بھی نہ ہو تو ایمان جاتا رہا۔ تو بہرحال اگرچہ بوجہ عادت پڑ جانے کے معاصی سے طبعاً کراہت نہیں رہی لیکن عقلاً تو برا سمجھتے ہیں۔ البتہ برائی کی وہ کیفیت جو اول بار گناہ کے صدور کے وقت ہوئی تھی وہ نہ رہی۔

اہتمام ترکِ معصیت ضروری ہے

ہر چند انسان امورِ طبعیہ کا مکلّف نہیں لیکن جب حق تعالیٰ نے ایک دولت دی ہو اور وہ ہو جائے کم' ہماری سوتدبیر سے تو چاہے گناہ نہ ہوا اس کے کم ہو جانے کا لیکن آئندہ کے لیے یہ دروازہ تو ہے معاصی کا کیونکہ اب مانع ضعیف ہو گیا ہے لہٰذا اندیشہ یہ ہو گیا ہے کہ معاصی کا صدور زیادہ ہوگا یہ بھی فکر کی بات ہے اس کا بھی تو غم ہونا چاہیے جو محتاط ہیں وہ احتمالات بعیدہ سے بھی مغموم ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ کسی کے پیٹ پر سے ایک دفعہ سوتے میں سانپ گزر گیا تھا وہ غم میں بیٹھا ہوا تھا لوگوں نے کہا کہ میاں اب غم کی کیا بات ہے خدا کا شکر کرو کہ بچ گئے کاٹا نہیں۔ اس نے کہا جی اس کا غم نہیں کہ اس نے کاٹ لیا مگر غم اس کا ہے کہ یہ اس کے آنے جانے کے لیے سڑک ہو گئی یہ برا ہوا کہ میرا پیٹ سانپ کا راستہ ہو گیا' دیکھئے کبھی کاٹ بھی نہ لے۔ یہ ہے تو حکایت ہنسی کی مگر ہر ہنسی سے نتیجہ نکالنا چاہیے اور سبق لینا چاہیے۔ گو یہ حکایت ہزل ہے مگر بعضے ہزل کے اندر بھی جد ہوا کرتا ہے تو اس حکایت میں جو احتیاط ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اندیشہ کی چیز سے بچنے کے اہتمام میں مشغول ہو اور تدبیر میں لگ جائے یہ معنی ہیں احتیاط کے تو اگر کسی نے غیبت کی اور اس کا جی برا نہ ہوا تو اس مقام میں چونکہ ایک باضابطہ مولوی یہ کہہ سکتا تھا کہ ایمان موجود ہے اور رنج طبعی ہے نہ ہوا تو گناہ کیا ہوا میں اس کا جواب دے رہا ہوں کہ بھائی پہلے جب مسرت طبعیہ اور کراہیت طبعیہ موجود تھی اس وقت یہ مانع قوی تھا' صدور معصیت کا اس وقت زیادہ مقاومت کی حاجت نہ ہوتی تھی کیونکہ خود طبیعت کے اندر ہی مقاوم موجود تھا۔ وہ مقاوم اب ضعیف ہو گیا' اب اگر بہت ہی اہتمام کے ساتھ معصیت سے رکو گے تب تو بچ سکو گے ورنہ بہت جلد مبتلا ہو جاؤ گے۔ دیکھئے شراب سے جو جی برا ہوتا ہے تو خود پینا تو درکنار اگر کوئی زبردستی پلا دے یا خود دھوکہ میں بلا قصد پی جائے تب بھی پریشان ہو جاتا ہے اور توبہ کرتا ہے اور غیبت سے ایسا جی برا نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات حس بھی نہیں ہوتی کہ ہم غیبت کر رہے ہیں بعض مرتبہ تو آخیر تک بھی حس نہیں ہوتی۔

رحمت کی قدر کی ضرورت

لیکن بعض دفعہ تھوڑی دیر ہی میں متنبہ ہو جاتا ہے مگر آدھی غیبت کے بعد پھر کون رکتا ہے۔ بالخصوص جو مولانا ہیں ان کو اس قسم کا متنبہ ضرور ہو جاتا ہے۔ البتہ عوام کو اکثر بالکل حس ہی نہیں ہوتی (مزاحاً فرمایا) وہ بڑے مزے میں ہیں' غیبت کو آخیر تک پہنچا کر ختم ہی کر دیتے ہیں اور انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم نے کوئی گناہ کیا اور مولانا صاحب کو بوجہ علم ہونے کے تنبہ ہوتا ہے خاص کر اگر کوئی مولانا صاحب تھوڑے سے شاہ صاحب بھی ہوں تب تو ضرور احساس ہوتا ہے مگر چونکہ بات تو شروع ہو گئی تھی تنبہ کے اثر کو دل سے ہٹا کر اور اس سے اعراض اور بے پروائی کر کے بجائے منقطع کر دینے کے غیبت کو اخیر تک پہنچا کر چھوڑتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اب حکایت تو شروع کر چکے ہیں غیبت تو ہو ہی گئی پھر اب چھوڑنے ہی سے کیا فائدہ ہو گا۔ دوسرے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اگر بیچ میں سے کہنا چھوڑ دوں گا تو سامع یوں سمجھے گا کہ اب آپ کو خبر ہوئی کہ یہ غیبت ہے اور یہ سمجھے گا کہ دیکھو مولانا صاحب نے شاہ صاحب نے باوجود غیبت ہونے کے پھر اس کا ارتکاب کیا اس سے ہماری شاہ صاحب اور مولوی صاحبی میں فرق آئے گا اور اگر غیبت کو پورا کر گئے تو اللہ تعالیٰ کو راضی کر لینا کونسا مشکل ہے کیونکہ انکی نظر شاہ صاحبی اور مولوی صاحبی پر نہیں ہے اور اگر بیچ میں منقطع کر دیا تو ہماری وقعت اور عظمت میں فرق آ جائے گا اور اللہ کو راضی کر لینا تو آسان سمجھتے ہیں جیسے توبہ توبہ بچے کا راضی کر لینا کہ چاہے جتنا رو رہا ہو اور غصہ کر رہا ہو جہاں اس سے یہ کہا کہ آج تجھے ہم ایک پیسہ دیں گے بس ہنسنے لگا' ان کا کیا ہے وہ تو ذرا سی دیر میں راضی ہو جاتے ہیں وہ تو بہت ہی ارزاں ہیں' اللہ توبہ اللہ توبہ نعوذ باللہ' یہ ان کی رحمت کی قدر کی۔

جباری وقہاری پر نظر رکھنے کی ضرورت

مگر جہاں ان کی رحمت پر نظر کی ان کی جباری ان کی قہاری ان کا جلال یہ بھی تو دیکھنے کے قابل تھے' اللہ اکبر اس پر نظر کر کے گناہوں سے ضرور رکاوٹ ہونی چاہیے کیونکہ ایسے جبار اور ایسے قہار کے راضی کرنے کی ہمت ہی کہاں پڑے گی۔ دیکھئے ایک حاکم پر پورا

اطمینان ہوتا ہے کہ میں جب معافی مانگوں گا ضرور معاف کردے گا مگر خدا جانتا ہے باوجود یقین کے بولنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اسی طرح جنہوں نے حق تعالیٰ کی عظمت کو پہچان لیا انہیں باوجود اس یقین کے کہ وہ رحیم وکریم ہیں معافی چاہنے سے ضرور معاف کردیں گے لیکن معافی مانگنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ایک عالم کو ان کے انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا' پوچھا کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا' انہوں نے کہا کہ حق تعالیٰ نے مجھے یہ فرمایا کہ تم ہمارے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کرتے جاؤ اور ہم سے معافی لیتے جاؤ چنانچہ میں نے سارے گناہوں کا تو اقرار کرلیا لیکن ایک ایسا واہیات گناہ ہے کہ ہمت نہیں ہوتی اس کے اقرار کرنے کی خدا کے سامنے۔ میں نے ایک لڑکے کو بری نگاہ سے دیکھا تھا اب یہ خدا کے سامنے کیسے کہوں کہ میں نے لڑکے کو گھورا تھا بس اس گناہ کے عذاب میں مبتلا ہوں' وہاں سے یہ اصرار ہے کہ زبان سے اقرار کرو' مجھے عذاب جھیلنا تو آسان ہے لیکن زبان سے یہ نہیں کہا جاتا کہ میں نے لڑکے کو گھورا تھا' بھلا ایسی واہیات بات کو خدا کے سامنے کیسے کہہ دوں' تو بات یہ ہے کہ بعد موت کے حقیقت اور عظمت حق جل شانہ وعم نوالہ کی منکشف ہوجاتی ہے اس لیے وہاں ان جلالت شان کا پورا اثر پڑے گا۔ یہاں چونکہ غفلت سے مستوری ہے استتار ہے اس لیے اثر نہیں ہوتا اور یہ بھی رحمت ہے کیونکہ اگر یہاں پر اتنا انکشاف ہوتا جتنا کہ آخرت میں ہوگا تو شاید شدت ہیبت سے نیک اعمال کا صدور بھی نہ ہوسکتا اس لیے حکمت کے اقتضاء سے کچھ استتار تو ہونا چاہیے مگر اتنا بھی نہیں کہ انکشاف کا کچھ اثر ہی نہ ہو۔ دونوں کا ہونا ضروری ہے من وجہ انکشاف ہو من وجہ استتار نہ اتنا انکشاف ہو کہ توبہ کرنے کی بھی ہمت نہ پڑے' نہ اتنا استتار ہو کہ معاودت معاصی پر حامل ہو' گناہوں کی کچھ پرواہی نہ تو خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی عظمت اور شان کا کچھ تو اثر ہونا چاہیے' گناہوں کے لیے کچھ تو رکاوٹ ہونا چاہیے' بس گویا یہ سمجھ رکھا ہے جس کی تشبیہ ایسی ہے جیسے بچے کے راضی کرلینے کی۔ کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے' خدا کے کمالات اور شان کا ماننے والا اور اس پر اس ماننے کا صرف ایسا اثر جیسے بچہ کا' کس قدر بے قدری ہے۔

اے گراں جان خوار دیدستی مرا　　　زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

(اے شخص تو مجھ کو صرف اسی لیے ذلیل سمجھتا ہے کہ تو نے مجھے سستا خرید لیا ہے)

کید نفس کی صورت

چونکہ دام تو خدا کے راضی کرنے میں لگے نہیں اس لیے یہ بے قدری ہے۔ "ماقدروا اللہ حق قدرہ" اس لیے خدا کا راضی کرنا آسان سمجھتے ہیں بہ نسبت مخلوق کی نظر سے گر جانے کے چونکہ مخلوق کی نظر سے گر جانا گراں اور ناگوار ہے اس واسطے یہ حضرت باوجود تنبہ کے وہ حکایت تو پوری کر ہی دیتے ہیں کیونکہ بیچ میں چھوڑنے سے سننے والے دل میں یہ نہ کہیں گے کہ حضرت نے غیبت شروع ہی کیوں کی تھی تو معلوم ہوا کہ ان حضرت کو دوران گفتگو ہی میں یہ خبر ہوگئی تھی کہ میں غیبت کر رہا ہوں پھر بھی اس کو چپکے چپکے کہے چلے گئے یہ تو مقدس نفوس کی حالت ہے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیتے ہیں کہ آئندہ کو خیال رکھیں گے اب جو غیبت شروع کر چکے ہیں اسے تو کر ہی لو تا کہ سننے والا اسی گمان میں رہے کہ حضرت غیبت کرتے ہی نہیں اس کا بھی پتہ نہ چلے کہ حضرت غیبت کرتے ہوئے بیچ میں چھوڑ دیتے ہیں کتنا بڑا کید نفس کا ہے' کچھ حد ہے۔ تو یہ کیا بات ہے' بات یہ ہے کہ جی اتنا بھی برا نہیں ہوتا جیسا عادت صدور کے قبل ہوتا اور میں بجائے ہوتا کے یوں نہ کہوں گا کہ قبل عادت صدور تھا کیونکہ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں کہ غیبت کے ارتکاب کی عادت نہ ہوئی ہو۔ غرض یہ ہے کہ ایسا جی برا نہیں ہوتا جیسے شراب پینے میں جو اول اول شراب پیتا ہے اس کا بہت جی برا ہوتا ہے اسی طرح افیون جو اول اول کھاتا ہے اسے بہت تکلیف ہوتی ہے خاص کر اگر سن لیں کہ افیون گناہ بھی ہے تب تو اور بھی جی برا ہوتا ہے۔ ویسے خود طبیعت بھی ایسی چیزوں کو قبول نہیں کرتی مگر باوجود اس کراہت طبعی کے جب عادت افیون کھانے کی پڑ جاتی ہے تو پھر یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر نہ ملے تو پریشان اور حیران ہوتا ہے اور آدمی تو آدمی' لکھنؤ کا واقعہ ہے ایک بندر کا قصہ سنا ہے کہ وہاں بزرگ نے یعنی کسی افیون نے کھلا کھلا کر ایک بندر کو افیون کی عادت ڈال دی' بڑا سا بندر تھا یہ حکایت سنی ہے واللہ اعلم کہاں تک صحیح ہے کہ وہ سڑک پر پڑا رہتا تھا' بڑا سا بندر تھا جو کوئی سفید پوش ادھر سے گزرتا اس کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتا مگر کاٹتا نہ تھا کیونکہ افیون کھانے سے آدمی خوش اخلاق بہت ہو جاتا ہے' غصہ تو رہتا ہی نہیں مگر کوئی صاحب اس غرض کے واسطے کہیں کھانا شروع نہ کر دیں' کسی کا اس نے دامن پکڑا وہ ڈرا کہ

کہیں کاٹ نہ کھاوے، کوئی شخص اس کے حال سے واقف آ گیا اس نے کہا کہ آپ ڈریئے نہیں، ایک پیسہ دے دیجئے اس کو افیون کی عادت ہے، افیون کے لیے پیسہ مانگ رہا ہے بس انہوں نے پیسہ دیدیا، اس نے پیسہ لیتے ہی دامن چھوڑ دیا، بس وہ اسی طرح ہمیشہ سفید پوشوں سے پیسہ وصول کر کے کسی افیون کی دکان پر پہنچتا تھا، سب کو اس کا حال معلوم تھا ہی دکاندار نے کٹوری میں افیون گھول کر سامنے رکھ دی اس نے پی لی اور کونہ میں آپ بیٹھ گئے مراقب۔ اب آپ بیٹھے پینگ میں جھوم رہے ہیں اور مزے لے رہے ہیں مگر ہمیشہ ایک ہی شخص کو نہ ستاتا تھا ہر روز اس کا مظلوم ایک مختلف شخص ہوتا تھا، بے چارہ بہت بھلا مانس بلکہ بھلا بندر تھا، بھلا مانس تو کیوں ہوتا مانس تو آدمی کو کہتے ہیں۔ غرض عادت کا خاصہ یہ ہے کہ طلب پیدا ہو جاتی ہے آدمی تو کیا جانور میں بھی اس سے طلب پیدا ہو جاتی ہے تو وجہ کیا، وجہ یہ ہے کہ چونکہ جی برا نہیں ہوتا اس لیے مانع طبعی نہیں ہے اور تجربہ ہے کہ ہم لوگوں کے افعال میں بھی اور تروک میں بھی یعنی جو افعال محمودہ ہم کرتے ہیں یا جن افعال مذمومہ سے ہم بچتے ہیں اس میں محض داعیہ عقلی کافی نہیں یعنی محض اس کے ذریعے سے اس فعل اور ترک پر سہولت سے قادر نہیں ہو سکتے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ کچھ طبعی تقاضا بھی ہو۔

توفیق منجانب اللہ ہوتی ہے

اب ہم نماز جو پڑھتے ہیں تو یوں سمجھتے ہوں گے کہ ہم بڑا کام کرتے ہیں حالانکہ نمازی سوچ لیں کہ نماز کے وقت قلب میں نماز کا تقاضا ایسا ہوتا ہے اگر نہ پڑھیں تو جی برا ہو اور دل پر بڑا بوجھ رہے۔ تو حضرت یہ وہ چیز ہے جو پانچوں وقت زبردستی نماز کے لیے کھڑا کر دیتی ہے۔ حدیث میں ہے:

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

(اللہ کی قسم اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتے تو ہم کبھی ہدایت یافتہ نہ ہوتے نہ ہم صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے)

یعنی لو لا ھدایة اللہ الخ اور ہدایت بھی کونسی ارائت الی المطلوب بھی نہیں ایصال الی المطلوب اگر وہ کشش نہ فرمائیں تو ہم سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

اگر از جانب معشوق نہ باشد کششے کشش عاشق بیچارہ بجائے نرسد

(اگر محبوب کی جانب سے کشش نہ ہو تو محض عاشق بے چارہ اپنی کوشش سے منزل مقصود پر نہ پہنچے گا)

یہ جو کچھ ہم سے نماز روزہ ہو رہا ہے یہ محض خدا کا فضل و کرم ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ یہ میری طلب کا نتیجہ ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی دراصل تیری زلفوں کا کام ہے لیکن مصلحتاً عشاق نے چین کے ہرنوں پر الزام لگایا ہے)

مگر نسبت آپ کے ارادہ ہی کی طرف کر دی جاتی ہے تاکہ آپ کا جی خوش ہو، ہمت بڑھے، جیسے بچہ سے باپ پتھر اٹھوا دیتا ہے، پتھر بچے سے تو اٹھتا نہیں لیکن باپ اٹھوا دیتا ہے اس طرح کہ ہاتھ تو لگا دیتا ہے اس کا لیکن اٹھالے جاتا ہے خود بلکہ بچے کو بھی خود اٹھالیتا ہے اس طرح کہ ایک گود میں تو بچہ اور ایک گود میں پتھر۔ کہتا ہے کہ واہ بھائی واہ بڑا بھاری پتھر اٹھا لائے شاباش۔ آہا اب تو ماشاءاللہ تو پہلوان ہو گئے، وہ بچہ خوش ہوتا ہے، سمجھتا ہے کہ ہم سچ مچ پہلوان ہو گئے، الو کہیں کا، وہ کیا پہلوان ہوتا وہ تو باپ نے دراصل پتھر اٹھایا ہے لیکن اس نے اپنے بچہ کی ہمت بڑھانے کے لیے اس کا بھی ہاتھ برائے نام لگا کر اٹھانا اسی کی طرف منسوب کر دیا اسی طرح انسان بڑا خوش ہوتا ہے کہ میں نے نماز پڑھی ہے حالانکہ حق تعالیٰ نے خود ایک گود میں آپ کو اور ایک گود میں نماز کو لے کر دونوں کو منزل مقصود تک پہنچا دیا ہے کام تو خود کیا اور نام آپ کا کیا کہ انہوں نے ہماری نماز ادا کی۔

مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چیں بستہ اند

(مصلحتاً عشاق نے چین کے ہرنوں پر الزام لگایا ہے)

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی

(حقیقت میں انہیں کا فضل ہے انہیں کی رحمت ہے کہ ہمیں اس طرح سے نیک کاموں کی توفیق دے رکھی ہے۔)

گناہوں کی جڑ

بہرحال اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بدون مانع طبعی کے گناہوں سے بچنا نہایت دشوار ہے اس لیے ضرورت ہے طبعی کراہت کی بھی سو قبل صدور معصیت تو طبعی کراہت ہوتی ہے

لیکن جب گناہ صادر ہوگیا تو وہ اب طبعی نفرت کم ہوئی۔ پھر صدور ہوا تو اور کم ہوئی پھر اور کم ہوئی اسی طرح کم ہوتے ہوتے پھر نفرت طبعی تو رہتی نہیں صرف عقلی رہ جاتی ہے ایمان تو رہتا ہے مگر وہ جو پہلے ایک عرفان کی کیفیت تھی اور ایقان کی وہ جاتی رہتی ہے پھر ہر موقع پر سخت مقاومت کی ضرورت پڑتی ہے وہ جو آسانی سے بچا رہتا تھا وہ بات نہیں رہتی اس لیے ضرورت ہے کہ ہر مسلمان محض اکتساب فضائل ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ گناہوں کو بھی چھوڑ دے یک لخت اور دفعۃً اس کا اہتمام کرے چند روز تو اہتمام کرنا پڑے گا پھر سہولت ہو جائے گی۔ حالت موجودہ میں چونکہ طبعی نفرت گناہوں سے جیسی چاہیے ویسی نہیں ہے اس لیے کوئی غیبت میں مبتلا ہے کوئی حرام خوری میں مبتلا ہے کوئی کینہ میں مبتلا ہے کوئی حسد میں مبتلا ہے کوئی تکبر میں مبتلا ہے اور غضب یہ ہے کہ ان گناہوں کے چھوڑنے کی فکر بھی نہیں، بہت سے ایسے ہیں کہ چوری نہیں کرتے، شراب خوری نہیں کرتے، بہت سے ایسے گناہوں سے بچے ہوئے ہیں، نمازوں کے بھی پابند ہیں، باقی حسد، کینہ، تکبر دوسروں کو ذلیل سمجھنا کسی کے ساتھ بدگمانی کرنا ان کو تو گناہ ہی نہیں سمجھتے حالانکہ یہ ایسے گناہ ہیں کہ سب گناہوں سے بڑھ کر بلکہ یہ جڑ ہیں سب گناہوں کی چونکہ ان گناہوں کو گناہ ہی نہیں سمجھتے اس لیے بے تکلف ارتکاب کرتے ہیں اور ارتکاب کے بعد اپنے کو مقدس سمجھتے ہیں، شراب پینے والے کو فاسق، فاجر سمجھتے ہیں اور اپنے کو مقدس سمجھتے ہیں حالانکہ کیا حق ہے انہیں اپنے آپ کو مقدس سمجھنے کا۔

ریا حلال شمارند وجام بادہ حرام زہے شریعت وملت زہی طریقت وکیش

(ریا کاری کو حلال سمجھتے ہیں اور شراب کے پیالہ کو حرام، کیا ہی شریعت وملت ہے اور یہی طریقت ومذہب ہے)

یہ عجیب شریعت ہے اور یہ عجیب طریقت ہے۔ دونوں کی خبر لی ہے حضرت حافظ شیرازی نے، مولویوں کی بھی اور درویشوں کی بھی یعنی یہ عجب مولویت ہے اور یہ عجب درویشی ہے کہ ریا کو اور نمائش کو اور جو اخلاق رذیلہ ہیں نفسانیہ ان کو تو حلال سمجھتے ہیں، ہاتھ میں تسبیح ہے اور غیبتیں کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ اللہ کر رہے ہیں۔ بعض کو تو دیکھا کہ تسبیح پڑھتے پڑھتے تھوڑی دیر کے لیے پڑھنا منقطع کر دیتے ہیں اور اس توقف میں غیبت کر لیتے ہیں مگر

تماشا تو ہم نے یہ دیکھا کہ تسبیح کے دانے بھی برابر چل رہے ہیں اور غیبت بھی کر رہے ہیں۔ نہیں معلوم غیبتیں شمار کر رہے ہیں' پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ ہمارا قلب ذاکر ہے' بس اس ذکر کو ہم گنتے ہیں' ''سبحان اللہ سبحہ بر کف توبہ برلب دل پر از ذوق'' (ہاتھ میں تسبیح' زبان پر توبہ اور دل ذوق گناہ سے بھرا ہوا) گناہ یہ ہے سبحہ بر کف توبہ برلب دل پر از ذوق گناہ۔ سبحہ سین سے ہے یعنی تسبیح معصیت راخندہ می آید بر استغفار ما۔ ہماری توبہ ایسی ہے کہ اس پر گناہ ہی ہنسیں تو تعجب نہیں کیونکہ دل سے تو گناہوں کے کرنے کے لیے تیار ہیں اور زبان سے ان گناہوں کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو واقعی استغفار کی حالت ہے نہ کہ استغفار بھی ہو بلکہ ہاتھ میں تو تسبیح ہے اور بجائے استغفار کے الٹی غیبتیں کر رہے ہیں' گناہ تو کر رہے ہیں اور دکھانے کو کھٹ کھٹ تسبیح بھی چل رہی ہے پس نفلیں اور تسبیح پڑھنے کا نام تقدس اور بزرگی رہ گیا ہے بالخصوص عورتوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی بڑی معراج یہ ہے کہ قرآن ختم کر لیا اور حضرت اگر دو ایک سپارہ بھی روز پڑھنے لگیں پھر تو رابعہ بصریہؒ ہو گئیں اور اگر ترجمہ بھی پڑھ لیا تب تو حضرت عائشہ سے بھی بڑھ گئیں' حضرت فاطمہ سے بھی آگے نکل گئیں' ایسی جلدی ناز ہوتا ہے ان کو کہ ایک بیوی تھیں ذرا دیندار ان کا شوہر تھا ذرا عامی شخص' تو آپ کیا کہتی ہیں کہ اللہ اللہ مجھ جیسی پارسا اور افسوس ایسے سے بیاہی ہے کمبخت اپنے منہ سے پارسا کہتے شرم بھی نہ آئی۔ اپنے آپ کو پارسا سمجھنے سے سب کیا دھرا برباد ہو جاتا ہے جہاں خیال میں آیا کہ میں کچھ ہوں بس سب کیا کرایا برباد ہو گیا تو صاحب کا ہے پر ناز کرتے ہو تو ان کو بڑی جلدی ناز ہو جاتا ہے تو کیا بات ہے۔ بات یہ ہے کہ تقدس فقط اس کو سمجھتی ہیں کہ نفلیں پڑھ لیں' وظیفے پڑھ لیے' قرآن پڑھ لیا' ترجمہ سیکھ لیا اور جو بی بی جی بھی ہو گئیں یعنی دو چار لڑکیوں کو بھی پڑھانے لگیں پھر تو معلم الملکوت ہو گئیں کیونکہ بچے بھی معصوم ہونے میں فرشتوں کے مشابہ ہیں اور چونکہ اسی میں منحصر سمجھ لیا ہے طاعتوں کو کہ ہم دس لڑکیوں کو پڑھاتے ہیں اس لیے غیبت سے وہ نہیں بچتی' تکبر سے وہ نہیں بچتی' کینہ اور حسد سے وہ نہیں بچتی' کسی پر طعن کرنا کسی کا دل دکھانا کسی کو کوسنا کاٹنا فخر کرنا شیخی بگھارنا دعویٰ کرنا یہ اس کے نزدیک گویا گناہ ہی نہیں اس میں سب مبتلا ہیں' خاص کر جو نیک بیبیاں ہیں ان کے یہاں رات دن یہی باتیں ہیں۔

حقوق اللہ کی حقیقت

حدیث شریف میں ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت کا ذکر آیا کہ وہ بہت نمازیں پڑھتی ہے، بہت روزے رکھتی ہے، بہت قرآن پڑھتی ہے "ولکن توذی جیرانھا" لیکن زبان دراز ہے، اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: "ھی فی النار[1]" وہ دوزخی ہے اور یہ بھی پوچھا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت ہے کہ وہ بہت نماز روزہ تو نہیں کرتی یہ نہیں کہ فرض نماز روزہ بھی نہ کرتی تھی مطلب یہ تھا کہ بہت نفل نمازیں نہ پڑھتی تھی اور بہت نفل روزے نہ رکھتی تھی جیسے ایک عورت نے مجھ سے کہا کہ مولوی جی میں آٹھ وقت کی نماز پڑھتی ہوں۔ میں نے کہا کہ کم بخت، اللہ تعالیٰ نے تو پانچ وقت کی نماز فرض کی اور تو آٹھ وقت کی پڑھتی ہے۔ اگر تہجد، اشراق اور اوابین کی نفلیں مراد ہیں تو کہاں نفل نماز کہاں فرض نماز ان کو ان میں کیوں ملاتی ہے، یوں کیوں نہ کہہ دیا کہ میں یہ یہ نفلیں پڑھتی ہوں، فرضوں کے ساتھ نفلوں کو بھی آپ نے ملا دیا اور ہانک دیا کہ میں آٹھ وقت کی نماز پڑھتی ہوں تا کہ یوں معلوم ہو کہ آٹھوں نمازیں ایک ہی درجہ کی ہیں۔ یہ حالت ہے تو وہ عورت زیادہ نماز روزہ نہ کرتی تھی جیسا کہ بعض عورتیں نفلیں بہت پڑھا کرتی ہیں اور نفل روزے بہت رکھتی ہیں، یعنی شب برأت کا روزہ مریم روزہ شش عید کے روزے تو بعضی جو نیک عورتیں ہیں وہ نفلیں بہت پڑھا کرتی ہیں، روزہ بہت رکھا کرتی ہیں، یہ بات نہیں تھی اس بیچاری میں یعنی ضروری ضروری نماز روزہ کرتی تھی "ولکن لا توذی جیرانھا" لیکن زبان دراز نہیں تھی اور اپنے پڑوسیوں کو تکلیف نہیں پہنچاتی تھی، آپ نے فرمایا: "ھی فی الجنۃ" وہ جنت میں ہے۔ حضرت خدا کے یہاں اول تو اس پر نظر ہے یعنی حقوق اللہ کی نسبت حقوق العباد پر زیادہ نظر ہے کیونکہ حقوق اللہ جو ہیں وہ دراصل ہم لوگوں کے ہی حقوق النفس ہیں مگر یہ حق تعالیٰ کی رحمت اور شفقت ہے کہ اگر کوئی اپنے حق کو ادا کرے مثلاً نماز پڑھے تو وہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے میرا حق ادا کیا تا کہ جی خوش ہو اور دل بڑھے کہ کتنا بڑا فضل ہے کہ کیا تو میں نے اپنا کام خدا نے اس کو اپنا کام بنالیا، نماز روزہ وغیرہ کو خدا نے اپنا حق

[1] مسند احمد ۲: ۴۴۰، مجمع الزوائد ۸: ۱۶۸، مشکوٰۃ: ۴۹۹۲

قرار دیا حالانکہ حقیقت میں یہ سب ہمارے ہی حقوق ہیں کیونکہ حق تو وہ ہے کہ اگر اس کو نہ ادا کیا جائے تو صاحب حق کا ضرر ہو جیسے کسی کے دس روپیہ ہمارے ذمہ ہیں اگر ہم نہ دیں تو اس کا ضرر ہے سو اگر ہم نماز روزہ نہ کریں تو خدا کا کیا ضرر ہے وہاں تو یہ کیفیت ہے: ''مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ'' اور یہ شان ہے کہ ''اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ'' یعنی اگر تم کفر بھی کرو تو حق تعالیٰ پسند تو نہیں کرتا لیکن اس کا نقصان نہیں تو حضرت اس واسطے جو حقوق اللہ ہیں وہ بھی ہمارے ہی حقوق ہیں اگر نماز روزہ نہ کریں تو ہمارا ہی نقصان ہے خدا کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ ظاہر ہے جب یہ بات ہے تو حق تعالیٰ کی اس پر زیادہ نظر ہے کہ کون تو ایسا ہے جو اپنے حقوق کی زیادہ نگہداشت کرتا ہے اور کون ایسا ہے جو دوسروں کے حقوق کی رعایت کرتا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے اس کا قاعدہ کہ حق العبد مقدم علی حق اللہ بہت سی نظیریں اس کی مثلاً زکوٰۃ ہے اس کے بارہ میں یہ حکم ہے کہ جو مقروض ہو اس کے ذمہ زکوٰۃ نہیں اس واسطے کہ زکوٰۃ ہے خدا کا حق اور قرض ہے بندہ کا حق اور بندہ کا حق مقدم ہے۔ خدا کے حق پر اب یہاں یہ شبہ ہوتا ہے عوام کو کہ جب خدا بڑا ہے تو اس کا حق بھی بڑا ہونا چاہیے لیکن میری اس تقریر سے وہ بھی رفع ہو گیا کہ وہ تو مجازاً کہا جاتا ہے خدا کا حق دراصل وہ تو اپنے ہی نفس کا حق ہے پھر جو حق تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت کر دی تو اس واسطے چونکہ اس نے حکم کیا اور حکم کیوں کیا۔ حکم اس لیے کیا کہ نفس کو نفع پہنچے تو دو حیثیتیں ہیں اس قسم کے حق کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ خدا کا حکم ہے اس حیثیت سے تو وہ حق اللہ ہے مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ اس حکم کی بنا کیا ہے سو بنا یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی خدا کا نفع ہے نہیں بلکہ اس حکم کرنے کی بنا فقط یہ ہے کہ بندہ کے نفس کو نفع پہنچے اس حیثیت سے وہ حق نفس ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ہم نے کسی کی دعوت کی کوئی مہمان ہے ہمارا اگر وہ کھانا کھاوے گا تو اسی کا نفع ہے ہمارا کوئی نفع نہیں کیونکہ اس کا کھانا ہمارے پیٹ میں تھوڑا ہی چلا جاوے گا اور اگر وہ نہ کھاوے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں اسی کا نقصان ہے۔ یوں تعلق کی وجہ سے وہ یہ کہہ دے تو اور بات ہے کہ دیکھئے میں نے کہنا مان لیا اور کھانا کھا لیا یہ ہماری لیاقت کی بات ہے کہ اس کے کھانے کو اپنا نفع اور اس کے نہ کھانے کو اپنی ضرر سمجھیں تو حقیقت میں نفس کے حق پر دوسرے کے حق کو مقدم کیا گیا ہے اس پر فقہاء کی بہت نظر ہے یہاں تک کہ اس تقدیم پر بہت سے احکام متفرع کیے گئے ہیں۔

حقوق العباد سے غفلت

لیکن باوجود تقدیم حقوق غیر کے ہمارا معاملہ ایسا ہے لوگوں کے ساتھ جیسے بھیڑیا کا بھیڑ کے ساتھ کہ پرائے حق کو کھاتے ہیں' پرائی آبرو برباد کرتے ہیں' غیبتیں کر کے شکایتیں کر کر کے بات کہنے میں اس کی پروا نہیں ہے کہ کسی کو ناگوار ہوگی جو جی میں آیا پھٹ سے کہہ دیا کہ کسی کو رنج ہوا کرے وہ سیاست بھی کرتے ہیں تو محض غیظ نفس سے حالانکہ

درشتی و نرمی بہم در بہ است   چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

(سختی اور نرمی ساتھ ساتھ اچھی ہوتی ہے جس طرح فصد کھولنے والا نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے)

جس پر سیاست کرنے کا حق ہو اس پر کبھی کبھی سختی بھی کر سکتے ہیں مگر حدود سے تو خارج ہونا جائز نہیں ہے کیونکہ سیاست کے بھی حدود ہیں' سختی کے بھی حدود ہیں' سزا کے بھی حدود ہیں اب تو محض غیظ نفس منشاء ہوتا ہے ہم لوگ ایسے ایسے گناہوں میں تو مبتلا ہیں پھر اپنے آپ کو ہیچ سمجھتے ہیں کہ ہم مقدس ہیں بلکہ جو فاسق فاجر ہیں اکثر دیکھا کہ ان میں تکبر ہوتا ہے جو بدترین گناہ ہے۔ پھر مقدس ہی کہاں رہے خلاصہ یہ کہ اگر یہ گناہ ہوں تو اور دوسرے گناہ ہوں تو ہمارا یہ برتاؤ ہو رہا ہے۔ اے صاحب خیر گناہ سے جی برا نہ ہو تو خدا نے عقل تو دی ہے ذہن تو دیا ہے کان تو ہیں کانوں میں تو پڑا تھا کہ یہ گناہ ہے پھر چاہے جی برا ہوتا نہ ہوتا اس سے بچنا چاہیے تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ گناہوں کا چھوڑنا ایک امر عظیم الشان ہے اس لیے میں نے پہلے اس کا بقدر ضرورت بیان کر دیا ہے تاکہ من تاب میں تو داخل ہو جاؤ۔

توبہ کا طریق

پھر اس داخل ہونے کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا۔ "فَاُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّئَاتِھِمْ حَسَنَاتٍ" (تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا) لیکن من تاب میں جب شامل ہوں گے جبکہ توبہ بھی طریقہ سے کرو گے کیونکہ ہر گناہ سے توبہ کرنے کا جدا طریقہ ہے۔ مثلاً اگر نماز نہیں پڑھی تو توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ پچھلی نماز قضا کرو اور

آگے کو ادا کرتے رہو اگر حج نہیں کیا تو اب کرلو اور پچھلے گناہ سے توبہ کرلو کسی کے مال کا نقصان کیا ہے تو مالک کو ادا کردیا، واپس کردیا، معاف کراؤ اور آئندہ کو برابر حق ادا کرتے رہو، آئندہ کسی کا حق ضائع نہ کرو، اگر غیبت کی ہو معاف کراؤ۔ اگر وہ شخص جس کی غیبت کی تھی مرگیا ہو یا اس سے ملنے کی امید نہ ہو تو یہ بھی طریقہ ہے کہ اس کے لیے ہمیشہ دعائے مغفرت کرتے رہو، اس سے بھی غیبت کا گناہ معاف ہوجاتا ہے۔ قیامت میں خدا تعالیٰ اس سے معاف کرادے گا۔ بہرحال ہر گناہ سے توبہ کرنے کا طریقہ جو معین ہے شریعت والوں سے پوچھ کر عمل کرو اور اس طریقہ کو استعمال کرو، توبہ میں خاصیت ہے کہ کوئی کتنا ہی بڑا گنہگار ہو کسی نے کتنے ہی زیادہ گناہ کیے ہوں حق تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے سب معاف فرمادیتے ہیں تو غرض من تاب کے تعلق سے یہ مضمون بھی ضروری تھا اور یہ میں اوپر بیان کرچکا ہوں کہ توبہ عن الشرک کا نام ہے ایمان، غرض توبہ ہی میں یہ بھی داخل ہے۔ ایمان بھی توبہ ہی کا ایک فرد ہے۔

نیک اعمال کی تاکید

آگے **عمل عملاً صالحاً** یعنی توبہ کے بعد بے فکر نہ ہوجایئے بلکہ آئندہ بھی نیک عمل کرتا رہے اور یہ میں بیان کرہی چکا ہوں کہ توبہ کے مفہوم میں دو چیزیں ہیں ایک وہ اعمال جن کے کرنے کا حکم ہے ان کو پابندی سے ادا کرتا رہے اور جن سے ممانعت ہے ان کا گویا اہتمام کے ساتھ تارک رہے یہ دونوں **عملاً صالحاً** میں داخل ہیں اور یہاں یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ فعل ترک کو کیسے شامل ہوگا۔ خوب سمجھ لو کہ ظاہر میں گناہوں کا چھوڑنا مفہوم عدمی معلوم ہوتا ہے مگر دراصل مفہوم وجودی ہے اس کا معنون وجودی ہے گو عنوان عدمی ہے اس کے سمجھنے کے واسطے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے، یوں سمجھئے اس سے بھی آسان تقریر کرتا ہوں، انسان جو مکلّف کیا گیا ہے تو اعمال اختیاریہ کا مکلّف کیا گیا ہے جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب یہ سمجھئے کہ مثلاً ہم جو اس وقت کھڑے ہیں تو نہ چوری کررہے ہیں نہ شراب پی رہے ہیں نہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، غرض سینکڑوں گناہ ہیں جن کو ہم اس وقت چھوڑے ہوئے ہیں، ایک تو ترک یہ ہے یہ تو ایسا ہے کہ اس ترک کی طرف ہمارا التفات بھی نہیں ہوتا اس کو ترک نہیں کہتے اس واسطے کہ جس ترک کا انسان مکلّف بنایا گیا ہے وہ ترک ہے جو

اپنے اختیار اور قصد سے ہو اور اختیار اور قصد کا مسبوق بالعلم ہونا ضروری ہے اور یہ ترک مسبوق بالعلم نہیں لہٰذا یہ وہ ترک ہی نہیں جس کا انسان مکلف بنایا گیا ہے اور یہ ترک مفہوم عدمی ہے جب انسان اس کا مکلّف نہیں تو اس ترک کا حکم بھی نہیں۔ ایک ترک تو یہ ہے اور ایک ترک یہ ہے کہ یا تو کوئی فی الحال داعیہ ہو مثلاً کوئی عورت چلی جارہی ہے جی چاہا کہ لاؤ اسے دیکھیں پھر نگاہ کو روک لیا' یہ ہے ترک وجودی اس کے لیے ضرورت ہے علم اور قصد کی مثلاً شراب پینے کا قصد تو نہیں لیکن ساتھ ہی یہ خیال ہے کہ کبھی نہیں پئیں گے' انشاء اللہ۔ یہ ترک وجودی ہے عدمی نہیں اور اجر اسی پر ملتا ہے ورنہ اگر ترک عدمی پر بھی اجر ملتا تو یہ لازم آتا کہ ہر لحہ میں کروڑوں طاعتوں کا اجر مل رہا ہے مثلاً اس وقت ہم ہزاروں گناہوں کو نہیں کر رہے ہیں' فرض کرو نامحرم پر نظر کرنا ہی ہے ہم اس وقت کسی نامحرم پر نظر نہیں کر رہے ہیں اب نامحرم ہیں لاکھوں' نہ ہم زینت کو دیکھ رہے ہیں نہ ہندہ کو دیکھ رہے ہیں' نہ خالدہ کو دیکھ رہے ہیں نہ اور کسی کو دیکھ رہے ہیں۔ غرض دنیا میں جتنی نامحرم عورتیں ہیں ان میں سے ہم اس وقت کسی کو بھی نہیں دیکھ رہے ہیں تو چاہیے کہ دنیا بھر کی نامحرم عورتوں پر نظر نہ کرنے کا ہمیں ثواب ملے بلکہ اور جتنی مرچکی ہیں اور جو آئندہ پیدا ہوں ان سب پر نظر نہ کرنے کا ثواب بھی ملے تو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نفخ صور تک جتنی نامحرم عورتیں ہوں ان سب پر نظر نہ کرنے کا ثواب گویا ہمیں ہر لحہ مل رہا ہے اس سے تو یہ لازم آیا کہ ہر شخص کے نامہ اعمال میں گناہوں سے نیکیوں کا شمار زیادہ ہو اس کا تو کوئی بھی قائل نہیں ہوسکتا کیونکہ قاعدہ ہے کہ:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَفِىْ عِيْشَةٍ رَاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ.

(پھر وزن اعمال کے بعد جس شخص کا پلہ بھاری ہوگا وہ تو خاطر خواہ آرام میں ہوگا اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی وہ کافر ہوگا) تو اسکا ٹھکانا ھاویہ ہوگا) اگر یہ بات ہو تو ہر شخص کی طاعات کا پلہ ہمیشہ معاصی سے بڑھا رہے اگر کوئی نماز کبھی نہ پڑھے تب بھی تو چاہیے کہ کوئی معذب ہی نہ ہو حالانکہ یہ نص کے خلاف ہے۔ علماء نے تصریح ہی کر دی ہے کہ ترک وہی ماجور علیہ ہے جو وجودی ہو تو عملاً صالحاً میں یہ تروک بھی شامل ہیں۔ تو خلاصہ توبہ کا یہ ہوا کہ جن اعمال کا حکم ہے ان کو کرنا اور جن کی ممانعت اور ان کو ترک کرنا تو

خلاصہ ارشاد کا یہ ہے کہ فقط توبہ پر اکتفا نہ کرے بلکہ آئندہ کے لیے بھی اصلاح اعمال کرے یعنی گناہوں کو بھی چھوڑے اور اعمال کی پابندی بھی کرے۔

ایمان پر عمل صالح کی خاصیت

اب اس کے واسطے ضرورت ہوگی علم حاصل کرنے کی کسی سے پوچھ کر یا پڑھ کر جب اس طریق سے توبہ کر چکا تو اب گویا خدا کے رستہ پر پڑا ہے۔ اب اس کے متعلق اس کو کچھ احوال پیش آئیں گے۔ ان کے متعلق میں ایک مضمون بیان کرتا ہوں گو وہ مختصر ہی ہوگا مگر انشاء اللہ کافی ہوگا اور بہت نافع۔ وہ یہ ہے کہ میں اب خاصیت بیان کرتا ہوں کہ ایمان اور عمل صالح میں خاصیت کیا ہے اس خاصیت کی بابت فرماتے ہیں: "فَاُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ" یعنی اس کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔ یہ ہے ترجمہ یعنی ان کے اندر جو برائیاں یعنی بری باتیں ہیں ان کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔ یہ خاصیت بیان کی ہے حق تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کی۔ البتہ اس خاصیت کا قوت وضعف تابع ہوگا، ایمان وعمل صالح کی قوت وضعف کے نیز یہ خاصیت فی نفسہ ہے، یہ ممکن ہے کہ کسی عارض ظاہری یا باطنی کے سبب اس کا ظہور نہ ہو، اب اس کی تھوڑی سی تفصیل میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا صورت تبدیل کی ہوئی ہے تو محققین اور اہل تجربہ کے ارشاد سے اور اپنے متعلقین کو جو مختلف احوال پیش آتے رہتے ہیں یعنی جن کی تربیت باطن میرے متعلق ہے وہ جو اپنے احوال و کیفیات بیان کرتے رہتے ہیں ان سب احوال ومقالات سے اخذ کر کے جو تفصیل مجھے معلوم ہوئی ہے اس کو میں نقل کرتا ہوں حاصل اس تفصیل کا یہ ہے کہ جو خدا کے رستہ میں چلنا شروع کرتا ہے اس کے درمیان میں دو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ایک اول ہوتی ہے ایک بعد میں ہوتی ہے یعنی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ سب سے اول تو تبدیلی یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ملکات کو بدلتے ہیں جس سے اعانت ہوتی ہے طاعت کے دوام واستقامت پر اور معاصی سے اجتناب پر اس کے لیے ایک مقدمہ عرض کرتا ہوں جس سے اس تبدیل کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہوگی وہ یہ ہے کہ افعال تابع ہوتے ہیں ملکات کے اور یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بغیر داعیہ کے عادۃً استمرار اعمال کا متعذر ہے اور داعیہ ہی ہے وہ بلکہ جو

اندر سے تقاضا کرتا ہے اس کا اثر یہ ہے کہ فعل سہولت سے سادہ ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ملکات متبوع ہیں اور اعمال ان کے تابع ہیں جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب یہ سمجھئے کہ حق تعالیٰ کیا کرتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا پرورش فرماتے ہیں اسی سلسلہ میں مجھے اس وقت یہ آیت یاد آ گئی: "اِتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْدًا يُصْلِحْ لَكُمْ" (اور اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کرو تو خدا تعالیٰ (اس کے صلہ میں) تمہارے اعمال قبول کرے گا) ظاہراً اصلاح فعل ہے بندہ کا تو یہاں سوال ہوتا ہے کہ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا اس سے تو متوہم ہوتا ہے کہ آپ ہی آپ اصلاح ہو جائے گی یعنی اللہ تعالیٰ خود ہی مثلاً نماز پڑھوا دیں گے کہیں ایسا ہوا بھی ہے پھر **یصلح لکم** کے کیا معنی۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اسناد اس اعتبار سے ہے کہ وہ اصلاح کا سامان پہلے مہیا کر دیتے ہیں اس کے بعد وہ مستلزم ہوتا ہے ترتب اصلاح کو کیونکہ جب ملکات درست ہو گئے تو معاصی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے دشواری نہیں رہتی اس معنی کر دہ اصلاح حق تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہے اور بندہ کی طرف بھی تو مدد یہ ہوتی ہے حق تعالیٰ کی طرف سے کہ ملکات کو بدل دیتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ بدون ملکات کے درست ہوئے انسان سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

جب تک ملکات درست نہ ہوں بہت کم توقع ہے کہ افعال شنیعہ کا صدور نہ ہو سکے اور یہ تبدیل کا قصہ طویل الذیل اور وسیع ہے یعنی اس کے تحقق اور ظہور کا سلسلہ آخرت تک جاری رہتا ہے یہاں بھی تبدل ہوتا ہے مختلف حالتوں میں وہاں بھی۔ یہ ایسا جامع وعدہ ہے سبحان اللہ سالکین ہر قدم پر اس کا تحقق دیکھتے ہیں اور واقعی حق تعالیٰ کے وعدہ کی ایسی ہی شان ہونی چاہیے۔ خود فرما رہے ہیں: "اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" (ایسا اجر جو کبھی منقطع نہ ہوگا) قطع نظر آخرت کے میں دیکھتا ہوں کہ دنیا ہی میں یہ تبدل شروع ہو جاتا ہے یہیں سے استمرار اور اثبات اور دوام سب کی توفیق ہوتی ہے اور اس تبدیلی کا انقطاع ہی نہیں جو تبدیلی ہوتی ہے ہوتی ہی چلی جاتی ہے چونکہ یہ تبدیلی سالکین کو پیش آتی ہے اس لیے ان کو تنبیہ کر دینا ضروری معلوم ہوا تا کہ ان کو اس کی بصیرت ہو کہ کتنی بڑی دولت ہم کو حاصل ہوئی ہے اس نے اپنا کام کیا تھا۔ یعنی اعمال صالحہ شروع کیے تھے اور مطلوب ہے اعمال صالحہ کا دوام اس دوام میں وہ خود اس طرح فرماتے ہیں کہ اس کے

اندر جو ملکات تھے سیئہ ان کو بدل کر ملکات حسنہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً پہلے بخل غالب تھا اب سخاوت غالب ہوگئی۔ یہیں سے عاقل سمجھ جائے گا کہ ملکات حسنہ کو اور قوی کر دیا جائے گا اس واسطے کہ جتنا ضعف ملکات حسنہ میں تھا وہ ملکات سیئہ کی آمیزش سے تھا تو ضرور ہوا کہ اب ملکات حسنہ کا حسن اور زیادہ ہو جائے گا کیونکہ حسن کی کمی کی علت قبیح کی آمیزش ہی تو ہے۔ غرض اس تبدیل کا حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ ملکات حسنہ کو تو پہلے سے بھی زیادہ قوی کر دیتے ہیں اور ملکات سیئہ کو ضعیف اور مضمحل کر دیتے ہیں۔ مضمحل میں نے اس لیے کہا کہ ملکات سیئہ کا بالکل ازالہ نہیں ہوتا اس واسطے کہ اگر بالکل ازالہ ہو جاوے تو یہ حکمت کے خلاف ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ ثواب ملے کیونکہ ازالہ کی صورت میں تو گناہوں سے بچنے میں کوئی ثواب ہی نہیں اس واسطے کہ جب دل میں گناہ کا تقاضا ہی نہ رہا بالکل التفات ہی نہ رہا ترک طاعت کا وسوسہ ہی نہ آوے تو گویا گناہ کے صدور کی قدرت ہی نہ رہی اس وقت اختیار طاعت اور ترک معصیت کوئی کمال ہی نہیں اس لیے ملکات سیئہ کا ازالہ تو نہیں ہوتا ہاں ان میں اضمحلال ہو جاتا ہے یعنی ان کے تقاضے کی کیفیت اتنی مضمحل ہو جاتی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا کہ نہیں ہے اس لیے بعض سالکین کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم میں اب کوئی ملکہ سیئہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بعد چندے کسی محرک سے وہ ملکات عود کرتے ہیں تو روتے ہیں سالک صاحب بیٹھ کر کہ ہائے میرا سارا مجاہدہ برباد ہو گیا۔ ارے یہ تو پھر معصیت کے تقاضے ہونے لگے۔

تبدیل ملکات کی حقیقت

اس وجہ سے مجھے متنبہ کرنا ضروری ہے کہ تبدیل ملکات کی حقیقت کیا ہے اور اس کی صورت کیا ہوتی ہے سالک نے غلطی اس لیے کی کہ وہ حقیقت اس تبدیل کی نہیں سمجھا وہ تبدیل ایسی سمجھتا ہے کہ ملکات سیئہ بالکل ہی جاتے رہتے ہیں حالانکہ ملکات سیئہ زائل نہیں ہوتے بلکہ ان میں اضمحلال ہو جاتا ہے مگر اس اضمحلال کا اثر ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا زوال کا تو یہ رحمت ہے کہ دواعی خیر کے تو قوی ہو جاتے ہیں اور دواعی شر کے ضعیف ہو جاتے ہیں نیکی کا تو ہر وقت تقاضا ہوتا رہتا ہے اور برائی کا بالکل تقاضا نہیں ہوتا بلکہ ترک طاعت اور ارتکاب معصیت ایسا دشوار ہو جاتا ہے کہ اگر اس کا قصد بھی کرے تو اس قدر جی برا ہو کہ گویا

کر ڈالا اور اس تبدیل کو فنا بھی کہتے ہیں کیونکہ بجائے ملکات سیئہ کے ملکات حسنہ پیدا ہو گئے اور یہ فنائے حسی ہے۔ فنا کی دو قسمیں ہیں فنائے حسی اور فنائے علمی۔ فنائے علمی اسے کہتے ہیں کہ غیر اس کے علم سے فنا ہو گیا جیسا کہ حق تعالیٰ کا ذکر ایسا غالب ہوا کہ ذاکر کے علم سے غیر حق فانی ہو گیا تو وہ غیر واقع میں فانی تھوڑا ہی ہو گیا بلکہ واقع میں تو وہ موجود ہے لیکن اس کے علم سے غائب ہو گیا اور یہاں واقع میں وہ ملکہ سیئہ جاتا ہی رہتا ہے لیکن جاتے رہنے کی حقیقت یہ ہے کہ مضمحل ہو جاتا ہے یعنی اس میں اضمحلال اس درجہ ہو جاتا ہے کہ گویا وہ جاتا ہی رہتا ہے۔ یہاں یہ نہیں ہے کہ اس ملکہ کی طرف سالک کا التفات نہیں رہا، نہیں بلکہ وہ ملکہ واقع میں زائل ہو گیا لیکن اسی تفسیر کے ساتھ اس کو فنائے حسی اور فنائے ذاتی کہتے ہیں تو بہر حال یہ رحمت ہوتی ہے کہ ملکات سیئہ ملکات حسنہ سے مبدل ہو جاتے ہیں۔ اب یہ ہوتا ہے کہ معصیت کا بالکل تقاضا ہی نہیں ہوتا، اب اگر کبھی سہواً بھی نسیاناً بھی صدور معصیت کا ہو جاتا ہے تو ایک پہاڑ غم کا ٹوٹ پڑتا ہے یہ حالت ہوتی ہے۔

بردل سالک ہزاراں غم بود　　　گر زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل میں ہزاروں رنج وغم صادر ہوتے ہیں اگر باطنی حالت میں ذرہ بھر کمی پاتا ہے)

روتے روتے جان دیتا ہے تو یہ رحمت ہوتی ہے تو خلاصہ کیا ہوتا ہے اس تبدیل کا۔ یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ مغلوب کرتے ہیں بری خواہشات کو اور غالب کر دیتے ہیں اچھی خواہشات کو اس سے انسان رستہ چلتا ہے ایک تو یہ تبدیل ہوتی ہے اس کو تبدیل ذات بھی کہتے ہیں یعنی جو پہلی ذات تھی وہ جاتی رہی اس کے بجائے ایک دوسری ذات اس کے قائم مقام ہو گئی یہ تبدیل ذات ہی تو ہوئی پھر جب ایک زمانہ اس پر گزر گیا اور جو اس میں حکمت تھی خدا کی کہ بندہ خوگر ہو جائے طاعت کا یعنی نفرت ہو جائے معاصی سے اور دلچسپی ہو جائے طاعات سے جب یہ مقصود حاصل ہو گیا تو بعض اوقات اس میں ایک اور تغیر ہوتا ہے وہ یہ کہ جن ملکات سیئہ کو مغلوب و مضمحل کیا گیا تھا جب ان کی مقاومت بوجہ ملکات حسنہ کے راسخ ہو جانے کے آسان ہو گئی تو اب وہ چاہتے ہیں اپنے بندہ کا اجر بڑھانا اس واسطے اس وقت رفتار حکمت کی یہ ہوتی ہے کہ اول امور طبیعہ دب جاتے ہیں مگر چند روز کے بعد وہ پھر ابھرنا شروع ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں کہ ابھرتے ابھرتے غالب ہو جاتے ہوں بلکہ اپنی اصلی فطرت

پڑآ جاتے ہیں کیونکہ یہ ملکات سیئہ اصل فطرت میں بھی غالب نہ تھے اگر کوئی کہے کہ نہیں ہم تو دیکھتے ہیں کہ بچپن میں بھی یہ ملکات غالب ہوتے ہیں لیکن یہ بات نہیں ہے بچپن میں بھی یہ ملکات موجود تو تھے لیکن غالب نہ تھے مشق کر کر ہم نے شہوت کو غضب کو حرص کو طمع کو قوی کر لیا ہے تو یہ ملکات سیئہ بچپن میں بھی موجود تو تھے لیکن غالب نہ تھے۔ ہاں استعداد تھی غالب ہونے کی لیکن اس کے ساتھ ہی مغلوب ہونے کی بھی استعداد تھی اور حکم یہ تھا کہ ان کو مغلوب رکھنا لیکن اس نے غالب کر لیا اپنی حماقت سے اب ضرورت پڑی مجاہدہ کی لیکن مجاہدہ کا اثر تو اتنا تھا کہ ملکات سیئہ قصد سے مغلوب ہو جاتے لیکن حق تعالیٰ جانتے تھے کہ اس سے کام نہیں چلے گا اس لیے وہ ان ملکات کو بہت ہی زیادہ مغلوب کرتے ہیں یہاں تک کہ بالکل زائل کرنے کے حکم میں جاتے ہیں جب اس کی حکمت پوری ہوگئی یعنی ملکات حسنہ اچھی طرح راسخ ہوگئے تو اب تکمیل اجر کے واسطے پھر ان ملکات سیئہ کو ذرا ذرا قوت دیتے ہیں۔

سالک کا امتحان

اس میں سالک کا امتحان بھی مقصود ہوتا ہے کہ دیکھیں امور غیر مکتسبہ ہی پر سارے قصہ کو ڈال کر بیٹھ رہا ہے یا خود بھی کچھ اس کو ہمارے امتثال امر کا اہتمام ہوتا ہے اور یہ حکمت امتحان کی اور وہ حکمت سابقہ تکمیل اجر کی حقیقت میں ایک ہیں' صرف حیثیتیں مختلف ہیں اس لیے ذرا ذرا وہ امور طبعیہ پھر ابھرتے ہیں جن میں خاصیت ہے کہ اگر یہ مغلوب بھی ہو جاتے ہیں تو بعد چندے پھر ابھرتے ہیں جیسے ہمیں خوب زور کی بھوک لگ رہی ہو اور کوئی مدت کا بچھڑا ہوا محبوب دفعتہً آ جائے تو اس وقت بھوک جاتی رہتی ہے کیا معنی کہ خوشی میں مغلوب ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ہم یوں ہی سمجھتے ہیں کہ بالکل جاتی ہی رہی مگر جب آپس میں اچھی طرح مل ملا لیے اور بات چیت ہو چکی تو اب پھر بھوک صاحبہ تشریف لاتی ہیں تو بہر حال امور طبعیہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ مغلوب ہو کر چند روز بعد پھر ابھرتے ہیں بہر حال اس تبدیل کے دو سلسلے ہیں' ایک مکتسب جس کا وقوع عالم ابتلاء میں ہوتا ہے ایک موہوب جس کا وقوع عالم جزاء میں ہوگا سو مکتسب سلسلہ تو یہ ہے کہ اول ملکات سیئہ دب گئے تھے جس کا اوپر ذکر ہوا پھر اس کے بعد ذرا اور ابھرنے شروع ہوگئے۔ ذکر جب اول اول شروع کرتے

ہیں اس وقت تو یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ بیوی یاد آتی ہے نہ بچے یاد آتے ہیں نہ کسی سے ملنا جلنا اچھا معلوم ہوتا ہے نہ کسی سے بولنے چالنے کو جی چاہتا ہے بس ہر وقت یہی چاہتا ہے کہ تنہائی میں بیٹھے اللہ اللہ کیا کریں۔ پھر ایک مدت گزرنے کے بعد یہ حالت پلٹا کھاتی ہے اب دوست بھی یاد آنے لگے' بیوی بچے بھی یاد آنے لگے' بعضی بعضی لذیذ چیزوں کو بھی جی چاہنے لگا۔ اب ذرا فرصت ہوئی تو سیر وتفریح کی خواہش پیدا ہوتی ہے یا اب غصہ کے وقت لہجہ بھی سخت ہو جاتا ہے الفاظ بھی سخت نکلنے لگتے ہیں پہلے تو کوئی جوتی بھی مار لیتا تھا تب بھی چونکہ مجاہدہ کر رہے تھے' غصہ بالکل نہ آتا تھا' پہلے نہ غم کی باتوں سے غم ہوتا تھا نہ خوشی کی باتوں سے خوشی ہوتی تھی۔ اب اگر بیٹا مرا ہے تو غم بھی ہو رہا ہے' آنکھ سے آنسو بھی جاری ہیں۔ پہلے تو وہ حالت تھی اب یہ نوبت آئی۔ اب یہاں ضرورت ہے شیخ محقق کی' یہاں سالک یہ غلطی کرتا ہے کہ اپنے کو سمجھتا ہے کہ میں مردود ہو گیا۔ کہتا ہے کہ میری ساری محنت برباد ہی گئی پہلے تو کوئی جوتی بھی مار لیتا تھا تب بھی ناگوار نہ ہوتا تھا' ارے میاں مجھے تو اب غصہ آنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری ابھی تک اصلاح ہی نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے میری سب محنت ہی برباد ہو گئی' حضرت محنت برباد نہیں گئی بلکہ اس تبدیل کی عمر ختم ہو گئی۔

احوال کا تغیر وتبدل

اب دوسری تبدیلی شروع ہوئی تنزل نہیں ہوا بلکہ ترقی ہوئی ہے غم کی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے جیسے اوپر مذکور ہوا "فَاُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنَاتٍ" (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا) کے مفہوم میں یہ تبدیل بھی داخل ہے۔ وہ پہلی تبدیل تھی یہ دوسری تبدیل ہے' وہ ذات کی تبدیل تھی' یہ صفات کی تبدیل ہے۔ وہاں تو غصہ کے بجائے حلم پیدا ہو گیا تھا غصہ کا گویا وجود ہی نہ رہا تھا۔ یہاں غصہ' غصہ ہی رہا مگر اب غصہ میں اثر وہ ہے جو حلم میں تھا۔ یہ تبدیل بہت عجیب ہے پہلی تبدیل کی مثال تو یہ ہے کہ ایک بے جان تھی لکڑی اس کی جگہ سانپ کو بٹھا دیا' ایک ذات کی جگہ دوسری ذات کو قائم کر دیا اور یہ بھی گو عجیب ہے مگر ایسی زیادہ عجیب نہیں نہایت عجیب تو یہ ہے کہ ایک لکڑی تھی بے جان اس میں ایسی روح پھونک دی کہ وہی چلنے لگی اس

کے اندر وہ اثر پیدا ہو گیا جو سانپ میں ہوتا۔ یہ نہایت عجیب تبدیل ذاتی تھی یہ وصفی ہے۔ یعنی غضب کی ذات غضب ہی رہی مگر اس میں وہ اثر نہیں رہا جو غضب میں ہوتا ہے۔ طمع، طمع ہی رہا مگر اس میں وہ اثر ہوا جو سخاوت میں ہوتا تو سالک میں کبھی یہ تبدیل بھی ہوتی ہے اس لیے اگر پہلی حالت نہ رہی تو غم نہ کرنا چاہیے بھائی الف بے پے ختم کر چکے ہو اب قرآن شروع ہوا ہے خدا کا شکر کرو کہ الف بے تے ختم ہوئی۔ پہلی تبدیل جو سلوک کی الف بے تے تھی اس کی عمر منقطع ہوئی اب دوسری تبدیل کا سبق شروع ہوا جو بمنزلہ قرآن کے ہے یہاں "فَاُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنَاتٍ" (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا) کا صدق یوں ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں سیئات کی ذات تو وہی رہی مگر وصف بدل کر اس کو ایسا بدلا کہ اس سیئہ کو اب حسنہ کہتے ہیں، ذات تو وہی رہتی ہے مگر اس کا وصف بدل دیتے ہیں وہ کیونکر اس کے متعلق ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق ہے سچ تو یہ ہے عجیب و غریب تحقیق ہے۔ یعنی فرماتے تھے کہ شیخ کامل کو چاہیے کہ رذائل نفس کا ازالہ نہ کرے بلکہ امالہ کر دے بخل رہے بخل ہی مگر اس کا محل بدل دیا جاوے بخل کو کھو کر سخاوت پیدا کی جاوے اسی طرح سمجھو کہ غصہ بھی بڑے کام کی چیز ہے اگر غصہ نہ ہوتا تو اسلام ہی نہ پھیلتا۔ اسلام جو پھیلا تو غصہ ہی کی بدولت کیونکہ مقابلہ کافروں کے غصہ ہی میں جان دینا اور جان لینا آسان ہو سکتا ہے اسی طرح اگر بخل نہ ہوتا تو رنڈیوں، بھڑووں، بدمعاشوں میں خوب مال لٹاتا یہاں تک کہ مستحقین کی بھی نوبت نہ آتی۔ اب مستحقین ہی کو دیتے ہیں چھانٹ چھانٹ کر یہ بخل ہی کی تو برکت ہے غیر مستحقین کو نہ دینا یہ بخل ہی تو ہے لیکن یہ بخل جو ہے سخاوت کی ماں ہے۔

سخاوت خود محتاج ہے اس بخل کی یا مثلاً مال دیکھا کسی کا اس کو دیکھ کر جی للچایا طمع تو ہوئی مگر اس کے مقتضا پر عمل نہیں کیا بلکہ شریعت کو مدار عمل ٹھہرایا اور اس مال کے لینے سے رکا رہا تو گویا وہ اثر ہوا اس طمع میں جو استغناء میں ہوتا بلکہ اس طمع سے گویا اور اجر بڑھ گیا، استغناء کا اگر طمع نہ ہوتی تو نرے استغناء میں اجر کہاں ملتا وہ تو ایسا ہوتا جیسے کوئی دیوار کھڑی ہے یا فرض کیجئے کوئی گائے کھڑی ہے اس کے سامنے کسی کے ہزار روپیہ رکھے ہوئے ہیں تو اس کا جی ہی نہیں چاہتا یہ روپیہ ہماری ملک میں آ جاوے اس کے اس رکے رہنے پر کوئی اجر ہی نہیں

برخلاف اس کے کہ ہم نے دیکھا کہ لوگ ٹمٹوں اور فٹنوں میں اڑے اڑے پھر رہے ہیں انہیں دیکھ کر ہمیں بھی خواہش ہوئی کہ ہماری ملک میں بھی یہ سواریاں ہوتیں تو ہم بھی اسی طرح اڑے اڑے پھرتے مگر اس وسوسہ کو فوراً یہ کہہ کر دفع کر دیا کہ **لاحول ولا قوۃ** ان چیزوں میں کیا رکھا ہے اور یہ آیت پڑھنے لگے: "**لَاتَمُدَّنَّ عَيْنَيْکَ اِلٰى مَامَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ**" آپ صلی اللہ علیہ وسلم آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کی طرف نہ دیکھتے جو ہم نے کافروں کو عطا کی ہے) پس یہ رکنا بڑا عمل ہے اور اسی پر ثواب ہے تو دیکھئے یہ رذائل نفس اب کیسے کارآمد ہو رہے ہیں کہ انہیں کی بدولت تقویٰ کی دولت میسر ہے اسی کو تو مولانا فرماتے ہیں:

شہوت دنیا مثال گلخن ست کہ ازو حمام تقویٰ روشن ست

(دنیا کی طلب اور خواہش مثل انگیٹھی کے ہے کیونکہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

کہ یہ دنیا کی خواہش ایسی ہے جیسے سوختہ ہوتا ہے کہ حمام کے نیچے گوبر وو بر ڈال کر آگ روشن کر دیتے ہیں تو اگر حمام کا پانی گرم کرنا چاہو تو اس گوبر سے کام لو اسی طرح یہ جو نفع ہے ع کہ ازو حمام تقویٰ روشن ست ۔ یہ ان خواہشات سے رکنے ہی کی بدولت حاصل ہوتا ہے اور یہ رکنا بدولت خواہش ہی کے ہے کیونکہ اگر خواہش ہی نہ ہوگی تو رکنا ہی کہاں متحقق ہوگا جب خواہش ہی جاتی رہی تو صبر اور مجاہدہ ہی کہاں رہا تو یہ تبدیل جو میں نے بیان کی یہ تبدیل وصفی ہے اور یہ لقب تبدیل ذاتی اور تبدیل وصفی میں نے رکھ دیئے ہیں آسانی کے لیے تاکہ پتہ بتانے میں سہولت ہو۔

اعمال کے درجے

تو اب دیکھئے اس دقیقہ کے نہ جاننے سے بہت سے سالک مغموم ہوتے ہیں کہ بعد ریاضات و مجاہدات کے بھی پھر عود کیا' امراض نفسانیہ نے حالانکہ عود۔ ان امراض نے نہیں کیا بلکہ اعمال پہلے ناقص تھے اب کامل ہو گئے یا یوں کہیے کہ ناقص تو نہ تھے کامل ہی تھے لیکن اکمل نہ تھے' اب کامل سے اکمل بنانا منظور ہے حق تعالیٰ کو' تو اعمال کے اکمل بنانے کے لیے یہ دوسری تبدیل واقع کی ہے تو خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے احوال کے تین درجے ہیں جن کی ترتیب سمجھ لینی چاہیے' اول درجہ تو یہ ہے کہ ابھی پہلی تبدیل بھی نہیں ہوئی۔ عوام الناس کی تو

یہ حالت ہے اور یہ ہے قابل تبدیل لیکن بتبدیل اول۔ باقی اول ہی سے دوسری تبدیل کی کوشش نہ کرے اس واسطے کہ دوسری تبدیل جب ہی معتبر ہے کہ جب بعد تبدیل اول ہو اور اگر کہا جائے کہ اس کے عکس میں کیا حرج ہے کیونکہ کمال کی بات تو یہ ہے کہ مثلاً غصہ ہو اور اس غصہ کو نہ چلاوے تو یہ تو اب بھی ممکن ہے پھر تبدیل اول کی تقدیم کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سو حضرت قبل تبدیل اول کے دوسری تبدیل پر قدرت حاصل کر لینا کارے دارد۔ یہ ایسا ہے جیسے بے قاعدہ بغدادی پڑھے کوئی سپارہ پڑھنے لگے تو کیا وہ سپارے پڑھنے پر قادر ہو جائے گا اور اگر کچھ شد بد پڑھ بھی لیا تو کیا اس سے مہارت کاملہ پیدا ہو سکتی ہے اسی طرح یہاں بھی گوشاذ و و نادر کبھی ایسا بھی ہو گیا ہے کہ قبل تبدیل اول دوسری تبدیل پر ابتداء ہی قدرت حاصل ہو گئی ہے مگر یہ کرامت ہے خواہ سالک کی خواہ کسی شیخ کی اور کرامت دائم نہیں ہوا کرتی جس نے پہلے مجاہدہ نہیں کیا تجربہ کر لو اگر اس کو غصہ کی عادت ہے اور وہ غصہ روکنا چاہے گا تو دو تین دن تو رکے گا پھر کچھ نہیں بلکہ پھر تو تین چار دن کے غصے ایک ساتھ نکالے گا تو اس رکنے سے فائدہ ہی کیا ہوا اگر تین چار دن غصہ روک بھی لیا اور کسی پر نہ چلایا تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اگر اب نہیں چلاتا تو پھر چلاوے گا اور پھر چلاوے گا بھی ایسا کہ اتنے دن کے غصوں کی ایک ساتھ قضا کرے گا' یہ تو وہی حکایت ہوئی کہ ایک شخص کے پاس ایک گھوڑا تھا اس میں ایک ایسی واہیات عادت پڑ گئی تھی کہ جب لید کرتا تو چلتے چلتے لوٹتا اور جب اس لید کو سونگھ لیتا تب آگے بڑھتا۔ اس واہیاتی میں دو تین منٹ برباد ہو جاتے' بڑی الجھن ہوتی اور منزل کھوٹی ہوتی سو الگ' مگر ہمیشہ صبر کیا کرتا بے چارہ۔ اتفاق سے ایک روز ایک شہسوار کا راستہ میں ساتھ ہو گیا' اس نے جو گھوڑے کی یہ حرکت دیکھی تو کہا میاں تمہارے گھوڑے میں یہ کیا واہیات عیب ہے اس نے کہا میاں کیا کہوں اس میں یہی عادت پڑ گئی ہے بہت ہی تنگ ہوں اس کا کوئی علاج ہی سمجھ میں نہیں آتا' سوار نے کہا کہ اچھا اسے میں ٹھیک کرونگا' یہ کہہ کر پیچھے ہو لیا' پھر جب گھوڑے نے لید کی تو اپنی عادت کے موافق اس نے سونگھنے کے لیے لوٹنا چاہا مگر سوار نے فوراً ایک زور سے چابک دیا منہ پر بس سیدھا ہو گیا اور بیچارہ کو مجبوراً بے سونگھے چلنا پڑا' اسی طرح جب وہ لید کرتا اور اسے سونگھنا چاہتا سوار فوراً ایک چابک زور سے منہ پر لگاتا غرض راستہ بھر اس نے لید نہ سونگھنے دی۔ جہاں تک راستہ دونوں کا مشترک تھا وہاں تک تو وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے جب اس شخص کا گاؤں تھوڑی دور رہ گیا تو

رستہ پھٹا سوار کو دوسرے گاؤں جانا تھا' جب وہ چلنے لگا تو اس گھوڑے کے مالک نے کہا کہ خدا کے سپرد اور اس سوار کو بہت دعائیں دیں کہ اللہ تمہارا بھلا کرے تم نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا میرے گھوڑے کا عیب دور کر دیا' تم نے آپ میری منزل سوارت کر دی ہے ورنہ اس کم بخت کے لید سونگھنے میں دو تین کوس کا حرج ہو جاتا مگر صاحب ادھر تو وہ سوار رخصت ہوا ادھر گھوڑ نے مڑ کر دیکھا اب استاذ جی نہیں ہیں' میدان خالی ہے جناب وہ لوٹا اور وہ تقاضا لید سونگھنے کا جو دبا ہوا تھا اس نے زور کیا' کئی کوس آ چکا تھا' راستہ میں جہاں جہاں لید کی تھی لوٹ کر ہر جگہ کی لید کو آپ نے جا جا کر سونگھا' جب سب مقامات سے فراغت ہو چکی اس وقت پھر نئے سرے رستہ چلنا شروع کیا۔ وہ شخص بڑا پریشان ہوا اور کہنے لگا خدا بھلا کرے اس سوار کا میری ساری منزل ہی خراب کر گیا۔ غرض جہاں پہنچنا تھا اس روز نہ پہنچ سکا' اگلے دن پھر منزل کی تو حضرت یہ مثل ہوگی۔ کر کے دیکھ لیجئے بدون مجاہدہ کے داعیہ کا مقابلہ اور مقاومت کرنا کارے دارد اگر کچھ دن تک مقاومت کر بھی لی پھر اسی حالت پر آ جاؤ گے اس واسطے ضرورت ہے شیخ کی کہ وہ ان حقائق پر آگاہ کرتا ہے ورنہ اگر فہم کی ضرورت نہ ہو خالی عمل ہی کافی ہو تو واللہ سلوک کا حاصل کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی فرمایا کرتے تھے اگر ہم کو پہلے سے یہ خبر ہوتی کہ تصوف میں اخیر میں کیا چیز حاصل ہوتی ہے تو میاں ہم تو کچھ بھی نہ کرتے مدتوں کے بعد معلوم ہوا کہ جس کے لیے اتنے مجاہدے اور ریاضت کیے تھے وہ ذرا سی بات ہے۔ حضرت نے تو اپنی عالی ظرفی کی وجہ سے اس ذرا سی بات کو نہیں بتلایا میں اپنی کم ظرفی سے بتلاتا ہوں کہ وہ ذرا سی چیز ہے کیا جس کو حاصل کرنے کے لیے اتنی محنتیں کرنی پڑتی ہیں وہ یہی ہے جس کو میں نے تبدیل ثانی کے عنوان سے بیان کیا ہے کیونکہ یہی ہے پیدا کرنے والی تعلق مع اللہ کی اور یہی ہے محافظ تعلق مع اللہ کی اور یہی ہے بڑھانے والی تعلق مع اللہ کی غرض وہ ذرا سی بات جو تصوف کا حاصل ہے یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی ہو سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کرے اور جس گناہ کا تقاضا ہو تقاضے کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے بس جس کو یہ بات حاصل ہو گئی اس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں نہ شیخ کی نہ سید کی نہ مغل کی نہ پٹھان کی' نہیں تو چاروں ذاتوں کی ضرورت ہے۔

کشند از برائے دلے بارہا　　　خورند از برائے گلے خارہا

مراعات صد کن برائے یکے (ایک کی خاطر ایک سو کی رعایت فرمادی) تو حضرت

شیوخ کو اپنا رہبر بنانا از بس ضروری ہے کیونکہ جو تجربہ کار ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ اس بات کے حاصل کرنے میں بلا شیخ کی مدد کے ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی اور جو کامیاب ہو گئے ہیں بلا شیخ کے مولانا نے اس کی وجہ بیان فرمائی ہے۔ مولانا ہیں بڑے محقق اول تو نصیحت فرماتے ہیں کہ کوئی شیخ ضرور تلاش کرو۔

یار باید راہ راتنہا مرو　　بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

(راہ سلوک میں مددگار ہونا چاہیے اس میں تنہا قدم مت رکھو بلا (مرشد) کے اس عشق کی وادی میں مت چلو)

یعنی بدون رہبر کے اس جنگل میں قدم نہ رکھو پھر فرماتے ہیں:

ہرکہ تنہا نادر ایں رہ رابرید　　ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اتفاقاً اس راہ سلوک کو جس شخص نے اکیلے خود طے کیا ہے وہ مردان خدا (اللہ والوں) کی توجہ سے کیا ہے)

اس میں دو جواب دیئے ہیں ایک تو لفظ نادر میں پس فرماتے ہیں کہ اول تو یہ نادر ہے کالمعدوم دوسرے لفظ عون میں پس فرماتے ہیں کہ:

ہرکہ تنہا نادر ایں رہ رابرید　　ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اتفاقاً اس راہ سلوک کو جس شخص نے اکیلے خود طے کیا ہے وہ مردان خدا (اللہ والوں) کی توجہ سے کیا ہے)

یعنی اگر شاذ و نادر کسی نے بلا رہبر کے بھی یہ راستہ طے کر لیا ہے تو اسے بھی ضرورت ہوئی ہے مدد کی مگر ایسے طریقے سے وہ مدد اسے دی گئی ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی جیسے کوئی بچہ گنگوہ سے چل کر تھانہ بھون پہنچا۔

یہاں پہنچ کر اس نے کہا کہ دیکھو میں نے کسی سے مدد نہیں لی مگر حضرت کو خبر بھی ہے کہ اماں جان کی گود میں یہاں تک آئے ہیں رستہ بھر اماں جان کی گود میں پڑے سوتے رہے مگر خبر نہیں ہوئی جیسے کوئی عرفات سے سوتا ہوا گزر جائے تب بھی اس کا حج ہو جاتا ہے۔ یہ خوب مزہ کا حج ہوا خبر بھی نہیں ہوئی مزے میں پڑے سوتے رہے اور ہو گئے حاجی کیونکہ یہ مسئلہ ہے کہ اگر

کوئی دوسرا شخص بھی کسی سوتے ہوئے کو عرفات پہنچا دے اور وہاں بھی سوتا ہی رہے تو اس کا بھی حج ہو جاتا ہے۔ پہلے آپ چلا تھا عرفات کی طرف مگر کمزور تھا اتنا کہ تھوڑی دور چل کر غش کھا کر گر پڑا اب میاں کو کچھ ہوش ہی نہیں کہ میں کہاں جارہا تھا اور کہاں پڑا ہوا ہوں وقت رہ گیا تھا کم اتفاق سے کوئی ایسا شخص ادھر سے گزرا جو اس کا کبھی رفیق رہ چکا تھا اس نے کہا لاؤ اسے شبری میں ڈال کر عرفات لے چلیں چنانچہ وہ اسی حالت میں اس کو شبری میں لاد کر عرفات لے گیا اور وہاں سے نکال بھی لایا اور یہ جو جاگے ہیں حضرت تو دیکھتے ہیں کہ میں سب حاجیوں کے ساتھ مزدلفہ میں ہوں اب وہ سمجھتا ہے کہ میں آپ سے آپ گیا تھا' عرفات اور خود حج کر کے مزدلفہ پہنچا ہوں' احمق کہیں کا۔ یوں سمجھتا ہے کہ میں نے آپ سے آپ حج کر لیا ہے یہ خبر نہیں کہ میاں تو دس قدم بھی چلنے کی طاقت نہ رکھتے تھے رستہ ہی میں بیہوش ہو کر گر پڑے تھے وہ تو کسی دوسرے ہی نے رحم کھا کر اپنی شبری میں لاد لیا ورنہ دیکھتے کیونکر حاجی ہو جاتے۔

فیوض غیبی کی صورت

ہاں یہ دوسری بات ہے کہ بیہوشی میں پتہ ہی نہ چلا کہ مجھے کون شخص عرفات کو لیے جارہا ہے اسی طرح جو شاذ و نادر بلا اعانت شیخ واصل ہو گیا ہو اس کا یہ سمجھنا غلطی ہے میں خود کامل ہو گیا (اس کی بھی) ضرور کسی نے مدد کی کیونکہ اللہ کے بندے بہت سے ایسے بھی رحیم و کریم ہیں جو بے کہے مخلوق کو فیض پہنچاتے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ان کا فیض آفتاب کا سا ہے کہ انہیں خود بھی خبر نہیں کہ ہم سے فیض پہنچ رہا ہے اور بعض اوقات وہ حضرات دعا بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مجدد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو ایک شخص کے بارے میں یہ مکشوف ہوا کہ اس کا نام اہل شقاوت میں درج ہے آپ یہ دیکھ کر تڑپ گئے اور مدتوں اس کے حق میں دعا کرتے رہے یہاں تک کہ اس کا نام سعداء میں درج کر دیا گیا ان حضرت کو اس کا کبھی علم بھی نہ ہوا ہوگا کہ میں جو سعید بن گیا ہوں تو کس کی دعا کی برکت سے وہ سمجھتے ہوں گے کہ میرا کوئی عمل بڑا مقبول ہوا جو میں بزرگ ہو گیا تو حضرت بعضے ایسے بھی اللہ کے بندے ہیں جو اس طرح دعائیں کر کے لوگوں کو فیض پہنچاتے رہتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں کہ خود انہیں بھی خبر نہیں کہ ہم سے لوگوں کو فیض پہنچ رہا ہے نہ لوگوں کو خبر کہ ہمیں ان سے فیض پہنچ

رہا ہے خود ان کے وجود ہی کی برکت ہوتی ہے چنانچہ تجربہ ہے کہ جب کوئی کاملین میں سے مرتا ہے تو سب کے قلوب میں کم وبیش تفاوت محسوس ہونے لگتا ہے حالانکہ اعمال وہی موجود رہتے لیکن وہ جو ایک نورانیت اور برکت تھی اس میں کمی محسوس ہونے لگتی ہے یہ اس کی شعائیں تھیں جن سے سب کے قلوب میں نورانیت تھی یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ نے فرمایا ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن کے بعد ابھی مٹی سے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ ہم نے اپنے قلوب کو متغیر پایا یعنی وہ بات نہیں رہی جو پہلے تھی جس کے معنی حضرات شیعہ یہ سمجھے کہ نعوذ باللہ وہ مرتد ہو گئے تھے **لاحول ولا قوۃ** یہ قدر کی آنکھوں والوں کی یہ قدر کی سچے اور صحیح الحس حضرات کی ظاہر بات ہے آفتاب جب غروب ہو گیا تو گو اب بھی لالٹین ہیں مگر ان میں وہ نور کہاں جو آفتاب میں تھا اور یوں خیر ان کا بھی نور غنیمت ہے اس واسطے کہ

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ   چارہ نبود در مقامش جز چراغ

(سورج تو چھپ گیا ہے اب سوائے چراغ کے اور کیا چارہ ہے کہ اس سے روشنی حاصل کی جائے)

یہ بھی غنیمت ہے یہی سہی مگر وہ بات جو پہلے تھی وہ بھلا کہاں رہ سکتی ہے تو یہ تفاوت نور قلب میں حضرات کاملین کی برکات کی علامات ہیں غرض ایسی کوئی صورت نہیں کہ بلا ان کی اعانت کے کوئی کامل ہو جائے تو یہ معنی ہیں مولانا کے ارشاد کے:

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید   ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اتفاقاً اس راہ سلوک کو جس شخص نے اکیلے خود طے کیا ہے وہ مردان خدا (اللہ والوں) کی توجہ سے کیا ہے)

تصوف کا حاصل

غرض کوئی شیوخ سے مستغنی نہیں، شیوخ کے یہ نفع ہیں۔ مثلاً یہی ایک بات ہے جو میں نے عرض کی کہ تصوف کا حاصل یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی ہو سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کر لے اور جس گناہ کا تقاضا ہو تقاضا کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچ جاوے، دیکھئے یہ ہے تو چھوٹی سی بات کہنے میں مگر وقوع میں کتنی عظیم الشان ہے، شیخ کا بس یہی کام ہے کہ وہ اس بات کے حاصل کرنے کی تدبیریں بتلاتا ہے اور کچھ نہیں کرتا یہاں مشائخ کو یہ خیال ہوا ہوگا

کہ اس نے تو سب کی دکان ہی پھیکی کردی اب کون پوچھے گا ہم کو سو یہ تشویش تو اسے ہو جسے شوق ہو مشیخت کا' بلا سے تم ہمیں بھی نہ پوچھو مگر جب اس چھوٹی بات پر عمل کرو گے اس وقت دیکھو گے کہ گاڑی نہیں چلتی' بیل بھی موجود' پہیے بھی موجود مگر دھکیلنے والے کی پھر بھی ضرورت ہے اس واسطے کہ گاڑی تو دلدل میں پھنسی ہوئی ہے دل دل میں سمجھا کرو کہ معلم کی ضرورت نہیں مگر دراصل ہے ضرورت محض دلدل کافی نہیں تو شیخ کا کام فقط یہ ہے جو میں نے ذکر کیا۔ الحمدللہ حضرت حاجی صاحب کی برکت سے اب تصوف مخفی تو ہے نہیں حاصل کرلو جس کا جی چاہے طریقہ بتلا دیا کہ یہ بگدر ہے یہ اس کے اٹھانے کی ترکیب ہے اٹھالو جس کا جی چاہے حقیقت تصوف کی تو میں نے ظاہر کردی آگے تمہاری ہمت ہے' اجی خوش نویس نے طریقہ بھی بتا دیا کہ ایسے لکھ قلم بھی دیدیا مگر لکھ تو لو بھلا بلا استاد سے مشق کیے ہوئے بلا کسی خوش نویس کی مدد کے کوئی خوش نویس ہو ہی سکتا' اسی واسطے حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

گر ہوا اے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر وپس بیا

(دل اگر سفر محبت کے طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو دامن رہبر کامل کو مضبوط تھام)

کرنے والے جانتے ہیں کہ باوجود وضوح طریق کے پھر بھی ضرورت ہوتی ہے رہبر کی

درا ردات باش صادق اے فرید　　تا بیابی گنج عرفاں راکلید

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق　　عمر بگذشت ونشد آگاہ عشق

(اے فرید تو حسن ارادت وعقیدت کا دامن کبھی نہ چھوڑ تاکہ معرفت کے خزانوں کی تجھے کنجی حاصل ہو' بلا مرشد کے جس نے طریق میں قدم رکھا اس نے عمر ضائع نہ کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا)

حقیقت میں یہی بات ہے تو بس یہ ضرورت ہوتی ہے شیخ کی بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب تک حقیقت طریق معلوم نہ ہو جب تک تو شیخ کی ضرورت کا کما حقہ علم بھی نہیں ہوتا اور بعد مشاہدہ حقیقت کے دلیل سے اور بصیرت سے معلوم ہوگا کہ ہاں واقعی یہ راستہ اکیلے طے نہیں ہو سکتا اور یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص علم پڑھے گا جب ہی تو علم کی قدر ہوگی اور جب ہی تو وہ یہ سمجھے گا کہ کتنا علم کافی ہے۔ جب ہی تو امت کے تمام اکابر نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ بلا شیخ کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کوئی تو بات ہے جو حاصل ہو جاتی ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

گر نبودے نالہ نے راثمر نے جہاں را پر نہ کردے ازشکر

اگراس طلب کے اندر کچھ اثر نہ ہوتا تو آخر یہ جو ثمرات کا ظہور اور مشاہدہ ہو رہا ہے یہ کیوں ہوتا۔ بہرحال اب حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد تو زیادہ ضرورت محسوس ہوگی شیخ کی پہلے تو چونکہ حقیقت نہیں معلوم تھی اس لیے ضرورت شیخ کا بھی اتنا احساس نہ تھا اب یہ ارمان بھی نہ رہا کہ ارے میاں اگر ہمیں تصوف کی حقیقت معلوم ہوجاتی تو ہم خود ہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے خواہ مخواہ پیروں کے نخرے نہ اٹھانے پڑتے اور ایسے اقوال جو منقول ہیں وہ طالب کے دل بڑھانے کو ہیں کہ وہ اس طریق کو محال نہ سمجھے' سو اب حقیقت معلوم ہوگئی ہے کرکے دیکھو' بسم اللہ' حضرت کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ

درراہ عشق وسوسہ اہرمن بسے ست ہشدار وگوش رابہ پیام سروش دار

(طریق باطن میں شیطان کے وساوس اور خطرات ہیں اوران سے بچنا چاہتے ہو تو ہوشیار رہو اور شریعت کا اتباع کرو)

حضرت قدم قدم پر گاڑی نہ اٹکے تو جبھی کہیے گا اول تو البتہ اس قدر ہوگا کہ بھی پتہ نہ چلے کہ حقیقت یہ ہے یا یہ ہے دونوں چیزیں برابر معلوم ہوں گی۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں درمیان شان برزخ لایبغیاں

(بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں جاری ہیں مگران کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشترک نہیں ہوتے)

یہ پتہ نہ چلے گا کہ ادھر جاؤں یا ادھر۔ دونوں چیزیں ایک نظر آئیں گی۔ بہرحال یہ تبدیل کرتا ہے شیخ کہ ملکات فاسدہ کو مغلوب کرنے کے طریقے بتلاتا ہے اور وہ طریقے مرکب ہیں تدبیر سے اور ذکر سے پھر کسی تعلیم پر عمل کرنے کے بعد یہ تبدیل واقع ہوتی ہے یعنی ملکات فاسدہ بالکل مغلوب اور کالمعدوم ہوجاتے ہیں اور ملکات حسنہ غالب ہوجاتے ہیں۔

تصوف کے درجات

یہ تفصیل میں اس لیے بیان کررہا ہوں تاکہ معلوم ہوجائے کہ درجات تصوف کیا ہیں' تو اول درجہ تو مجاہدہ تھا یعنی تعلیم طریق پر عمل' اس کے بعد تبدیل ہوگی۔ جب یہ تبدیل نہ تھی

اس وقت دواعی نفس قوی تھے اس لیے اعمال صالحہ کی اور ترک معاصی کی توقع نہ تھی، آگے چل کر سڑک کے اندر دوسری منزل آئی وہ یہ کہ ملکات حسنہ غالب ہوگئے اور ملکات سیئہ ایسے مغلوب ہوئے کہ قریب قریب زائل ہوگئے اب یہ حالت ہے کہ رات بھر جاگنا بھی آسان ہے اب نہ بیوی بچوں کی محبت دل میں ہے نہ کوئی دوست یاد آتا ہے نہ لذائذ کی طرف التفات ہے، دنیا سے بالکل دل سرد ہوگیا، کسی چیز کی خواہش باقی نہیں رہی، سوائے اللہ اللہ اور نماز روزہ کے کسی چیز میں دل نہیں لگتا، اگر کوئی ہفت اقلیم کی سلطنت بھی دینے لگے اس سے بھی انکار کردیں بلکہ جوان کے سامنے اس کا بیان بھی کردے اس کے پیچھے لگ جاویں، جب یہ تبدیل راستہ میں واقع ہو چکے اس وقت دوسری تبدیل کا موقع نہیں اگر قبل تبدیل اول کسی کو تبدیل ثانی کے حصول کی ہوس ہو تو وہ اچھی طرح سمجھ لے کہ یہ صورت تو ہوگی مگر حقیقت نہیں، یعنی قبل تبدیل اول کے جو گمان ہے کہ میں قادر ہوں طمع کے روکنے پر وہ قدرت نہیں ہاں صورت ہے قدرت کی اس کی ایسی مثال ہے خوب سمجھ لو جیسا کہ پہلے جھوٹے پھول آتے ہیں جب وہ جھڑ جاتے ہیں تو پھر سچے پھول آتے ہیں، پھر پھل آتا ہے، تو گو جھوٹے پھولوں کی اور سچے پھولوں کی ایک ہی سی شکل ہوتی ہے مگر دیکھئے حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کس قدر تفاوت ہے کہ سچے پھول تو بارآور ہیں اور جھوٹے پھول بار آور نہیں۔ یہ مثال تو میرے دل میں اللہ تعالیٰ نے القا فرمائی، دوسری مثال مولانا نے ارشاد فرمائی اور اسی کی برکت سے یہ مثال میرے ذہن میں آئی۔ فرماتے ہیں:

اے شدہ صبح کاذب را رہیں   صبح صادق راز کاذب ہم ببیں

یعنی صبح کاذب کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھانا جو صبح صادق ہے اس کا انتظار کرو کیونکہ صبح کاذب کا جو نور ہے اس کے بیچ میں تاریکی ہے اس میں کہیں مت چل پڑنا ورنہ بستی سے باہر ہوئے نہیں کہ چوروں نے مارا نہیں ایسے میں تنہا جانا اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔ ضروری ہے کہ کوئی رہبر لے لو یا کسی کانسٹیبل کے ساتھ ہو لو۔ ناواقف کہتا ہے کہ اونھ مجھے کانسٹیبل یا رہبر کی ضرورت نہیں اجالا تو ہو رہا ہے۔ بہت اچھا جاؤ اکیلے پیر غیب پہنچو گے اور پیر بن جاؤ گے، وہاں دفن ہو کر تو واقع میں جس طرح صبح صادق میں اور صبح کاذب میں فرق ہے اسی طرح

سے جو تقویٰ قبل مجاہدہ کے ہوتا ہے اور جو بعد مجاہدہ کے ہوتا ہے ان دونوں کی شکل گو ایک سی ہوتی ہے مگر حقیقت میں بڑا فرق ہے۔ غرضیکہ یہ دھوکہ ہوتا ہے سلوک میں کہ جب اس نے مجاہدہ اور ذکر و شغل شروع کیا تو ملکات سیئہ رفتہ رفتہ مغلوب ہونے شروع ہوتے ہیں یہاں تک کہ قریب قریب مردہ کے ہو گئے جب اس تبدیلی پر ایک مدت گزر گئی اب وہ ملکات پھر ابھرنے لگے اور رفتہ رفتہ ان میں پھر جان آنا شروع ہوئی اب اس کی جان کو بنی کہ ہائے میں تو پھر ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا۔ پہلے تو یہ حالت تھی کہ کیسا ہی حسین سامنے سے گزرتا اس کی طرف دیکھنا تو کیسا تھوکنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا اور اب جی چاہتا ہے کہ دیکھیں تو کیسا ہے بس جی غارت ہو گیا' سارا مجاہدہ ہم تو پھر ویسے کے ویسے ہی ہو گئے' بہت سے لوگوں نے اس غم میں خودکشی تک کر لی ہے۔ سمجھے کہ ہم ملعون ہو گئے' مردود ہو گئے' ملکات سیئہ پہلے مضمحل ہو گئے تھے اور گناہوں سے طبعی نفرت ہو گئی تھی اب صرف عقلی نفرت تو ہے طبعی نہیں رہی۔ بات یہ ہے کہ یہ تیسری منزل ہے سلوک کی جس میں ملکات سیئہ کا اضمحلال جو قوی ہو گیا ہے اب کم ہونا شروع ہو گیا ہے اب حق تعالیٰ اپنے بندہ کو اجر دینا چاہتے ہیں کیونکہ اب تک ملکات سیئہ مغلوب بحکم معدوم رہے پھر اجر مقاومت کا کہاں ملتا باقی ان ملکات کو جو اتنے دنوں بیکار رکھا گیا یہ ایسا ہے جیسے شریر گھوڑے کا کھانا پینا بند کر کے اس کو شائستہ بنایا جاتا ہے پھر جب شائستہ ہو گیا تو اب اس کو خوب کھلاتے پلاتے ہیں اس کھلانے پلانے سے جو اس کے اندر قوت پیدا ہوتی ہے اس کے ذریعے سے اب وہ چلتا تو خوب ہے لیکن شرارت نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا بھی ہے تو ذرا سی ایڑ سے سیدھا ہو جاتا ہے۔ اصل میں حق تعالیٰ کو مقصود تھا مقاومت کا اجر دینا اور اول ہی سے مقاومت تھی مشکل اس لیے یہ انہیں کی شان تربیت تھی کہ انہوں نے پہلے یہ تبدیل کی جس کو تبدیل اول کہا جا رہا ہے:

کیمیا داری کہ تبدیلش کنی　　　گرچہ جوئے خوں بود نیلش کنی

(تو ایسی کیمیا رکھتا ہے کہ خون کی ندی کو دریائے نیل میں بدل دے' اسی طرح کی میناگری آپ کا کام ہے اور اسی طرح کی اکسیر بازی آپ کے اسرار ہیں (یعنی ایسے شخص کے) دل میں اپنی خشیت پیدا کر دیتے ہیں جو پہلے اس سے بالکل ناآشنا تھا)

اور یہ تبدیلی کی

اے مبدل کردہ خاکے رازرز   خاک دیگر رانمودہ بوالبشر
کار تو تبدیل اعیان و عطا   کار ماجرم ست نسیان و خطا

تو یہ تبدیل اول اس تبدیل ثانی کے لیے مقدمہ تھی جو مقصود تھی یہ حضرت سمجھے کہ بس منزل ختم ہوگئی اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے ایک نادان بڑھیا کی حکایت ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب بیان فرماتے تھے کہ جب حج کرنے کے لیے سب لوگ مکہ معظمہ سے عرفات جانے لگے تو اس کے رفقاء اس کو بھی لے چلے وہ چلانے لگی کہ ارے بھائی مکہ میں تو آ گئے اب آگے اور کہاں لیے جاؤ ہو (یعنی کہاں لیے جاتے ہو۱۲) پہاڑوں اور پتھروں میں۔ اجی اللہ کے گھر تو پہنچ گئے اب اور کیا چاہو ہو‘ یہ خبر نہ تھی اس کو کہ مکہ جو جارہے ہیں تو عرفات کے ہی لیے تو جارہے ہیں۔ یوں فضیلت چاہے مکہ معظمہ ہی کی زیادہ ہو مگر مکہ جو گئے ہیں تو عرفات ہی کے لیے تو گئے ہیں کیونکہ مکہ معظمہ جانے سے آخر مقصود کیا ہے حج ہی تو ہے اور حج نصیب ہوتا ہے عرفات کے میدان میں پہنچ کر تو جیسے یہ بیوقوف بڑھیا مکہ میں داخل ہو کر آگے چلنا نہیں چاہتی تھی اسی طرح بعض سالکین جو ناواقف ہیں وہ اس تبدیل اول کی حالت سے خارج ہونا گوارا نہیں کرتے ارے بھائی ابھی تم مکہ میں داخل ہو‘ آگے کیوں نہیں چلتے ارے عرفات تو آگے ہے‘ عرفات میں چلو وہاں پہنچ کر حج نصیب ہوگا اب چلے تو بیچ میں مزدلفہ آیا‘ مزدلفہ کیا ہے تبدیل ثانی جس کا نام میں نے رکھا ہے تبدیل وصفی سالک تبدیل ذاتی کی حالت میں سمجھتا تھا کہ مجھے قرب تام حاصل ہے اور اب تبدیل وصفی کی حالت میں سمجھتا ہے کہ مجھے بعد ہو گیا بعد تو ہوگا مگر ہر بعد مضر نہیں مزدلفہ پہنچ کر مکہ سے تو ضرور بعد ہوا مگر عرفات کے لیے یہ قرب ہوا یہ تیسرا اسٹیشن ہے اس کے آگے ایک بہت پر بہار مقام ہے اس کا نام ہے وصول جو گویا عرفات ہے تو یہ چار منزلیں ہیں اب پہنچا ہے منزل مقصود پر اس مثال سے یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ تبدیل ثانی زیادہ اصعب ہے بہ نسبت تبدیل اول کے کیونکہ مکہ سے عرفات جانے میں بہت مشقت پڑتی ہے لیکن یہاں بعض کو یہ شبہ ہوگا کہ تبدیل ذات تو صاحب زیادہ دشوار ہے بہ نسبت وصف کے کیونکہ تبدیل ذات تو یہ ہے کہ مثلاً تانبا تھا اب سونا ہو یہ تبدیل بہت مشکل ہے اور تبدیل وصف یہ ہے کہ پہلے سے بھی سونا تھا مگر میلا تھا اس کو صاف

کردیا' یہ تو زیادہ مشکل نہیں تو یہ درسیات پڑھنے سے شبہ پیدا ہوا مگر میں نے تو درسیات کی اصطلاح کو نہیں لیا بلکہ میں نے اپنی اصطلاح جدا مقرر کی ہے اور اس کی شرح بھی کر چکا ہوں کہ تبدیل ذات کے معنی یہاں یہ نہیں ہیں کہ وہ ذات جو پہلے تھی وہ بالکل معدوم ہو جاتی ہے بلکہ وہ ذات معدوم بمعنی مغلوب ہو کر اس کے اوپر دوسری ذات ابھر کر غالب ہو جاتی ہے جیسے پہلے ایک تھا افسر دوسرا تھا اس کا ماتحت پھر اس ماتحت کو افسر کر دیا گیا اور اس افسر کو اس کا ماتحت بنا دیا گیا۔ مثلاً پہلے بخل غالب تھا اور سخاوت مغلوب تھی اب بخل کی ذات کو تو مغلوب کر دیا اور سخاوت کو غالب کر دیا۔ یہ تھوڑا ہی ہوا کہ بخل کو سخاوت بنا دیا' یوں خدا کی قدرت میں تو سب کچھ ہے۔ غرض تبدیل ذات تو یہ ہوئی اور تبدیل وصفی یہ ہے کہ بخل رہا تو بخل ہی لیکن اس میں اثر اور صفت سخاوت کی پیدا ہو گئی جیسا کہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں بہر حال وہ تبدیل اول اہون ہے اور یہ ثانی اعلیٰ درجہ کی ہے اور اصعب ہے اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ تبدیل ثانی اصعب اور اعجب ہے یوں تبدیل اول بھی عجیب ہے مگر تبدیل ثانی بہت عجیب ہے تو گویا تبدیلیں ہوتی ہیں سالک کے احوال میں چونکہ ان کے متعلق عوام اور خواص غلطی کرتے ہیں اس لیے متنبہ کر دیا گیا ہے سو خواص تو سمجھ ہی گئے ہوں گے۔

عوام کو ہدایت

عوام کو چاہیے کہ جتنی برائیاں اپنے اندر ہوں رفتہ رفتہ عادت ڈالیں ان سب کے چھوڑنے کی' لیکن یہ نہیں کہ خود سوچ کر تدبیریں کریں' نہیں بلکہ کسی محقق بزرگ سے رجوع کریں اور اس بزرگ سے محض ذکر و شغل ہی نہ پوچھیں بلکہ زیادہ تر اپنے امراض کا علاج پوچھیں کہ مجھ میں مثلاً تکبر ہے کوئی تدبیر ایسی بتلائیے کہ یہ کم بخت جاتا رہے' یوں نہ پوچھو کہ کس تدبیر سے تکبر کم ہوگا بلکہ یوں پوچھو کہ کوئی ایسی تدبیر بتائیے کہ ہمارا تکبر جاتا رہے' بھائی خوب سمجھ لو جب تک عادتوں کو بدلو گے نہیں اور نفس کو دباؤ گے نہیں تمہارا دین قائم نہیں رہ سکتا۔ خصوص ترقی تو ہرگز نہیں کر سکتا اب میں عورتوں کو خطاب کرتا ہوں۔ عورتیں تو صرف نماز روزہ ہی کو دین سمجھتی ہیں جس نے نماز روزہ کر لیا اپنے نزدیک پورا دین حاصل کر لیا اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں حالانکہ تمہارے اندر سینکڑوں عیب ہیں تمہارے اندر ناحق کا غصہ

ہے تمہارے اندر غیبت کا عیب ہے، تمہارے اندر ریا ہے، تمہارے اندر فخر ہے کبر ہے ان کی تدبیریں پوچھو بزرگوں سے بالخصوص کبر کے مٹانے کے تو ایسی کوشش کرو کہ کوئی گالیاں بھی دے کوئی کیسی ہی ذلت کرے لیکن تمہیں ناگوار نہ ہو، پہلے اس کی کوشش کرو تب آئندہ طریق کھلے گا، یہ عورتوں کو میں اس لیے سناتا ہوں چونکہ انہیں کچھ خبر ہی نہیں ہے انہیں تبدیل اول ہی کی خبر نہیں جب بری عادتوں کے چھوڑنے کی کوشش کرو گی تو پھر حق تعالیٰ اور توفیق دے گا پھر اور توفیق دے گا، چلنا تو شروع کرو، پھر رستہ ہی میں آ دے گی تبدیل اول بھی تبدیل ثانی بھی پھر تو گاڑی چلے ہی گی جب تبدیل ثانی تک خدا پہنچنا نصیب کرے گا پھر تو وہاں صرف حقیقت سمجھا دینا ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ تبدیلیں ہوتی ہیں احوال میں اور میں عرض کر ہی چکا ہوں کہ ان کے متعلق خواص کی غلطیاں کیا ہیں اور عوام کی غلطیاں کیا ہیں۔ یہ تو دنیا میں تبدیلیں ہوئیں جن میں ایک گونہ اکتساب کو دخل ہے آگے آخرت میں بھی تبدیل ہوتی ہے جو موہوب محض ہے۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے رحمت کا وہ تبدیل وہ ہے جو حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض کے لیے یہ تبدیل بھی ہوگی کہ ان کو گناہوں کے بدلے نیکیاں دیدی جاویں گی بس اب ختم ہوا یہ بیان

گنہگاروں کو بشارت

آگے فرماتے ہیں: ''وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'' (اور اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بے حد مہربان ہیں) اس کی دو تقریریں ہیں ایک تو یہ کہ فرما رہے ہیں گنہگاروں کو کہ بشارت سن لو کہ بس تمہاری طرف سے توبہ ہی کی دیر ہے اللہ تعالیٰ غفور ہیں وہ تو توبہ قبول کر ہی لیتے ہیں، سب گناہوں کو مٹا ہی دیتے ہیں کیونکہ ہم غفور ہیں اور یہی نہیں بلکہ رحیم بھی ہیں یعنی توبہ کے بعد جو اعمال کرو گے انہیں بھی ہم قبول کریں گے۔ اس تفسیر کے اعتبار سے تو یہ ارشاد تحقیق توبہ کے ساتھ متعلق ہے جو الامن تاب (مگر جو توبہ کرے) میں مذکور ہے اور جو ''فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ'' (تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا) کے ساتھ متعلق کیا جاوے تو وہ ایک نہایت لطیف تفسیر ہوگی اور یہ دوسری تقریر ہے یعنی ایک تبدیل کا تعلق تو ہے رحمت سے اور دوسری تبدیل

کا تعلق ہے مغفرت سے یعنی برے ملکات کو مٹا دیا اور ان کی جگہ اچھے ملکات عطا کر دیئے۔ یہ تو مغفرت ہوئی اور یہ رحمت ہے کہ برے ملکات کو مٹایا تو نہیں مگر ایسا کر دیا کہ ان کی خاصیت بدل دی۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی تبدیل کے متعلق غفور کو کہا جاوے اور دوسری تبدیل کے متعلق رحیم کو کہا جاوے تو یہ نہایت ہی اچھا مطلب ہو جاتا ہے اب میں ختم کرتا ہوں نماز (یعنی نماز عشاء ۱۲) میں بھی چند منٹ کی دیر ہوگئی ہے۔ اس وعظ کا نام تکمیل الاعمال بتبدیل الاحوال مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں احوال کی تبدیل کا بیان ہے جس سے اعمال کی تکمیل ہوتی ہے اور پچھلے جمعہ کے وعظ کا جو نام ہے اس کے مناسب بھی ہے۔ اس کا نام ہے تجدد الامثال بعد الاعمال اور اس کا نام ہے تکمیل الاعمال بتبدیل الاحوال۔ اب دعا فرمایئے کہ حق تعالیٰ فہم سلیم اور ہمت قوی عطا فرمائے اور اپنی مرضیات کی توفیق اور رہبری فرمائے اور نامرضیات سے بچنے میں مدد فرمائے۔ فقط

خطبہ جمعہ کے بعد ختم کے قریب فرمایا کہ صاحبو! یہ مہینہ شوال کا ہے اس کی بعض خصوصیات کا مختصراً ذکر کرتا ہوں۔ ایک خصوصیت تو اس مہینہ کی یہ ہے کہ اس میں چھ روزے رکھنا مستحب ہے۔ حدیث شریف میں ان روزوں کی بڑی فضیلت آئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو کوئی رمضان المبارک کے روزوں کے بعد چھ روزے شوال میں بھی رکھے گا اس کو ایسا ثواب ملے گا گویا اس نے سال بھر برابر روزے رکھے اور یہ سال بھر روزوں کا حساب اس طرح ٹھیک ہے کہ ہر نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا ملتا ہے تو رمضان کے ایک مہینے کے روزے دس مہینے کے روزوں کے برابر ہوئے اور چھ روزے شوال کے ۶۰ دن کے برابر ہوئے جس کے دو مہینہ ہوئے ہیں تو یہ کل مل کر ایک سال ہو گیا' اگر کسی کو ہمت ہو تو یہ خیال کرنے کی بات ہے اور یہ ضروری نہیں کہ یہ چھ روزے مسلسل رکھے بلکہ شوال کے اندر اندر پورے کر لے' خواہ ایک ساتھ رکھ لے خواہ فصل کے ساتھ رکھے' برابر ثواب ہے۔

دوسری خصوصیت اس مہینہ کی یہ ہے کہ یہ اشہر حج میں سے ہے یعنی اس مہینہ سے حج کے مہینے شروع ہو جاتے ہیں اور چونکہ مکہ معظمہ بعید ہے اس لیے یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان سے روانگی اس مہینہ سے شروع ہو جاتی ہے اگر کسی کو خدا نے وسعت دی ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ

فوراً سفر کا قصد کر لے ہم نے خرچ کا حساب لگایا تھا تو آج کل ساڑھے تین سو روپیہ حج کے لیے کافی ہے یوں کوئی نواب بن کر جانا چاہے تو وہ اور بات ہے اور مدینہ طیبہ کے لیے سوسوا سو روپیہ اور چاہئیں لیکن جس کے پاس صرف حج کے لیے روپیہ ہو مدینہ طیبہ کے لیے روپیہ نہ ہو تو اس کے اوپر حج فرض ہے۔ آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب مدینہ طیبہ ہی نہ جانا ہوا تو کیا حج ہوا۔ یہ بالکل غلط عقیدہ ہے اگر اس بنا پر حج میں تاخیر کرے گا تو وہ فاسق ہوگا۔ غرض جس کے پاس ساڑھے تین سو روپیہ علاوہ اہل وعیال کے نان ونفقہ کے موجود ہوں اس پر اسی سال حج کرنا فرض ہے اگر تاخیر کرے گا گنہگار ہوگا۔ ہاں اگر راستہ کی بدامنی وغیرہ کے متعلق خبریں سنی ہوں تو اس کی تحقیق کر لے، تحقیق کرنے کے ذرائع موجود ہیں اگر کوئی تحقیق کرنا چاہے گا تو ہم بھی مدد کرنے کے لیے حاضر ہیں، تحقیق کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ بھی عقل کی اور مصلحت کی بات ہے اگر تحقیق کے بعد امن طریق معلوم ہو جاوے تو پھر بلا عذر حج میں تاخیر کرنا فسق ہے کیونکہ سال بھر کی مدت بہت ہوتی ہے، موت وحیات صحت مرض کی کس کو خبر ہے لہٰذا جس کے پاس ساڑھے تین سو روپیہ موجود ہوں وہ قصد روانگی کر لے کیونکہ ابھی بہت فراغت کا وقت باقی ہے بہت لوگ جا رہے ہیں۔ فقط

طریق القلندر

اہل شہر کی درخواست پر یہ وعظ ۳۰ نومبر ۱۹۱۸ء مطابق ۲۵ صفر ۱۳۳۷ھ شب شنبہ
کو درگارہ حضرت قلندر صاحب پانی پتی میں چوکی پر کھڑے ہو کر فرمایا
دو گھنٹہ چالیس منٹ میں ختم ہوا۔ حاضرین کی تعداد چالیس ہزار کے قریب تھی۔
مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب وخواجہ عزیز الحسن صاحب نے قلمبند فرمایا۔

طریق قلندری جو تصوف کا ایک مقبول طریق ہے اس کا صحیح مفہوم اور اس کے متعلق عام غلطی کا ازالہ کہ چار ابرو کا صفایا کرانے والے کو قلندر سمجھتے ہیں۔ اس فکر میں لگ جاؤ کہ کسی کامل مکمل کی صحبت میسر آئے' دو چیزیں لازم طریق ہیں' ایک عمل دوسری محبت اول میں ہمت کی ضرورت ہے اور دوسری میں اہل اللہ کی محبت اور ان کے اتباع کی۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰه نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّم اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ. (المائدہ آیت نمبر۵۴'۵۵)

ترجمہ: اے ایمان والو! جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم پیدا کرے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی وہ مسلمانوں پر مہربان ہوں گے' کافروں پر تیز ہوں گے' جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروانہ کریں گے' یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے' جس کو عطا فرمائیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے بڑے علم والے ہیں' تمہارے دوست اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ایماندار لوگ ہیں جو کہ اس حالت سے نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں کہ ان میں خشوع ہوتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے دوستی رکھے گا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ایماندار لوگوں سے پس اللہ کا گروہ بلاشک غالب ہے)

لزوم و وجوب

جن آیتوں کی میں نے تلاوت کی ہے ان میں ہر چند کہ مضامین متعدد ہیں، مگر باوجود تعدد کے غیر مربوط نہیں بلکہ ان مضامین میں باہم ارتباط ہے اور ارتباط بھی ایسا ہے کہ تابعیت اور متبوعیت یا اصالت اور فرعیت کا کیا معنی کہ ان میں بعض اجزا اصل ہیں اور بعض فروع و توابع یا یوں کہئے کہ بعض مقصود ہیں اور بعض متمم اور مکمل یا یوں کہئے کہ بعض مقصود ہیں اور بعض علامات و آثار بہرحال جس عنوان سے چاہے تعبیر کیجئے۔ حاصل یہ ہے کہ بعض مضامین اصل ہیں اور بعض تابع۔ اب اس اصل کو جس لفظ سے چاہے تعبیر کر دیا جاوے اور تابع کو جس لفظ سے چاہے تعبیر کر دیا جاوے لیکن یہ خوب سمجھ لیا جاوے کہ تابع کے یہ معنی نہیں کہ وہ مقصود نہیں بلکہ مقصود وہ بھی ہیں مگر مقصود مقصود میں فرق ہوتا ہے یعنی ایک تو مقصود ہوتا ہے من کل الوجوہ اور ایک مقصود ہوتا ہے من بعض الوجوہ۔ گو لزوم اور وجوب دونوں میں مشترک ہوتا ہے۔ مثلاً جیسے نماز اور وضوء ہر شخص جانتا ہے کہ نماز اصل ہے اور وضو تابع اور اس کی شرط ہے مگر باوجود اس کے یہ نہیں ہے کہ وضو کسی درجہ میں بھی مقصود نہیں، یعنی اس معنی کو غیر مقصود نہیں ہے کہ بلا وضو بھی نماز کو جائز سمجھا جاوے بلکہ دونوں میں عجیب تعلق ہے کہ وضو تو بلا نماز کے صحیح ہے لیکن نماز بلا وضو کے صحیح نہیں۔ یعنی یہ تو ہے کہ بدون وضو کے نماز درست نہیں لیکن اس کا عکس نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی وضو تو کرلے مگر نماز نہ پڑھے یعنی جس نماز کے لیے وضو کیا ہے اس نماز کے وقت کے اندر اس وضو سے اس نماز کو ادا نہ کرے تب بھی جب دوسرا وقت نماز کا آئے گا تو کسی مفتی کا فتویٰ نہیں کہ اس دوسری نماز کے لیے پھر وضو کرنے کی ضرورت ہے بلکہ وہی وضو کافی ہوگا، دوسری نماز کے لیے اداء اور پہلی نماز کے لیے قضاء۔ غرض وضو بلا نماز صحیح ہوسکتا ہے لیکن نماز بلا وضو صحیح نہیں ہوسکتی۔

مقصود و غیر مقصود

یہ مثال اور اس مثال کے اندر یہ خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے تاکہ اجمالاً ایک غلطی معلوم ہوجاوے جو بعض لوگ اعمال کے اندر کرتے ہیں کہ مقاصد غیر مقاصد کے اندر تفصیل

کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اعمال غیر مقصود کا حذف بھی جائز ہے یعنی آج کل یہ بات زبان زد ہے کہ مقصود تو حق تعالیٰ کی یاد ہے اور نماز روزہ وغیرہ محض اس کے ذرائع ہیں اور غیر مقصود ہیں۔ چنانچہ اس زمانے میں بہت لوگوں نے یہ شرب اختیار کر رکھا ہے اس مثال سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ نماز روزہ وغیرہ کا غیر مقصود ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ وضو کا کہ گو غیر مقصود ہے لیکن کیا اس کو جائز الحذف یا جائز الترک کہہ سکتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ غیر مقصود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مقصود کے برابر نہیں اور غیر مقصود بھی محض اس درجہ میں ہے کہ نماز کا رکن اور اس میں داخل نہیں کیونکہ شرط ہمیشہ مشروط سے خارج ہوا کرتی ہے مگر بوجہ شرط ہونے کے مقصود کی مکمل و متمم ہونے کے درجہ میں یہ بھی مقصود ہے۔ بہرحال مقصود کے درجات ہوا کرتے ہیں خوب سمجھ لیجئے میرے الفاظ مقصود و غیر مقصود سے شبہ ہو سکتا تھا اس کو رفع کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس مثال سے اس کو رفع کر دیا گیا بلکہ اس طرح کہا جاوے تو اور زیادہ واضح ہے کہ مقصود تو سب اعمال ہیں لیکن بعض مقصود ہیں اور بعض مقصود و مقصود اعظم ہیں۔ بہرحال وہ شبہ حذف ہو گیا۔

مقصود اعظم

اب بعد حذف شبہ کے میں پھر عود کرتا ہوں اپنی تقریر کی طرف یعنی جتنے اجزاء ان آیتوں میں ہیں وہ ہیں تو سب کے سب مقصود لیکن ان میں جو مضمون مقصود اعظم ہے اس کو اس وقت بیان کرنے کے لیے میں نے تجویز کیا ہے کیونکہ وہ مضمون از روئے قواعد شرعیہ کے نیز باعتبار اپنی نوع کے اصل ہے باقی مضامین اسی کے متمم اور توابع اور لاحق ہیں' یہ حاصل ہے اس مضمون کا۔ اس مضمون کا حاصل مفصل تو ان آیتوں میں ہے جو عنقریب بیان میں' انشاء اللہ تعالیٰ آنے والا ہے اور مجمل حاصل ایک اور بھی ہے کہ جو حضرت عراقی کے ایک شعر میں ایک دوسرے عنوان سے مذکور ہے جس کے متعلق ایک دوست نے مجھے مشورہ بھی دیا تھا کہ اس شعر کا مضمون آج بیان کیا جاوے۔ وہ شعر حضرت عراقی کا یہ ہے:

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی　　　　کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(میرے مرشد مجھے تو طریق جذب کا رستہ دکھلائیے کیونکہ ریاضت و محنت کا معاملہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے)

اس وقت اس فرمائش کو میں نے قبول نہیں کیا تھا مگر رد بھی نہیں کیا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ بیان بالکل اختیار میں نہیں نہ پہلے سے کوئی مضمون تجویز کیا جاتا ہے عادت اللہ ہر ایک کے ساتھ جدا ہے۔ اکثر اور غالب معاملہ اپنے ساتھ یہی دیکھا جاتا ہے کہ عین وقت پر یا قریب کوئی مضمون خود تقاضا کرتا ہے قلب میں بس اسی کا اتباع کیا جاتا ہے اور اسی کو بیان کر دیا جاتا ہے جس عنوان سے بھی میسر ہوا تو اس وقت گو اس فرمائش کو قبول نہیں کیا گیا لیکن رد کی بھی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ ذہن خالی تھا مگر وقت کے قریب اسی مضمون کا تقاضا قلب میں پیدا ہوا میں نکتہ اس وقت یہ سمجھا تھا کہ چونکہ یہ بیان ایک بزرگ کے مزار کے قریب ہے جو بزرگ اسی لقب کے ساتھ مشہور ہیں (یعنی حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندر قدس سرہ العزیز ۱۲) اس لیے یہ فرمائش کی گئی ہے۔

ترک اعمال

غرض میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ محض شاعری نکتہ ہے اسی واسطے قلب نے اس فرمائش کو قبول نہیں کیا لیکن بعد اس کے اس کی ضرورت بھی معلوم ہوئی۔ وہ ضرورت یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی حالت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر تو وہ ہیں کہ جنہیں اعمال کی طرف توجہ ہی نہیں، بہت سے ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ نہ نماز نہ روزہ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ نماز روزہ کے ساتھ تمسخر بھی ہے اور استہزاء بھی ہے کوئی تہذیب کے ساتھ استہزاء کرتا ہے کوئی بدتہذیبی کے ساتھ تو فقط ترک ہی نہیں بلکہ استہزاء اور استخفاف بھی ہے اور اگر خیر استہزاء اور استخفاف نہ بھی ہو تو اخلال اور سستی اور کسل تو ضرور ہے۔ استطاعت ہے اعمال کی مگر نہیں کرتے، نماز روزہ کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے، بدنگاہی سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے، غیبت سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے، پرائے حقوق سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے، سب وشتم، لڑائی جھگڑا، مکروفریب ان سب سے بچ سکتے ہیں مگر نہیں بچتے، کثرت سے تو ہم لوگوں کی یہی حالت ہے کہ گویا اعمال ہیں ہی نہیں بلکہ بجائے ان کے دوسرے اعمال ہیں یعنی معاصی میں مبتلا ہیں اور زیادہ ایسے ہی ہیں مگر اس کے ساتھ ان لوگوں کو اپنے اعمال وطاعات کا دعویٰ بھی نہیں اس لیے یہ لوگ اتنے زیادہ قابل شکایت نہیں جتنے قابل شکایت وہ لوگ ہیں کہ

انکے یہاں اعمال بھی ہیں، تقویٰ بھی طہارت بھی اور اپنے کو عابد زاہد بھی سمجھتے ہیں مگر ان اعمال میں روح نہ ہونے سے وہ اعمال ایسے ہیں جیسے بادام بلا مغز یا دودھ بلا روغن، ان کے حال پر زیادہ تاسف ہے اور وہ زیادہ قابل رحم ہیں۔ دو وجہ سے ایک تو یہ کہ بیچاروں نے محنت بھی کی، مشقت بھی اٹھائی، مجاہدے بھی کئے مگر افسوس پھر بھی مقصود حاصل نہ ہوا، سارے دن چلے دھوپ سہی خاک پھانکی، پیروں میں آبلے پڑے، مگر منزل پھر بھی نہ قطع ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک عزیز نے رات کو سفر کا قصد کیا، سواروں میں نوکر تھے، رخصت قریب ختم تھی، ملازمت پر واپس جا رہے تھے، بھتیجے نے کہا بھی کہ اندھیری رات ہے اس وقت نہ جایئے، پریشان ہو جایئے گا لیکن نہیں مانا، کہا تم بچہ ہو، کیا سمجھو نوکری کا معاملہ ہے۔ رخصت ختم ہو گئی ہے میں کیسے رک سکتا ہوں، بھتیجے نے کہا بہت اچھا جایئے مگر پریشان ہو جایئے گا خیر صاحب چلے وہاں سے رات ایسی اندھیری کہ چل تو رہے مگر کچھ پتہ نہیں کہ کدھر جا رہے ہیں، دو چار میل ٹھیک چلے کیونکہ اپنے گاؤں سے اتنی دور تک تو راستہ ہر شخص کو معلوم رہتا ہی ہے، بے دیکھے بھی آدمی جا سکتا ہے، مگر آگے چل کر خدا معلوم رخ کس طرف کو ہو گیا کہ راستہ بھولے اور ایسے بھولے کہ بھولنے کو بھی بھول گئے اور بھولنا تو وہی ہے کہ بھولنے کو بھی بھول جاوے۔ چنانچہ رستہ بھول کر خدا جانے کہاں کے کہاں پہنچے اور بالآخر خدا جانے کیسا چکر کھایا کہ پھر اسی راستہ کو ہو لئے جس سے روانہ ہوئے تھے۔ اب وہ تو سمجھ رہے ہیں کہ ہم آگے کو چل رہے ہیں اور حقیقت میں ہٹ رہے ہیں پیچھے، غرض ساری رات گھوم گھام کر صبح لوٹ کر پھر وطن شریف ہی میں آ پہنچے، صبح صادق کا وقت تھا، ان کے مکان کے قریب جامع مسجد ہے جو بہت کرسی دار ہے اور اس کے فنا میں ایک برگد کا درخت ہے، جامع مسجد کو دیکھ کر کہا کہ اخاہ یہ کون سا گاؤں ہے جس کی مسجد بھی ایسی ہی ہے جیسی ہمارے گاؤں کی، پھر برگد ملا کہا ارے میاں یہ تو درخت بھی ویسا ہی ہے جیسا ہمارے گاؤں کا، یہ گاؤں تو ہمارے وطن کا مذکر ہے، بھائی یہ گاؤں بہت اچھا ہے، آگے بڑھے تو اپنا سا مکان بھی معلوم ہوا۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ کیا قصہ ہے، بھتیجے صاحب مکان سے نکل کر نماز کو جا رہے تھے، انہوں نے کہا السلام علیکم کہا کون، فلانے کہا ہاں، کہا میاں یہ تو بتاؤ میں ہوں کہاں، کہا وہیں ہو جہاں میں ہوں اور کہاں ہوتے۔ کہا ارے میاں میں تو رات بھر چلتا رہا اور پھر گھر کے گھر ہی میں رکھے ہوئے

لاحول ولا قوۃ. یہ تو بڑی واہیات ہوئی' بھتیجے نے کہا میں نے آپ سے کہا نہ تھا لیکن آپ نے مانا ہی نہیں تو بڑا افسوس ہے ایسے مسافر پر جو ساری رات سفر کرے اور صبح کو پھر وہیں آ جاوے جہاں سے چلا تھا' تھکا بھی ماندہ بھی ہوا' وقت بھی صرف ہوا' پھر بھی وہیں کا وہیں جہاں پہلے تھا۔ خیر یہاں یہ بات تو نہیں ہے کہ یہ شخص بالکل مشابہ ہے اس مسافر کے یہاں راستہ کچھ نہ کچھ قطع تو ہوتا ہے لیکن بالکل ناتمام یعنی ایسے جیسے چھکڑے کی چال کہ صبح سے شام تک تو چلا اور کتنا آیا دس میل اور ایک ریل ہے کہ اتنے میں دو سو میل نکل گئی۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ریل اور چھکڑے کی رفتار میں جو اس قدر تفاوت ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔ ریل میں آخر وہ چیز کیا ہے جس نے اس کی رفتار کو اس درجہ تک پہنچا دیا ہے سبب اس تفاوت رفتار کا یہی ہے ریل میں مشین لگی ہوئی ہے اسی نے اس کو ہوا بنا رکھا ہے' اگر چھکڑے میں بھی ویسی ہی مشین لگا دیں تو اس میں بھی وہی بات پیدا ہو جاوے۔ بالخصوص جبکہ اس میں مشین لگانا ممکن بھی ہو اور سہل بھی ہو تو حسرت ہے اور اس شخص پر جو پھر بھی مشین نہ لگائے۔

متقی اور ریاکار

پھر ایسے لوگوں میں بھی بعض تو وہ ہیں جو متقی پرہیز گار ہیں اور بعضے ایسے ہیں جو محض ریاکار ہیں جس میں ریا اور نمائش ہے' اس کی تو بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسی اس مسافر کی اور بعینہ وہی حالت ہے کیونکہ ریا حابط عمل ہے۔ گو فرض تو سر سے اتر جاتا ہے لیکن مقبول نہیں ہوتا اور مقصود مقبولیت ہی ہے جب مقبول ہی نہ ہوا تو وہ پھر عمل ہی کیا ہوا وہ تو لاشی محض ہوا اس کی تو وہ پہلی ہی مثال ہے۔ چنانچہ جو لوگ محض نمائش کے لیے عمل کرتے ہیں یعنی فقط اس واسطے کہ لوگ کہیں کہ صاحب یہ بڑے عمل کرنے والے ہیں' ان کی بابت حدیث شریف میں وارد ہے' فرماتے ہیں جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہ قیامت میں سب سے اول ایک ایسے شخص کو لایا جاوے گا جو شہید ہوا ہو گا اللہ کے راستے میں' اس کو بتلایا جاوے گا کہ ہم نے تم کو یہ یہ نعمتیں دی تھیں وہ ان سب نعمتوں کا اقرار کرے گا' پھر سے پوچھا جاوے گا کہ ہم نے تو تم کو یہ یہ نعمتیں دیں اور تم نے اس میں عمل کیا کیا' وہ عرض کرے گا کہ میں نے آپ کی راہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ اپنی جان' ارشاد ہو گا کہ تم جھوٹے ہو' ہم کو خوش کرنے کے لیے

جان نہیں دی (بل لیقال انک جری) بلکہ اس لیے جان دی کہ سب میں یہ شہرت ہو جائے کہ بڑے بہادر تھے۔ (فقد قیل) تو تمہاری تعریف اور شہرت ہو چکی جو تمہارا مطلب تھا وہ دنیا ہی میں تم کو حاصل ہو چکا' دوم تمہارا مدعا پورا ہو گیا' پھر حکم ہو گا کہ اس کو منہ کے بل جہنم میں پھینک دیا جاوے۔ پھر بلایا جاوے گا ایک بڑے عالم کو اسی طرح اس سے پوچھا جاوے گا کہ کہئے صاحب آپ نے کیا کیا' وہ کہے گا میں نے یوں وعظ کہے' یوں نصیحتیں کیں' یوں لوگوں کو ہدایت کی اور یوں علم سکھایا۔ ارشاد ہو گا یہ ہمارے واسطے نہیں کیا (بل لیقال انک قاری) بلکہ اس واسطے کہ لوگوں میں مشہور ہو کہ بڑے عالم ہیں۔ بس تو آپ بھی وہیں تشریف لے جایئے جہاں آپ کے بھائی صاحب گئے ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے یہ آیا ہے حدیث میں کہ اس کو بھی منہ کے بل جہنم میں پھینک دیا جاوے گا۔ پھر ایک سخی صاحب لائے جاویں گے' ان سے بھی یہی سوال کیا جاوے گا' وہ کہے گا کہ میں نے بہت مال و دولت اللہ کے راستے میں خرچ کیا تھا' ارشاد ہو گا کہ اس واسطے نہیں کیا کہ ہم راضی ہوں (بل لیقال انک جواد) بلکہ اس واسطے کہ لوگ کہیں کہ بڑے سخی ہیں۔ ان کی داد و ہش کا کیا کہنا ہے بس سارے شہر میں وہی تو ایک سخی ہیں اگر کوئی اور بھی سخی ہو گا تو فلانے کے برابر نہیں ہو گا سو جو تمہارا مقصد تھا وہ حاصل ہو چکا۔ لہٰذا تم بھی وہیں جاؤ جہاں تمہارے دو بھائی جا چکے ہیں۔ چنانچہ اس کو بھی جہنم میں منہ کے بل پھینک دیا جاوے گا تو حضرت یہ تین عمل کتنے بڑے بڑے ہیں' علم دین' سخاوت' شہادت۔ اب ان سے بڑھ کر اور کون سا عمل ہو گا لیکن دیکھ لیجئے ریا کی بدولت ان کی کیا گت بنی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس شخص کا عمل صرف صورت عمل ہے حقیقتاً عمل ہی نہیں اور واقعی جو لوگ محض ریا کار ہیں ان کا تو وہی حال ہے کہ

از بروں چوں گور کافر پر حلل　　　　واندروں قہر خدائے عز وجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　　　واز درونت ننگ می دارد یزید

(باہر سے تو کافر کی قبر کی طرح آراستہ ہے اور قبر کے اندر خدا کا قہر و غضب ہے' ظاہر میں تو بایزید بسطامی پر طعنہ کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے یزید بھی شرماتا ہے)

ناتمام عمل

ان لوگوں کی تو یہ حالت ہوئی اور بعض وہ لوگ ہیں جن کے عمل ریا سے تو نہیں ہیں خلوص کے ساتھ ہیں مگر ناتمام اور غیر مکمل، گویا جسد بلا روح ہیں، خیر وہ کچھ ہیں تو سہی مگر ایسے ہی ہیں جیسے چھکڑے کی رفتار بمقابلہ ریل کے تو اگر کوئی نادان ایسا ہو کہ اس کو ریل عطا کی گئی ہو جس میں انجن بھی ہے اور سامان آگ کا بھی موجود ہے مگر صرف آگ ڈالنے اور مشین چلانے کی کسر ہے۔ اگر اس میں آگ چھوڑ دی اور بھاپ پیدا کر دی تو پھر وہ ریل ہے کہ صبح سے شام تک دو سو تین سو میل نکل گئی بلکہ زیادہ نہیں تو بس ایک ٹھیلہ ہے تو انجن بھی موجود آگ کا سامان بھی موجود ہے لیکن بیوقوف ڈرائیور ہے کہ اس کو ٹھیلتا ہے۔ ٹھیلنے کے لیے اول تو نیچے اترنا پڑتا ہے پھر بہت کچھ زور بھی لگانا پڑتا ہے۔ گو اس طرح ٹھیلنے سے بھی وہ چلتی ہے کیونکہ آخر لوہے کی سڑک پر ہے مگر کتنی صبح سے شام تک دو تین چار میل، بس اور جہاں چھوڑ دیا، بس کھڑی ہوگئی اگر فوراً نہیں تو کچھ دور اور چل کر سہی۔ غرض ٹھیلنے سے دن بھر میں دو چار میل چل سکتی ہے اور بہت سے بہت دس میل، اگر کوئی بہت ہی قوی ہوا اور برابر چلا گیا دھکیلتا ہوا تو اس شخص مذکور کی حالت اس کے مشابہ ہے اور یہ حالت بھی قابل افسوس ہے ہم نے بہت لوگ ایسے دیکھے ہیں کہ تقویٰ بھی طہارت بھی، ظاہری حالت بھی درست، ڈاڑھی بھی نیچی، پائنچے بھی ٹھیک نماز بھی، روزہ بھی، یہ سب کچھ مگر ساتھ ہی اس کی روح جس کو میں آگے بیان کروں گا وہ نہیں، غرض ہر عمل بے روح ہے یعنی کم جان ہے، گو بالکل بے جان نہیں اس کی رفتار ایسی ہی سست ہے جیسی ٹھیلہ کی۔ حق سبحانہ تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ نے ایک انجن گاڑی اس شخص کو دی جس کی کلیں بھی بہت اچھی اچھی ہیں، بھاپ بنانے کے لیے سامان بھی دیا، کوئلہ بھی، پانی بھی، دیا سلائی بھی مگر آگ سلگائے کون اور بھاپ بنائے کون، اس کی بلاستی کی وجہ سے ہاتھ پاؤں کو اتنی حرکت دینا بھی گراں ہو رہا ہے تو یہاں کسر کا ہے کی ہے۔ صرف بھاپ کی اور آگ سلگانے کی چونکہ بھاپ نہیں اس لیے رفتار تیز نہیں، اس وقت اسی بھاپ کو ذکر کیا جا رہا ہے اور یہی مراد ہے میری روح سے اور بھاپ نہ تو موجود ہے نہ اس کی فکر و کوشش ہے اسی کو حضرت عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر میں ذکر کیا ہے۔ اشارۃ

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی ۔۔۔ کہ دراز و دور دیدم رہ ورسم پارسائی

(میرے مرشد مجھے تو طریق جذب کا رستہ دکھلایئے کیونکہ ریاضت ومحنت کا راستہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے)

تو یہ ضرورت میری سمجھ میں آئی اس مضمون کی اور اس لیے یہ مضمون باوقعت معلوم ہوا کہ اس میں ایک بڑی کوتاہی کی تکمیل ہے اور اسی وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا اور اس ضروری چیز کی شرح اور تعین میں آگے چل کر کردوں گا مگر اجمالاً حضرت عراقی کے اس شعر سے سمجھ میں آجاوے گی۔ اصل تو یہ وجہ ہے اس شعر کے مضمون کو اختیار کرنے کی' باقی اس میں وہ شاعری نکتہ بھی ہے جس کی بنا پر میرے دوست نے مجھے مشورہ دیا تھا' یعنی مقام بیان میں۔ اس لقب کے ایک بزرگ کا مزار ہونا مگر ممکن ہے ان کا ذہن بھی اس مضمون کی ضرورت کی طرف گیا ہو۔ بہرحال دو نکتے جمع ہوگئے' ایک تو یہ کہ فی نفسہ بھی یہ مضمون ضروری ہے' دوسرے خصوصیت مقام سے اس کا استحسان اور بڑھ جانا کیونکہ جس مقام پر یہ بیان ہو رہا ہے وہاں ایک ایسے بزرگ کا مزار مبارک ہے جو اس لقب قلندر ہی کے ساتھ مشہور ہیں۔ نیز ایک برکت کی بھی انشاء اللہ تعالیٰ توقع ہے پھر چونکہ یہ وعظ ایک بزرگ کے ساتھ نامزد ہے اس لیے بھی امید اس مضمون کے نافع ہونے کی ہے مگر یہ سب درجہ تائید وتزئین میں ہے۔ یہ نکتے درجہ مقصودیت میں نہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ مجھے اس طریق کو بیان کرنا ہے جس کے متعلق ہم میں کمی ہو رہی ہے اور جس کی طرف اب ہمارا التفات نہیں رہا اس وجہ سے یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے۔

طریق قلندرانہ

حق سبحانہ تعالیٰ نے جو مضمون اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے وہ اس طریق کی تفصیل ہے۔ البتہ قرآن میں یہ اصطلاح نہیں ہے اور یہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو اصطلاح چاہے مقرر کرلے تعبیر کرنے والے کو اختیار ہے جس اصطلاح میں چاہے کسی مضمون کو تعبیر کرے' گو اس آیت میں یہ اصطلاح نہیں ہے لیکن یہ مضمون ہے وہی۔ چنانچہ تفصیل سے معلوم ہو جاوے گا لیکن اس کے قبل ممکن ہے کہ کسی کو اس شعر کے متعلق ایک شبہ ہو اس کو رفع کیے دیتا ہوں۔ وہ شبہ یہ ہے کہ حضرت عراقی نے اس شعر میں رہ قلندر اور رہ پارسائی کو متقابل فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی
(میرے مرشد مجھے تو طریق جذب کا راستہ دکھلایئے)
اے مرشد مجھ کو قلندر کا رستہ بتلا دیجئے۔

کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی
(کیونکہ ریاضت ومحنت کا راستہ دشوار معلوم ہوتا ہے)

کیونکہ رستہ پارسائی کا تو بہت دور دراز ہے۔ یہ ترجمہ ہے اس شعر کا اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ قلندر کا رستہ پارسائی کے رستہ کے مقابل ہے۔ تو گویا اس طریق قلندری میں پارسائی نہ ہوئی ہوگی۔ یعنی آدمی بالکل آزاد اور رند بے قید ہو جاتا ہوگا۔ اسے ڈاڑھی رکھنی بھی ضروری نہ رہتی ہوگی اس پر نماز بھی فرض نہ رہتی ہوگی' شراب بھی اسے حلال ہو جاتی ہوگی۔ غرض حلال حرام کی بالکل تمیز نہ رہتی ہوگی۔ شاید طریق قلندری کا خلاصہ ذہنوں میں یہ ہوگا تو اللہ بچاوے ایسے طریق سے غرض کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے اس شعر کے مضمون سے اس کو پہلے رفع کیے دیتا ہوں کیونکہ اس کا رفع کرنا فی نفسہ بھی ضروری ہے۔ نیز اس کی اس بیان میں بھی ضرورت ہوگی جو مجھے اس وقت کرنا ہے اور یہ اس بیان میں معین بھی ہوگا۔ اب یہاں ضرورت ہے تھوڑے سے علم درسی کی مگر خیر میں حتی الامکان آسانی سے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ غیر اہل علم بھی بقدر ضرورت سمجھ سکیں' تقریر اس کی یہ ہے کہ عراقی کے شعر میں جو طریق قلندری وطریق پارسائی میں تقابل واقع ہوا ہے وہ ظاہر سیاق سے تبائن پر ضرور دال ہے جس کے لیے عدم تصادق لازم ہے لیکن تبائن وعدم تصادق کے لیے تنافی وعدم اجتماع ضروری نہیں' دیکھئے کل میں اور اس کے اجزاء خارجیہ میں تبائن وعدم تصادق متحقق ہے لیکن تنافی نہیں اور اجتماع ہوتا ہے جیسے بیت کے لیے جدار اور سقف اجزاء خارجیہ ہیں جن میں باہم تصادق نہیں بلکہ تقابل ہے لیکن ایک کل ہے اور دوسرا جزو اور دلائل سے ثابت ہے جس کا کافی بیان اس وعظ میں بھی ہے کہ طریق قلندر کے دو جزو ہیں ایک عمل جو حقیقت ہے طریق پارسائی کی اور دوسرا محبت اور طریق قلندر نام ہے ان دونوں کے مجموعہ کا اور چونکہ یہ اجزاء خارجیہ ہیں ان میں تصادق تو نہیں مگر کلیت و جزئیت کا تعلق ہے پس طریق قلندر کل

ہوا اور طریق پارسائی اس کا ایک جزو ہوا' جز کے انتفاء سے کل کا انتفاء لازم ہے پس طریق پارسائی جہاں منتفی ہو جاوے گا سو حاصل شعر کا یہ ہوا کہ محض طریق پارسائی کافی نہیں جو کہ ایک جزو ہے۔ طریق قلندری کا بلکہ طریق قلندری مطلوب ہے جس میں دونوں جز جمع ہیں طریق پارسائی بھی اور طریق محبت بھی پس اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا' باقی اب دوسری تحقیق ہے کہ ان دونوں میں اصل کون ہے محبت یا اعمال اس کا فیصلہ بھی ہوا جاتا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ یہاں اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ طریق قلندر وہ طریق ہے جو مرکب اور اعمال دونوں سے آگے ایک اصطلاحوں کا فرق ہے جو اصطلاح متقدمین میں پائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے وہ قلندر میں یہ بھی قید ہے کہ جس میں اعمال کی تقلیل ہو یعنی اعمال ظاہرہ مستحبہ کی' کیا معنی کہ بہت نفلیں اور وظائف نہ ہوں بلکہ محبت کی خاص رعایت ہو یعنی تفکر اور مراقبہ زیادہ ہو۔ ایک تو یہ اصطلاح ہے اور ایک اصطلاح اور ہے یعنی خواہ ان اعمال کی تکثیر بھی ہو مگر غلبہ آزادی کو ہو لیکن آزادی خلق سے نہ کہ خالق سے۔ کیا معنی کہ قلندر کو دنیا کی وضع اور رسوم کی پروا نہیں ہوتی نہ مصالح پر نظر ہوتی ہے۔ مثلاً ہم یہ بھی نظر کرتے ہیں کہ بھائی ایسا نہ کہو کوئی کیا کہے گا اور مثلاً ہم لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ فلانے کو کہو مت برا مانے گا۔ وحشت ہوگی بھائی مگر بشرطیکہ ان رعایتوں کا شریعت سے اذن بھی ہو اور قلندر کو اس کی کچھ پروا نہیں ہوتی کہ کوئی برا مانے گا یا بھلا مانے گا اس کا دل صاف اور سادہ ہوتا ہے غرض وہ آزاد ہوتا ہے مصالح سے اس کی مصلحت صرف ایک ہوتی ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

(مصلحت دید میری یہ ہے کہ تمام دوست دنیا کو چھوڑ دیں اور صرف یار کی زلف کو پکڑ لو)

اس کی بڑی مصلحت یہی ہوتی ہے کہ ایک کو لے کر سب کو ترک کر دو' اس کی تو بس یہی حالت ہوتی ہے۔

دلارامے کہ داری دل درو بند وگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(اے دل جس کو تو دوست رکھتا ہے اس میں دل لگا اور تمام جہان سے آنکھیں بند کر لے)

اوراس کا یہ مشرب ہوتا ہے:

ہمہ شہر پر زخوباں منم و خیال ماہے چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بہ کس نگاہے

(تمام شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند ہی کے خیال میں محو ہوں' کیا کروں میں' کاش کہ بدخو کی نظر کسی پر نہ پڑتی)

سوائے محبوب کے کسی پر اس کی نظر ہی نہیں پڑتی۔ بجز ایک کے سارے جہان کو انہوں نے ہیچ اور فنا کر دیا ہے۔ جب انہوں نے اپنے ہی کو ہیچ اور فنا کر دیا تو پھر دوسرے پر کیا نظر کریں۔ کہتے ہیں کہ

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا اور جو خودنا کام ہو اس کو کسی سے کام کیا

(جب اپنی ہی ہستی مٹادی تو دوسروں کی ہستی کی انہیں کیا پروا) مشہور ہے کہ جب اپنی ہی ٹوپی اتار دی تو پھر دوسروں کی ٹوپی کی کیا پروا' جب وہ اپنی ہی ہستی کو مٹا چکا تو دوسروں کی ہستی کی پروا ہو اس کی جوتی کو' ایسے لطیفہ نکالا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کے اس قول سے "رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَافِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ" (اے اللہ میں تیرے نذر کرتی ہوں جو کچھ میری نیت میں ہے اور تیرے راستہ اسے آزاد کرتی ہوں) اس کا یہ تھوڑا ہی مطلب ہے کہ وہ غلام تھا' اب اسے آزاد کرتی ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میں اسے تیرے ہی لیے خاص کرتی ہوں اے اللہ تعالیٰ یہ خالص تمہارا ہے' تمہارے دین کی خدمت میں ساری عمر رہے گا' تو حر کے معنی خالص کے ہوئے چنانچہ اہل لغت نے لکھا ہے' طین حر یعنی وہ مٹی جس میں کنکر وغیرہ نہ ملا ہو' حر خالص مٹی کو کہتے ہیں' یہاں بھی حر کے معنی ہیں خالص اللہ کا اور اب تو خالص کے وہ معنی ہوگئے جو نہ خالص کے ہیں یعنی ایسا میلا جیسا میل والا گھی۔ سو آج کل کے خالص تو واقعی بالکل نہ خالص ہیں۔ یعنی اس کے جو اصل معنی ہیں اس معنی کو نہیں جیسے عوام پوچھتے ہیں کہ یہ گھی نخالص ہے' بیچنے والا کہتا ہے کہ ہاں بالکل نخالص ہے ایسے ہی احرار کی دو قسمیں ہیں ایک خالص ایک نخالص' نخالص کون جس میں میل ہو' میل کا ہے کا ہو' میل ہو حب دنیا کا میل ہو حب غیر کا' میل ہو معصیت کا' شرک و کفر کا' یعنی آج کل آزاد اس کو کہتے ہیں جو شریعت سے آزاد ہو' اللہ اکبر ایسا شخص بھی

کہیں آزاد کہا جا سکتا ہے۔ حضرت یہ تو وہ آزاد ہے جو ہزاروں قیدوں میں ہے یعنی معصیتوں میں مبتلا ہے' پھر آزادی کہاں رہی کیونکہ معصیت کی قید تو سب قیدوں سے سخت قید ہے' غرض بے قید کوئی نہیں' کوئی خدا کی قید میں ہے کوئی شیطان کی قید میں بہر حال قید سے تو خالی کوئی نہیں' اب اس کا فیصلہ خود کرلو کہ کونسی قید پسند کے قابل ہے۔ حضرت سعدی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اسیرش نخواہد رہائی زبند　　　شکارش نہ جوید خلاص ازکمند

(اس کا قیدی قید سے آزادی نہیں چاہتا اس کا شکار کمند سے رہائی نہیں چاہتا)

اور مولانا فرماتے ہیں:

گردو صد زنجیر آرے بگسلم　　　غیرزلف آں نگار مقبلم

(اگر دو سو زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تو ساری توڑ ڈالوں مگر معشوق کی زلف کو توڑنا گوارہ نہیں)

یعنی اگر سینکڑوں قیدوں میں بھی ڈال دیا جاؤں تو ساری قیدیں توڑ ڈالوں مگر معشوق کی زلف کی قید کہ اس کو توڑنا ہرگز گوارہ نہ کروں کیونکہ یہ قید تو محبوب قید ہے۔ غرض قید بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو محبوب کی قید اور ایک ناگوار قید۔ دیکھو تو سہی اگر عاشق کو کسی دعوت کے لیے پکڑو تو وہ رسے توڑ کر بھاگے گا کہ ہمیں دعوت سے کیا مطلب ہم تو آزاد ہیں۔ اب فرض کرو اسی رو میں محبوب بھی آ گیا اور اس نے بھی کہا کہ چلو میاں تمہاری آج دعوت ہے ہمارے یہاں اور وہ اس سے بھی کہہ دے کہ نہیں جناب میں تو آزاد ہوں' میں دعوتوں میں نہیں جایا کرتا کوئی اس سے کہے کہ ارے احمق جس کی بدولت تو آزاد ہوا ہے اسی کے یہاں تو آج دعوت ہے جس کے لیے تو نے سارے تعلقات قطع کیے' آج کی دعوت اسی شخص کے تعلق سے مسبب ہے اس کی دعوت میں بھی جانے سے تو آزاد بنتا ہے تو تو عاشق ہی نہیں۔ یہ اچھی آزادی ہوئی صاحب کہ نماز بھی چھوڑ دی' روزہ بھی چھوڑ دیا یہ آزاد کہاں سے ہوا' یہ تو ہزاروں قیدوں کے اندر جکڑا ہوا ہے' آزاد وہ ہے جو غیر اللہ سے آزاد ہو جو خالص اور حر ہو تو قلندر کے یہ معنی ہیں۔

اصطلاح قلندر

خلاصہ یہ کہ متقدمین کی اصطلاح میں تو قلندر وہ ہے جس میں اعمال غیر واجبہ کی تقلیل ہو اور متاخرین نے اس کے معنی میں وسعت کی ہے' یعنی قطع نظر اس سے کہ اعمال میں تقلیل ہو یا تکثیر ہو لیکن خلق سے آزاد ہو اور یہ دونوں اصطلاحیں جدا جدا ہیں لیکن ایک نکتہ کی بنا پر یہ دونوں اصطلاحیں متوافق بھی ہو جاتی ہیں یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ قلندر کے اعمال میں تقلیل ہوتی ہے تو قلت اور کثرت امور اضافیہ میں سے ہیں یعنی بمقابلہ دوسرے اہل اعمال کے تو وہ عمل میں بھی بڑھا ہوا ہے یعنی اوروں سے تو اس کا عمل بھی غالب ہے لیکن خود اس میں جو محبت اور عمل دو چیزیں جمع ہیں ان میں محبت کا حصہ عمل سے بڑھا ہوا ہے۔ پس اس کمی کا یہ مطلب نہیں کہ عمل میں فی نفسہ کوئی کمی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ گو عمل بھی بہت بڑھا ہوا ہے لیکن محبت میں اس سے زیادہ بیشی ہے۔ عمل تو کامل ہے ہی مگر محبت کامل سے بھی آگے یعنی اکمل ہے اس تقریر سے یہ دونوں اصطلاحیں باہم متوافق ہو گئیں' اب ایک اور تیسری اصطلاح جہلاء کی ہے جو بالکل بدعت ہے کہ قلندر وہ ہے جو چار ابرو کا صفایا کر دے اور نماز روزہ سب کو رخصت کر دے' ایسے شخص کو جہلاء کہتے ہیں کہ صاحب یہ قلندر ہیں استغفر اللہ وہ کیا قلندر ہوتا' ہاں اگر کوئی معذور ہو' غیر مکلّف ہو' مثلاً مجنوں ہے' دیوانہ ہے تو وہ مستثنیٰ ہے یعنی خدا کے یہاں اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ یہ دوسری گفتگو ہے کہ آیا وہ کامل بھی ہے۔ سو یہ خوب سمجھ لیجئے کہ نہ وہ کامل ہے نہ مکمل کیونکہ مکمل ہونے کے لیے خود کامل ہونا ضروری ہے' تکمیل کے لیے کمال شرط ہے جو خود ہی درزی کا کام نہ جانتا ہو وہ دوسرے کو سینا کیونکر سکھا سکتا ہے۔

اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم

تو مجاذیب اور بہلول جو ہوتے ہیں چونکہ یہ خود کامل نہیں ہوتے لہٰذا دوسرے کی تکمیل بھی نہیں کر سکتے کامل اور مکمل وہی ہے جو قدم بقدم ہو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے جس کا ظاہر ہو مثل ظاہر پیغمبر کے اور باطن ہو مثل باطن پیغمبر کے۔ یعنی ہر امر میں اور ہر حال میں پیغمبر ہی اس کے قبلہ و کعبہ ہوں۔ اس کے ظاہر کا قبلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہر ہو

اوراس کے باطن کا قبلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا باطن ہو۔ اس کو خوب سمجھ لیجئے دیکھئے تو سہی نماز کی صحت کے لیے قبلہ رخ ہونا ضروری ہے ہاں قبلہ سے تھوڑا فرق ہو تو خیر مضائقہ نہیں نماز صحیح ہوجاوے گی۔ چاہے رکعتیں بھی زیادہ نہ پڑھے اور چاہے قرأت میں بھی کچھ تقلیل ہو مگر ہو قبلہ رخ، تب ہی نماز کی صحت متحقق ہوگی اور اگر مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تو چاہے رکعتوں کی تعداد بھی زیادہ ہو اور قرأت میں بھی تطویل ہو لیکن نماز صحیح نہ ہوگی دیکھو یہ مسجد بنی ہوئی ہے (بیان مسجد سے متصل ہو رہا تھا ۱۲ جامع) اس کی سمت کی طرف نماز صحیح ہوجاتی ہے وجہ یہ کہ مسجد خانہ کعبہ کی طرف گویا منہ کیے ہوئے ہے لہٰذا جو کوئی اس کی سمت کی طرف اپنا منہ کر کے نماز پڑھے گا چاہے دو رکعت ہی کیوں نہ ہوں اس کی نماز صحیح ہوجاوے گی۔ برخلاف اس کے اس مسجد کی سمت کے مقابل مشرق کی جانب اگر آپ اس مسجد کی ایک شکل بنا کر (کیونکہ وہ مسجد کیا ہوگی مسجد کی محض شکل ہی ہوگی) اس میں نماز پڑھیں جس میں اتنی لمبی لمبی سورتیں ہوں کہ ایک رکعت میں تو سورہ بقرہ ہو دوسری میں سورہ آل عمران، پھر تیسری میں سورہ نساء اور چوتھی میں سورہ مائدہ غرض چار رکعتوں میں یہ بڑی بڑی چار سورتیں ختم کی گئیں اب آپ ہی کہیے یہ نماز کیسی ہوئی۔ بالکل ہیچ در ہیچ اس پر ثواب تو کیا ملتا بلکہ اور عذاب ہوگا تو اس نماز میں کیا چیز کم ہے فقط کمی یہ ہے کہ رخ قبلہ سے ملا ہوا نہیں ہے اس کے سوا اور کسی کی کمی نہیں، شکل بھی نماز کی، مسجد کی بھی ساری ہیئت وہی لیکن تحریف قبلہ کے سبب وہ نماز ہرگز مقبول نہیں بلکہ مردود ہے، نماز بھی اور نمازی بھی تو ہمارے اعمال کا قبلہ و کعبہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال ہیں جس عمل کا رخ اس قبلہ کی طرف ہوگا وہی مقبول ہوگا۔ پس ہمارے ظاہر کا قبلہ پیغمبرؐ کا ظاہر ہے اور باطن کا قبلہ پیغمبرؐ کا باطن یعنی ہماری ظاہری حالت وہ ہونی چاہیے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حالت تھی، یعنی آپ کپڑا پہنتے تھے، ہمیں بھی ننگا نہیں رہنا چاہیے، آپ ڈاڑھی رکھتے تھے ہماری ڈاڑھی بھی منڈی یا کٹی نہ ہونی چاہیے، آپ کے ٹخنے کھلے ہوئے رہتے تھے ہمارے بھی کھلے رہنے چاہئیں اور یہ ہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹخنے کھلے رہتے تھے بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹخنے ڈھانکنے سے منع بھی فرمایا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ناخن

ترشے ہوئے اور لبیں بنی ہوئی رہتی تھیں۔ یہ ہی حالت ہمارے ناخن اور لبوں کی ہونی چاہیے' غرض ہمارا ظاہر بالکل مشابہ ہونا چاہیے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر کے کہ بس صورت دیکھتے ہی معلوم ہو جاوے کہ یہ غلام ہے ایسے آقا کا۔

ایک پیر بھائی

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ایک مرید الہ آباد کے رہنے والے تھے' میں الہ آباد گیا ہوا تھا' وعظ کے اندر دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھے شخص ڈاڑھی منڈی ہوئی خوب گورے چٹے گوٹہ ٹھپے کے کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے ہیں' جاڑے کے دن تھے' رضائی جو اوڑھے ہوئے تھے اس پر بھی گوٹہ اور پیمک لگی ہوئی تھی۔ وعظ کے بعد میرے پاس آ کر بڑی محبت سے بولے کہ مولوی منہ کھول دے میں نے دل میں کہا جب یہ ایسی محبت سے کہہ رہا ہے تو لاؤ منہ کھول دو' میرا کیا بگڑتا ہے' کوئی تھوک تو دے گا نہیں' غرض میں نے اپنا منہ کھول دیا' اس نے فوراً ہی ایک لڈو میرے منہ میں رکھ دیا' میں نے کھا لیا کہ خدا کی نعمت ہے کسی کے ہاتھ سے دلوائیں۔ میں نے پوچھا تم کون ہو' یہ سنتے ہی اس کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے' تھا صاحب محبت' غلطی میں مبتلا تھا' مکار نہ تھا' دکاندار نہ تھا' زار زار آنسو بہہ رہے تھے' وہ خود ہی شرمندہ تھا اپنی اس حالت پر رو کر کہا اس نالائق کو بندہ امداد اللہ کہتے ہیں' مجھ کو بھی رحم آ گیا' آخر پیر بھائی کا خیال ہوتا ہی ہے اور نہ بھی ہوتا پیر بھائی تو کیا تھا جو شرارت اور سرکشی نہ کرے اور اپنے آپ کو خطاوار سمجھے اس پر رحم ہی آتا ہے۔ البتہ شرارت کرنے والے پر غصہ آتا ہے' خیر میں نے ان سے بات چیت کی اور مناسب تسلی دی اس وقت تو ان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع ملا نہیں' اتفاق سے ایک مرتبہ میں گنگوہ گیا ہوا تھا' وہ بھی وہاں چلتے پھرتے آ گئے' میری جو خبر سنی تو اطلاع کر کے مع ایک مجمع عظیم کے میرے پاس پہنچے اور آتے ہی پھولوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا' میں نے ہار تو ہاتھ میں لے لیا اور انبساط کے لیے پوچھا یہ کیسے ہیں' کہا ہم ایک باغ میں گئے تھے' عوام الناس ایسوں کے بڑے معتقد ہوتے ہیں' سمجھتے ہیں کہ قطب الاقطاب ہیں' ارے قطب الاقطاب ہوتے تو ڈاڑھی کہاں جاتی مگر ان کے نزدیک تو ڈاڑھی کا نہ ہونا ہی دلیل قطبیت کی ہے۔ اگر یہ بات

ہے تو پھر سارا چین اور جاپان بس اقطاب اور اغواث ہی سے بھرا پڑا ہے کیونکہ وہاں قدرتی طور پر کسی کے ڈاڑھی مونچھ نکلتی ہی نہیں۔ غرض ایسوں کو برکت کے لیے کوئی باغ لے جاتا ہے کوئی کھیتوں پر لے جاتا ہے۔ ان حضرات کو بھی کوئی اپنے باغ لے گیا ہوگا۔ غرض انہوں نے کہا کہ ہم ایک باغ میں گئے تھے' باغ والے نے پھول دیدیئے تھے' سو کچھ تو حضرت شیخ عبدالقدوس رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر چڑھائے' جی چاہا کہ کچھ تمہیں بھی دیں کیونکہ وہ پیارے تھے مردوں میں' تم پیارے ہو زندوں میں' اپنے پیاروں کو اچھی چیز دیا ہی کرتے ہیں۔ یہ انہوں نے تقریر کی۔ بڑا مجمع تھا میں نے کہا شاہ صاحب یہ پھول جو آپ نے شیخ کے مزار پر چڑھائے ہیں آپ کے نزدیک تو بڑی چیز ہیں لیکن ایک مثال فرض کرو اگر کوئی شخص ہو جو سو روپیہ تولہ کا عطر سونگھنے والا ہو اور تم چار آنہ تولہ کا عطر بہت ہی گھٹیا اور چکٹا ہوا لے جاؤ اور جا کر اس کی ناک میں دے دو تو کیسا' کیا یہ ایذاء رسانی نہیں ہے' کہا بیشک' میں نے کہا اچھا اب یہ بتاؤ کہ حضرت شیخ تمہارے نزدیک شمائم و روائح جنت سے مشرف ہیں یا محروم ہیں' کہنے لگے معاذ اللہ کون کہہ سکتا ہے کہ محروم ہیں' میں نے کہا تو بس یہ جو پھول تم نے حضرت شیخ کے مزار پر چڑھائے ہیں' دو حال سے خالی نہیں یا تو ان کی خوشبو پہنچتی ہے یا نہیں پہنچتی ہے۔ اگر نہیں پہنچتی تو پھول چڑھانا بیکار اور اگر پہنچتی ہے تو ان جنت کے پھولوں کے مقابلہ میں جو حضرت شیخ کو حاصل ہیں تمہارے یہ دنیا کے پھول سو روپیہ تولہ کے عطر کے مقابلہ میں چار آنہ تولہ کا چکٹا ہوا عطر ہے یا نہیں۔ کہا بیشک' میں نے کہا تو بس یہ تو وہی مثال ہوئی کہ سو روپیہ تولہ کے عطر سونگھنے والے کی ناک میں چار آنہ تولہ کا سڑا ہوا عطر دے دیا' تم نے پھول چڑھا کر حضرت شیخ کی روح کو تکلیف پہنچائی' کہنے لگے میں توبہ کرتا ہوں یہ مسئلہ آج سمجھ میں آیا ہے اب کبھی کسی مزار پر پھول نہ چڑھاؤں گا میری توبہ ہے۔

محبت کی نشانی

اس کے بعد ہم لوگ نماز کے لیے مسجد میں گئے لوگ وضو کرنے لگے اور وہ ایک طرف بیٹھ گئے' میں ان کے پاس جا بیٹھا اور آہستہ سے کہا تم میرے پیر بھائی ہو اس لیے تم سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ تمہیں حضرت حاجی صاحب سے محبت ہے یا نہیں' بس رونے لگے کہ میں تو

عاشق ہوں، میں نے کہا پھر عاشق ہوکر کیوں اپنے محبوب کی مخالفت کرتے ہو کیا حضرت حاجی صاحب کی ایسی ہی ڈاڑھی تھی، کہا میں توبہ کرتا ہوں کہ میں اب کبھی ڈاڑھی نہیں منڈواؤں گا۔ صاحب انہوں نے ڈاڑھی منڈانے سے بھی توبہ کرلی، میں اس شبہ میں رہا کہ کہیں منہ دیکھنے کی توبہ تو نہیں ہے مگر پھر جو میرا الہ آباد جانا ہوا تو رستہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص خوب مقطع ڈاڑھی لیے ہوئے سامنے سے چلے آرہے ہیں، میں نے پہچانا بھی نہیں، ایک شخص نے بتایا کہ یہ فلانے ہیں، تب تو میں بہت خوش ہوا اور بغل گیر ہوکر ملا تو ان کی اصلاح اسی اصول سے کی گئی کہ جب تمہاری صورت حضرت حاجی صاحب جیسی نہیں پھر تم ان کے عاشق کیا ہوئے۔

قلندر کے معنی

تو قلندر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنا ظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر کے خلاف رکھے نہ بزرگوں کے کلام میں کہیں اس کے یہ معنی منقول ہیں محض لغو اصطلاح ہے اور اس غلط اصطلاح کے ہونے سے ایک اور خرابی ہوگئی وہ یہ کہ جن بزرگان دین کا جن میں کہ علماء بھی تھے قلندر لقب ہوگیا چنانچہ حضرت قلندر صاحب صاحب مزار بھی عالم تھے، عوام ان کی نسبت اس لفظ کو سن کر یہ سمجھتے ہیں کہ معاذ اللہ یہ حضرات بھی ایسے ہی ہوں گے کہ نہ ڈاڑھی نہ مونچھ نہ نماز نہ روزہ، لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ حاشا وکلا حضرت نہایت متبع سنت اور پابند شریعت تھے اور کوئی بزرگ بھی ایسے نہیں ہوئے جنہوں نے اتباع سنت نہ کیا ہو حتیٰ کہ اگر غلبہ حال سے کبھی اتباع میں کچھ کمی بھی ہوگئی ہے تو اپنی اس حالت کو ناقص سمجھا ہے اور کبھی اس پر اصرار نہیں کیا نہ کہ نعوذ باللہ اس کو قصداً اختیار کرتے۔ غرض یہ بالکل تہمت ہے کہ بعض بزرگوں کا طریق خلاف شریعت بھی رہا ہے۔ سب بزرگوں کا ایک ہی طریق رہا ہے اور وہ طریق شریعت ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں: "ماردته الشریعة فهی زندقة" یعنی جس حال یا جس مقال کو شریعت رد کرے وہ بالکل الحاد اور زندقہ ہے۔ حضرت خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں اگر برہوا پری مگسے باشی برآب روی خسے باشی دل بدست آرکہ کسے باشی اگر بزور کرامت ہوا پر بھی اڑو گے تو کیا ہے، گویا مکھی ہوجاؤ گے کہ وہ بھی تو ہوا میں بلا تکلف اڑتی ہے، پانی پر چلو گے تو یوں سمجھو کہ ایک تنکا ہو گئے کیونکہ وہ بھی تو پانی کی سطح پر بہتا

ہوا جاتا ہے ہاں اپنے دل کو قابو میں کرو تب انسان بنو گے اور اسی قسم کے بہت سے اقوال ہیں میری کتاب تعلیم الدین میں جمع ہیں اس میں دیکھ لیجئے۔

اعمال سے بیزاری

حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کسی نے کہا کہ ایک قوم ہے جو یہ کہتی ہے "**نحن وصلنا فلاح حاجة لنا الی الصلوٰة والصیام**" ہم واصل ہوگئے ہیں لہٰذا ہمیں حاجت نہیں رہی نماز کی اور نہ روزہ کی۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کے جواب میں فرمایا "**صدقوا فی الوصول ولکن الی سقر**" یہ تو وہ سچ کہتے ہیں کہ واصل ہوگئے ہیں لیکن جہنم واصل ہوئے ہیں۔ خدا واصل نہیں ہوئے' پھر ارشاد فرمایا "**ولو عشت الف عام لما ترکت من اورادی شیئا الا بعذر شرعی**" یعنی اگر ہزار برس بھی میں زندہ ہوں تب بھی نماز تو بڑی چیز ہے کیونکہ فرض ہے۔ وظیفے جو محض مستحب ہیں بلکہ بعض مستحب کے درجہ میں بھی نہیں یہ بھی کبھی نہ چھوڑو۔ "**الا بعذر شرعی**" ہاں کوئی عذر شرعی لاحق ہوجاوے تو مجبوری ہے ورنہ کوئی وظیفہ تک بھی کبھی نہ چھوڑوں۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اخیر عمر تک ہاتھ میں تسبیح رکھتے تھے' دیکھئے وظیفہ تو وظیفہ تسبیح رکھنا بھی عمر بھر نہ چھوڑا حالانکہ تسبیح کا رکھنا نہ سنت نہ مستحب کچھ بھی نہیں' نہ موقوف علیہ کسی وظیفہ کا نہ کسی وظیفہ کے لیے شرط' یہ منتہی ہوجانے کے بعد حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اس کی حاجت باقی رہی تھی کیونکہ مبتدی کے لیے تو خیر وہ آلہ تذکر بھی ہوسکتی ہے۔ منتہی تو تذکر میں راسخ ہوجاتا ہے اسی لیے منتہی کے شان میں لکھا گیا ہے۔ خلوت و چلہ بر و لازم نماند مگر اس پر بھی حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس اپنی ابتداء کی حالت کو بھی نہ چھوڑا۔ کسی نے عرض بھی کیا کہ حضرت اب تو آپ منتہی اور واصل کامل ہوچکے ہیں اب آپ کو ہر وقت ہاتھ میں تسبیح لیے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا ارے اس تسبیح ہی نے تو مجھے واصل بنایا ہے اور اس درجہ تک پہنچایا ہے پھر کیا اب اس رفیق کو چھوڑ دوں' اسی کی بدولت تو یہاں تک پہنچے کیا اسی کو رخصت کردوں۔ اسی نے تو محبوب تک پہنچایا ہے تو پھر یہ بڑی ناشکری ہے کہ آج اس کو جواب دیدوں' اللہ اکبر کیسے تھے یہ حضرات جناب یہ آئمہ طریق ہیں' کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ناواقف تھے یا خشک ملا تھے۔ یہ لوگ بڑے بڑے عارف کامل اور عاقل گزرے ہیں ان کے یہ اقوال وافعال ہیں۔

کرامت

حضرت جنید رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص دس برس رہا' چلتے وقت عرض کیا کہ حضرت میں نے اتنی مدت خدمت میں قیام کیا لیکن کبھی کوئی کرامت آپ کی نہیں دیکھی۔ میں نے سنا تھا کہ آپ بہت بڑے کامل ہیں اسی لیے خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ کچھ فیض حاصل کروں گا مگر اتنی مدت قیام کو گزر گئی کوئی کرامت آپ سے کبھی صادر نہ ہوئی۔ یہ سن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا' جوش میں آ کر فرمایا کہ اچھا یہ بتلا جنیدؒ سے تو نے اس عرصہ میں کوئی فعل سنت کے خلاف ہوتے بھی کبھی دیکھا ہے' اس نے کہا نہیں' یہ بات تو نہیں دیکھی۔ اس پر آپ نے جوش میں آ کر فرمایا ارے پھر اس سے بڑھ کر جنیدؒ کی اور کیا کرامت ہوگی کہ اس نے دس برس تک اپنے خدا کو ایک لمحہ کے لیے بھی ناراض نہیں کیا اس سے بڑھ کر اور کیا کرامت تو جنید کی دیکھنا چاہتا ہے۔ واقعی اس سے بڑھ کر کیا کرامت ہو سکتی ہے' حقیقی کرامت تو یہ ہی ہے' بڑی کرامت تو استقامت ہے۔ "**الاستقامة فوق الكرامة**" (استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے) اسی واسطے خدا تعالیٰ نے یہ دعا تعلیم فرمائی ہے: "**اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ**" (ہمیں سیدھے راستہ پر چلا' ان لوگوں کے راستہ پر جن پر تو نے انعام فرمایا) اور صراط اہل الکرامت نہیں فرمایا۔ خوب سمجھ لو شریعت کا اتباع کسی حال میں متروک نہیں' سب بزرگوں کا اس پر اتفاق ہے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی طریق چشتیہ کے کتنے بڑے شیخ اور صاحب حال و قال درویش ہیں انہیں کے مکتوبات کو دیکھ لو' کوئی مکتوب شرع کی تاکید اور ترغیب سے خالی نہیں' غرض یہ طریقہ تھا بزرگوں کا تو یہ معنی قلندر کے بالکل گھڑے ہوئے ہیں کہ نہ نماز' نہ روزہ' نہ ڈاڑھی' ہو نہ مونچھ' غرض دراصل صرف دو اصطلاح صحیح ہیں جن کی حقیقت کی تفصیل میں پہلے عرض کر چکا ہوں' ایک کتابی اصطلاح ہے ایک زبانی' ایک کتاب میں ہے اور ایک اگرچہ کتاب میں نہیں لیکن مستند حضرات کی زبان پر ہے۔ چنانچہ حضرت عراقی نے بھی اپنے شعر میں اس دوسری ہی اصطلاح کو لیا ہے۔

عمل ومحبت

اس اصطلاح میں خلاصہ طریق قلندر کا یہ ہے کہ وہ جامع ہوتا ہے' اعمال اور محبت کا عمل اور محبت کے تفاوت کی ایسی مثال ہے جیسے ریل گاڑی کا بدون بھاپ کے ٹھیلنے سے چلنا اور جیسے بھاپ سے چلنا۔ اگر انجن میں بھاپ نہیں ہے تو ریل دھکیلنے سے بھی چلے گی تو ضرور مگر کتنی زیادہ سے زیادہ دو چار چھ یا آٹھ دس میل اور وہ بھی بمشکل اور اگر انجن میں بھاپ ہے تو بس چھوٹتے ہی اڑ گیا' ساری گاڑیوں کو لے کر ہوا کی طرح۔ ولایتی ڈاک کی رفتار نہیں دیکھی' آخر اس میں کیا چیز زیادہ ہے' اس میں اور ایک ٹھیلہ گاڑی میں جس کو مزدور چلاتے ہیں' کیا فرق ہے بس یہ فرق ہے کہ ایک میں بھاپ ہے اور ایک بھاپ نہیں ورنہ پہیے مشین گاڑیاں سب چیزیں ویسی ہی ہیں۔ مگر فرق کیا ہے دونوں میں صرف بھاپ کا فرق ہے اگر ولایتی ڈاک میں بھی بھاپ نہ رہے تو وہ بھی ٹھیلہ ہے' تو عمل مثل گاڑی کے ہے اور محبت گویا بھاپ سے جو بمنزلہ گاڑی کی روح کے ہے تو اصل چیز ریل میں بھاپ ہی ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پہیے توڑ کر رکھ دو' اگر کہیں پہیے توڑ کر رکھ دے تو بھاپ کا نہ ہونا تو آخر اتنا مضر بھی نہیں لیکن ایسی حالت میں بھاپ کا ہونا ہی بس غضب ہے۔ دیکھو ریل کبھی پٹڑی پر سے اترتی ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ہاتھوں سے ٹھیلتے ہوئے لیے جا رہے ہیں' زور کی آندھی آئی یا کوئی اور سبب ہو گیا کہ پہیے لین سے اتر گئے اب چونکہ اس وقت وہ بھاپ کے زور سے نہیں چل رہی ہے اس لیے لین سے بھی اترے گی تو زمین کے اوپر ہی چلنے لگے گی اگر زمین سخت ہوئی ورنہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کھڑی ہو رہے گی اور اگر کہیں خدانخواستہ ایسا ہوا کہ بھاپ کے زور میں اڑی چلی جا رہی تھی کہ پہیہ لین سے اتر گیا تو بھاپ کی یہ برکت ہوئی کہ پہیے زمین کے اندر گھس گئے' پرزے ٹکڑے ہو گئے' ڈرائیور اور سواریاں سب ہلاک ہو گئیں' ایک قیامت برپا ہو گئی۔ تو بس بھاپ موجود ہونے کی صورت میں اگر یہ لین پر رہی تب تو مسافت کو نہایت سہولت اور امن و عافیت اور تیزی کے ساتھ قطع کرتی رہے گی اور اگر کہیں لین کو چھوڑ دیا تو واللہ قیامت برپا ہو جاوے گی۔ مشین کا بھی گاڑیوں کا بھی چلانے والے کا بھی مسافروں کا بھی سب کا تہس نہس ہو جاوے گا تو اس

مثال میں گویا تین حالتیں ہوئیں ایک تو یہ کہ بھاپ نہیں ہے لیکن لین پر ہے اس صورت میں رفتار ضرور آہستہ ہوگی لیکن خیر کوئی خطرہ بھی نہیں۔ دوسری حالت یہ ہے کہ بھاپ تو اس میں ہے لیکن لین پر نہیں ہے۔ یہ بس قیامت کا سامنا ہے اور ایک حالت ہے نور علی نور وہ یہ کہ بھاپ بھی ہو اور لین پر بھی ہو۔ سبحان اللہ یہ ہے البتہ لطف تو اے صاحبو! جس نے اپنی ریل میں بھاپ تو پیدا کر لی لیکن اس کو لین پر سے اتار دیا واللہ وہ نہایت خطرناک حالت میں ہے اور وہ بھاپ کیا ہے وہ بھاپ ہے محبت۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور لین کیا ہے صراط مستقیم شریعت کی یعنی جس نے محبت تو پیدا کر لی لیکن اعمال شریعت کو رخصت کر دیا۔ وہ قطع طریق تو کیا کرتا اور الٹا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت باطنی میں ڈال دیا اور جس نے محبت تو پیدا نہیں کی لیکن عمل شریعت پر کرتا رہا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے بلا بھاپ کی ریل کہ ٹھیل رہے ہیں اول تو رفتار نہایت سست پھر جہاں ٹھیلنا چھوڑ دیا بس رک گئی اس لیے یہ بھی کچھ نہیں اے صاحب عمل کو اور محبت کو دونوں کو جمع کر لو۔ یہ البتہ ہوگی وہ ریل جس میں بھاپ بھی ہے پہیے بھی ہیں اور لین پر بھی ہے۔ پھر دیکھو کیسی جلدی مسافت قطع ہوتی ہے تو میں نے ریل کی مثال میں جو یہ کہا تھا کہ بھاپ اصل چیز ہے کہ اصل چیز ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فقط محبت کافی ہے عمل کی حاجت نہیں بلکہ بھاپ کے اصل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ پہیوں کی تیزی کا ذریعہ یہی ہے بغیر اس کے رفتار میں تیزی ممکن ہی نہیں۔ لیکن اگر سرے سے پہیے ہی ندارد ہوں تو نری بھاپ کیا کر سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہیں کے وہیں سی سی بھک بھک ہوتی رہے اسی لیے جس میں محض جوش و خروش ہے اس میں سوائے اس کے حق حق اور الا اللہ الا اللہ کے نعرے لگا لیے اور بھی کچھ ہے۔ نفع کیا اس سے غل شور تو بہت مگر ہیں وہیں جہاں پہلے تھے تو نفع کیا اس جوش و خروش سے یہ جوش و خروش تو ایسا ہی ہے جیسا اس ریل کا جس کے انجن میں آگ بھی دہک رہی ہے بھاپ بھی بھری ہوئی ہے مگر سر ہے تو کیا کہ پہیے ٹوٹ گئے ہیں تو وہ بیچاری سوائے اس کے کھڑی دھواں دیئے جائے اور ٹیں ٹاں ٹیں ٹاں کیے جاوے اور کیا کر سکتی ہے۔ جہاں صبح تھیں حضرت وہیں شام اور جو گاڑی بے بھاپ کی چلی جارہی ہے اس میں غل و شور تو بہت نہیں مگر راستہ آناً فاناً قطع

ہورہا ہے۔ کاش جس گاڑی میں بھاپ تھی پہیے بھی درست ہوتے اور لین پر بھی ہوتی تب لطف تھا کہ ایک ساتھ کلکتہ جا کر دم لیتی اور اب تو نری بھاپ بالکل بیکار ہے۔

ارادہ

تو محبت کو جو میں نے اصل کہا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اعمال کی تکمیل کا بلکہ خود اعمال کا بھی ذریعہ ہے کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ بدون محبت کے اعمال کا صدور بھی ممکن نہیں۔ حتیٰ کہ محبت ضعیف یعنی محبت کا ادنی درجہ وہ ہے جس کو ارادہ کہتے ہیں اور یہ مسلم مسئلہ فلسفہ کا ہے کہ بلا ارادہ کے کوئی عمل وجود میں آ ہی نہیں سکتا' ہر عمل کے لیے صدور سے قبل ارادہ کا متعلق ہونا شرط ہے تو محبت کا ادنی درجہ ارادہ ہوا۔ مثلاً ہم نے جب جانا چاہا اور ارادہ کیا تو محبت ضعیف متحقق ہوگئی کیونکہ چاہنے ہی کو تو محبت کہتے ہیں گو تڑپ نہ ہو' یہ تو ادنیٰ درجہ کی محبت ہوئی جس کے بدون درجہ کا عمل ہی صادر نہیں ہوسکتا اور اعلیٰ درجہ کی محبت یہ ہے کہ

تو دروگم شووصال ایں ست وبس　　گم شدن را گم کن کمال این ست وبس

(تو اس میں فنا ہو جا یہی وصال کافی ہے اپنا گم ہو جانا بھول جا انتہائی کمال ہے)

ہائے کیا اچھا مضمون ہے

تو دروگم شووصال ایں ست وبس　　گم شدن را گم کن کمال این ست وبس

(تو اس میں فنا ہو جا یہی وصال کافی ہے اپنا گم ہو جانا بھول جا انتہائی کمال ہے)

فنا

گویا فنا کا درجہ جس کو کہتے ہیں وہ اعلیٰ درجہ ہے محبت کا یعنی تمام تعلقات غیر اللہ اس قدر مغلوب ہو جائیں کہ کوئی نہ معبود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے۔ لا الہ الا اللہ کا اور نہ مقصود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے "فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَلاَ يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا" (پس نیک عمل کرے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے) کا اور نہ سالک کی نظر میں موجود ہونے میں شریک رہے جو حاصل ہے۔ "کل شیء ھالک الا وجھه" (سوائے حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کے سب فانی ہیں) کا جب اسم فاعل کو معنی حال پر محمول کیا جاوے' کما ھو احد الوجود فی التفسیر پس

اول ادنیٰ درجہ کی محبت پیدا ہوئی اس سے عمل ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہے پھر اس عمل کی برکت سے محبت کا اس سے قوی درجہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس سے پہلے درجہ سے قوی عمل پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے تو ترتیب یوں ہوئی کہ اول محبت ضعیف سی ہوتی ہے جس کو ارادہ کہتے ہیں اس سے ایک عمل پیدا ہوا اور اس کے ساتھ اور بھی مؤیدات کو مدد کے لیے جمع کر لیا تو اس محبت میں اب ترقی ہوئی اس عمل کی برکت سے' پھر اسی محبت زائد سے جو عمل پیدا ہوا اس سے اور محبت پیدا ہوئی پھر اس محبت سے اور عمل پیدا ہوا پھر اس عمل کی اور برکت ہوئی' پھر اس سے اور عمل پیدا ہوا۔ خلاصہ یہ کہ دونوں میں یہ ترتیب رہتی ہے کہ اول محبت ضعیف پھر عمل ضعیف پھر محبت زائد پھر عمل زائد' پھر اور محبت زائد پھر اور عمل زائد' غرض ساری عمر یہ دونوں سلسلے چلتے رہتے ہیں کہ ہر عمل سے محبت اور ہر مزید محبت سے مزید عمل غرض نہ اس سے استغناء نہ اس سے ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہوگئی تو بس سارا سلسلہ منقطع تو حضرت یہ تو ساری عمر کا دھندا ہے کہ محبت پھر عمل پھر محبت وعلیٰ ہذا۔ نہ اس سے کبھی فارغ نہ اس سے کبھی مستغنی' یہ ہے گویا حاصل اس طریق جامع بین المحبت والعمل کا جس کو حضرت عراقی نے اپنے شعر میں طریق قلندر سے تعبیر کیا ہے۔ غرض ذہن میں یہ مضمون آیا تھا جو حضرت عراقی کے اس شعر میں مذکور ہے جس کو میں نے اس وقت بیان کرنے کے لیے اختیار کیا ہے پھر میں نے سوچا کہ کیا کوئی آیت بھی اس مضمون کی ہے سوالحمدللہ قرآن کی یہ آیت بھی ذہن میں آ گئی جس میں یہ ہی مضمون موجود ہے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ تصوف کے اصول صحیحہ قرآن وحدیث میں سب موجود ہیں اور یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف قرآن وحدیث میں نہیں ہے بالکل غلط ہے۔ یعنی غالی صوفیوں کا بھی یہی خیال ہے اور خشک علماء کا بھی کہ تصوف سے قرآن وحدیث خالی ہیں مگر دونوں غلط سمجھے خشک علماء تو یہ کہتے ہیں کہ تصوف کوئی چیز نہیں' یہ سب واہیات ہے' میاں بس نماز روزہ قرآن حدیث سے ثابت اسی کو کرنا چاہیے' یہ تصوف صوفیوں نے کہاں کا جھگڑا نکالا ہے تو گویا ان کے نزدیک قرآن وحدیث تصوف سے خالی ہیں اور غالی صوفی یوں کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں تو ظاہری احکام ہیں۔ تصوف علم باطن ہے' ان کے نزدیک نعوذ باللہ قرآن وحدیث ہی کی ضرورت نہیں۔ غرض دونوں فرقے قرآن وحدیث کو تصوف سے خالی سمجھتے ہیں' پھر اپنے

اپنے خیال کے مطابق ایک نے تو تصوف کو چھوڑ دیا اور ایک نے قرآن حدیث کو جنہوں نے قرآن وحدیث کو چھوڑ دیا انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ قرآن حدیث تو محض ظاہری انتظام کی چیزیں ہیں درویشی کا ان سے کیا علاقہ' میاں درویشی تو چیز ہی اور ہے جو باطن سے تعلق رکھتی ہے۔ اے صاحبو! کیا غضب کرتے ہو خدا سے ڈرو اس کے متعلق میری ایک مستقل کتاب بھی ہے اول تو الحمدللہ یہ بات ہے کہ قرآن وحدیث سارا لبریز ہے تصوف سے ہر تصنیف سے ظاہر ہے لیکن میں نے اس مضمون پر دو مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ایک تو حقیقت الطریقہ جو مدت ہوئی مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہے جس میں مسائل تصوف کی حقیقت احادیث سے ثابت کی گئی ہے اب ایک رسالہ مستقل اور بھی آج کل لکھ رہا ہوں جس میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ تصوف کے مسائل قرآن مجید سے بھی ثابت ہیں۔ پاؤ قرآن یعنی آٹھ پارہ تو ہو گئے ہیں بائیس پارہ اور باقی ہیں۔ خدا مدد فرمائے۔ یہ رسالہ دراصل عربی میں ہے پھر خیال ہوا کہ ساتھ کے ساتھ اردو میں بھی ترجمہ ہوتا جائے تو اچھا ہے چنانچہ ہو رہا ہے اور وہ جو رسالہ ہے۔ حقیقت الطریقہ وہ تو اصل ہی سے اردو میں ہے تو ان دونوں کتابوں سے معلوم ہوگا کہ قرآن وحدیث لبریز ہے تصوف سے اور واقعی وہ تصوف ہی نہیں جو قرآن وحدیث میں نہ ہو۔ غرض جتنے صحیح اور مقصود مسائل تصوف کے ہیں وہ سب قرآن میں موجود ہیں کوئی آیت شاید خالی ہو جس میں ایک آدھ مسئلہ تصوف کا مذکور نہ ہو چنانچہ اسی آیت کو دیکھئے جو اس وقت تلاوت کی گئی ہے اس میں بھی تصوف موجود ہے فرماتے ہیں: ''يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ الى اخر الآيات'' (اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے مرتد ہو جائے) حق سبحانہ تعالیٰ اپنے دین کے محفوظ ہونے کی خبر دے رہے ہیں' کوئی یہ ناز نہ کرے کہ دین کا کام ہماری وجہ سے چل رہا ہے۔ اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی نعوذ باللہ دین سے پھر جاوے تو سرکاری کام بند نہ ہوگا' چاہے سارے ٹھیکیدار اور مزدور استعفیٰ دے دیں جیسے دنیا میں سارے عملے والے دفتر کا کام چھوڑ دیں تو حکام کو عین وقت پر پریشانی اور تشویش ضرور ہوتی ہے اس واسطے کہ جب عملے والے سب مخالف ہو گئے تو اب کام کس سے لیں۔ اسی طرح شبہ یہ ہو سکتا تھا کہ اگر نعوذ باللہ سب کے سب مسلمان مرتد ہو جائیں تو شاید اللہ تعالیٰ کو بھی سوچ ہو جیسے آج ہی ایک

حکایت میں بیان کر رہا تھا کہ ایک نابینا حافظ نے مجھے بیان کیا کہ ہم چار آدمی نماز پڑھ رہے تھے' تین مقتدی اور ایک امام' امام صاحب کا وضو ٹوٹا' انہوں نے مجھے خلیفہ بنایا اور خود وضو کرنے چلے گئے' اب ایک امام اور دو مقتدی رہ گئے' مقتدیوں میں سے ایک نے دوسرے سے نماز کے اندر ہی چپکے سے پوچھا کہ ارے یہ کیا ہوا' بیچارے نے استخلاف امام کا مسئلہ کبھی سنا نہ تھا' دوسرا نصیحت کرتا ہے کہ ارے چپ رہ یوں بھی ہوا کرے ہے (ہوا کرتا ہے) یہ بڑے بوجھ بجھکو تھے' اب امام صاحب کی سنئے جو خلیفہ بنائے جانے کے لائق سمجھے گئے تھے' آپ فرماتے ہیں ارے اب میں کسے نماز پڑھاؤں' یہ دو ہی تو مقتدی تھے اور ان دونوں کی نماز بولنے سے فاسد ہوگئی۔ غرض اس نے بھی اپنی نماز تباہ کی تو دیکھئے ذرا سی بات میں سب کی نماز رخصت ہوگئی۔ یہاں کی نماز تو ایسی ہے کہ جب مقتدی نہ رہیں تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ اب میں نماز کسے پڑھاؤں اسی طرح اگر کسی بادشاہ سے ساری رعایا باغی ہو جائے تو اب وہ کس پر سلطنت کرے' یہاں کے حکام تو ایسے ہیں کہ رعایا نے ہڑتال کر دی تو بس ان کی حکومت ندارد' اللہ تعالیٰ کو بھی شاید کوئی نعوذ باللہ ایسا ہی سمجھتا۔ سو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں یہ قصہ نہیں' دین سے پھر کر دیکھ لو' سب ایک دم سے باغی ہو جاؤ' اول تو تمہارے پھر جانے سے ہمارا کوئی کام اٹکتا نہیں اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ہمارے ایمان اور نماز روزہ سے کیا نفع مگر خیر جیسا بھی کچھ کام ہو رہا ہے گو وہ بندوں کی ہی مصلحت کے لیے ہو رہا ہے سو اس کے متعلق بھی خداوند تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ فرماتے ہیں کہ کسی کے مرتد ہونے سے وہ بھی نہیں رک سکتا۔ یہی حاصل ہے اس آیت کا "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ" (اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے پھر جاوے) "فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ" نزدیک ہی یعنی بہت جلد ایسی قوم کو اللہ تعالیٰ پیدا فرما دیں گے جس کی ایسی شان ہوگی "یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ" وہ اللہ تعالیٰ کو دوست رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو دوست رکھیں گے۔ دیکھئے سوف کے ساتھ فرماتے ہیں جو تقریب کے لیے آتا ہے یعنی فوراً اور واقعی انہیں کیا ضرورت ہے کسی انتظام یا اہتمام کی' ایک لفظ کن سے مولوی' شیخ' غوث' ابدال' قطب جو چاہیں بنا دیں اور جس کو چاہیں بنا دیں۔

ایک حکایت

چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے حضرت غوث اعظمؒ کی ایک حکایت لکھی ہے ان کے خادم کی روایت ہے کہ ایک بار آخیر شب میں حضرت اٹھے، خادم کہتے ہیں کہ میں سمجھا نماز تہجد کی تیاری کریں گے چنانچہ میں بھی اٹھا تا کہ حضرت کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے، ویسے حضرت کو اپنے اٹھنے کی اطلاع نہ ہونے دی۔ واقعی بزرگوں کی خدمت ہے بڑی مشکل۔ انہوں نے جو کیا ٹھیک کیا، اطلاع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، کوئی احسان جتلانا تھوڑا ہی تھا، اب تو اگر کوئی خدمت کرتے ہیں تو جتلا کر کرتے ہیں حالانکہ ادب کی بات یہ ہے کہ خیال اور نگرانی تو رکھے مگر خواہ مخواہ جا کر مزاحمت نہ کرے اور تنہائی میں مخل نہ ہو، خصوص اخیر رات میں تو بزرگ یہ چاہتے ہیں کہ نہ کوئی ہمیں وضو کے لیے پانی لا کر دے نہ استنجے کا ڈھیلا لا کر دے بلکہ اس وقت تو یہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سامنے بھی نہ آئے اپنے ہاتھ سے سب کام کریں کیونکہ وہ وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے که یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ کوئی محبّ اپنے محبوب کے وصول سے لطف اندوز ہو)

بس اس وقت یہ جی چاہتا ہے کہ بالکل تنہائی کا عالم ہو بلکہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اپنے وجود کو بھی جی چاہتا ہے کہ یہ بھی نہ رہے خود اپنا وجود بھی حجاب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت قلندر جو اس موقع کے صاحب مزار ہیں اسی مضمون کو اپنے ایک شعر میں بیان فرماتے ہیں:

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم

لیجئے اپنی آنکھ پر بھی غصہ ہے اور یہ کیوں دیکھتی ہے میں ہی تجھے دیکھتا اور

گوش را بجز حدیث تو شنیدن ندہم

میں ہی تیرا کلام سنتا یہ کان کیوں سنیں۔ واقعی صاحب یہ بھی حالت ہوتی ہے۔ حضرت عارف شیرازی بھی اس مضمون کو فرماتے ہیں اور وہ تو قسم کھا رہے ہیں۔

بخدا کہ رشکم آیدز دو چشم روشن خود کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے

(خدا کی قسم مجھے اپنی دونوں روشن آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ایسے حسین سے میری نظر دور ہی رہتی)

آنکھ پر بھی رشک آتا ہے۔ سووہ تو وقت ہی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو بھی مٹانے کو جی چاہتا ہے اور اگر کوئی اپنا خادم خاص بھی اس وقت پاس کھڑا ہو تو وہ بھی پسند نہیں آتا۔ اسی واسطے مؤدب خدام یہ کرتے ہیں کہ پاس کو تو لگے رہے لیکن اس طرح کہ اپنی موجودگی کی تو خبر نہ ہونے دی لیکن جب دیکھا کہ کوئی کام مخدوم کے قابو کا نہیں ہے فوراً حاضر ہو کر شریک ہو گئے اور بعد فراغت پھر غائب۔ چنانچہ اس خادم نے ایسا ہی کیا کہ خفیہ طور پر حضرت غوث پاک کے پیچھے پیچھے لگا رہا' ادھر حضرت نے کچھ توجہ بھی نہیں کہ میرے ساتھ کوئی اور شخص تو نہیں ہے۔ غرض حضرت اٹھ کر خانقاہ سے نکل کر سیدھے شہر پناہ کے پھاٹک پر پہنچے' حضرت شیخ کی برکت اور کرامت سے شہر پناہ کا قفل خود بخود کھل کر گر گیا۔ حضرت کواڑ کھول کر شہر سے باہر ہو گئے۔ چند ہی قدم چلے تھے کہ ایک بڑا بھاری شہر نظر پڑا حالانکہ بغداد کے قریب کوئی اتنا بڑا شہر کہاں۔ اب خادم کو بڑی حیرت کہ یا اللہ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں' لیکن بولے نہیں' چپ چاپ ساتھ چلتے رہے' یہاں تک کہ اس شہر کے اندر داخل ہو کر ایک مقام پر پہنچے وہاں ایک مکان تھا اس کے اندر داخل ہوئے اس میں چند آدمیوں کا ایک مختصر سا مجمع تھا اور ایک مسند پر تکیہ لگا ہوا تھا جیسے کسی کی آمد کا انتظار ہو رہا ہو' حضرت شیخ کو دیکھتے ہی وہ لوگ تعظیم کے لیے اٹھے اور حضرت کو مسند پر بٹھایا۔ پھر اشاروں سے کچھ عرض معروض کی جس کو حضرت ہی سمجھے' خادم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا' اس کے بعد ایک طرف سے آواز کراہنے کی آئی آہ آہ' پھر تھوڑی دیر بعد وہ آواز بند ہو گئی' پھر کچھ دیر بعد ایسی آواز آنے لگی جیسے پانی ڈالنے کی ہوتی ہے' پھر وہ بھی بند ہو گئی' پھر تھوڑی دیر بعد ایک حجرہ کھلا اور اس کے اندر سے ایک جنازہ نکلا جس کے ہمراہ چند آدمی تھے ان میں ایک بوڑھے نورانی شکل کے بزرگ بھی تھے۔ حضرت شیخ کے سامنے جنازہ رکھا گیا' حضرت نے نماز جنازہ پڑھائی' پھر وہ لوگ جنازہ کو لے گئے' ادھر یہ لوگ جنہوں نے حضرت شیخ کا استقبال کیا تھا پھر آ کر سب حضرت کے گرد بیٹھ گئے اور اسی طرح اشاروں میں دوبارہ پھر کچھ عرض کیا اس پر حضرت شیخ اسی وقت گردن جھکا کر مراقب ہوئے' تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک زنار دار شخص عیسائی لباس پہنے ہوئے حاضر ہوا' آپ نے اپنے دست مبارک سے اس کا زنار توڑ دیا اور کلمہ شریف پڑھا کر اس کو مسلمان کیا پھر حاضرین سے ارشاد فرمایا کہ یہ ہے پھر حضرت اس جگہ سے اپنے مکان پر لوٹ آئے' خادم کو اسی ادھیڑ بن میں اور

حیرت میں صبح ہوگئی کہ اے اللہ یہ کیا قصہ ہے۔ یہ حضرت کی خدمت میں کچھ سبق بھی پڑھتے تھے کیونکہ پہلے درویش اکثر عالم بھی ہوتے تھے تو چونکہ یہ خادم محض مرید نہ تھے بلکہ شاگرد بھی تھے اس لیے دل کھلا ہوا تھا کیونکہ یہ علاقہ شاگردی استادی کا بے تکلفی کا ہوتا ہے یہ خلاف پیری مریدی کے تعلق کے کہ اس میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوتی۔ چنانچہ انہوں نے رات کے واقعہ کے متعلق دریافت کیا کہ حضرت یہ کیا معاملہ تھا مجھے اس قدر حیرت ہے کہ میرے حواس درست نہیں' فرمایا کہ وہ شہر موصل تھا جو بغداد سے بہت دور ہے لیکن حق تعالیٰ نے میرے لیے اسے بالکل قریب کر دیا اور طے ارض ہو گیا اور وہ مجمع جنہوں نے میرا استقبال کیا ابدال تھے اور ان ہی میں سے ایک ابدال قریب مرگ تھے جن کے کراہنے کی آواز آرہی تھی اور وہ بوڑھے نورانی شکل والے بزرگ جو جنازہ لے کر نکلے تھے وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اس جماعت نے مجھے باطنی طور پر مجھ کو اطلاع دے کر دریافت کیا کہ اس کی جگہ کون ابدال مقرر کیا جائے' میں نے حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی۔ ارشاد ہوا کہ قسطنطنیہ کے گرجا میں اس وقت ایک نصرانی صلیب کو پوج رہا ہے اس کو کر دیا جائے چونکہ کافر تو کسی عہدہ باطنی پر ہو نہیں سکتا جیسا آج کل لوگ سمجھتے ہیں کہ چمار چوڑھے بھی صاحب خدمت ہوتے ہیں' کیا اللہ تعالیٰ کو خدمت کے لیے مسلمان نہیں ملتے جو چوڑھوں چماروں سے کام لیں۔ سبحان اللہ اچھی قدر کی ولایت کی خوب سمجھ لو کہ کافر ہرگز ولی نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی کافر کو ولی کرنا بھی ہوتا ہے تو اول اس کو اسلام کی توفیق دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس نصرانی کے معاملہ میں بھی یہ ہی ہوا کہ قسطنطنیہ سے ایک دم میں زمین کی طنابیں کھینچ کر اس کو حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچایا گیا اور حضرت شیخ کی توجہ کی برکت سے کلمہ پڑھنے کے ساتھ ہی وہ رتبہ ابدالیت پر پہنچ گیا حالانکہ نہ کوئی مجاہدہ کیا نہ ریاضت' اسی کو تو کہتے ہیں حضرت مسعود بک: مرشد چو کامل است چلہ شد' شد شد۔ لیکن یہ محض شاذ و نادر ہے' کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے ورنہ چکی ہی پیسنا پڑتی ہے جو کچھ ملتا ہے چکی ہی پینے سے ملتا ہے' خدا کے واسطے کہیں اس شاذ و نادر ہی پر نہ بیٹھ رہنا۔ شاذ و نادر پر بیٹھے رہنا تو ایسے ہے جیسا کوئی عورت اس بنا پر بے نکاح بیٹھی رہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے بھی تو بے مرد کے اولاد ہو گئی تھی یا کوئی مرد صاحب اس بھروسہ پر کسی عورت کو نکاح کے لیے تلاش نہ کریں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حضرت حوا علیہا السلام بدون

عورت پیدا ہوگئی تھیں۔ میری پسلی سے بھی ایک ہوا (چھوٹی ہ سے) سے نکل آئے گی' یہ دونوں بالکل احمق ہیں۔ میاں خدا نے ایک دفعہ یوں بھی کر دیا کہ بلا نکاح کے عورت کو اولاد دے دی اور ایک مرتبہ یہ بھی قدرت دکھلا دی کہ مرد کی پسلی سے عورت پیدا کر دی' اب یہ تو نہیں کہ روز روز ایسا ہی ہوا کرے اور لوگ اس شاذ و نادر ہی کے منتظر بیٹھے رہیں نہ عورت مرد سے نکاح کرے نہ مرد عورت کی فکر کرے' آج کل یہ عجیب واہیات ہے کہ طالبین شاذ و نادر پر بیٹھے رہتے ہیں کہ پیر ایک نظر کرے گا تو بس بیڑا پار ہو جائے گا اور خود کچھ کرتے کراتے نہیں۔ کیوں جی وہ تمہارے باوا کا نوکر تو ہے نہیں' اگر نظر نہ کرے تو کیا کر لو گے۔ یہ کیا بیوقوفی کی بات ہے' نیز اس کے قبضہ کی بھی تو بات نہیں اگر کسی کے اختیار میں ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کے قلب میں ضرور اسلام ڈال دیتے' بھائی بلا کام کیے بھی کہیں کامیابی ہوتی ہے۔ اصل طریق تو یہ ہی ہے کہ

کارکن کار بگذار از گفتار کاندریں راہ کار باید کار

(کام کر بے کار باتیں چھوڑ' اس طریقِ الفت میں صرف عمل ہے)

قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(طریقت میں عمل کرنا چاہیے نہ کہ دعوی کیونکہ دعویٰ بغیر عمل کے بے حقیقت ہے)

نری آرزؤں اور ہوسوں سے کام نہیں چلتا۔ اسی کو کہتے ہیں:

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

(عرفیؒ اگر رونے سے وصال میسر آ جائے تو اس کی تمنا میں سو سال تک رو سکتا ہوں)

تو کیا ہوتا ہے نری آرزؤں اور تمناؤں سے کام تو کام کرنے سے ہی ہوتا ہے اور کام بھی ایسا جس میں کام ہی کو ثمرہ سمجھا جاوے۔ گو اور کوئی ثمرہ نہ ملے' جب کام اور ثمرہ ایک ہی چیز ہے تو بدون کام کیے ثمرہ کا حصول چہ معنی جب کام نہیں تو ثمرہ بھی نہیں کیونکہ ثمرہ تو وہی کام تھا۔ حضرت سرمد رحمت اللہ علیہ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

سرمد گلہ اختصاری باید کرد یک کار ازیں دو کاری باید کرد
یا تن بہ رضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیاری باید کرد

(اے سرمد شکایت کو مختصر کر اور دو کاموں میں سے ایک کام کر یا تو بدن کو دوست کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وقف کر دے یا دوست سے قطع نظر کر لے)

ثمرات میں ناکامی کی شکایت کرنے والوں سے کہتے ہیں کہ میاں ان حکایات شکایات کے دفتر کو تو طے کرو زیادہ قیل وقال کی حاجت نہیں، ہم تو ایک مختصری بات کہتے ہیں کہ بس ان دو کاموں میں سے ایک کام کو اختیار کر لو، یا تو یہ کرو کہ جس بات میں محبوب حقیقی راضی ہو خواہ وہ ناکامی ہی کیوں نہ ہو اس پر راضی رہو یعنی کام ہی کو ثمرہ سمجھو کیونکہ یہ تسلیم ورضا جب ہی ہو سکتی ہے جبکہ عطائے حق کو کہ توفیق عمل ہے ثمرہ سمجھے اور اگر یہ پسند نہیں اور اس سے تم خفا ہوتے ہو تو بھائی سیدھی بات یہ ہے کہ پھر اپنے لیے کوئی دوسرا خدا ڈھونڈ لو اس خدا کو چھوڑ دو۔ یہ حضرت سرمد نے خوب دوٹوک بات کہی۔ واقعی یہ مجذوبوں والی ہی بات ٹھیک ہے کہ

یاتن بہ رضائے دوست می باید داد ‌‌‌ ‌‌ یا قطع نظر زیارمی باید کرد

(یا تو بدن کو دوست کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے وقف کر دے یا دوست سے قطع نظر کر لے)

غرض کام ہی کو مقصود سمجھ کر اس میں لگا رہے کام کر کے بھی ثمرات کا انتظار نہ کرے نہ کہ بے کام کیے ثمرات کی توقع رکھے۔ ایں خیال ست ومحال ست وجنوں۔ بہر حال کام کرنا چاہیے کہ ثمرات بھی حسب سنۃ اللہ کام ہی سے ملتے ہیں لیکن کبھی خدا تعالیٰ اپنی یہ قدرت بھی دکھلا دیتے ہیں کہ بلا اسباب بھی مقصود کو پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں بھی اپنی ایسی ہی قدرت کا بیان فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے "فسوف یاتی اللّٰہ" یعنی تمہارے مرتد ہو جانے سے خدائی کام میں کچھ فتور واقع نہ ہوگا جیسے کوئی یہ غلط قیاس کر لے کہ ساری رعایا کے باغی ہو جانے سے سلطنت کا کام تو نہیں چل سکتا تو خدا کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو، وہ کسی سے مجبور نہیں، ان کی ذات قادر مطلق ہے، دم میں جو چاہیں کر دیں۔ "فسوف یاتی اللہ بقوم" عنقریب ایک ایسی قوم پیدا کر دیں گے جس کی شان ایسی ایسی ہوگی۔ آگے اس کی حالت کا بیان ہے "یحبھم ویحبونہ الخ" تو اس موقع پر جس قوم کا ذکر فرمایا ہے وہ قوم ظاہر ہے کہ بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ اس واسطے کہ مقابلہ کے موقع پر سنا رہے ہیں۔ بجائے تمہارے ان کو تیار فرما دیں گے تو لازمی طور پر وہ قوم ایسی ہونی چاہیے جو ہر

طرح کامل اور اعلیٰ درجہ کی ہوتا کہ مرتد ہونے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے پھرنے ہٹنے سے کیا ہوا' ہماری جگہ دوسری قوم ہم سے بھی بڑھ چڑھ کر اسلام میں داخل ہوگئی تو گویا اس قوم کا اعلیٰ درجہ کی صفات سے متصف ہونا خود سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے۔ غرض جو صفات اس مقام پر مذکور ہوں گی وہ نہایت عظیم الشان اور قابل اعتبار ہوں گی۔ اب ان صفات کو سنئے کہ وہ کیا ہیں سب سے اول جو صفت بیان کی گئی وہ یہ ہے کہ "یحبھم ویحبونہ" یعنی خدا کو ان سے محبت ہوگی اور ان کو خدا سے' دیکھئے حضرت سب سے پہلے حق تعالیٰ نے یہی صفت بیان فرمائی کہ وہ لوگ اہل محبت ہوں گے۔ اس تقدیم ذکر سے صفت محبت کا سب سے زیادہ مہتم بالشان ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسی سے میں نے استدلال کر کے یہ عرض کیا تھا کہ بس دین میں محبت ہی اساس ہے' راس ہے' جڑ ہے' اصل ہے اور بنیاد ہے۔ جب بات ہے تو اے صاحبو! آپ نے کیا کوشش کی اپنے اندر محبت پیدا کرنے کی' نمازی بھی ہوگئے' روزہ دار بھی ہوگئے' حاجی بھی ہوگئے مگر محبت جو اصل چیز ہے آخر اس کی بھی کچھ کوشش کی' کچھ بھی نہیں' کوشش تو کیا اور الٹا یہ کیا ہے کہ جو محبت کرنے والے ہیں ان پر ہنستے ہیں ان کو پاگل اور مجنوں اور نہ جانے کیا کیا خطاب دے رکھے ہیں اور ان کی بھی بڑی کوتاہی ہوگی اگر وہ پاگل اور مجنوں کا لقب سن کر برا مانیں۔ کچھ خبر بھی ہے یہ لقب تو بہت بڑا ہے ارے یہ تو ایسا لقب ہے کہ اس کو سن کر تمہیں خدا کا شکر کرنا چاہیے نہ کہ برا مانو کیونکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مخالف بھی تمہارے اعلیٰ درجہ کے محبّ خدا اور رسول ہونے کی شہادت دینے لگے۔ بات یہ ہے کہ مخالف یہ لقب اسی کو دیتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کا محبّ ہو اور اس کا راز یہ ہے کہ جو شخص اعلیٰ درجہ کا محبّ ہوتا ہے اس کے افعال عقل معاش اور دنیوی مصلحتوں کے خلاف ہونے لگتے ہیں اور یہی تو وجہ ہے کہ جو لوگ محض عقل معاش رکھتے ہیں وہی ایسے شخص کو مجنوں اور بیوقوف کہتے ہیں اور یہ لقب بہت پرانا ہے۔

صحابہ

چنانچہ کلام مجید اس پر شاہد ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ" (جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی

ایمان لے آؤ جیسا اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں گے جیسا یہ بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں) دیکھئے حضرات صحابہ کو جو اعلیٰ درجہ کا ایمان رکھتے تھے منافقین نے نعوذ باللہ سفہاء کا لقب دے رکھا تھا کیونکہ وہ حضرات اپنے سب اعزہ واقرباء کو چھوڑ کر اور مال ومتاع کو خیر باد کہہ کر ایمان لائے تھے جو بظاہر عقل معاش کے بالکل خلاف تھا۔ اسی لیے منافقین کہتے تھے کہ ان کی عقل ماری گئی ہے کہ اپنا اتنا بڑا نقصان کر کے ایمان لائے ہیں یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے۔ کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح یہ بیوقوف ایمان لے آئے ہیں تو دیکھئے ان احمقوں نے حضرات صحابہ کو بھی نعوذ باللہ بیوقوف بتایا۔ اس زمانہ میں بھی یہی حال ہے۔

ایک نومسلم

ہمارے قصبہ میں ایک شخص نومسلم ہیں وہ پہلے امیر کبیر گھرانے کے تھے۔ جب وہ مسلمان ہو گئے تو ظاہر بات ہے کہ پھر ظالم لوگ بھلا وہ دولت وثروت ان کو کہاں دیتے' بیچارے ہمارے بھائی کے ہاں دس بارہ روپے کے نوکر ہیں' یا تو خود صاحب جائیداد تھے یا اب نوکری کرتے ہیں اور اپنا پیٹ پالتے ہیں مگر جس جگہ نوکر ہیں وہاں پر ہیں بہت عزت اور آرام کے ساتھ جس جگہ کے رہنے والے ہیں وہاں ایک مرتبہ کسی کام سے ان کا جانا ہوا۔ وہاں ان کے عزیز واقارب سب ہی ہیں مگر اب ان سے کیا علاقہ۔ لہٰذا وہ جا کر کسی موقع پر ٹھہر گئے ان کے عزیز واقارب سب ملنے آئے اور ان کی بڑی خاطر کی۔ وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ میں لیٹا ہوا تھا اور وہ لوگ بھی پاس بیٹھے تھے' وہ سمجھے کہ یہ سو رہا ہے لیکن میں جاگ رہا تھا' ایک بولا کہ ارے سنا ہے یہ بڑے آرام میں ہے' ایک شیخ کے یہاں کارندہ ہے' اس کی بہت بڑی حویلی ہے' نوکر چاکر' گائیں' بھینسیں سبھی کچھ ہے اور یہ سب پر حکومت کرتا ہے' بڑی عزت ہے' بڑے مزے ہیں' دوسرا بولا کہ بھائی سب کچھ سہی مگر اس نے کی بہت کھوٹی بات (یعنی بری بات) کہ اپنے عزیز قریب بیوی بچے سب چھوڑ دیئے اور مسلمان ہو گیا۔ لیجئے یہ ان کو لقب ملا تو سمجھنے کی بات ہے کہ باپ بھائی جائیداد بیوی سب کو چھوڑ دینا آسان کام نہیں ان کی پہلی بیوی مسلمان نہیں ہوئی وہ اب بھی موجود ہے اور اب بھی کبھی کبھی جب ساس نندوں سے پریشان ہوتی ہے ان سے کہلا بھیجتی ہے کہ تم میری مدد

نہیں کرتے، اب بھی اتنا بڑا ناز ہے بہر حال انہیں بیوقوف اس بناء پر قرار دیا کہ عزیز و قریب سب کو چھوڑ دیا اور ایمان کے مقابلہ میں کسی چیز کی پروانہ کی تو صاحب یہ شان ہوتی ہے اعلیٰ درجہ کے محبّ کی اور یہ لقب اس کو ملتے ہیں۔

حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سب سے بڑھ کر عاقل سید العقلاء حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کفار نعوذ باللہ مجنوں کہتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جا بجا ان کے یہ اقوال موجود ہیں: "اَمْ یَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ" (یا یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جنون کے قائل ہیں (نعوذ باللہ) اور کہتے ہیں آپ مجنوں ہیں) اور خدا تعالیٰ نے اس کی نفی فرمائی ہے: "مَااَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ" (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے فضل سے مجنوں نہیں) گو یہ احتمال بھی ہے کہ اور کچھ تو بن نہ پڑتا تھا محض جل کر یہ کہہ دیتے ہوں کوئی اور منشاء نہ ہو اس قول کا مگر یہ ظاہر کے خلاف ہے چنانچہ شاعر اور ساحر بھی تو کہتے تھے تو وہ لوگ یہ تینوں لقب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اطلاق کرتے تھے۔ یعنی شاعر ساحر اور مجنوں اور شاعر اور ساحر کا منشاء ہمیں معلوم ہے چنانچہ میں ابھی عرض کروں گا۔ جب دو کا منشاء معلوم ہے تو ظاہر یہ ہے کہ تیسرے لقب کا منشاء بھی ضرور ہوگا۔ شاعر اور ساحر کہنے کا منشا سنئے وہ ایسا ہے جیسا کسی نے کہا ہے کہ معشوق من آنست کہ نزدیک تو زشت است۔ شاعر اور ساحر اس لیے کہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک میں ایسا اثر تھا کہ جب کفار سنتے تھے تو ان کے خیالات میں عظیم الشان تبدیلی واقع ہو جاتی تھی۔ پس طرز بیان کی تاثیر کو تو شاعری اور مضمون کی تاثیر کو ساحری کہتے تھے۔ اسی لیے کوششیں کرتے تھے کہ کسی طرح لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہ سنیں۔ چنانچہ ڈرتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو ان کا کلام مت سنو "لاتسمعوا القرآن" خبردار قرآن مت سننا' بس اس کا سننا ہی غضب ہے والغوا فیہ اور اگر وہ پڑھنے ہی لگیں تو تم شور وغل مچانا' گپڑ سپڑ کرنا شروع کر دو' **لعلکم تغلبون** شاید اسی سے جیت جاؤ (اس طرح سے کہ وہ مجبور ہو کر خاموش ہو جائیں) یہ تہذیب تھی ماشاء اللہ۔ غرض وہ بہت ہی ڈرتے تھے کہ یہ تو شاعر اور ساحر ہیں'

ان کا کلام سنا نہیں اور اثر ہوا نہیں بس اسی واسطے شاعر اور ساحر کہتے تھے۔ غرض کلام کی قوت تاثیر اس کا منشاء تھا۔ اسی طرح مجنوں جو کہتے تھے تو اس کا بھی ایک منشاء تھا وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کے مقابلہ میں ساری دنیا کی مصلحتوں کو چھوڑ دیا، یعنی ان بیوقوفوں کے نزدیک نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عقل کے خلاف بات کی۔ چنانچہ سب نے مل کر ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک سفیر بھیجا جو حاضر ہوکر آپ کی خدمت میں منافع ومصالح پیش کرے اس نے آ کر عرض کیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ سردار بننا چاہتے ہیں تو ہم لوگ سب آپ کو بخوشی اپنا سردار بنالیں کیونکہ آپ نہایت شریف النسب ہیں، آپ جس قبیلہ میں پیدا ہوئے ہیں وہ حسب نسب میں سب سے بڑھ کر ہے، آپ کو اپنا سردار بنا لینے میں ہم کو کوئی عار نہیں مگر ہمارے بتوں کو برا نہ کہیے، اگر آپ عورتیں چاہتے ہیں تو قریش کی ساری لڑکیاں حاضر ہیں، ایک سے ایک حسین موجود ہے، جتنی چاہیں پسند کر لیجیے، اپنی بہنیں اور لڑکیاں آپ کے نکاح میں دینا ہمارے لیے فخر ہے بلکہ انہیں خود آپ کی لونڈیاں بننا باعث عزت ہے اور اگر مال کی خواہش ہے تو ہم ابھی ایک بڑا خزانہ آپ کے لیے فراہم کر دیں بس آپ قرار وسکون سے بیٹھے رہیے اور ہمارے بتوں کو برا کہنا چھوڑ دیجیے۔ جب سفیر یہ سب باتیں کہہ چکا تو آپ نے بجائے جواب دینے کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورہ حم سجدہ کا شروع کا حصہ تلاوت فرمایا:

حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ.

(یہ کتاب رحمٰن ورحیم کی طرف سے نازل کی گئی ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی ہے ایسے لوگوں کے لیے جو دانشمند ہیں بشارت دینے والا ہے ڈرانے والا ہے مگر اکثر لوگ روگردانی کرتے ہیں اور سنتے نہیں) الی اخر الآیات اور اس کی یہ حالت تھی کہ بالکل ساکت اور صامت تھا جیسے کہ نقش دیوار۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھتے پڑھتے یہ آیت تلاوت فرمائی: "فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ" (پھر یہ اعراض کریں تو آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد وثمود پر آئی تھی) تو گھبرا کر کہنے لگا بس کیجئے بس کیجئے اب سننے کی تاب نہیں' اس قدر اثر ہوا کہ سنا نہیں گیا اور اٹھ کر بھاگا اور بھاگ کر اپنے ساتھیوں میں پہنچا جنہوں نے اسے بھیجا تھا یعنی ابو جہل وغیرہ' وہ سب منتظر بیٹھے تھے' ابو جہل بڑا ذہین تھا اس نے دور ہی سے دیکھ کر تاڑ لیا کہا کہ بھائی یہ گیا تو تھا اور چہرہ سے ایسا شریر تھا کہ دور ہی سے پہچان گیا کہ ارے یہ تو ڈھیلے ڈھیلے گھٹنوں سے آ رہا ہے اس کے چہرہ کا تو کچھ رنگ ہی بدلا ہوا ہے' گیا تھا اور چہرہ سے آ رہا ہے اور چہرہ سے' جب پاس پہنچا تو سب نے پوچھا ارے یار کہہ تو سہی کیا گزری' اس نے کہا کہ اجی کیا پوچھتے ہو جب میں سب باتیں پیش کر چکا تو انہوں نے ایک ایسا کلام پڑھا کہ واللہ اگر میں وہاں تھوڑی دیر اور بیٹھا رہتا تو سخت اندیشہ تھا کہ کوئی بجلی میرے اوپر آ گرتی ۔ کیا پوچھتے ہو کیا کیفیت تھی اثر کی ۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ میں تم کو ایک ایسی کڑک سے ڈراتا ہوں جیسی کہ عاد اور ثمود پر گرائی گئی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس اب بجلی گری ۔ خدا جانے کیا کلام تھا اور کس غضب کا اس میں اثر تھا ۔ واللہ اگر اور تھوڑی دیر بیٹھوں اور سنوں تو بجز اس کے مسلمان ہو جاؤں اور کوئی صورت نہ تھی' مشکل سے اپنا پیچھا چھڑا کر آیا ہوں ۔ تو یہ حال تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اثر کا چونکہ وہ لوگ رات دن دیکھتے تھے کہ یہ الٹ پلٹ کر دیتے ہیں ایک جلسہ میں تمام قوموں کو (قوم جمع ہے قومہ کی بمناسبت مقابلہ لفظ جلسہ جامع ۱۲) اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) شاعر اور ساحر کہتے تھے ۔

جب اس قوم نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری مل رہی ہے وہ نہیں لیتے' اونٹ مل رہے ہیں وہ نہیں لیتے' مال مل رہا ہے وہ نہیں لیتے' حسین حسین عورتیں مل رہی ہیں وہ نہیں لیتے تو وہ نامعقول سمجھے کہ بھلا یہ کون سی عقل کی بات ہے ۔ جب دنیا کی ساری نعمتیں مل رہی ہیں تو پھر خواہ مخواہ انکار ہے ۔ عقل کی بات تو یہ ہے کہ میاں جب چندہ اور روپے مل رہے ہیں تو لے لو کام آ دیں گے' احمقوں نے اپنے اوپر قیاس کیا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ۔ ایک مقام پر میری ایک انگریز سے جو کہ اجنٹ تھا اس کی خواہش پر ملاقات ہوئی ۔ دوران گفتگو میں اس نے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے آپ نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے میں نے

کہا ہاں صاحب لکھی ہے۔ تو آپ کیا کہتے ہیں آپ کو کتنا روپیہ ملا۔ میں نے دل میں کہا کہ واہ واہ بس یہ ہے آپ کا مبلغ پرواز اور مطمح نظر۔ جب میں نے کہا کہ کچھ بھی نہیں ملا تو بڑے تعجب سے پوچھا کہ آپ نے اتنی بڑی کتاب لکھی اور کچھ بھی نہ ملا تو پھر کیا فائدہ ہوا اتنی محنت ہی پھر کیوں کی اس کے نزدیک جسے روپیہ نہ ملے وہ کوئی دین کا کام ہی نہ کرے' خیر میں نے اسی کے مذاق کے موافق اسے سمجھایا' میں نے کہا کہ اس سے مجھے دو فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ علاوہ اس زندگی کے ہم مسلمانوں کے اعتقاد کے موافق ایک دوسری زندگی بھی ہے جس کو ہم لوگ آخرت کہتے ہیں' وہاں ایسے کاموں کا عوض ملنے کی ہمیں توقع ہے اور دوسرا فائدہ دنیا کا بھی ہے وہ یہ کہ میں نے جو یہ تفسیر لکھی ہے اپنے بھائی مسلمانوں کے فائدہ کے لیے لکھی ہے اور یہ ایک قومی خدمت ہے۔ جب میں اس تفسیر کو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں دیکھتا ہوں تو مجھے اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ میری قوم کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے چونکہ یہ تقریر اس کے مذاق کے موافق تھی اس کو سن کر اس کی نظر میں میری بڑی وقعت ہوئی تو جو روپیہ پیسے اور جاہ کو مقصود سمجھے گا وہ ضرور ایسے شخص کو کہے گا کہ بڑا بیوقوف ہے کہ اس نے محض دین کے لیے اپنا جاہ مال سب برباد کر دیا۔ ہمارے ایک دوست نے ناجائز ہونے کی بنا پر ڈپٹی کلکٹری چھوڑ دی ہے تو اب سب لوگ انہیں لتاڑتے ہیں کہ عقل ہی ماری گئی ہے' ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہاری ہی عقل ماری گئی ہے جو اس کو خلاف عقل کہتے ہو۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

جو لوگ جاہ اور مال ہی کو مقصود سمجھتے ہیں اور جنہوں نے فقط دنیا ہی کو اپنا قبلہ توجہ بنا رکھا ہے وہ ہم پر ہنستے ہیں لیکن اگر وہ ہم پر ہنستے ہیں تو ہم ان پر ہنستے ہیں۔ "فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ" (ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو) حضرت نوح علیہ السلام نے جب حسب ارشاد خداوندی کشتی بنائی تو ان کی قوم ان پر ہنستی تھی' کوئی پوچھتا کہ یہ کشتی کیوں بنائی جارہی ہے' آپ فرماتے ایک بڑا سخت طوفان آنے والا ہے اس وقت یہ کام آوے گی۔ لوگ یہ سن کر کہتے کہ قحط تو پڑ رہا ہے اور آپ کو طوفان کی سوجھ رہی ہے' لوگ ان پر ہنستے کہ بس نبوت ختم ہوئی اب نجاری شروع کی۔ حضرت نوح علیہ السلام نہایت متانت سے فرماتے:

"اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَاتَسْخَرُوْنَ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ"

(اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ کون شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا ہی چاہتا ہے جو اس کو رسوا کردے گا اور اس پر دائمی عذاب ہونا ہے) تم اس وقت ہم پر ہنستے ہو۔ ہم اس وقت تم پر ہنستے ہیں اس میں تو دونوں برابر۔ کل فرق معلوم ہوگا کہ کس پر عذاب آتا ہے اور کون ذلیل ہوتا ہے۔ تو لوگ احمق ہوئے ہیں جو ایسوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگ تھے حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمتہ اللہ علیہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پیر بھائی قصبہ رام پور کے ایک رئیس کے بیٹے ان کے مرید ہوگئے۔ یعنی حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ اور دونوں بزرگوں کی خدمت میں آنے جانے لگے۔ ان کے فیض صحبت سے ان کی حالت بدل گئی' دنیا کی طرف سے بے رغبتی اور آخرت کی جانب رغبت پیدا ہوگئی ان کے باپ کے پاس ایک دفعہ کچھ گنوار آئے اور کہنے لگے کہ تھارے (یعنی تمہارے) بیٹے کا بڑا افسوس ہے فقیر ہوگیا' وہ بولے خیر بھائی' تو ایک گنوار کیا کہتا ہے' اجی بری صحبت ایسی ہی ہو ہے (یعنی ہوتی ہے) جبھی تو بڑے بوڑھے بری صحبت سے کریں (کرتے ہیں) دیکھو مکڑ گیا' فقیر ہوگیا 'تو گو بیوقوف نے دینداروں کی صحبت کو بری صحبت سمجھا۔ استغفر اللہ ان ہی حضرت حافظ صاحب کا ایک اور واقعہ ہے' کوئی نوجوان شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اس کی حالت بدلنے لگی' ایک بار اس کا باپ حاضر ہو کر نہایت بیبا کی سے کہنے لگا کہ جب سے میرا بیٹا آپ کے پاس آنے لگا بگڑ گیا۔

حضرت تھے بڑے جلالی فرمایا اپنے بیٹے کو ہمارے پاس نہ آنے دو' روک دو' ہمارے پاس جو کوئی آئے گا ہم تو اسے بگاڑیں ہی گے' جس کو لاکھ مرتبہ غرض ہو اور بگڑنا چاہے وہ ہمارے پاس آئے' ہمیں تو بگاڑنا ہی آتا ہے' ہمیں بھی تو کسی نے بگاڑا ہی ہے' ہم نے تو اپنے پیر سے بگاڑنا ہی سیکھا ہے' اجی جو بگڑنے سے ڈرے وہ ہمارے پاس آوے ہی کیوں ایسے کے پاس جائے جسے سنوارنا آتا ہو ہمیں تو بگاڑنا ہی آتا ہے اللہ اکبر ایک شخص کی جیب میں

کوڑیاں تھیں اس نے ان کو نکال کر پھینک دیا اور ان کی جگہ اشرفیاں بھر لیں تو کیا وہ بیوقوف ہے وہ ہرگز بیوقوف نہیں البتہ جو لوگ اشرفیوں کی قیمت سے واقف نہیں وہ کوڑیاں پھینکتے وقت اسے ضرور برا بھلا کہیں گے کہ لو جی بھری ہوئی جیب ہی خالی کر دی' ارے تمہیں کیا خبر اس نے کوڑیوں سے جیب خالی کر کے اشرفیوں کے لیے جگہ کی ہے اگر ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ موجود ہے اس سے کوئی کیمیا سکھانے والا کہے کہ مجھے ایک لاکھ روپیہ دے دو میں کیمیا بنانا سکھا دوں گا اور وہ وعدہ کرنے والا نہایت معتبر ہو تو وہ فوراً لاکھ روپیہ دے گا' پھر اس نے ایک لاکھ روپیہ لے کر کیمیا سکھلا دی تو اب وہ سیکھنے والا اس قدر خوش ہے کہ پھولا نہ سماتا' اسے اس کا مطلق افسوس نہیں کہ میں نے ایک لاکھ روپیہ کیوں دیا بلکہ وہ زبان حال سے کہتا ہے:

جمادے چند دادم جاں خریدم — بحمداللہ عجب ارزاں خریدم

(میں نے چند سکے دے کر جان خریدی' اللہ کا شکر ہے کہ بہت سستی خریداری کی)

مگر اس کا پڑوسی جو کیمیا کا قائل اور اس فن کو جانتا نہیں وہ اسے بیوقوف بناتا ہے کہ میاں تم بھی بڑے احمق ہو ایک لاکھ روپیہ یوں ہی دے دیا' اتنی بڑی رقم فضول ہی ضائع کر دی۔ جب وہ کہتا ہے کہ بھائی میں نے یہ رقم ضائع نہیں کی بلکہ اس کے بدلے کیمیا بنانا سیکھ لیا ہے تو کہتا ہے جاؤ میاں بیٹھو بھی بیوقوف ہوئے ہو کیسی کیمیا' لاکھ روپیہ دیدیا ایک وہمی اور فضول سی چیز کیمیا کے لیے یہ حضرت صرف لاکھ روپیہ کو رو رہے ہیں مگر وہ ایک ہی دن میں لاکھ روپیہ بنا لے گا بلکہ جسے کیمیا بنانا آتا ہے وہ دل کا اس قدر غنی ہو جاتا ہے کہ اسے بنانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی وہ ہر وقت مطمئن ہے کہ جب چاہوں گا اور جتنا چاہوں گا لاکھ دو لاکھ بنا لوں گا تمہیں کیا خبر کہ جس نے مال اور جاہ کو چھوڑا اسے کیا کیمیا مل گئی ہے۔

کیمیا ایست بندگی پیر مغاں — خاک او گشتم وچندیں درجاتم دادند

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند — واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

(مرشد کی تابعداری عجیب کیمیا ہے کہ اس کے پاؤں کی خاک بننے سے بڑے درجے ملے' کل صبح کے وقت مجھ کو غصہ سے نجات دی اور اس اندھیری رات میں مجھ کو آب حیات پلا دیا)

یہ ہے وہ کیمیا اور وہ دولت جو حاصل ہوتی ہے اور جس کے حصول کے بعد جوش میں آ کر یہ کہتے ہیں:

دوش وقت سحراز غصہ نجاتم دادند وانداراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

(کل صبح کے وقت مجھ کوغصہ سے نجات دی اوراس اندھیری رات میں مجھ کوآب حیات پلادیا)

دوسروں کو کیا خبراس دولت کی۔ اندھے مادرزاد کو کیا خبر کہ نظر کسے کہتے ہیں اور روشنی کیسی ہوتی ہے۔ عنین کیا جانے کہ نکاح میں کیا مزہ ہے اور منکوحہ کیسی قابل قدر چیز ہے اسی طرح جن کی باطنی آنکھیں پٹ ہیں وہ باطنی دولت کی حقیقت کیا سمجھیں' وہ تو ظاہری جاہ و مال چھوڑنے والوں کو بیوقوف ہی بنادیں گے کہ لوصاحب روپیہ پیسہ ملتا تھا نہیں لیا' سرداری مل رہی تھی نہیں قبول کی' اب دیکھئے کہ یہ کس کی حالت تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی تو اعلیٰ درجہ کی حالت یہ ہے کہ عقلاء زمانہ بیوقوف کہا کریں اور دیوانہ سمجھا کریں یہ تو بڑے فخر کی بات ہے ایسی دیوانگی تو مطلوب ہے۔ یہ دیوانگی تو وہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد مرعسس رادیدو در خانہ شد

مااگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(جو دیوانہ نہیں ہوا وہی دیوانہ ہے جس طرح کوئی کوتوال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے' اسی طرح جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا ہے عقل رفو چکر ہو جاتی ہے۔ ہم اگر قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا بات ہے یہی بات کیا کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی اوران کی محبت کے متوالے ہیں)

اور حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی بے زروگنج بصد حشمت قاروں باشی

درره منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل وہ بہتر ہے کہ سرخ شراب سے تو مست رہے اور بغیر سونے چاندی کے خزانوں کے تو دولت مند بن جائے۔ لیلیٰ کی منزل میں جان کو سینکڑوں خطرے ہیں' پہلی شرط اس راہ کے لیے مجنوں بن جانا ہے)

بلکہ اگر وہ جنون کم ہو جائے تو غم ہوتا ہے اور جب وہ پھر عود کرتا ہے تو خوش ہو کر فرماتے ہیں۔

باز دیوانہ شدم من اے طبیب باز سودائی شدم من اے حبیب

باز آمد آب من درجوئے من باز آمد یارمن درکوئے من

(پھر اے طبیب ہم دیوانہ بنے اے حبیب ہم پھر سودائی ہوئے' پھر میری آرزو پوری ہوگئی جب میرا محبوب مجھے مل گیا)

خوش ہوتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ دیوانگی پھر آ گئی اور عقل کو یوں خطاب کرتے ہیں:

آزمودم عقل دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دوراندیش کو میں نے آزما لیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کو دیوانہ بنا لیا)

اور مولانا فرماتے ہیں:

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　　جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(دل ودماغ کو تیز کر لینے کا نام راستہ پانا نہیں اس لیے فضل شاہ تو متوجہ ہی شکستہ دل پر ہوتا ہے)

تو یہ حالت ہوتی ہے تو حالت مطلوب کیا ہوئی۔ یہ ہوئی کہ طلب میں ایسی حالت ہو جائے کہ لوگ دیوانہ سمجھنے لگیں۔ حدیث میں بھی تو آتا ہے۔ حصن حصین میں ہے "اذکروا اللّٰہ حتی یقولوا انہ لمجنون"[۱] اللہ تعالیٰ کی اتنی یاد کرو کہ لوگ تم کو پاگل کہنے لگیں اور واقعی ایسی حالت ہو جاتی ہے۔

ذکر حق

ایک بزرگ تھے۔ وہ خط بنوا رہے تھے مگر زبان سے ذکر اللہ جاری تھا۔ نائی نے لبیں لیتے وقت عرض کیا کہ حضور تھوڑی سی دیر کے لیے خاموش ہو جائیں ورنہ ہونٹ کٹ جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ہونٹ کٹ جائے گا تو کیا ڈر ہے پھر جڑ جائے گا لیکن اگر اللہ کی یاد کو میں نے منقطع کر دیا تو جو سانس غفلت میں گزرے گا اس کا کوئی تدارک نہیں۔ بس میں اپنا کام کروں تم اپنا کام کرو' اگر ہونٹ کٹتے ہیں تو کٹنے دو' چاہے سارے ہی کٹ جائیں میں ذکر کو منقطع نہ کروں گا۔ ہائے مولانا نے بھی ایک ایسی ہی حکایت لکھی ہے۔

زاہدے راگفت یارے درعمل　　کم گری تا چشم را ناید خلل

ایک زاہد تھے جو رویا بہت کرتے تھے ان کے ایک رفیق طریق نے کہا کہ کم رویا کرو ورنہ آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔

---

۱ میزان الاعتدال: ۲۶۶۷

گفت زاہداز دو بیروں نیست حال　　　　چشم بیند یا نہ بیند آں جمال

زاہد نے کہا کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ آنکھیں وہ جمال دیکھیں گی یا نہ دیکھیں گی۔

گر بہ بیند نور حق خود چہ غم است　　　　در وصال حق دو دیدہ کے کم است

اگران آنکھوں سے میں نے جمال حق دیکھ لیا تو پھران آنکھوں کے نہ رہنے کا کیا غم' یہ دو آنکھیں کیا ایسی ایسی لاکھوں آنکھیں بھی ہوں تو اس جمال پر نثار ہیں۔

در نہ بیند نور حق راگو برو　　　　ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

اور اگر اس جمال کو نہ دیکھا تو ایسی کمبخت آنکھوں کا پھوٹ جانا ہی بہتر ہے وہ آنکھ ہی کیا جس کو وہ جمال نہ دکھائی دے اور وہ کان ہی کیا جس کو وہ خطاب نہ سنائی دے ایسی آنکھ اور ایسے کان ہی کو میں کیا کروں گا۔ حضرت یہ لوگ آنکھ کو کان کو جان کو مال کو سب کو محبت حق میں فنا کر دیتے ہیں۔ ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

ہوفنا ذات میں کہ تو نہ رہے　　　　تیری ہستی کی رنگ و بو نہ رہے

جتنا تعلق ذات حق سے بڑھتا جاتا ہے اور سب کو فنا کرتے جاتے ہیں تو ایسوں کو لوگ بیوقوف تو بنا ہی دیں گے کہیں گے اچھے متقی ہوئے ہونٹ ہی کٹا بیٹھے اور کرواللہ کوئی ان سے کہے کہ میاں تمہیں کیا ہونٹ کٹے تو ان کے کٹے تم سے تو شکایت نہیں۔ ایک بزرگ صرف ستو ہی گھول کر پی لیتے کہ کھانا کھانے میں دیر لگتی ہے' حرج بہت ہوتا ہے' ستو گھولا اور جلدی سے ایک گھونٹ پی لیا' پھر اپنے اللہ کی یاد میں لگ گئے' ان کی غذا تو بس یہ ہے ایسے شخص کو ظاہر ہے کہ لوگ بیوقوف ہی کہیں گے چونکہ ہر وقت توجہ حق کی طرف رہتی ہے ایک استغراق کا سا عالم طاری رہتا ہے اور جب توجہ ہی کسی اور طرف نہیں تو بہت سی باتوں میں بھول ہو جاتی ہے۔ محبوب حقیقی کے سوا انہیں اور کچھ یاد نہیں رہتا۔ (بقول احقر جامع ۱۲)

گم گشتہ حیرت کوئی مجھ سا بھی نہیں ہے　　　　میں خود ہوں کہیں دل ہے کہیں ہوش کہیں ہے

ہمیشہ رہتا ہوں اک بیخودی کے عالم میں　　　　جہاں نہ میرے لیے ہے نہ میں جہاں کیلئے

تو ایسے شخص کو اہل دنیا پاگل نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔ میں نے اپنے استاد علیہ رحمۃ سے خود سنا ہے۔ مولانا علاوہ زبردست عالم ہونے کے بڑے درویش اور صاحب باطن شیخ

تھے۔ فرماتے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ خط لکھ کر آخر میں دستخط کرنے چاہے تو اپنا نام ہی بھول گیا' بہت یاد کیا مگر یاد ہی نہ آیا۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے استغراق کا کہ اپنا نام ہی یاد نہ رہا۔ ایسا حیرت ناک واقعہ ہے کہ اگر میں نے خود حضرت سے نہ سنا ہوتا تو باور آنا بھی مشکل تھا۔ حضرات صحابہؓ میں بھی اس رنگ کے ایک بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ ایک دن آپ کی صاحبزادی صاحبہ بھی ساتھ جا رہی تھیں' لوگوں نے پوچھا کہ یہ لڑکی آپ کی ہے' تو آپ بہت غور سے اسے دیکھ کر فرماتے ہیں کہ ہاں گھر والے کہتے تو تھے کہ یہ لڑکی میری ہے' یعنی یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ میری لڑکی ہے۔ گھر والوں کے قول سے استدلال کیا۔ میں نے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی ان کا بھی یہی رنگ تھا۔ ایک بار مولانا کے پوتے کی شادی کا ہنگامہ تھا' مجمع کو دیکھ کر پوچھا ارے بھائی یہ لوگ کیوں جمع ہیں' پھر عرض کر دیا گیا کہ پوتے صاحب کا نکاح ہے' فرمانے لگے ہاں میاں ہاں ابھی تو تم نے کہا تھا کہ نکاح ہے' ہم بھول ہی گئے تمہارا کیا قصور ہے ہماری ہی یاد خراب ہے۔ یاد ہی نہیں رہتا' پھر تھوڑی دیر بعد وہی سوال کہ میاں یہ کیا ہو رہا ہے' یہ لوگ کس لیے جمع ہوئے ہیں' پھر کہہ دیا گیا کہ حضرت نکاح ہے' فرمایا ارے بھائی ہم تو بھول بھول جاتے ہیں کیا کریں' اب ہم پوچھیں بھی تو مت بتانا کوئی کہاں تک بتائے۔ اجی ہوگا ہمیں پوچھنے ہی کی کیا ضرورت ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کا حال حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس قدر استغراق تھا کہ ہمیشہ تو نماز جماعت سے جامع مسجد میں پڑھتے تھے لیکن راستہ عمر بھر بھی یاد نہ ہوا' یہ کیفیت تھی استغراق کی کہ حضرت کے ایک خادم تھے' بختیار وہ آگے آگے چلتے اور حق حق کہتے جاتے بس اس آواز پر چلتے جاتے اور مسجد تک پہنچ جاتے کیا ٹھکانا ہے استغراق کا کہ تیس برس تک ایک ہی مسجد میں نماز پڑھی مگر راستہ ہی یاد نہ ہوا اس قدر تو استغراق تھا مگر اتباع سنت کا یہ حال تھا کہ کسی ادنیٰ سنت کو بھی کبھی ترک نہیں کیا۔ غرض تیس برس تک نماز باجماعت جامع مسجد میں ادا کی لیکن پھر بھی راستہ یاد نہ ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ ایک دل میں دو چیزیں نہیں سما سکتیں۔ اہل اللہ کے قلب میں ایک ایسی چیز بس گئی ہے کہ کسی دوسری چیز کی اس میں گنجائش ہی نہیں رہی۔ حضرت ایسوں کو عقلاء مجنون نہ کہیں تو کیا کہیں' جنہیں نہ

اولاد یاد نہ خادم یاد' عقلاء تو ایسوں کے بارے میں یہی کہیں گے کہ معلوم ہوتا ہے دماغ میں خلل ہے۔ ارے نادانو تمہارے ہی دماغ میں خلل ہے جو چیز ان کے اندر ہے اگر تمہارے اندر ہو تو کلیجہ پھٹ جائے۔ (بقول احقر جامع)

کر کے نالے بھی مجھے ناز شکیبائی ہے　　درد یہ اور کو ملتا تو وہ مر ہی جاتا

یہ ان کے دماغ ہی کی تو صحت وقوت ہے اس قدر ضبط ہے۔ چنانچہ حضرت مخدوم عبدالحق ردولوی رحمتہ اللہ علیہ باوجود اس قدر مغلوب الحال ہونے کے فرماتے ہیں منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بہ فریاد آمد اینجا مردانند کہ دریا فرو برندو آروغ نزنند ہم کو تو نقل کرتے بھی جھجک ہوتی ہے لیکن ان کو حق حاصل ہے۔ فرماتے ہیں: منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ میں شور مچانے لگا' یہاں مرد ہیں کہ سمندر کے سمندر چڑھا جائیں اور ڈکار نہ لیں۔ (بقول جامع)

ایک چلو میں یہ حالت ہوگئی　　کر چکے رندی بس اے مجذوب تم

تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر ایک ایسی چیز تھی جس کو منصور بھی ضبط نہ کر سکے۔ جب منصور سے وہ چیز ضبط نہ ہو سکی تو اوروں سے تو کیا ہو سکتی ہے' ایسی چیز جس کے اندر ہو کیا اسے جامع مسجد کا راستہ یاد رہ سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی استقامت ایسی تھی کہ نماز تو نماز جماعت بھی کبھی نہ چھوٹی۔ یہ تھا اتباع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس اتباع ہی کی برکت سے اس درجہ تک پہنچے اور یہ رتبہ پایا اور اتباع میں ایسی برکت ہونے کا ایک راز ہے جس کے متعلق پہلے ایک حکایت سن لیجئے۔ قنوج میں ایک وکیل ہیں' شیخ محمد عالم وہ خود مجھ سے اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ کسی اور بستی میں جا رہا تھا راستہ میں ایک مکان کی دہلیز میں سے ایک بڑی بی کی آواز آئی۔ انہوں نے مجھ کو بلا کر بڑی محبت سے میرے سر پر اور میری کمر پر ہاتھ پھیرا اور پیار کیا اور بٹھلا کر میرے لیے حلوا تیار کیا اور کہا کہ اگر کبھی تمہارا آنا ہوا کرے تو میرے پاس ہو کر جایا کرو' مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بڑھیا سے میری نہ جان نہ پہچان یہ کیوں ایسی محبت سے پیش آ رہی ہے۔ آخر میں نے پوچھا کہ بڑی بی تم میری کیوں اتنی خاطر کر رہی ہو۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا کہ تمہاری شکل کا ایک میرا بیٹا ہے وہ بہت دن سے پردیس میں ہے اس کی ایسی ہی شکل ہے جیسی تمہاری' تمہیں دیکھ کر

مجھے وہ یاد آ گیا اور اس کی سی شکل ہونے کی وجہ سے مجھے تم سے محبت ہوگئی تم میرے بیٹے کی شکل پر ہو اس لیے تم پر پیار آ گیا۔ یہ ایک مثال ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کے محبوب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو شخص آپ کی ہیئت بناتا ہے اس پر خدا تعالیٰ کو محبت اور پیار آتا ہے کہ یہ میرے محبوب کا ہمشکل ہے یہ راز ہے حضور کی اتباع میں خاص برکت کا اور یہ ایسا طریق ہے وصول کا جو سب سے زیادہ نزدیک ہے اس کو جو اختیار کرے گا وہ بہت جلد پہنچے گا اور وہ بہت جلد کامیاب ہوگا ورنہ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

مپندار سعدی کہ راہ صفا   تواں رفت جز درپئے مصطفیٰ

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کرنے والا کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا' سعدیؒ یہ خیال مت کر کہ سیدھا راستہ بغیر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طے ہوسکتا ہے)

بدون حضور کے اتباع کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ خود حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ'' کہہ دیجئے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو' خدا کو تم سے محبت ہو جائے گی۔ ظاہری نسق کلام کا یہ مقتضا تھا کہ یوں فرماتے ہیں کہ تم کو خدا سے محبت ہو جاوے گی مگر یوں نہیں فرمایا گویا اس طرف اشارہ ہے کہ تم تو کیا خدا سے محبت کرتے تمہارا تو کیا منہ ہے۔ ہاں خدا ہی کو تم سے محبت ہو جائے گی۔ اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو گے اللہ اکبر' ہم اگر چاہتے اور کوشش کرتے کہ ہم سے خدا کو محبت ہو جائے تو قیامت تک بھی یہ دولت نصیب نہ ہو پاتی کیونکہ کہاں ممکن کہاں واجب چہ نسبت خاک را با عالم پاک' لیکن اتنا بڑا رتبہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے حاصل ہو جاتا ہے تو صاحبو بڑی چیز یہ ہے' یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع۔ حضرت شیخ عبدالحق ردولوی رحمتہ اللہ علیہ کو بھی اتنا بڑا رتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اتباع سے حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ آپ سے کبھی کوئی سنت ترک نہ ہوتی تھی مگر استغراق اتنا رہتا تھا کہ تیس برس تک جامع مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جاتے آتے رہے لیکن راستہ یاد

نہ ہوا تو ایسا استغراق تھا۔ ایک دن ردولوی سے باہر بہت دور ایک ندی کے کنارے جا رہے تھے۔ یہ جگہ بہت پسند آئی، فرمایا کہ یہ تو بڑے لطف کی جگہ ہے اب یہیں رہا کریں گے۔ بختیار خادم تھے عاشق عرض کیا بہت بہتر اور دونوں وہیں رہنے لگے، بہت زمانے کے بعد ایک دن کچھ افاقہ ہوا تو دفعتاً دریا پر نظر پڑی، خادم سے فرمایا کہ ارے میاں ردولی میں تو پہلے کوئی دریا نہ تھا اب یہاں دریا بھی بہنے لگے، سیر و تفریح کی جگہ ہوگئی۔ خادم نے عرض کیا کہ حضرت یہ ردولی کہاں ہے یہ تو فلانے مقام کا دریا ہے ردولی سے آئے ہوئے تو حضور کو بہت دن ہوگئے، تب فرمایا کہ اگر یہ ردولی نہیں ہے تو چلو بھائی یہاں سے، گھر سے بے گھر ہونا ٹھیک نہیں۔ لیجئے یہ بھی خبر نہیں کہ یہ ردولی ہے یا کوئی اور مقام ایسے شخص کو عقلاء زمانہ لیکن جہلاء آخرت کیا پاگل نہ کہیں گے۔ مگر مقبول ہے یہ لقب اور مطلوب ہے یہ حالت اس واسطے کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ ہی کہا گیا ہے جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں اور اولیاء اللہ کو بھی یہ ہی کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ" کفار اہل ایمان کو ذلیل سمجھ کر ان پر ہنستے ہیں اور ان کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں لیکن ایمان والوں کو اس سے دلگیر نہ ہونا چاہیے، ہنسنے والے یہاں ایمان والوں پر ہنس لیں اور اپنے آپ کو ان سے بڑھا ہوا سمجھ لیں لیکن قیامت کے روز اہل تقویٰ ان سے بڑھے ہوئے رہیں گے اور یہ گھٹے ہوئے ہوں گے۔ (بقول حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ)

بسا سوار کہ آنجا پیادہ خواہد شد　　　بسا پیادہ کہ آنجا سوار خواہد بود

(بہت سے سوار وہاں پیدل جائیں گے اور بہت سے پیدل وہاں سوار ہو جائیں گے)

یا بقول ملا در رسالہ مناظرہ مسٹر و ملا

وہاں اپنی حقیقت تجھ کو دکھلاؤں گا اے مسٹر　　　یہاں رکھتی ہے میری کامرانی شکل حرمانی

مطلب میرا یہ ہے کہ شریعت کا اتباع کرنے والے مصالح دنیویہ کو پیش نظر کیوں رکھتے ہیں وہ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ مصالح دینیہ و دنیویہ دونوں کو جمع رکھیں۔ یعنی اس معنی کر کہ دنیا بھی خوب کماؤ کھاؤ اور دین کے بھی بھلے بنے رہو۔ ادھر مخلوق کو بھی راضی رکھو ادھر خدا

کو بھی اگر خدا کو معبود اور مقصود سمجھتے ہو تو مخلوق کو راضی یا ناراضی کرنے سے قطع نظر کر لو' قصداً تو کسی سے لڑو بھڑو نہیں لیکن اس کی بھی کوشش نہ کرو کہ مخلوق ہم سے راضی ہی رہے' بس اس شان کا ہونا چاہیے مسلمان کو لیکن یہ ضروری بات ہے کہ یہ شان جبھی پیدا ہو سکتی ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا پورا اتباع کیا جائے گو یہ بھی ضرور ہے کہ اس حالت میں لوگ ملامت کریں گے مگر تمہارا یہ مذہب ہونا چاہیے۔

نسازد عشق را کنج سلامت   خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق سلامتی کے گوشہ کی موافقت نہیں کرتا اسکو تو ملامت کے کوچہ کی رسوائی اچھی معلوم ہوتی ہے)

اور خوش ہونا چاہیے کیونکہ اس میں ایک راز وہ یہ کہ جس میں ملامت ہو جاتی ہے اس میں آدمی پکا ہو جاتا ہے مثلاً کسی نے داڑھی رکھ لی تو داڑھی منڈوانے والے اس پر ہنسیں گے کہ آئے مولانا صاحب۔ آئے حضرت قبلہ یہ ضرور ہوگا اور یہ ناگوار بھی ہوگا لیکن اس کا اثر یہ ہوگا کہ اگر کبھی جی بھی چاہے گا منڈانے کو تب بھی اس غصہ میں آ کر نہ منڈائے گا اور ان کی ضد میں ڈاڑھی رکھنے کا اور بھی عزم کر لے گا تو یہ نفع ہے ملامت میں۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں ملامت کی ہرگز پروانہ کرنی چاہیے اگر لوگ تم پر ہنسیں یا طعن کریں تو دلگیر ہونے کی کیا وجہ ہے۔ سبحان اللہ میاں' یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے' یہ تو وہ رتبہ ہے جو حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اس وقت بھی اہل ایمان پر یوں ہی لوگ ہنسا کرتے تھے تو جب حضور کا اتباع کرو گے لوگ ہنسیں گے ضرور لیکن اس کی کچھ پروانہ کرو' اب فرض کرو تم نے کوئی شادی کی بلا رسم' تو لوگ طعنے دینا شروع کریں گے اور سینکڑوں لتاڑ پڑنی شروع ہوں گی کہ یہ بڑے متقی نکلے ہیں کہ باوا دادا سے بھی بڑھ گئے' باوا دادا سے جو رسمیں چلی آ رہی تھیں سب ناجائز ہی قرار دیدیں ایسے کنجوس ہیں کہ برادری کا کھانا بھی اڑا دیا' یہ سب طعن و تشنیع سن کر بھی تم خوش رہو اور کچھ پروا مت کرو' عشق میں بھلا رسوائیوں سے بھی کوئی سلامت رہا ہے لہٰذا تم کو خوش ہونا چاہیے اور یہ کہنا چاہیے۔

نسازد عشق را کنج سلامت   خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق سلامتی کے گوشہ کی موافقت نہیں کرتا اسکو تو ملامت کے کوچہ کی رسوائی اچھی معلوم ہوتی ہے)

اور سنو اگر لباس شرع کے موافق پہنو گے تو جنٹلمین لوگ ہنسیں گے کہ یہ کیا دقیانوسی لباس پہنا ہے' اول جلول کتے کی جھول' چہرہ دیکھو تو وحشت برستی ہے' ارے عاشقوں کے چہرہ پر تو وحشت ہی زیب دیتی ہے۔ مانگ پٹی تو زنانوں کا شعار ہے' واللہ وہ عاشق نہیں جو کوٹ بوٹ سے درست ہو' خدا کی قسم جن کے دلوں میں محبت گھس گئی ہے انہیں اپنے سر اور پاؤں کی بھی خبر نہیں۔ کوٹ بوٹ تو کیا پہنتے اگر ان کے پاس پھٹی جوتی اور پھٹا لباس بھی ہوگا تو انہیں عار نہ ہوگی اور اب تو یہ حالت ہے کہ بھلا مرد تو مرد عورتوں نے باریک کپڑے پہننے شروع کر دیئے ہیں اگر کوئی اچھے کپڑے شریعت کے موافق پہنے تو کہتی ہیں کہ یہ کیا کنجڑنوں اور قصائیوں کے سے کپڑے پہنے ہیں۔ اس قدر چست اور منڈھا ہوا لباس پہنتی ہیں کہ بدن کی ساخت اور ساری ہیئت ہی ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اگر اتفاق سے کسی غیر محرم کی نظر پڑ جائے تو کس قدر بے غیرتی ہے اور پائنچے ایسے چست کہ پنڈلی میں چٹکی لیں تو کھال بلکہ گوشت کی بوٹی تک اکھڑ آئے پھر اوپر سے کھڑے جوتے حالانکہ حرام ہے' عورتوں کے لیے مردوں سے مشابہت حدیث میں لعنت آئی ہے ایسی عورتوں پر مردوں سے مشابہت کریں اور اس قدر چست پائنچے بازار والی فاسق فاجر عورتوں کا شعار ہے اور مشابہت فساق فجار کی بھی ناجائز ہے۔ اس کا منشاء فقط تفاخر ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ذرا آن بان سے رہیں اور خوبصورت معلوم ہوں اور کوئی یوں نہ کہے کہ یہ کیسے باؤلوں کے سے ڈھیلے پائنچے ہیں' جیسے جھلی مارنی پہنے پھرتی ہیں (یعنی سینگی لگانے والیاں) تو اب عورتیں بھی اس طرح سے طعن کرنے لگی ہیں۔ غرض عورتوں نے بھی اب آپس میں مردوں کا سا تفاخر کرنا شروع کر دیا ہے مینڈکی کو بھی نور کام ہوا۔ مردوں کو تو یہ مرض تھا ہی عورتوں کو بھی ہوا اور مردوں کا تفاخر تو خیر چل بھی سکتا ہے کیونکہ ایک کو دوسرے کی اندرونی حالت معلوم نہیں۔ جیسا چاہا اپنے کو ظاہر کر سکتے ہو مگر عورتیں گھروں میں آنے جانے والیاں ایک کو دوسرے کے گھر کی خبر۔ یہ ایک دوسرے سے کیونکر اپنا اصلی حال چھپا سکتی ہیں اس لیے مرد اگر تفاخر کرتے ہیں تو ان کی اتنی بیوقوفی نہیں کیونکہ ایک کو دوسرے کا حال معلوم نہیں کہ گھر میں چوہے قلابازی کھا رہے ہیں' قلعی نہیں کھلتی' بس ایک جوڑا انگریزی بنا لیا اور ہر موقع پر اچھے خاصے جنٹلمین بن گئے جو غریب ہیں انہوں نے بھی بس ایک اچکن بڑھیا بنوالی اور ہر موقع پر وہی اچکن ڈاٹ لی اور

نواب کے بچے بن گئے حالانکہ گھر میں خاک بھی نہیں بعض لوگ انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے لیکن جنٹلمین کا سا رنگ و روغن بناتے ہیں، روغن پر ایک حکایت یاد آئی' کوئی ایسے ہی تھے شیخی باز' ظاہری وضع تو نہایت امیرانہ اور گھر میں کھانے تک کو نہیں، روز گھر سے آ کر اپنے دوستوں میں شیخی بگھارا کرتے کہ آج گوشت بہت مزیدار پکا تھا' پلاؤ بھی اچھا تھا' چاہے گھر میں دال اور خشکہ بھی میسر نہ آیا ہو' میاں فاقہ ہی سے ہوں اور ترکیب یہ کرتے کہ گھر میں جو جلنے کا چراغ تھا اس کا تیل انگلیوں اور مونچھوں کو لگا لیتے تا کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ واقعی نواب صاحب بہت مرغن گوشت اور پلاؤ کھا کر آئے ہیں۔ ایک دن عجب دل لگی ہوئی' حسب دستور چراغ میں سے تیل لے کر جو مونچھوں کو چپڑنے لگے تو اتفاق سے بتی بھی مونچھوں میں لپٹ گئی۔ اور چونکہ وہ چلتے جلتے چھوٹی سی رہ گئی تھی اس لئے ان حضرت کو وہ محسوس بھی نہ ہوئی۔ باہر آ کر حسب عادت دوستوں میں ڈینگیں مارنے لگے کہ واللہ آج کا پلاؤ تو بہت ہی مزیدار تھا' ایک صاحب کی نظر جو مونچھوں پر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ چراغ کی بتی لپٹی ہوئی ہے۔ بس ساری قلعی کھل گئی کہ حضرت چراغ کا تیل مونچھوں میں لگا لگا کر آتے ہیں تا کہ لوگوں پر ظاہر ہو کہ بہت مرغن کھانے کھاتے ہیں۔ فوراً انہوں نے کہا کہ جناب بجا ہے اور دیکھئے پلاؤ کا ایک چاول بھی مونچھوں میں لپٹ آیا ہے' ہاتھ پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ چراغ کی بتی ہے بہت ہی خفیف ہوئے تو اس شیخی بازی سے فائدہ کیا۔ خیر یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ لوگوں کو پتہ چل گیا ورنہ مردوں کو شیخی تو کچھ چل بھی جاتی ہے کیونکہ گھر کے اندر کا حال مردوں کو کیا معلوم لیکن عورتوں کو تو ایک دوسری کا حال معلوم ہے کہ اتنے پانی میں ہے' پھر شیخی کیسی۔ پھر بیگم صاحبہ خواہ مخواہ ہی اینٹھ مروڑ میں مری جاتی ہیں پھر ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ اگر لباس قیمتی ہی پہننے کا شوق ہے پہنو' تو شریعت کیخلاف نہ ہونا چاہیے' دوسرے زینت میں غلو نہ ہو' بس اتنا تجمل کافی ہے کہ کوئی ذلیل نہ سمجھے' کوئی باؤلا جھلا نہ کہے (یعنی پاگل) اور اصل بات تو یہ ہے کہ نہ ذلت کی پروا ہو' نہ بدنامی کی یہ دونوں شانیں عشق کے لوازم میں سے ہیں۔ "یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ" (جن کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی اور اللہ تعالیٰ سے ان کو محبت ہوگی) اور "لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ" (اور وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال نہ کریں گے) اسی طرف اشارہ ہے۔

پردہ

محبین پر تو ملامت ہوتی ہے مثلاً پردہ ہی ہے بعضی عورتیں جو متشرع ہیں وہ سب نامحرموں سے پردہ کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ چچازاد بھائی سے بھی ان کے اوپر بڑے طعن ہوتے ہیں کہ بھلا بھائی سے بھی کہیں پردہ ہوتا ہے عورتوں کے نزدیک چچا کا لڑکا ایسا ہے جیسے سگا بھائی۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سگا بھائی ہے لیکن ایسا سگا ہے جو سگ سے ماخوذ ہے اور الف جو آخر میں ہے وہ ایسا ہے جیسے کسی بڑے ہانڈی کو ہنڈا کہتے ہیں۔ اسی طرح یہاں سگا کے معنی ہیں بڑا سگ۔ ایک شہری بچہ سے کسی نے پوچھا کہ فلانا تمہارا سگا بھائی ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ میرا حقیقی بھائی ہے، سگ تو کتے کو کہتے ہیں' چھوٹا سا بچہ تھا لیکن کسی سے سن لیا ہوگا کہ سگ کتے کو کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے کہ حقیقی بھائی کہئے سگ نہ کہئے' تو غرض یہ کہ عورتیں چچازاد بھائی کو مثل حقیقی بھائی کے سمجھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس سے کیا پردہ۔ عورتیں تو عورتیں ایسے پردہ سے مرد بھی خفا ہیں کسی نے ہمت کر کے اپنے قریبی نامحرم رشتہ داروں سے بھی پردہ کرنا شروع کیا تو اب چاروں طرف سے اعتراض کی بھرمار ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ میاں کچھ نہیں اب عزیزوں میں آپس میں محبت ہی نہیں رہی۔ دوسرے صاحب بھی اینٹھ گئے کہ ان کے گھر جاویں تو کیا دیواروں سے بولیں۔ اب ہم ان کے یہاں جانا ہی بند کر دیں گے۔ سبحان اللہ کیا عزیزوں کے تعلقات اور آپس کا میل جول بے پردگی ہی پر موقوف ہے اگر یہ معنی ہیں تو توبہ نعوذ باللہ اللہ میاں پر اعتراض ہے کہ ایسے قریبی رشتہ داروں کو بھی نامحرم قرار دے دیا۔ استغفر اللہ مگر اسی میں بعض ایسی بھی ہمت والیاں ہیں کہ چاہے کوئی ہو وہ کسی نامحرم کے سامنے نہیں آتیں۔ چاہے کوئی برا مانے یا بھلا مانے اور اکثر جگہ تو پردہ کی ایسی کمی ہے کہ محرمیت نہیں کچھ نہیں دور دور کے رشتہ داروں کو بے تکلف گھر میں بلا لیتی ہیں اور بے محابا ان کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ بالکل ناجائز ہے اور گناہ ہے مردوں کو چاہیے کہ وہ انہیں تنبیہ کریں اور سب نامحرموں سے پردہ کرائیں۔ اگر کسی کو ناگوار ہو تو بلا سے ہو' کچھ پرواہ مت کرو' ہرگز ڈھیلا پن نہ برتو بلکہ مردوں کو چاہیے کہ اگر کوئی نامحرم رشتہ دار عورت ان سے پردہ نہ کرے تو وہ خود اس سے چھپا کریں' میری ایک خالہ تھیں یعنی میرے والد صاحب کی سالی یہ دستور ہے ہی کہ عموماً

سالیاں بہنوئی سے پردہ نہیں کرتیں۔ چنانچہ وہ بھی والد صاحب کے سامنے آنے لگیں، والد صاحب اگرچہ عمر میں ان سے بہت بڑے تھے اور باپ کے برابر تھے لیکن ان کو غیرت آئی اور سامنے آنے سے منع کر دیا۔ انہوں نے مانا نہیں اور پھر بھی سامنے آئیں۔ گو والد صاحب دنیا دار تھے مگر غیرت دار بڑے تھے، ایک بار خوب ڈانٹا کہ خبردار جو کبھی میرے سامنے آئی ٹانگیں توڑ دوں گا، بہت برا مانا اور بہت روئیں کہ بھائی نے مجھے ایسا ایسا کہا، مگر پھر کبھی سامنے نہیں آئیں، پردہ کرنے لگیں تو انہوں نے برا مانا مگر والد صاحب نے کچھ پروا نہ کی، پردہ کرا کر چھوڑا، اسی طرح تم کرو، اگر کوئی برا مانتا ہے مانا کرے کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے، برا مان کر کوئی کرے گا کیا۔ اچھا تو ہے سب چھوڑ دیں، کوئی اپنا نہ رہے، یوں ہی تعلق خلق سے گھٹے، جب کوئی اپنا نہ رہے گا اور سب سے توقع منقطع ہو جائے گی تب تو سوچے گا کہ بس جی اب تو اللہ تعالیٰ ہی سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ بقول کسی کے

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا

اب سمجھئے گا کہ اعزہ اقربا یار دوست یہ سب حجاب تھے اب کوئی حجاب نہ رہا۔ اب خدا کے ہو جتنے تعلقات کم ہوں اتنا ہی اچھا، ہمارے ایک بزرگ تھے ماموں امداد علی صاحب ویسے تو ایک آزاد منش درویش تھے مگر باتیں بڑی حکمت کی فرمایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ تارک الدنیا تو ہونا بہت مشکل ہے مگر ہاں جب کسی پر میاں کا فضل ہوتا ہے تو اس کو متروک الدنیا بنا دیا جاتا ہے یعنی ایسے اسباب غیب سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ خود دنیا اس کو چھوڑ دیتی ہے یہ صورت ہوتی ہے ترک دنیا اور ترک تعلقات کی یعنی جب متروک الدنیا ہو گیا تو دنیا سے نفور ہو کر تارک الدنیا بھی ہو ہی گیا اور بھائی یہ تو سوچو کہ کسے کسے راضی کرو گے، راضی تو ایک ہی ہوتا ہے، کئی تو راضی ہوا نہیں کرتے تو حضرت یہ کیجئے کہ صرف ایک اللہ کو راضی رکھئے بہت سے آدمیوں کو کہاں تک راضی رکھئے گا۔ مثلاً "رَجُلاً فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلاً سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلاً"، ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص ہے جس میں کئی ساجھی ہیں جن میں باہم ضد اضدی ہے اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا ہے کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہے)

دلارامے کہ داری دل دروبند   دگر چشم از ہمہ عالم فروبند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہو تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کر لے)
میں کہتا ہوں کہ ایک مردار بازاری عورت کی محبت میں اس کی رضامندی کی خاطر اپنی آبرو جائیداد خاندان کی عزت سب برباد کر دیتے ہیں' کسی چیز کی پروانہیں کرتے' تو کیا خدا کی محبت اس سے بھی کم ہوگئی۔ مولانا فرماتے ہیں:

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود   کوئے گشتن بہرا و اولیٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو اس کی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے)

کیا عشق مولیٰ عشق لیلیٰ سے بھی کم ہوگیا۔ دیکھو لیلیٰ کی محبت میں مجنوں کی کیا کیفیت تھی پھر تم خالق لیلیٰ کے مجنوں ہو۔ تمہاری تو اس سے بھی بڑھ کر حالت ہونی چاہیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رضا کے مقابلہ میں کسی کی ناراضی کا خیال نہ کرو۔ یہ میں نہیں کہتا کہ باؤلے نہ بنو بلکہ مستقیم رہو شریعت پر اور پختہ کار ہو جاؤ۔ محبت میں اگرچہ سارا جہان خلاف بلکہ ملامت سے تو عشاق خوش ہوتے ہیں اور ایک راز ہے خوش ہونے کا۔ ایک تو اس سے خوش ہوتے ہیں کہ الحمدللہ ہمیں لوگ اللہ تعالیٰ کا عاشق سمجھتے ہیں۔ ایک یہ کہ ضد میں دین اور پختہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً شادی کی اور بارات میں صرف چار آدمی لے گئے۔ پھر اس پر چاروں طرف سے لتاڑ پڑنا شروع ہوا تو اس سے اور بھی چڑ پیدا ہو جائے گی اور ضد میں آ کر کہے گا کہ اب کی بار اس سے بھی مختصر لو۔ اب کے تو چار آدمی بھی تھے' اب کے دیکھنا انشاء اللہ جو چار آدمی بھی ہو کر لو میرا کیا کرتے ہو' اگر لتاڑ نہ پڑے تو اتنے پختہ نہ ہوں جتنے لتاڑ میں پختہ ہو جاتے ہیں اس لیے لتاڑ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے بس تو نیک کام پر اگر لتاڑ پڑے تو خدا کا شکر کرو۔ خلاصہ یہ کہ طریق محبت ہے اصل لیکن اس کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے اس واسطے کہ اگر عمل نہ کیا تو محبت باقی نہیں رہتی بلکہ گھٹ جاتی ہے اور گھٹتے گھٹتے بالکل ہی فنا ہو جاتی ہے (جیسے چراغ میں اگر تیل ڈالنا چھوڑ دیں تو لو کم ہوتی چلی جائے گی اور رفتہ رفتہ چراغ گل ہو جائے گا) چنانچہ اسی طریق محبت کی طرف اشارہ ہے آیت کے اس جزو میں **"یحبھم و یحبونہ"** یعنی وہ لوگ ایسے ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ محبت کریں گے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے' آگے ان کی علامت مذکور ہے کہ وہ کیسے ہیں۔ وہ ایسے ہیں **"اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ"**

یعنی اللہ کے ماننے والوں کے سامنے تو نرم ہیں کیونکہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کے متعلقین سے بھی محبت ہوتی ہے اور اللہ کے مخالفین کے سامنے سخت ہیں۔ یعنی فقط یہی نہیں کہ ان سے محبت اور میل جول نہیں بلکہ ان سے اعراض ہے اور انکے ساتھ سختی کا برتاؤ ہے۔ محبت کا تو یہی مقتضا ہے کہ محبوب کے مخالفین سے اعراض ہو۔ صاحب یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب کی نافرمانی کرنے والوں سے بھی محبت ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

لَاتَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْا اٰبَاءَ هُمْ اَوْ اَبْنَائَهُمْ اَوْاِخْوَانَهُمْ اَوْعَشِيْرَتَهُمْ اُوْلٰئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُوْلٰئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.

آپ نہ پاویں گے ان لوگوں کو جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہوں کہ وہ دوستی کریں اللہ رسول کے مخالفوں کے ساتھ چاہے وہ ان کے باپ ہوں یا اولاد ہوں یا بھائی ہوں یا چاہے ان کا کنبہ ہی کیوں نہ ہو؛ ان سب کو مخاطب کر کے صاف کہہ دیا

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد　　فدائے یک تن بیگانہ کا شنا باشد

(ہزار رشتہ دار جو خدا تعالیٰ سے بے تعلق ہوں اس ایک بیگانہ شخص پر قربان جو خدا کا دیوانہ ہے)

صاف کہہ دیا کہ سن لو صاحب ہم میں تم میں میل نہیں۔ ہمارا تمہارا مذہبی اختلاف ہے ہم سے تم سے کوئی تعلق نہیں، بس معاف کرو۔ خیر اگر اتنی ہمت نہ ہو تو کم از کم محبت اور دوستی تو نہ ہو۔ مثلاً میل جول شادیوں میں شرکت وغیرہ اور بات ہے مصرعہ مل گئے صاحب سلامت ہوگئی۔ حدیث شریف میں بھی اہل باطل کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنے کا حکم ہے۔ ارشاد ہے: "لاتصلوا علی جنازتھم ولا تصودوھم"[1] یعنی اگر بیمار پڑیں تو جا کر ان کی عیادت مت کرو اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازہ کی نماز مت پڑھو۔ اگر مخالفین حق سے قطع تعلق ہی ہو گیا تو ہو جانے دو؛ آخر یہ علاقے کیا کام آئیں گے بلکہ ان علاقوں کے تو قطع ہو جانے پر حق سبحانہ تعالیٰ ایسی ایسی بشارتیں دے رہیں۔ فرماتے ہیں: "اُولٰئِكَ كَتَبَ

[1] لم اجد الحديث في موسوعة اطراف الحديث النبوي الشريف

فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ'' یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان کو راسخ کر دیا ہے آگے سبحان اللہ کیا وعدہ ہے ''وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ'' یعنی خدا نے مدد دی ان کو ایک روح کے ساتھ وہ روح کیا ہے نسبت باطنی خدا کے ساتھ۔ اس سے ایسی قوت قلب میں پیدا ہوتی ہے کہ اگر سارا عالم بھی مخالف ہو جائے تو بھی کچھ پروا نہیں ہوتی۔ تعلق مع اللہ سے ایک نور قلب میں پیدا ہوتا ہے اس نور کو روح اس لیے کہہ دیا کہ اس سے قلب میں حیات پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق بڑھتا ہے کہ بس یہ شان ہو جاتی ہے۔

موحد چہ بر پائے ریزی زرش　　چہ شمشیر ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکس　　ہمین است بنیاد توحید وبس

(موحد کے قدموں پر سونا نچھاور کر دیا اس کے سر پر ہندی تلوار رکھ دو امید و خوف اس کو کسی سے نہ ہوگا بس توحید کی بنیاد یہی ہے)

اور بھی بشارت سنئے ''وَیُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا'' یعنی ان کو ایسی جنتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور اس سے بھی بڑی نعمت یہ ہوگی: ''رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ'' خدا ان سے راضی ہوگا اور وہ خدا سے راضی ہوں گے۔ پھر فرماتے ہیں: ''اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰهِ'' یہ خدا کی جماعت ہے یہ خدائی پارٹی ہے۔ ''اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' اور سن لو کہ خدا ہی کی پارٹی کے لوگ فلاح پانے والے ہیں تو حضرت اب کیا تو برادری اور کیا رشتہ داری دور دور کی۔ کہتے ہیں کہ صاحب برادری کو تو چھوڑا نہیں جاتا کیا کریں، بہت اچھا صاحب برادری کو نہیں چھوڑا جاتا تو پھر اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دو کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک دل میں اللہ بھی ہو اللہ کا مخالف بھی، تو حضرت نماز روزہ تو ہے مگر محبت نہیں جس کے آثار آگے مذکور ہیں۔

محبت کا اظہار

یہ آثار مسلمانوں میں کم ہیں، الا ماشاء اللہ محبت کے آثار یہ ہیں: ''اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ'' اللہ والوں کے ساتھ نرم ہیں اور اللہ کے مخالفوں کے ساتھ سخت ہیں۔ ایک تو یہ آثار ہیں دوسرے آثار کیا ہیں۔ یہ ہیں ''یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ'' بڑی محنت کے عمل کرتے ہیں۔ دیکھئے محبت کے آثار میں سے عمل بھی ہے اور صاحب کیوں نہ ہو اگر محبت ہو

تو وہ ظاہر کیوں نہ ہوگی۔ (بقول شخصے ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو) میں بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر کہیں تمہارا محبوب مدتوں کے بعد ترستے ترستے تم کو مل جائے تو بھائی ایمان سے کہو تمہارا کیا جی چاہے گا' کیا جی نہ چاہے گا کہ اس کو فوراً سلام کریں اور دوڑ کر اس کے پاس پہنچیں اور جا کر اس سے لپٹ جائیں اور کیا مزے لے لے کر اس سے گفتگو نہ کرو گے اور کیا زبان سے یہ نہ کہو گے کہ اللہ کا شکر ہے مدتوں کی آرزو پوری ہوئی اور کیا دعائیں نہ دو گے کہ خدا عمر دراز کرے اور زیادہ ہمت ہوئی تو کیا اس کی جوتیاں بھی ہاتھ میں لے لے کر سر آنکھوں پر نہ رکھو گے اور کیا اس کے تلووں سے آنکھیں نہ ملو گے۔ غرض کیا کیا نہیں کرو گے' اگر اس سے محبت ہے' اور ایک عاشق ایسا ہے کہ معشوق ملا اور یہ منہ پھیر کر بیٹھ گئے کسی نے پوچھا یہ کیا' کہا تم کیا جانو ہم اہل باطن ہیں ہمارے باطن میں محبت بھری ہوئی ہے' ہمارا باطن لبریز ہے محبت سے مگر اظہار کی ضرورت نہیں' بھائی دنیا میں کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کو محبت ہے بلکہ ہر شخص یہ کہے گا اور بالکل سچ کہے گا کہ جھوٹا ہے مکار ہے۔

تعصی الالہ وانت تظہر حبہ   هذا العمر فی الفعال بدیع
لوکان حبک صادقا لاطعتہ   ان المحب لمن یحب یطیع

(ترجمہ) نافرمانی کرتا ہے تو خدا کی اور ظاہر کرتا ہے اسکی محبت کو یہ قسم ہے میری جان کی کہ عجیب بات ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ محبّ جس سے محبت کرتا ہے اس کا مطیع ہوتا ہے تو صاحبو! ایسے شخص کو بھلا کوئی بھی عاشق کہے گا جو کوئی سنے گا یہی کہے گا کہ واہ صاحب اچھے عاشق ہیں اور اچھی محبت ہے کہ معشوق نے پکارا تھا' بولے ہی نہیں' بلایا تھا گئے ہی نہیں' یہ شخص ہرگز عاشق نہیں جھوٹا ہے' نالائق ہے خواہ مخواہ شیخی بگھارتا ہے' کیا عاشق ایسے ہی ہوتے ہیں' اجی حضرت یہ تو بڑی بات ہے کہ کہنا نہ مانا اہل صدق نے تو ذرا سی بات سے عاشق کو اہل وفا کے زمرہ سے خارج کر دیا ہے۔ چنانچہ کسی ہوسناک کا شعر ہے:

اس کے کوچہ سے جب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں   وہ ہوسناک ہیں جو رو بقضا جاتے ہیں

جو عاشق ہوگا وہ کوچہ محبوب سے اٹھ کر ہی کیوں جائے گا۔ محبوب ہی اٹھ کر چلا جائے تو یہ دوسری بات ہے۔ تو دیکھئے اس کو بھی خلاف محبت کہا ہے۔

عشق الٰہی کا دعویٰ

اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تو دعویٰ اور حال یہ کہ جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اقیموا الصّلوٰۃ" نماز پڑھوتو آپ کہتے ہیں نہیں صاحب میں تونہیں پڑھتا۔ جب زکوٰۃ کا حکم دیتے ہیں تو کہتے ہیں میں نہیں دیتا۔ جب روزہ کے لیے کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں میں نہیں رکھتا۔ اسی طرح جب خلاف شرع لباس' شرک سے' بدعت سے منع کیا جاتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ نہیں صاحب میں تونہیں مانتا اور کہنے کو اللہ کے عاشق ہیں' زبان پر ہے ہائے اللہ ہائے اللہ۔ یہ اچھے عاشق ہیں صاحب میں کہتا ہوں کہ جیسے مخلوق کی محبت تھی کہ محبوب کو دیکھتے ہی رہ نہ سکا' بدون ہاتھ پاؤں چومے بدون لپٹے' بدون قدموں پر گرے' بدون تلوے چاٹے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جانے سے' گر پڑنے سے تعریف کرنے سے کیسے رہا گیا۔ اگر محبت ہوتی تو تعظیم کے کلمات بھی کیوں نہ زبان سے نکلتے' جھک بھی کیوں نہ جاتا' سجدہ میں بھی کیوں نہ گر پڑتا' اسی کا تو نام نماز ہے' تو نماز پڑھتے نہیں اور اللہ کے عاشق ہیں اچھے عاشق ہیں' کوئی شعر سنا تھا یا گانا بجانا سنا تھا' اس پر کودنے لگے' بس عاشق ہیں' اگر یہی ہے تو پھر سانپ بھی اولیاء اللہ ہیں کیونکہ جب بین کی آواز سنتے ہیں تو وہ بھی مست ہوجاتے ہیں' آدمی کیا بہت سے جانور بھی گانے بجانے پر عاشق ہیں۔ بھلا یہ کوئی محبت ہے' محبت تو وہ چیز ہے کہ خدا کی قسم نہ گانے کی ضرورت نہ بجانے کی ضرورت اور بے چین ہیں۔

کسانیکہ یزداں پرستی کنند   بر آواز دولاب مستی کنند

(جولوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں وہ رہٹ کی آواز پر مستی کرتے ہیں)

بلکہ اس کی بھی ضرورت نہیں ان کی تو ہر وقت یہ شان ہے۔

خوشاوقت شوریدگان غمش   اگر ریش بینند دگر مرہمش
دمادم شراب الم درکشند   اگر تلخ بینند درکشند
گدایانے از بادشاہی نفور   بامیدش اندر گدائی صبور

(اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر غم دیکھتے ہیں تو اس پر مرہم رکھتے ہیں' ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں' جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں' ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں)

حضرت ان کے سر پر ہر وقت ارے چلتے ہیں ان کی حالت کی دوسرے کو کیا خبر۔ کسی نے خوب کہا ہے:

اے ترا خارے بپا شکستہ کے دانی کہ چیست　　حال شیرا نے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(اے تیرے پاؤں میں تو کانٹا نہیں لگا تو ان شیروں کا حال کیا جانے جن کے سروں پر مصیبت کی تلوار پڑی ہے)

کسی کو کچھ خبر نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے وہاں تو ہر وقت یہ حالت ہے

کشتگان خنجر تسلیم را　　ہر زماں از غیب جانے دیگر است

(مقتولان خنجر تسلیم تو ہر گھڑی یاد خدا میں لذت محسوس کرتے ہیں)

ان کی حالت تو یہ ہے کہ ان سے ذرا برابر نافرمانی نہیں ہوتی۔ حضرت عاشق اور محبت تو یہ ہے اسی واسطے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ یعنی صرف عمل نہیں بلکہ سخت سے سخت محنت کے کام کرتے ہیں۔ پھر ایسوں کو بھلا کہاں بھوک پیاس' کہاں چین' آرام' کہاں حظوظ ولذائذ کا اہتمام' کہاں مرغن کھانوں کی رغبت ہاں خدا دے تو کھا بھی لیتے ہیں مگر اہتمام نہیں نہ ان چیزوں سے ان کو دلچسپی بلکہ ان کا مذہب یہ ہوتا ہے:

عاقبت سازو ترا ازدیں بری　　ایں تن آرائی واین تن پروری

(تیرا بدن سجانا اور تن پروری آخر کار تجھ کو دین سے دور کر دے گا)

وہ تو ان سب خرافات سے یکسو ہو چکے ہیں اور ہر وقت خدا جانے کس شغل میں ہیں چونکہ وہ اہل محبت ہیں اس واسطے سخت سے سخت کام بھی کر لیتے ہیں' مشکل سے مشکل کام بھی ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے تو دیکھئے خود حق تعالیٰ کے ارشاد "يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" سے معلوم ہوا کہ محبت کے واسطے عمل معاف نہیں بلکہ اس پر اور زیادہ محنت پڑتی ہے۔ نیز محبت کے آثار میں سے یہ بھی ہے کہ "لَا يَخَافُوْنَ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ" یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی کی ملامت سے نہیں کرتے' کوئی کچھ کہے پروا نہیں کرتے۔ اپنے کام میں مشغول ہیں کوئی کچھ ہی کہا کرے ذرہ برابر التفات نہیں کرتے۔ آگے فرماتے ہیں:

"ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَاءُ" یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں "وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ" اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں چاہیں تو سب کو یہ نعمت عطا فرمادیں مگر وہ علیم بھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ کون دینے کے قابل ہے کون نہیں، جو مانگتا ہے اسی کو دیتے ہیں کسی کے سر نہیں منڈتے' یہ ہے آیت کا ترجمہ اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ کن لوگوں کی مدح اور مدح کا کیا حاصل ہے۔ مدح کا حاصل یہ ہے کہ خدا سے کامل محبت رکھتے ہیں خدمت اور طاعت میں پوری مشقت اٹھاتے ہیں اور کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ بس اسی شان کے شخص کو قلندر کہتے ہیں اور یہی معنی قلندر کے حضرت عراقی کے اس شعر میں ہیں:

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی　　　که دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے مرشد مجھ کو تو طریق جذب کا رستہ دکھلا دے کیونکہ محنت و ریاضت کا معاملہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے)

تو گویا عراقی کا شعر خلاصہ ہے قرآن مجید کی آیت کا اور قرآن مجید کی آیت تفصیل ہے عراقی کے قول کی۔ پس قلندر وہ ہے جس میں عمل اور محبت دونوں جمع ہوں اور جس کی یہ شان ہو۔

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق　　　ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

(ایک ہاتھ میں شریعت کا جام دوسرے ہاتھ میں عشق کا ہتھوڑا ہر بوالہوس جام اور سنداں سے کھیلنا نہیں جانتا)

اور رہ پارسائی وہ ہے جس میں نرا عمل ہو بلا محبت

قلندرانہ طریق عمل

اب میں صرف پانچ منٹ اور بیان کرونگا پھر ختم کر دوں گا چونکہ بہت دیر ہوگئی ہے نیت تو یہیں ختم کر دینے کی تھی لیکن اصل مقصود بیان کرنے سے رہ گیا ہے یعنی رہ قلندر کی حقیقت تو بیان ہو چکی مگر اس کا طریق عمل بیان کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ محض حقیقت کا حال معلوم ہو جانا عمل کے لیے کافی نہیں۔ لہٰذا رہ قلندر کی تحصیل کا طریق بھی بیان کرتا ہوں اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایسا طریق ہے جو محبت اور عمل دونوں کا جامع ہے۔ پس ان دونوں چیزوں کی تحصیل کا طریق معلوم ہونا چاہیے۔ سو عمل کے متعلق تو خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمت

کرو عمل ہو جائے گا۔ پس اس کا یہی طریق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ محبت کیونکر پیدا ہو تو لیجئے میں اس کا ایک نسخہ لاکھوں روپیہ کا مفت بتائے دیتا ہوں' وہ نسخہ مرکب ہے چند اجزاء سے اور وہ سب چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔ غور سے سنئے وہ چند چیزیں ہیں۔ سب سے اول عمل کیونکہ میں اول ہی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ عمل میں خاصیت ہے محبت پیدا کر دینے کی اور اس کو بہت بڑا دخل ہے محبت پیدا کرنے میں چاہے تجربہ کر لو' روز روز کسی کے پاس جایا کرو' دیکھو محبت ہو جاوے گی۔ پہلے تھوڑی ہوگی پھر جاتے جاتے ایسا تعلق ہو جاوے گا کہ بہت ہی زیادہ غرض یہ مسلم امر ہے کہ میل جول جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی زیادہ محبت ہوگی۔ وہ جو کہتے ہیں پالے کی محبت اس کی یہی تو اصل ہے غرض نیک عمل میں یہ برکت ہے کہ اس سے محبت حق پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم تو مدت سے نیک عمل کر رہے ہیں مگر محبت پیدا نہیں ہوئی' جواب یہ ہے کہ نیک عمل کے مفہوم میں ایک یہ ہی نہیں کہ بس عمل کر لیا بلکہ وہ مرکب ہے اور اجزاء سے بھی' ایک جزو تو عمل کرنا ہے دوسرا جز یہ ہے کہ عمل کو اس کے طریق کے مطابق کیا جائے۔ مثلاً صرف ٹکریں مارنے کو نماز نہیں کہتے' نیک عمل جس طرح کیا جاتا ہے اور جو اس کا مامور بہ طریق ہے اس طریق سے اس کو کرو پھر دیکھو محبت کیسے نہیں پیدا ہوتی۔ تیسری وجہ اثر نہ ہونے کی یہ ہے کہ تم عمل کو صرف عادت سمجھ کر کیا' اس نیت سے نہیں کیا کہ اللہ کی محبت بڑھ جاوے۔ عمل میں یہ نیت نہیں کہ اے اللہ آپ کی محبت پیدا ہو جائے' سو اس نیت سے عمل کرو پھر دیکھو انشاء اللہ کیسا اثر ہوتا ہے۔ بہر حال ایک جزو تو اس نسخہ کا یہ ہے کہ نیک عمل میں بہ نیت ازدیاد محبت استقامت کے ساتھ مشغول ہو۔

اہل محبت کی صحبت

دوسری بات ضروری یہ ہے کہ اللہ کا نام لو جی لگا کہ یعنی تھوڑا اللہ اللہ بھی کرو۔ تیسری بات یہ ہے اور یہ بہت ضروری ہے کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کرو۔ اس سے لوگ بھاگتے ہیں اول تو اس طرف توجہ ہی نہیں کہ کسی بزرگ کی خدمت میں جا کر رہیں۔ بس تھوڑی سی کتابیں پڑھ لیں اور سمجھ لیا کہ ہم کامل مکمل ہو گئے۔ بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل مکمل ہوا ہے۔ ہاں تو مکمل تو ہو گئے یعنی کمبل پوش باقی نہ کامل ہوئے نہ مکمل۔ ارے بھائی موٹی بات ہے کہ بلا بڑھئی کے

پاس بیٹھے کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا۔ حتیٰ کہ اگر بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لیکر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جا سکے گا' بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی کے پکڑنے کا انداز بھی نہیں آتا' بلا خوشنویس کے پاس بیٹھے ہوئے اور بلا قلم کی گرفت اور خط کی کشش کو دیکھتے ہوئے ہرگز خوشنویس نہیں ہو سکتا' غرض بدوں صحبت کامل کے کوئی کام نہیں بن سکتا۔ لہٰذا پیر کامل کی صحبت لازمی ہے پھر تو ایسا ہوتا ہے کہ کبھی مرید پیر سے بھی بڑھ جاتا ہے مگر ابتداء میں تو کسی شیخ کامل کی صحبت کے بغیر چارہ نہیں اور آج کل اسی کی ضرورت کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اصلاح

کبھی کسی مصلح کے پاس گئے بھی تو وہاں تو ہوتی ہے اصلاح پہنچتے ہی لتاڑ پڑنا شروع ہوگئی۔ تو اب یہ حضرت گھبرائے کہ میاں کس مصیبت میں آ پھنسے' ہم تو آئے تھے بزرگ سمجھ کر انہوں نے لتاڑنا ہی شروع کیا' یہ کیسے بزرگ ہیں' یہ کیسے اللہ والے ہیں' اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی معدہ کا مریض طبیب کے پاس جا کر کہے کہ دیکھو جی ہم اپنے گھر حلوے کھایا کرتے تھے حلوے ہی ہمارے لیے تجویز کرنا۔ ذرا حماقت تو دیکھئے حالانکہ خدا کے فضل سے آپ کو دست بھی ہو رہے ہیں معدہ بھی خراب ہے' ہضم بھی درست نہیں یہ تو حضرت کی حالت اور حلوے کی فرمائش طبیب بھلا اس کی کیوں رعایت کرتا اس نے اس کی حالت کے مناسب کڑوا مسہل تجویز کیا اور جب اس نے پینے سے انکار کیا اور تین پانچ کی تو گرا کر زبردستی چمچوں کے ذریعے سے پلا دیا لیکن اس نے قصداً قے کر کے سارے پئے ہوئے مسہل کو پیٹ سے نکال دیا۔ آپ قے کرتے جاتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ واہ جی ہم تو اپنے گھر میں حلوے کھایا کرتے تھے حکیم جی نے نہ جانے کیا الا بلا پلا دی' کاش کوئی خیر خواہی سے کہتا کہ ارے بیوقوف تو کیا سمجھے تجھے جو وہ اس وقت کڑوا مسہل پلا رہا ہے تو تیرے ساتھ وہ دشمنی نہیں کر رہا ہے بلکہ دراصل وہ تجھے حلوے کھانے کے قابل بنا رہا ہے۔ ابھی تیرا معدہ حلوے کے قابل نہیں ایسی ہی حالت میں حلوہ کھانے سے تو تجھے دست ہو رہے ہیں تو حضرت اصلاح تو اصلاح ہی کے طریقہ سے ہوتی ہے۔ مولانا نے مثنوی میں اسی مضمون کو ایک حکایت کے ضمن میں لکھا ہے۔ حکایت یہ لکھی ہے کہ ایک قزوینی نے ایک دلاک سے کہا کہ تم میرے شانہ پر ایک تصویر شیر کی گود دو۔ چنانچہ اس نے گودنا شروع

کیا اور سوئی لے کر کچ سے کر دیا۔ قزوینی کو جو تکلیف ہوئی تو ہائے واویلا کرنے لگا اور کہنے لگا کہ ارے میاں یہ کیا کر رہے ہو اس نے کہا کہ کر کیا رہے ہوں شیر کی شکل بنا رہا ہوں۔ پوچھا کس عضو سے شروع کیا ہے کونسی چیز بنا رہے ہو۔ کہا دم کی طرف سے شروع کیا ہے دم بنا رہا ہوں کہا میاں اس شیر کے لیے دم کیا ضرورت ہے بے دم ہی کا سہی۔ اجی چھوڑو بھی اس دم کو میرا تو اس نے دم ہی نکال دیا' پھر اس نے دوسری طرف سے شروع کیا' پھر کچ سے سوئی چبھوئی' پھر وہ چیخنے چلانے لگا اور پھر پوچھا اب کونسا عضو بنا رہے ہو کہا اب کی دفعہ کان بنا رہا ہوں' وہ بولا کہ ارے میاں بعضے شیر بوچے بھی تو ہوتے ہیں' کان بھی چھوڑ دو' بوچا ہی شیر سہی پھر تیسری جگہ سوئی لگائی تو پھر چلانے لگا اور پوچھنے لگا کہ بھائی اب کیا بنا رہے ہو' کہا پیٹ' کہا میاں تم بھی عجب آدمی ہو اجی وہ سسرا کھائے پئے گا تھوڑا ہی جو پیٹ بنا رہے ہو' یہ بھی رہنے دو' اب تو دلاک کو بڑا غصہ آیا' سوئی اٹھا کر زمین پر پھینک دی اور جھلا کر کہا

شیر بے گوش و سر وا شکم کہ دید ... ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

میاں ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا جس کے نہ سر ہو نہ کان نہ پیٹ' پھر مولانا اس سے نتیجہ نکالتے ہیں اور فرماتے ہیں:

چوں ندادی طاقت سوزن زدن ... از چنیں شیر ژیاں پس دم مزن

(جب تو سوئی چبھونے کی طاقت نہیں رکھتا تو شیر کا نام نہ لے)

تم تو شیخ کے پاس اصلاح کی غرض سے آئے ہو تو اس کی سختی اور لتاڑ کو برداشت کرو اور اگر قزوینی کی طرح سومن کی برداشت نہیں ہے تو شیر کا نام ہی مت لو۔ اصلاح کی درخواست ہی نہ کرو۔ بھائی وہاں تو اصلاح اصلاح ہی کے طریقہ سے ہوگی' پھوڑا لے کر گئے ہو تو نشتر لگے ہی گا' اب وہاں تو نشتر لگانا ضروری اور یہاں یہ حال

تو بیک زخمے گریزانی زعشق ... تو بجز نامے چہ می دانی زعشق

(تو تو عشق کے زخم سے ہی بھاگتا ہے تو نے عشق کے نام کے سوا دیکھا ہی کیا ہے)

بس نام ہی نام ہے عشق کا' ایک ہی زخم لگا تھا کہ بھاگے وہاں تو ادب یہ ہے کہ

چوں گزیدی پیر نازک دل مباش ... سست دریزندہ چو آب وگل مباش

در بہ ہر زخمے تو پر کینہ شوی ... پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

(جب تو بھاگے پیر نازک دل نہ بن' پانی اور مٹی کی طرح سست اور گرنے والا نہ بن' اگر ہر زخم پر بغض اور کینہ دل میں رکھنے لگے گا تو کیسے بغیر پالش کے آئینہ بن جائے گا)

یہ مصیبت ہوگئی ہے تو حضرت نرا وظیفہ اصلاح کے لیے ہرگز کافی نہیں۔ نرے وظیفے والے پیروں سے واللہ ثم واللہ جو کبھی اصلاح ہو۔ اصلاح تو ہوتی ہے اصلاح کے طریقے سے تو اہل محبت کے پاس جاؤ اور وہ جو کہیں وہ کرو' تھوڑے دنوں میں دل نور سے معمور ہو جائے گا اور خدا کی قسم اس قدر محفوظ ہو گے کہ تمہاری نظر میں پھر سلطنت کی بھی کچھ حقیقت اور وقعت نہ رہے گی۔ (حضرت حافظ فرماتے ہیں)

چو بیخود گشت حافظ کے شمارد ‏ بیک جو مملکت کاوس کے را

(جب حافظ بے خود ہو گیا ایک جو کے برابر بھی کیکاوس کی حکومت کو کب شمار کر سکتا ہے)

نتیجہ

جناب میرے پاس قسم سے زیادہ کوئی ذریعہ یقین دلانے کا نہیں' اے صاحب مکرر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو اس طریق سے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کر لے گا وہ ایسا ہو جائے گا کہ پھر اس کو نہ موت کا خوف ہوگا نہ ذات الجنب کا نہ نمونیا کا۔ نہ بخار کا نہ قحط کا' نہ وباء کا' کوئی غم نہ رہے گا۔ بس بالکل جنت کی سی حالت ہو جائے گی' ہاں غم ہوگا تو ایک کہ اللہ تعالیٰ تو ناراض نہیں' خدا کے نزدیک میں کیسا ہوں' نہ جانے وہ مجھ سے راضی ہیں یا ناراض۔ بس اس غم کے سوا اور کوئی غم نہ ہوگا مگر یہ غم ایسا لذیذ ہے کہ ہزاروں خوشیاں اس پر نثار۔ اس شخص سے اگر کوئی کہنے لگے کہ لاؤ تمہارا یہ غم تو ہم لے لیں اور اس کے عوض اپنی ساری خوشیاں تمہیں دے دیں تو کبھی نہ بدلے گا۔ تو حضرت یہ دولت ملے گی اہل اللہ کے پاس جانے اور ان کا اتباع کرنے سے تو حاصل طریق کا یہ ہے کہ اعمال میں ہمت کر کے شریعت کے پابند رہو ظاہراً و باطناً اور اللہ اللہ کرو اور کبھی کبھی اہل اللہ کی صحبت میں جایا کرو اور ان کی غیبت میں جو کتابیں وہ بتائیں ان کو پڑھا کرو' لو جی یہ چار چیزیں ہیں۔ میں ٹھیکہ لیتا ہوں کہ جو ان چار پر عمل کر کے دکھلاوے گا وہ "**یحبھم ویحبونہ**" کا مصداق یعنی اللہ تعالیٰ کا محبوب اور محبّ ہو جاوے گا ضرور ہو جاوے گا' ضرور ہو جاوے گا' ضرور بالضرور ہو جاوے گا۔ لو صاحب

اب اختیار ہے جو چاہے عمل کر کے دیکھ لے اور تجربہ کر لے اور اس کی ضرورت نہیں کہ مرید ہو جاوے' اجی کس کی پیری مریدی لیے پھرتے ہو یہ پکھنڈ ہے۔ بیعت کی صورت ضرورت نہیں اصل چیز بیعت کی روح یعنی اتباع ہے جیسے طبیب سے رجوع کرتے وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ تحقیق نیت کرتا ہوں میں کہ آج سے بناؤں گا تم کو طبیب اپنا اللہ اکبر۔ اسی طرح اس کی کیا ضرورت ہے کہ پیر کہے کہ میں نے تمہیں مرید کیا اور مرید کہے میں نے تمہیں پیر بنایا' اس پٹہ اور قبولیت کی ضرورت ہی کیا ہے اگر پکے کاشت کار ہوں گے اور طریقہ سے کاشتکاری کرو گے تو بلا پٹہ وقبولیت کے بھی غلہ پیدا ہوگا۔ غرض مرید ہونے کی ضرورت نہیں' پیر کیمطابق کام شروع کر دو' بس ہو گیا تعلق۔ واللہ وہی نفع ہوگا جو پیری مریدی میں ہوتا ہے' اب لوگوں کا عجب حال ہے کہ کام بتاؤ تو نہ کریں بس بیعت کا نام کرنا چاہتے ہیں۔ بیعت کیا ہے محض رسم ہی رسم رہ گئی ہے۔ چنانچہ جو پیر ایسے ہیں کہ مرید تو کر لیتے ہیں لیکن کام کچھ نہیں بتلاتے ان سے تو لوگ بہت خوش ہیں اور میں مرید تو کرتا نہیں لیکن کام بتلاتا ہوں تو مجھ سے ناراض ہیں۔ یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ جو بھید ہیں فقیری کے وہ جو انچھر ہیں' پریم کے وہ مریدوں ہی کو بتائے جاتے ہیں۔ یہ خیال ہے کہ مرید کرتے ہی پیر بس پریم کے وہ انچھر بتادے گا اور اللہ والے ہو جائیں گے' دھرے تھے انچھر دھرے تھے بھید ڈلے پتھر۔ میاں خدا رسول کا نام لو اور احکام بجالاؤ بس یہی انچھر ہیں۔ اصلاح نفس کے طریقے پیر سے پوچھو یہی بھید ہیں اگر کوئی کہے کہ کیا باطنی طریق بس یہی ہے تو ہم بہ آواز دہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے اور اس طریق میں کبھی بڑے بڑے حالات بھی پیش آئیں گے' بڑی بڑی کیفیت بھی طاری ہوں گی یہ سب ہوگا مگر یہ مقصود نہیں ہے' بھائی حالات تو سڑک کے درخت ہیں' پھولوں کے نظر آئے تو کیا نہ نظر آئے تو کیا سڑک تو بہر حال قطع ہوگی۔ درختوں اور پھولوں کا نظر آنا نہ آنا سڑک کے قطع ہونے کے لیے ضروری نہیں' نظر پڑیں گے' تب قطع ہوگی' نہ نظر پڑیں گے تب قطع بس چلتے رہنا شرط ہے اور بعضوں کو یہ درخت اور پھول عمر بھر بھی نظر نہیں آتے' واللہ جن حالات کو آپ بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ طریق میں بس ایسے ہیں جیسے سڑک پر دو طرفہ درخت لگے ہوں' گلاب اور بیلے کے' کبھی نظر نیچی کر کے چلتے ہیں تو کیا قطع نہیں ہوتا' راستہ تو برابر قطع ہوتا ہے چاہے درخت نظر پڑیں یا نہ پڑیں۔ افسوس ہے

تصوف کا ناس کر دیا ہے ان جاہل صوفیوں نے اور فقیری کو ہوا بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ چلے کھینچو، بیوی کو طلاق دے دو، اولاد کو عاق کر دو، دروازہ کو تیغا کر دو، چالیس چنے رکھ لو اور ایک چنا روز کھاؤ، بدون اس کے اصل فقیری ملتی ہی نہیں، میں کہتا ہوں واللہ دو شالوں میں گدے تکیوں میں سلطنت میں، مرغن کھانوں میں فقیری ملتی ہے مگر گھر میں نہیں شیخ کامل کی خدمت میں ملتی ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمتہ اللہ علیہ جن کی شان اتنی بڑی ہے کہ مولانا روم جیسے عارف کی ان کے بارے میں یہ رائے ہے:

ہفت شہر عشق را عطار گشت ماہنوز اندرخم یک کوچہ ایم

(عطار نے عشق کے سات شہروں کی سیر کی ہے ہم تو ابھی عشق کے ایک کوچہ ہی کے پیچ وخم میں چل پھر رہے ہیں)

وہ فرماتے ہیں:

گرہوائے ایں سفر داری دلا دامن رہبر بگیر و بس بیا
درارادت باش صادق اے فرید تابیابی گنج عرفاں راکلید
بے رفیقے ہر کہ در راہ عشق عمر بگذشت وشد آگاہ عشق

(اے دل اگر اس محبت کے سفر کو طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو کسی رہبر کامل کے دامن کو مضبوط پکڑے چلا آ، اے فرید حسن عقیدت وارادت کا دامن کبھی نہ چھوڑنا چاہیے تاکہ تجھ کو گنج معرفت کی کنجی حاصل ہو، بلا مرشد کے جس نے طریق عشق میں قدم رکھا اس نے عمر ضائع کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا)

شیخ کامل

مگر شیخ ہونا چاہیے کامل اور کامل شیخ کی پہچان یہ ہے کہ شریعت کا پورا متبع ہو، بدعت اور شرک سے محفوظ ہو، کوئی جہل کی بات نہ کرتا ہو، اس کی صحبت میں بیٹھنے کا یہ اثر ہو کہ دنیا کی محبت گھٹتی جائے اور حق تعالیٰ کی محبت بڑھتی جائے اور جو مرض باطنی بیان کرو اس کو بہت توجہ سے سن کر اس کا علاج تجویز کرے اور جو علاج تجویز کرے اس علاج سے دمبدم نفع ہوتا چلا جائے اور اس کے اتباع کی بدولت روز بروز حالت درست ہوتی چلی جائے۔ یہ علامت ہے شیخ کامل کی،

ایسا شخص اگر مل جائے تو وہ اکسیر اعظم ہے تو یہ ہے طریقہ محبت پیدا کرنے کا' اس سے تو ہوگی محبت آگے رہا عمل تو اسکے لیے ضرورت ہوگی ہمت کی' اب ایک اور غلطی میں لوگ مبتلا ہیں کہ پیر بنا کر اس کو پلہ دار اور ذمہ دار اعمال کا سمجھتے ہیں۔ اس میں ان کا قصور نہیں کیونکہ ان کو بہکایا ہے دکانداروں نے۔ چنانچہ ایک گاؤں میں ایک پیر صاحب آیا جایا کرتے تھے' ایک بار آئے تو کچھ دبلے ہو رہے تھے' گھر پر مرغن کھانے نہ ملے ہوں گے۔ ایک چوہدری نے جو مرید تھا دیکھ کر کہا کہ اے پیر یہ کیا بات ہے' توں (یعنی تو) دبلا بہت ہو رہا ہے' اب کیا تھا انہیں موقع مل گیا' کہا چوہدری جی دبلا نہ ہوں تو کیا ہوں' تمہاری طرف سے کام بھی تو مجھے بہت کرنے پڑتے ہیں' تم نماز نہیں پڑھتے' تمہاری طرف سے مجھے نماز پڑھنی پڑتی ہے' تم روزے نہیں رکھتے تمہاری طرف سے مجھے روزے رکھنے پڑتے ہیں اور سب سے مشکل کام یہ ہے کہ تمہاری طرف سے مجھے پل صراط پر چلنا پڑتا ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ بس اسی فکر میں جان سوکھی جاتی ہے۔ اب تو معلوم ہو گیا کہ کیوں دبلا ہو رہا ہوں' ان ہی وجہوں سے دبلا ہو گیا۔ یہ سن کر چوہدری کو بڑا رحم آیا' کہنے لگا وہ وہ (کلمہ تاسف) ارے پیر تجھے تو بڑے کام کرنے پڑیں ہیں' تیرے اوپر تو بڑی محنت پڑے ہے' جا میں نے تجھے اپنا مونجی کا کھیت دیا۔ پیر صاحب نے سوچا کہ یہ گاؤں کے لوگ ہیں ان کا کیا اعتبار ہے ابھی چل کر کھیت پر قبضہ کر لینا چاہیے ورنہ ممکن ہے بعد کو رائے بدل جائے فوراً کہا کہ چوہدری جی میں نے تمہارا کھیت کبھی دیکھا نہیں چل کے مجھے دکھا دو اور قبضہ کرا دو' اس نے کہا چل' اب پیر صاحب تو آگے آگے اور مرید صاحب پیچھے پیچھے کھیتوں میں راستہ نہیں ہوتا' پتلی پتلی ڈولیں ہوتی ہیں۔ خاص طور سے مونجی اور دھان کے کھیتوں کی ڈول بہت اونچی اور پتلی ہوتی ہے اور کھیتوں میں پانی بھرا رہتا ہے اور یہ دونوں بھی ایک پتلی سی ڈول پر سے گزر رہے تھے' دفعتاً پیر صاحب کا پیر پھسلا اور دھڑام سے نیچے آ رہے کیونکہ پانی کی وجہ سے مٹی بھی چکنی ہو رہی تھی' چوہدری نے کود کر اوپر سے ایک لات رسید کی اور کہا کہ تو تو کہے گا کہ میں پل صراط پر چلتا ہوں جو بال سے بھی باریک ہے تو بالکل جھوٹا ہے ایک بالشت چوڑی میڈ پر تو تجھ سے چلا ہی نہ گیا' بال سے باریک پل صراط پر تو تو ضرور چلتا ہوگا' جا میں کھیت نہیں دیتا' میں نے تو پل صراط کے بدلے دینا تھا' اب کیوں دوں' جا میں اب نہیں دیتا' کھیت کا کھیت بیچارے کے ہاتھ سے گیا' پانی میں جدا گرا اور اوپر سے لات پڑی سو

الگ تو جناب ان جاہلوں کو ایسے دُکانداروں نے یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ تمہیں کچھ عمل کرنے کی ضرورت نہیں سب ہمیں کرلیں گے۔ بس اب وہ سچے پیروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ چنانچہ میرے پاس خطوط آتے ہیں کہ صاحب تہجد کے لیے آنکھ نہیں کھلتی دعا کردو کہ آنکھ کھلا کرے، میں لکھ دیتا ہوں کہ اچھا میں اس شرط پر دعا کروں گا کہ آپ میرے لیے یہ دعا کردیجئے کہ میری ایسی ٹانگیں ہوجائیں کہ میں روز کلکتہ پہنچ کر اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو اٹھا دیا کروں، بیوقوف ہوئے ہو، اگر آنکھ نہیں کھلتی تو میں کیا کروں، میاں اٹھوں کسی طرح اور اگر کسی طرح نہیں اٹھا جاتا تو عشاء کے بعد ہی تہجد کی رکعتیں پڑھ لیا کرو، غرض ہر چیز کا علاج ہے۔

توجہ کی حقیقت

بعضے کہتے ہیں کہ وظیفہ پورا نہیں ہوتا کوئی ایسی توجہ دیجئے کہ وظیفہ پورا ہوجایا کرے، پس سارے کام توجہ ہی سے چلانا چاہتے ہیں، لاؤ میں توجہ کی حقیقت ظاہر کردوں۔ صاحبو! کہیں دوسروں کی توجہ سے بھی کام چلتا ہے جب تک کہ خود توجہ نہ کرے اور ہمت سے کام نہ لے سارا کام ہمت پر موقوف ہے۔ بیوقوف یوں سمجھتے ہیں کہ بس سب کچھ پیروں کے ہاتھ میں ہے، پیر تو بیچارے کیا چیز ہیں خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوطالب کے لیے بہت چاہا کہ مسلمان ہوجائیں مگر ہدایت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا آپ کو ارشاد ہوا: ''اِنَّکَ لَاتَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ'' یعنی آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کرسکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔ لیجئے جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی اپنی توجہ سے ہدایت نہ کرسکے تو پیر بیچارے تو کیا کرتے۔ دیکھا آپ نے اب صاحبو! آپ کی توجہ کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ پھر ایک اور غضب یہ ہے کہ دین تو دین دنیا کے کام بھی پیر ہی کے سپرد کیے جاتے ہیں۔ ایک صاحب نے مجھے خط لکھا کہ یہاں اتنے آدمی اب تک طاعون میں مرچکے ہیں، خیر جو مرچکے وہ تو مرچکے اب جو زندہ ہیں ان کی خیریت چاہیے، ایسی دعا کیجئے کہ وہ نہ مریں۔ میں نے لکھا کہ حضور آپ کو تو ماشاء اللہ وہاں کی انسپکٹری مل گئی ہے جو وہاں کے انتظامات کی فکر ہے لیکن مجھے ابھی ٹھیکیداری نہیں ملی تم تو انسپکٹر ہوگئے ہو مگر میں تو ٹھیکیدار نہیں ہوا۔ یہ درخواست تو ایسی ہے کہ گویا حوالات سے اتنے مجرم تو بھاگ گئے بقیہ کا میں پہرہ

دوں۔ سو مجھے اس چوکیداری سے معاف کیجئے۔ اس قسم کی حماقتیں کرتے ہیں نعوذ باللہ شرک میں مبتلا ہو گئے لوگ۔ غرض یہاں تو جو کچھ حاصل ہوتا ہے اور تم چاہتے ہو کہ کچھ کرنا نہ پڑے پیر کی توجہ ہی سے سب کام بن جائیں اور کمال حاصل ہو جائے۔ ارے بھائی جن سے یہ درخواست ہے پہلے ان سے تو تحقیق کر لو کہ انہیں جو کمال حاصل ہوا ہے وہ کاہے سے حاصل ہوا ہے۔ حضرت چکی پینے سے پہلے چکی پیسی' پھر آٹا نکل آیا' پھر پانی ڈال کر آٹا گوندھا' پھر روٹی بنا کر توے پر ڈالی پھر وہ پک گئی پھر کھالی۔ اب تو چاہتے ہو کہ کرنا تو کچھ نہ پڑے اور پیٹ بھر جائے۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی' دو شخص ہم سفر تھے' کسی مقام پر روٹی پکانے کے لیے ٹھہرے' تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ آٹا تو میں لے آؤں گا لکڑی تم لے آؤ' اس نے کہا بھائی مجھ سے تو نہیں اٹھا جاتا' میں تو بہت تھک گیا ہوں تمہیں دونوں چیزیں لے آنا' خیر وہ آٹا بھی لے آیا' لکڑی بھی لے آیا' پھر اس نے کہا کہ میں آگ جلاؤں تو آٹا گوندھ لو' کہا اجی صاحب معلوم نہیں پتلا ہو جائے سخت ہو جائے پھر تم خفا ہونے لگو' بس تمہیں گوندھ' بیچارے نے آٹا بھی گوندھ لیا' پھر اس نے کہا کہ تم توے پر روٹی ڈالتے جاؤ' میں سینکتا جاؤں' کہا میں نے تو بھائی کبھی روٹی پکائی نہیں' کچی رہ جاوے' جل جائے تمہیں اچھی پکاؤ گے خیر اس نے روٹی بھی پکالی' جب سب ہو ہوا چکا اور روٹی پک پکا کر تیار ہو گئی تو اس نے ساتھی سے کہا کہ آؤ روٹی تیار ہے کھاؤ' کہنے لگا بھائی تمہارے خلاف کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی اب کہاں تک خلاف کروں اور کب تک انکار کرتا ہوں' شرم آتی ہے' اچھا لاؤ کھالوں' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' بس احسان جتا کر کھانے بیٹھ گئے' خیر غنیمت ہے ایک بات تو مانی تو اب تم بھی چاہتے ہو کہ ایسا پیر ملے جو پکی پکائی کھلا دے لیکن ایسا نہ ہو گا۔

ایں خیال است و محال ست و جنوں

(یہ خیال ہے اور ناممکن ہے اور دیوانہ پن ہے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو پکی پکائی کھلائی ہی نہیں اور کسی کی تو کیا ہستی ہے اور کیا مجال ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو غایت شفقت سے بہت چاہتے تھے کہ پکی پکائی ہی کھلا دیں مگر غیرت حق اور مصلحت دین کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت نہ دی تو بھائی خوب سمجھ لو کہ کام کرنے ہی سے کام چلے گا بس طریق یہی ہے کہ کام کرو اور محنت کرو'

خدا برکت دے گا' اگر کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ کام کرو اور محنت کرو جیسا کہ "يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں) سے میں ثابت کر چکا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو پیر ایسا کامل مکمل ہو اور جس میں مذکورہ علامتیں ہوں اس کی خدمت میں رجوع کرو لیکن بیعت پر اصرار نہ کرو' درخواست پر اگر وہ کرلے اس کی عنایت ہے باقی تم اس کو دق نہ کرو پھر جو وہ کہے کرو' اگر محنت کراوے محنت کرو' ذکر و شغل کراوے ذکر شغل کرو' غرض اس کی فکر میں لگ جاؤ کہ کسی کامل مکمل کی صحبت میں میسر آئے۔ اب آخر میں یہ عرض ہے کہ مقصود میں کوتاہی کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو عمل میں کوتاہی کرتے ہیں ان کو چاہیے کہ اپنے قصد کو پختہ کریں اور ہمت سے کام لیں' دوسرے وہ ہیں جن میں محبت کی کمی ہے۔ وہ اہل محبت کی صحبت اختیار کریں۔ غرض یہ دونوں چیزیں لازم طریق ہیں ایک عمل دوسری محبت اول میں ہمت کی ضرورت ہے۔ دوسرے میں اہل اللہ کی صحبت اور ان کے اتباع کی اس سے ان صفات کے جامع اور ان ثمرات کے مستحق ہو جاؤ گے جو اس وقت بہ ضمن آیت قرآن بالتفصیل بیان کیے گئے جو کچھ مجھے کہنا تھا میں کہہ چکا اب میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام اس کی خصوصیات کے لحاظ سے جو کہ ظاہر ہیں طریق القلندر رکھتا ہوں۔ اس نام میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قلندر کے متعلق چونکہ عموماً لوگ بہت غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اس نام کو سن کر یا دیکھ کر بے اختیار ان کو اشتیاق ہوگا کہ لاؤ دیکھیں اس وعظ میں طریق قلندر کی کیا حقیقت بیان کی گئی ہے اور جب دیکھیں گے تو عمر بھر کے لیے ساری غلط فہمیوں سے محفوظ ہو جائیں گے اور حضرت حافظ کے ان اشعار کی حقیقت کی تحقیق اور حقیقت کی تصدیق ہو جاوے گی۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ۔۔۔ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک تر زمو اینجاست ۔۔۔ نہ کہ سر بتراشد قلندری داند

(جو شخص بھی چہرہ آراستہ کرے یہ لازم نہیں کہ دلبری جانتا ہو جو شخص آئینہ بناتا ہو یہ لازم نہیں کہ سکندری جانتا ہو' اس جگہ ہزاروں باریکیاں بال سے زیادہ باریک جو شخص بھی سر منڈا لے ضروری نہیں کہ قلندری بھی جانتا ہو)

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائیں اور قلندر کی جو صفت اس وقت کتاب و

سنت اور اقوال مشائخ دائمہ طریق سے بیان کی گئی ہے اس کا پورا پورا مصداق بنائیں اور ہر قسم کی گمراہی اور کجی سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھیں چونکہ یہ بیان حضرت قلندر رحمتہ اللہ علیہ کے مزار مبارک کے قریب ہوا ہے جس میں حضرت کا روحانی فیض شامل ہونا بھی بعید نہیں اس لیے میں اس کا ثواب حضرت کی روح مبارک کو پہنچاتا ہوں۔ (پھر سارے مجمع نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور بعد دعا حضرت نے فرمایا کہ مصافحہ سے معافی چاہتا ہوں، مجھ کو بھی تکلیف ہوگی اور سب کو تکلیف ہوگی، گیارہ بج چکے ہیں رات زیادہ ہوگئی سب صاحب آرام فرمائیں۔ فقط)

تواضع کی حقیقت اور ضرورت اور فوائد ہم لوگوں میں کبر کا مرض عام ہے۔ ہر انسان میں اس کا مادہ اور اکثر میں اس کا اثر بھی موجود ہے۔ بعض تو علم کے ساتھ بھی گمراہ ہیں۔ فقہاء اور صوفیاء یہ دو جماعتیں دین کی حق شناس ہیں۔ آج کل کی معاشرت کی بناء کبر پر ہے۔ فیشن پرستی اسلام سے بہت دور ہے۔ غصہ کا نتیجہ ظلم ہے۔ انتقام سے عفو بہتر ہے۔ بلا محبت حق کے تقویٰ کا کچھ اعتبار نہیں۔ تواضع کبر کی ضد ہے۔ حدیث میں دنیا و آخرت کی قید نہیں بلکہ اللہ کے واسطے تواضع اختیار کرنے سے دونوں جگہ ہی انشاء اللہ رفعت حاصل ہوگی۔

اوج قنوج

تواضع کی حقیقت ضرورت اور فوائد کے متعلق یہ وعظ قنوج کی جامع مسجد میں ۳ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ بروز جمعۃ المبارک ہوا ۲ گھنٹے ۲۲ منٹ میں ختم ہوا۔

حکیم محمد مصطفیٰ صاحب مقیم میرٹھ نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّم اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم فقدقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ بِہٖ.[1]

ترجمہ: ارشادفرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوشخص اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور بلندی عطا فرماتے ہیں۔

تمہید

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جوشخص اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ رفعت و بلندی عطا فرماتا ہے میرا ارادہ بیان وعظ کا نہ تھا اس سفر میں کئی جگہ فرمائش کی گئی ہے مگر جواب نفی میں دیا گیا یہ سفر اسی ضرورت سے کیا ہے کہ طبیعت عرصہ سے مضمحل ہے وطن میں رہ کر فراغ ملنا مشکل تھا اس واسطے یہ سفر کیا تا کہ کاموں سے فراغ رہے اور راحت ملے اور وعظ کہنے میں تعب ہوتا ہے جو مقصود سفر کے خلاف ہے مگر مجھے پہلے سے احتمال تھا کہ قنوج میں ضرور استدعا کی جائے گی لیکن غالب یہی ارادہ تھا کہ بیان نہ کروں گا۔ جیسا اس سفر میں اور کہیں بھی بیان نہیں ہوا اور رات نیند بھی خراب رہی اس وجہ

---

[1] کنز العمال: ۵۷۳۰، مشکوۃ المصابیح: ۵۱۱۹، مجمع الزوائد ۸: ۸۲

سے بھی طبیعت مضمحل ہے پھر کوئی مضمون بھی ذہن میں حاضر نہ تھا یہ تو عذر تھا مگر میرے بھائی اختر نے لوگوں کی طرف سے خواہش ظاہر کی اور درخواست اس طرح کی گئی کہ اگر طبیعت متحمل ہو سکے تو کچھ بیان ہو جاوے۔ نیز مقدار وقت کو میری رائے پر چھوڑ دیا گیا' اس گنجائش دینے نے زیادہ اثر کیا اس کے بعد یہ حدیث دفعتہً قلب پر وارد ہوئی شاید منظور خدا ہو جو مضمون بے ساختہ آ گیا اور شاید وہ مضمون یہاں کے مناسب ہو۔

کبر اور اس کا علاج

یہ حدیث چھوٹی سی ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت بڑی تعلیم ترغیب کے عنوان سے ارشاد فرمائی ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا ہے اس کو حق تعالیٰ رفعت اور بلندی عطا فرماتے ہیں۔ یہ مضمون ایسا ہے کہ یہاں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت اس کی ضرورت ہے۔ یہ جگہ بھی اس کے مواقع میں سے یہی عام ضرورت اس کی یہ ہے کہ وہ امراض جو انسان سے تعلق رکھتے ہیں بہت ہیں ان سب کا بیان تفصیل کے ساتھ اس وقت تو نہیں ہو سکتا اس لیے ایک وہ مرض جو اکثر دیگر امراض کی جڑ ہے اور لوگوں میں غالب بھی ہے بیان کے لیے اختیار کیا گیا۔ اسی کا بیان اس حدیث میں ہے' وہ مرض کبر ہے جو عام طور پر سے اکثر طبیعتوں میں مرکوز ہے شاید ہی کوئی اس سے خالی ہو' ہر انسان میں اس کا مادہ اور اکثر میں اس کا اثر بھی موجود ہے کوئی عقل میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور کوئی تمول میں اور کوئی حسن میں غرض کوئی طبیعت اس سے مستثنیٰ نہیں۔ دنیاداروں کی تو کیا شکایات دیندار بھی اس سے خالی نہیں کوئی علم میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور کوئی عمل میں اکثر اہل علم کو دیکھ لیجئے کہ وہ عوام کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی عام آدمی راستے میں مل جاوے تو خود تو یہ اس کو کیا سلام کریں گے اور اگر وہ سلام کرے تو بعض اوقات جواب بھی نہیں دیتے اس کی وجہ سوا اس کے اور کیا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بڑا اور اس کو حقیر سمجھتے ہیں اور بعض کا جہل تو ایسا مرکب ہے کہ اپنی اس نامعقول حرکت پر قرآن و حدیث سے شہادت لاتے ہیں۔ مثلاً قرآن شریف میں ہے: "هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ" جس کے معنی یہ ہیں کہ عالم اور غیر عالم برابر نہیں اور

احادیث میں جا بجا علماء کی فضیلت آئی ہے اور فضیلت کے معنی یہ ہیں جو کہ دوسروں سے بڑھا ہوا ہو تو قرآن وحدیث سے جاہلوں کا چھوٹا ہونا اور ہمارا بڑا ہونا ثابت ہو گیا۔ پھر اگر ہم اپنے آپ کو بڑا سمجھیں تو کیا بے جا ہے۔ یہ ثبوت ہیں ان کے خیال خام کے ان لوگوں نے وہ آیتیں نہیں دیکھیں جن میں عالم بے عمل کی مذمت آئی ہے۔ مثلاً آیت "وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ" (اللہ تعالیٰ نے اس کو باوجود علم کے گمراہ کر دیا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ علم کے ساتھ بھی گمراہ ہیں اور احادیث میں تو بالتصریح ایسے علماء کی سخت مذمت اور ان کے سخت وعید موجود ہے جو عالم ہو کر عمل نہیں کرتے ایسی حدیثیں بہت اور ہر حدیث کی کتاب میں موجود ہیں پس جب کہ اس میں بدترین عمل موجود ہے جس کا نام تکبر ہے تو یہ عالم بے عمل کے مصداق ہوئے اور ان وعیدوں اور مذمتوں کے مورد ہوئے جو قرآن و حدیث میں موجود ہیں پھر کس بات پر پھولے ہوئے ہیں قطع نظر اس کے جن عوام کو یہ حقیر سمجھتے ہیں کیا معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کا ارادہ ان کے ساتھ کیا ہے تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد (یار کس کو چاہتا ہے اور میلان اس کا کس طرف ہوتا ہے) ممکن ہے خدا تعالیٰ ان کو تم سے بھی اچھی حالت میں پہنچا دیں اور ممکن ہے کہ تم کو مردود کر دیں اور ان کو مقبول بنا لیں، خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں، کیا خبر تمہارا خاتمہ کیسے ہو اور ان کا خاتمہ کیسا ہو۔

امید اور خوف

بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ کے یہاں کوئی قاعدہ قانون نہیں ہے یہ تو بالکل اندھیر ہے کہ کوئی اعمال صالحہ کرتا ہو اور مومن ہو اور باوجود اس کے اس اندیشہ میں رہے کہ جانے عنداللہ مقبول ہوں یا مردود اس کے تو معنی ہوئے کہ ایمان اور اعمال صالحہ بیکار چیز ہیں، کیونکہ اس کے بعد بھی نتیجہ یہی کہ ہر وقت یہ خوف لگا ہوا ہے۔ تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد۔ یہاں تک کہ یار کس کو چاہتا ہے اور اس کا میلان کس طرف ہے اسی طرح بداعمالیوں میں کچھ حرج نہیں کیونکہ بداعمالی کرنے والا بھی امید کر سکتا ہے تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد۔ یہاں تک کہ یار کس کو چاہتا ہے اور اس کا میلان کس طرف ہو جائے اس طرح تو دین کا کارخانہ ہی سب درہم برہم ہو جاتا ہے نہ وعدہ کوئی رہا نہ وعید۔

اور یہ بات نصوص کے بھی بالکل خلاف ہے۔ "وَعْدَ اللّٰهِ لَايُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ" (اللہ کا وعدہ ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ وعدہ خلاف نہیں کرتے) وغیرہ سینکڑوں آیتیں موجود ہیں جو دونوں طرف سے یقین دلانے والی ہیں نیک اعمال کرنے والے کے لیے جنت کا وعدہ ہے جو خلاف نہیں ہوسکتا اور عصاۃ وکفار کے لیے جہنم کی وعید ہے جو خلاف نہیں ہوگی پھر اس کے کیا معنی کہ نیک اعمال کر کے بھی اس اندیشہ میں رہو۔ تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد (یار کس کو چاہتا ہے اور اس کا میلان کس طرف ہوجاتا ہے) اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ قانون خداوندی میں کچھ اندھیر نہیں۔ مگر تم نے اس میں غور نہیں کیا۔ جن آیتوں میں ایمان وعمل صالح پر وعدہ ہے اس میں شرط یہ ہے کہ ایمان وعمل صالح موت تک مستمر رہے چنانچہ حدیث میں ہے: "الاعمال بالخواتیم"[1] (اعمال کا دارومدار خاتموں پر ہے) اور جن آیتوں میں کفر و معصیت پر وعید ہے اس میں بھی یہی شرط ہے کہ اسی حالت میں موت ہو تب وعید ہے چنانچہ ارشاد ہے: "فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ" (پھر کافر ہونے کی حالت میں مر جائے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہوجاتے ہیں) پس قاعدہ تو یہی ہے کہ کسی پر میلان جو میلش باشد میں مذکور ہے۔ بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ اعمال کی وجہ سے میلان ہوتا ہے اعمال صالحہ پر میلان رحمت کے ساتھ ہوتا ہے اور بداعمالیوں پر نقمت کے ساتھ ہوتا ہے اور یہی حاصل ہے ان نصوص کا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کے لیے اعتقاد رکھنا چاہیے جنت کا اور کافر کے لیے اعتقاد رکھنا چاہیے دوزخ کا۔

توفیق اور سلب کا اختیار

یہ بات تو یقینی ہے کہ عمل صالح پر نتیجہ اچھا مرتب ہوگا اور برا نتیجہ نہ ہوگا اور بداعمالی پر نتیجہ برا مرتب ہوگا' اچھا مرتب نہ ہوگا لیکن ایمان وعمل صالح استمرار ودوام الی الموت کی ایک شرط ایسی ہے جو کمر توڑ دینے والی ہے کیونکہ عمل نیک اور عمل بد گو آپ کے ارادہ پر ہے اور یہی مدار تکلیف ہے لیکن ارادہ کا پلٹ دینا حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے وہ اس پر قادر ہیں کہ ایک ایسے شخص کو جو آج کافر ہے کل کو ایسا مومن کامل کردیں کہ غوث وقطب ہوجائے اور

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی ۹: ۲۰۵' میزان الاعتدال: ۸۲۳

ایک غوث اور قطب کو دم بھر میں ایسا کافر کردیں کہ شیطان سے بھی بدتر ہو جائے خود شیطان ہی کی حالت آپ کو معلوم ہو جائے کہ داخل ملائکہ تھا (مگر حق تعالیٰ کا ارادہ اس کے خلاف تھا) اور وہ ذرا دیر میں ظہور میں آ گیا لیکن اس سے اعمال کا بیکار ہونا یا قدرت سے خارج ہونا لازم نہیں آیا کیونکہ وہ کافر کفر کی حالت میں مقبول نہیں ہوا بلکہ توفیق ایمان کے بعد مقبول ہوا اور توفیق کے بعد اس کا صدور اختیار سے ہوا اور وہ غوث وقطب ایمان وعمل صالح کی حالت میں مردود نہیں ہوا بلکہ سلب ایمان وسلب اعمال کے بعد مردود ہوا اور خذلان کے بعد اس سلب کا صدور اختیار سے ہوا۔ پس یہ بات یقینی ہے کہ بقاء ایمان کی حالت میں کوئی مردود نہیں ہوسکتا اور بقاء کفر کی حالت میں کوئی مقبول نہیں ،ہوسکتا مگر یہ بقاء انتہاء سلسلہ علل کے درجہ میں کس کے قبضہ میں ہے۔ یہ ہے اصل اس بات کی کہ بندگان خدا خوف سے کانپا کرتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ حق تعالیٰ کے وعدہ وعید پر بالکل یقین رکھتے ہیں۔ یقین تو اس بات کا رکھتے ہیں کہ اعمال پر نتیجہ مرتب کرنا وعدہ ہے جو خلاف نہیں ہوسکتا اگر اخیر تک ہم ایمان وعمل صالح پر جمے رہے تو یقیناً نجات ہے اور اگر اخیر تک کوئی کفر پر جمارہا تو یقیناً جہنم کا عذاب ہے اس کا تو پورا یقین ہے مگر کانپتے ہیں اس واسطے کہ دل حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے ارادہ کا پلٹ جانا ہر وقت ممکن ہے۔ جس کے لیے کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ایک ایسے فاعل مختار کے قبضہ میں ہے۔ جس پر کسی بات کی روک ٹوک نہیں ہوسکتی۔ ہاں وہ کریم و رحیم بھی ضرور ہے۔ جس سے بہت کچھ امیدیں ہیں۔ غالب یہی ہے کہ جو ایمان وعمل صالح کا ارادہ کرتا ہے حق تعالیٰ اس پر رحم وکرم فرماتے ہیں اور اس کو دوام واستمرار کی توفیق دیتے ہیں لیکن جس وقت نظر اس کے اختیار اور حکومت علی الاطلاق پر پڑتی ہے اس وقت سب امیدیں فراموش ہو جاتی ہیں کسی نے خوب کہا ہے:

غافل مرو کہ مرکب مرداں راہ را　　در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش　　ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند

(غافل ہو کر نہ چل اس لیے کہ مردان راہ کے گھوڑے سخت جنگل میں چلنے سے عاجز رہے ہیں' نا امید بھی مت ہو اس لیے کہ رند شرابی اچانک ایک نالہ سے منزل تک پہنچ گئے ہیں)

اور یہ صرف شاعری نہیں بلکہ ایسے واقعات ہوئے خدا تعالیٰ کی شان یہ ہے:

گنہ آمرز زرنداں قدح خوار   بطاعت گیر پیران ریاکار

(درنداں شراب خوار کے گناہ بخشنے والے ریاکار پیروں سے طاعت پر مواخذہ کرنے والے ہیں)

حق تعالیٰ کی عظمت

گوایسا کم ہوا ہے لیکن ہوا ضرور ہے کہ ایک مومن کافر اور زندیق بن گیا اور ایک کافر ملحد مشرک مومن کامل بن گیا۔ جب ایک بات ممکن الوقوع ہے گو کم ہی ہو۔ تب بھی ڈرنے کی چیز ہے لوگ کچہری میں جاتے ہیں تو ڈر معلوم ہوتا ہے کیونکہ انکو اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی پیچ ایسا نہ آن پڑے کہ قانون بھی ہمارے خلاف ہو جائے۔ اسی طرح اچھے اچھے ماہرین قانون کو یہی حاکم سے خوف ہوتا ہے حالانکہ ان کو قانون معلوم ہوتا ہے پھر حق تعالیٰ سے کیسا کچھ خوف ہونا چاہیے اس کو خود سمجھ لو کیونکہ حق تعالیٰ حاکم مطلق ہیں جن کے اوپر کوئی کسی قسم کا حاکم نہیں۔ تمہاری حالت کا بدل دینا اور قانون کو تمہارے خلاف کر دینا ہر وقت ان کے اختیار میں ہے' کاہے کا ناز اور کاہے کا انداز' ناز و انداز اس وقت تک سوجھتے ہیں جب تک حق تعالیٰ کی عظمت نظر میں نہ ہو اور اگر عظمت نظر میں ہو تو پتے پانی ہو جائیں حق تعالیٰ کی عظمت وہ چیز ہے اس کے انکشاف کے وقت عقل و ہوش سب رخصت ہو جاتے ہیں۔ سمجھنے کی بات ہے کہ ناز انداز کسی عمل ہی پر ہو سکتا ہے اور عمل کیسا ہی اعلیٰ درجہ کا ہو مگر حق تعالیٰ کی شان کے موافق نہیں ہو سکتا۔ کیا بندہ اور کیا اس کا عمل جس کو خدا کی شان کے موافق کہا جاوے نیز ناز تو مکتسب چیز پر ہو سکتا ہے اور اعمال جن پر آپ کو ناز ہے گو وہ مکتسب ہے لیکن اکتساب بھی اس کی صدور کی ایک علت ہے۔ علۃ العلل نہیں ہے بلکہ اس کی علت حقیقتاً مشیت حق ہے۔ پس چوں کہ اکتساب علۃ قریبہ ہوتی ہے اس لیے اعمال کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے مگر اس کے لیے بھی ایک دوسری شے علت ہے یعنی مشیت حق چنانچہ معلوم ہے: "وَمَاتَشَاؤُنَ اِلاَّ اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ" (اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہیں) صاحبو! ادھر کی مشیت سے سب کچھ ہوتا ہے اور آپ کو جو دخل ہے وہ برائے نام ہے ایک بزرگ کی حکایت ہے جو قابل عبرت ہے گو یہ حکایت خواص کے خطاب کے قابل تھی مگر مسلمان خواص ہی ہیں اس لیے بیان کرتا ہوں۔

امثال عبرت

حکایت یہ ہے کہ ان بزرگ نے ایک دفعہ ذکر اللہ کا ارادہ کیا تو بڑی دیر تک چاہتے رہے کہ زبان سے خدا کا نام لیں مگر زبان پر نہ آیا' حیرت کی بات ہے لوگ کہیں گے کہ کیسے ہوسکتا ہے مگر یہ حالات اہل حال پر گزرتے ہیں جن پر گزرتے ہیں وہ جانتے ہیں' دوسرے کیا جانیں۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی چیست　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

اہل حال کو سخت سے سخت حالات نا قابل برداشت پیش آتے ہیں کتنی سخت بات ہے کہ خدا تعالیٰ کا نام بھی زبان پر نہ آیا۔ اس سے جو حالت ان کے دل پر گزری ہوگی وہی جان سکتے ہیں یہ تو بہت بڑی بات ہے سالک کے قلب پر تو ذرا سا میل بھی آتا ہے وہ تو جان کھونے کو تیار ہو جاتا ہے۔

بردل سالک ہزاراں غم بود　　گرز باغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں اگر ذرہ بھر بھی اسکی باطنی حالت میں کمی ہوتی ہے)

ان کو سخت حیرت ہوئی کہ ایسا کیوں ہوا' بس یاد آ گیا کہ ایک دفعہ جوانی میں لاابالی پن سے ایک بیہودہ کلمہ زبان سے نکلا تھا جس سے توبہ نہیں کی گئی آج اس کا وبال پڑا ہے وہ حجاب ہو رہا ہے کہ کلمہ کو زبان پر نہیں آنے دیتا۔ حضرت یہ دشوار گزار گھاٹیاں حق تعالیٰ کے راستہ میں پیش آتی ہیں جو راستہ طے کرتے ہیں ان سے پوچھو مگر ہم لوگوں نے تو سہل طریقہ اختیار کیا ہے کہ اس راستہ میں قدم نہ رکھو' نہ پڑھو نہ قضا ہو' اس حکایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ جو کسی سے اعمال صالحہ کی توفیق سلب کر لیتے ہیں اس کی بھی کوئی وجہ ہوتی ہے یوں ہی بلا وجہ بے قاعدہ توفیق سلب نہیں کرتے' گو قدرت یہ بھی ہے کہ بلا وجہ بھی سلب کر لیں مگر وہ ایسا کرتے نہیں بلکہ جب کسی سے کوئی نعمت سلب ہوتی ہے اس کا سبب اس شخص کا کوئی عمل اختیاری ہوتا ہے جس کو خدا نے یاد رکھا اور بندہ نے بھلا دیا۔ بندہ نے اس کو معمولی سمجھا اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بات تھی اس لیے مواخذہ کے وقت جہل کے سبب یوں گمان کر لیا جاتا ہے کہ بلا وجہ مواخذہ ہوا اس لیے کسی گناہ کو معمولی نہ سمجھنا چاہیے اور نہ کسی سزا کو بلا وجہ سمجھنا چاہیے۔

حضرت جنید بغدادی ایک بار چلے جارہے تھے ایک مرید ساتھ تھا' راستہ میں ایک خوبصورت لڑکا عیسائی کا نظر پڑا مرید کی نظر اس پر پڑ گئی' مرید نوآموز یا ناآموز تھا' اس کو نظر بھر کر دیکھا' شیطان نے اس کو بہکا دیا کہ صنعت خدا دیکھ لے اس نے نظر کر لی پھر حضرت جنید سے کہتا ہے کہ کیا خدا تعالیٰ اس صورت کو بھی دوزخ میں ڈالے گا۔ حضرت جنید نے کہا کیا تو نے اس کو دیکھا ہے اچھا اس کا وبال سامنے آئے گا۔ اس وقت تو بات رفع دفع ہو گئی' بیس سال بعد وبال کا ظہور ہوا کہ وہ مرید قرآن بھول گیا' ہم لوگوں کی نظر ان باتوں پر کہاں پہنچ سکتی ہے ہم کسی سزا کو بیس سال کے فعل کی طرف کیسے منسوب کریں مگر یہ بات بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے ہے درحقیقت یہ سزائیں کسی عمل کی ہوتی ہیں اور یہ کوئی ضرورت نہیں کہ سزا عمل کی اسی وقت ہی مرتب ہو جائے' دیکھئے آموں کے موسم میں آم زیادہ کھائے جائیں تو اس کا اثر کئی مہینے کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ پھوڑے پھنسی زیادہ نکلتے ہیں یہاں کوئی نہیں کہتا کہ پھوڑے پھنسی آموں کا اثر نہیں اس طرح ترتب وبال میں دیر ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ کسی گزشتہ عمل کی سزا نہیں۔ یہ حضرت جنید کی حکایت تو درمیان میں آ گئی تھی میں ان بزرگ کی حکایت بیان کر رہا تھا کہ دیر تک ذکر کی توفیق نہیں ہوئی ان بزرگ کو یاد آیا کہ جوانی کے زمانہ کا ایک کلمہ بیہودہ حجاب ہو رہا ہے انہوں نے توبہ کی بس توفیق ہو گئی تو اگر کوئی نیک عمل کرتا ہے یا زبان سے ذکر کرتا ہے وہ محض خدا کی نعمت ہے اس پر ناز کیسا۔ وہ تو خدا ہی کی رحمت ہے تم نے کیا کیا۔

علم پر ناز

اگر کسی کو علم پر ناز ہو تو سن لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر تو کسی کو علم عطا نہیں ہوا۔ حق تعالیٰ آپ کو ارشاد فرماتے ہیں: "وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ" یعنی اگر ہم چاہیں تو وہ تمام علوم جو آپ کو دیئے ہیں دفعۃً سلب کر لیں۔ "ثُمَّ لَاتَجِدُ لَکَ بِهٖ عَلَیْنَا وَکِیْلاً" یعنی پھر کوئی آپ کا کارساز بھی نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے کتنا ہولناک خطاب ہے۔ آپ ڈر ہی تو گئے ہوں گے اور تعجب نہیں کہ یاس کی نوبت آ جاتی اس واسطے حق تعالیٰ نے یہ جز و بڑھا دیا۔ "اِلَّا رَحْمَةً مِنْ رَّبِّکَ" یعنی بس رحمت خدا ہی ساتھ دے سکتی ہے اور کوئی ساتھ نہیں دے سکتا۔ ان الفاظ کے جوڑ سے پتہ چلتا ہے اس حالت کا جو اس آیت

کے اترنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر گزری ہوگی کہ اتنے لفظ پر بھی اکتفا نہیں کیا گیا "اِلَّا رَحْمَةً مِنْ رَّبِّکَ" کیونکہ اس سے اتنا معلوم ہوا کہ رحمت دستگیری کر سکتی ہے مگر اس کا وقوع ہوگا یا نہیں اس لفظ سے اس کا اطمینان نہیں ہوتا اس واسطے ایک جملہ اور بڑھا دیا۔ "اِنَّ فَضْلَهٗ کَانَ عَلَیْکَ کَبِیْرًا" یعنی چونکہ خدا تعالیٰ کا فضل آپ کے شامل حال ہے اس لیے بالفعل رحمت آپ کی دستگیر ہے۔ آپ کسی طرح کا اضطراب نہ کریں بس اس لفظ سے یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اطمینان ہوگیا کہ ایسا واقعہ نہ ہوگا کہ علوم سلب کر لیے جائیں۔ صرف اظہار قدرت اور تصحیح عقیدہ کے لیے ایسا فرمایا گیا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ گفتگو ہے۔ تا بدیگراں چہ رسد دوسروں کی تو کیا حقیقت ہے ہم کو ذرا ہوش سنبھالنے کی ضرورت ہے کسی کو علم پر ناز ہے تو حماقت ہے۔ عمل پر ناز ہے تو حماقت ہے۔ ان میں سے کوئی جز بھی اس درجہ میں مکتسب نہیں جس پر ناز کیا جائے جس کو کوئی چیز حاصل ہے وہ سب عطائے الٰہی ہے اس کو اپنی چیز سمجھنا اور تزکیہ نفس کرنا کبر ہے اور کبر وہ عیب ہے جو گند در گند ہے اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ کبر کس درجہ بری چیز ہے مگر ہم لوگوں میں بہت کم قلوب اس سے پاک ہوں گے اس حدیث میں اسی کا علاج ہے اس وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا ایک وجہ تو یہ ہوئی اس کے اختیار کرنے کی' دوسرے یہ کہ یہ مرض عام ہونے کے ساتھ ام الامراض و بیماریوں کی جڑ بھی ہے' اکثر شدید امراض باطنی کی جڑ یہی ہے اور اکثر عیوب کا سلسلہ کبر ہی پر منتہی ہوتا ہے۔ مثلاً غصہ کہ یہ ایک بڑا مرض ہے مگر پیدا ہوتا ہے کبر ہی سے بعض وقت تو اس کا ظہور خود غصہ والے کے منہ سے ہونے لگتا ہے۔ مثلاً بد دماغ آدمی غصہ کے وقت اپنی زبان سے کہنے لگتے ہیں کہ تو نہیں جانتا ہم کون ہیں۔

انسان کی اصلیت

ایک بزرگ نے اس کا خوب جواب دیا انہوں نے ایک شخص کو ٹوکا کہ غرور سے نہ چلو وہ غصہ میں آ کر کہنے لگا "لاتدری من انا" یعنی جانتا نہیں میں کون ہوں' ان بزرگ نے کہا جانتا ہوں "**اولک نطفة نذره و اخرک جیفة قذره وانت بین ذالک تحمل العذره**" یعنی پہلے تو تو ایک پلید نطفہ تھا اور انجام کار ایک گندہ مردار ہو جائے گا اور اس کے بیچ میں یہ حالت

ہے کہ پیٹ میں نجاست کو لیے پھرتا ہے واقعی انسان کی حالت تو یہی ہے ہم ظاہر میں کیسے پاک و صاف ستھرے بنتے ہیں نہاتے ہیں دھوتے ہیں صابن ملتے ہیں عطر لگاتے ہیں اور نفیس مزاج بنتے ہیں میل کچیل سے گھن کرتے ہیں میلے کپڑے تک پہننا گوارا نہیں کرتے مگر حالت یہ ہے کہ جس چیز سے گھبراتے ہیں وہ ایک کافی مقدار میں پیٹ کے اندر ہر وقت بھری رہتی ہے کوئی تول کر دیکھے تو پانچ سیر تین سیر دو سیر پائخانہ ہر وقت پیٹ کے اندر ساتھ رہتا ہے جس چیز سے گھنیاتے ہیں وہی لادے پھرتے ہیں صاف ستھری مجلسوں میں جاتے ہیں مگر یہ تبرک ساتھ ہے آدمی ذرا غور کرے تو اس سے تمام ناز جاتا رہے یوں کہیئے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ سب کا عیب ڈھک رکھا ہے جس سے ہم ستھرے بنے پھرتے ہیں اگر پیٹ کی نالی نالی میں قوۃ ماسکہ نہ ہوتی جس سے پاخانہ رکا رہتا ہے اور خاص وقت پر نکلنے کا تقاضا ہوتا ہے اور یہ نالی ہر وقت بہا کرتی یا کم از کم اس راستہ سے اس کی بدبو ہی ہر وقت آیا کرتی تو کوئی پاس بھی نہ بیٹھنے دیتا سب صفائی اور نفاست بھول جاتے ہیں چنانچہ جن لوگوں کی یہ قوت ماسکہ کمزور ہو جاتی ہے اور ہر وقت دست بہنے لگتے ہیں تو دیکھ لیجئے ان سے کیسی نفرت کی جاتی ہے مگر حق تعالیٰ نے اپنی شان ستاری سے پیٹ کو ایسا ڈھکا ڈھول بنایا کہ کسی کو خیال بھی نہیں آتا کہ تمہارے پیٹ میں پاخانہ ہے یا کیا ہے گندہ دہنی ایک مرض ہے۔ اس میں دیکھ لیجئے کہ کوئی پاس بھی نہیں آنے دیتا جس کے نزدیک جائیں وہی نفرت ہے۔ حق تعالیٰ نے وہ حالت دکھلانے کے لیے اس قسم کے بعض امراض پیدا کرتے ہیں تاکہ ان کو دیکھ کر حق تعالیٰ کی رحمت کو یاد کر لیا کریں کہ یہ بھی ممکن تھا کہ غلاظت پیٹ میں اس طرح پر ہوتی جس کی بو آیا کرتی مگر خدا تعالیٰ نے اس کو چھپا دیا۔

امام کی خصوصیات

زمانہ طالب علمی میں ایک گندہ دہن آدمی میرے ہی پاس جماعت میں کھڑا ہوا تھا اس بھلے مانس کو بھی کچھ ضد تھی کہ جب میرے پاس کھڑا ہوتا مجھے سخت ایذا ہوتی جماعت کے خیال سے میں کھڑا رہتا مگر جان پر بن جاتی۔ دیکھئے گندہ دہنی ایسی بری چیز ہے اگر خدانخواستہ آنتوں میں سے ایسا سوراخ کھلا ہوا ہوتا جس سے بدبو آتی تو کیا حالت ہوتی کیا کرتے اس کو کس طرح بند کرتے کیا اس کے منہ کو ڈورے سے باندھا کرتے غرض اس

کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے یہاں ایک بات درمیان میں یاد آئی جو فقہاء نے بیان کی ہے واقعی دو جماعتیں حقیقت شناس ہیں دین کی صوفیاء اور فقہاء نے لکھا ہے کہ جس شخص سے جماعت کو ایذا ہو جیسے کوڑھ کا مریض یا خارش کا مریض یا گندہ دہن وغیرہ اس کو جماعت معاف ہے کیونکہ ایک کی وجہ سے دس کی جماعت جاتی ہے بعض لوگوں کو اس ایذاء پر صبر نہ ہوگا تو وہ جماعت سے بیٹھ رہیں گے۔ فقہاء نے تکثیر جماعت کو مہتم بالشان سمجھا ہے اسی تکثیر کی وجہ سے امام کی صفات لکھی ہیں ان سب کی بناء اسی پر ہے کہ جماعت میں تکثیر ہو اور نفرت نہ ہو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر علم و فضل میں چند آدمی برابر ہوں تو ایک وجہ ترجیح کی خوبصورت ہونا بھی ہے جو ان میں سب سے زیادہ خوبصورت ہو اس کو امام بنایا جائے مگر امرد نہ ہو کیونکہ امرد کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی طرف زیادہ رغبت ہوگی اور ایک وجہ ترجیح کی یہ بھی لکھی ہے کہ جو نسب میں بڑھا ہوا ہو نسب سے بھی آدمی کی عزت ہوتی ہے اور مقتدیوں کو اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں عار نہیں آتی تو اس سے تکثیر ہوگی۔ جماعت کی یہاں تک لکھا ہے کہ جس کی بیوی زیادہ خوبصورت ہو اس کو امام بنایا جائے کیونکہ ایسا آدمی عفیف زیادہ ہوگا اور غیر عفیف سے عفیف کے پیچھے جماعت زیادہ جمع ہوگی اور اس سے کوئی یہ سمجھے کہ امام صاحب کی بیوی کو جا کر جھانکا کریں تا کہ اس کا حسین ہونا معلوم ہو بلکہ یہ بات آپس میں ملنے جلنے والوں کو معلوم رہتی ہے کہ کس کے گھر کی کیا حالت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مقتدیوں کو یہ بات معلوم ہو کہ فلاں شخص کی عورت حسین ہے تو یہ بھی کسی درجہ میں وجہ ترجیح کی ہو سکتی ہے فقہاء شرعی مذاق نہایت صحیح رکھتے ہیں شریعت کی تاکیدیں جماعت کے متعلق دیکھکر تکثیر جماعت کی صورتیں تجویز فرمائی ہیں' شریعت کو تکثیر جماعت کا خاص اہتمام ہے اس لیے امام کو تطویل قرأت سے منع فرمایا ہے اور تطویل کرنے والے کو فتان فرمایا ہے تا کہ جماعت میں تقلیل نہ ہو' امام کے متعلق ان جملہ احکام کی بناء تکثیر جماعت ہی ملے گی اس طرح شریعت نے مقتدیوں میں رعایت کی ہے کہ ان باتوں سے منع کیا ہے جو تکثیر جماعت میں حارج ہوں۔ مثلاً حدیث میں ہے جو شخص لہسن کھاوے وہ مسجد میں نہ آوے کیونکہ اس سے ایذاء ہوتی ہے جو مخل فی التکثیر ہے۔ (کثرت میں خلل انداز)

حاکم کی اطاعت

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مجذوم عورت کو طواف کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا "یاامة اللّٰه اقعدی فی بیتک ولا تؤذی الناس" یعنی اے خدا کی بندی اپنے گھر بیٹھ اور لوگوں کو تکلیف مت دے وہ طوعاً کرہاً چلی گئی۔ چند سال کے بعد دیکھا گیا کہ پھر آرہی ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہو چکا تھا مگر اس کو خبر نہ تھی ایک شخص نے اس سے کہا "بشری فقد مات ذاک الرجل" یعنی اب دل کھول کر طواف کرلے کیونکہ عمر (جنہوں نے منع کیا تھا) وفات پاچکے ہیں اس نے بہت تاسف کیا اور انا للہ پڑھا اور کہا میں اب آئندہ طواف نہ کروں گی۔ اگر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ زندہ ہوتے تو طواف کرتی میں ان کو مردہ سمجھ کرنہیں آئی تھی بلکہ زندہ سمجھ کر آئی تھی، طواف کے شوق نے مجھے مجبور کیا اور میں نے جی میں کہا کہ طواف کروں گی، بہت سے بہت یہ سزا ہوجاوے گی۔ عمرؓ ایسا شخص نہ تھا کہ زندگی میں تو اس کا حکم مانا جاوے اور مرنے کے بعد نہ مانا جاوے، یہ کہہ کر چلی گئی۔ یہ تھی اطاعت حاکم کی اور یہ تھا مسلمانوں کا باہم ارتباط اور تعلق جس کی نظیر ملنا مشکل ہے حتیٰ کہ ایسے ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ بعض لشکروں کے امیر نے حکم دیا کہ سپاہی آگ میں کود پڑے اور وہ کودنے کے لیے تیار ہوئے (یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کا ہے) اس لشکر میں فقہاء صحابہ بھی تھے۔ انہوں نے ان کودنے والوں کو پکڑا اس قاعدہ کے موافق "لاطاعة للمخلوق فی معصیة الخالق"[۱] (اللہ تعالیٰ کی معصیت میں مخلوق کی طاعت منہی ہے) اور مجمع مرکب از مجاذیب و سالکین تھا پھر یہ مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سالکین مانعین کی تصویب فرمائی، غرض وہ بی بی واپس چلی گئی، تقریر اس کے متعلق تھی جس شخص کے مسجد میں جانے سے دوسروں کو ایذا ہو اس کو چاہیے کہ نماز گھر میں ادا کرے یہاں سے ایک مسئلہ اور بھی نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص مفسد ہو جس کے مسجد جانے سے بہت سوں کو تکلیف پہنچتی ہو اگر قابو چلے تو اس کو مسجد میں آنے سے روک دینا جائز ہے کیونکہ جبکہ اتنی ایذا کی وجہ سے کہ منہ

---

[۱] المصنف لابن ابی شیبة ۱۲:۵۴۶، الدرالمنثور ۲:۱۷۷

میں سے بدبو آنے سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے شریعت نے مسجد میں آنے سے روک دیا ہے تو جن سے دینی یا دنیاوی فتنہ کا اندیشہ ہو ان کی ممانعت بطریق اولیٰ نکلتی ہے یہ کلام اس پر چلا تھا کہ غصہ کی اصل تکبر ہے چنانچہ بعضوں کی زبان پر غصہ کے وقت یہ بات آجاتی ہے کہ جانتا نہیں کہ ہم کون ہیں اگر پردہ اٹھادیا جائے تو معلوم ہو ہم کون ہیں اگر یہاں پر اٹھادیں تو ساری مسجد کے آدمی بھاگتے نظر آویں۔

حکمت اور مصلحت

حق تعالیٰ نے حیات میں بھی پردہ ڈھکا رکھا ہے اور بعد ممات کے بھی کیسی ستاری کی ہے حکم دیا ہے کہ لاش نہلاؤ تاکہ کوئی گندی چیز مرض کی حالت میں لگ لگا گئی ہو جس سے لوگوں کو نفرت ہو تو وہ دھل جائے اور جنازہ کا لے چلنا ان پر بار نہ ہو اور صاف ستھرے کپڑوں میں لپیٹو اور خوشبو لگاؤ اور خوشبو میں سے بھی کافور کو اختیار کیا جو مانع تعفن بھی ہے ان سب میں یہی حکمت ہے کہ اس سے کسی کو نفرت نہ ہو اور عیوب ڈھکے رہیں۔ ایک مقتول کی لاش کی تشریح ڈاکٹر نے کی اس کے بعد اس کی تجہیز و تکفین کی گئی۔ میں بھی اس کے غسل و نماز میں شریک تھا۔ واللہ اس قدر تکلیف ہوئی ہے کہ بیان نہیں کی جاسکتی اور واجب ہونے کی وجہ سے شرکت تو کی مگر دماغ و قلب کی جو حالت تھی اس کو وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو اس وقت شریک تھے اگر ایسی حالت ہر مردہ کے ساتھ پیش آوے تو عجب نہیں کہ لوگ دفن کرنا بھی چھوڑ دیں اور ویسے بھی چھوڑ کر بھاگ جائیں اور کتے بلی اس کو خراب کرتے پھریں' اس مقتول کی حالت دیکھ کر قدر معلوم ہوئی۔ اس حدیث کی جس میں ہے کہ تین چیزوں کو مؤخر نہ کرو ایک تو ان میں سے جنازہ بھی ہے' سبحان اللہ شریعت کے کیا احکام ہیں ان ہی کی بدولت مسلمانوں کا مردہ کیسی عزت و احترام کے ساتھ جاتا ہے کہ کسی کو ذرہ بھی ناگواری نہیں ہوتی۔ اس مقتول کی لاش کا کفن دفن سب کچھ ہوا مگر کس درجہ ناگواری کے ساتھ کہ الامان الامان اس دیر نہ کرنے میں حکمت یہ بھی ہے کہ مقبول کو منزل مقصود پر جلدی پہنچاؤ اور مردود کو اپنی گردنوں سے جلدی پھینکو۔ احکام شرعی میں ایک ایک نہیں سینکڑوں حکمتیں ہیں اہل ظاہر کے لیے بھی حکمتیں ہیں اور اہل باطن کے لیے یہی حکمتیں ہیں۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد　　برنگ ارباب صورت را ببوار باب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

مردہ کو تجہیز و تکفین کے جلدی کرنے میں باطنی حکمت تو یہ ہے کہ جو ابھی مذکور ہوئی اور جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بیان فرمایا اور ظاہری حکمت یہ ہے کہ بدبو آنے سے پہلے اس کو ڈہانک دیا جائے اس کے عیب نہ کھلیں اور لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے زندوں کا نفع اور مردہ کا بھی نفع۔

تدابیر نجات

یہاں سے ایک بات اور نکلتی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ساتھ اتنی شفقت ہے کہ اتنی بات بھی گوارا نہیں کہ ہمارے دماغ سے بدبو سے تکلیف پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جسم کو جہنم میں کیسے چھوڑیں گے۔ انشاء اللہ بہت کچھ امیدیں ہیں۔

نماند بہ عصیاں کسے درگرو　　کہ دارد چنیں سید پیش رو

(جو شخص ایسا سردار پیش رو رکھتا ہو وہ گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں نہ رہے گا)

اس کے معنی یہ نہیں کہ جہنم میں جانے نہ دیں گے جس سے ہم لوگ تکیہ کر بیٹھیں کہ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سروں پر موجود ہیں' فرشتوں کے ہاتھ ہم کو چھڑا لیں گے اور عذاب نہ ہونے دیں گے بلکہ اس کا اثر یہ ہے کہ آپ نے دوزخ میں جانے کے اسباب سے منع فرمایا ہے جیسے بدبو سے بچنے کی تدبیر بتائی ہے کہ جلدی دفن کرو مردہ کو سڑنے نہیں دیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ آپ حق تعالیٰ سے دعا کر دیتے کہ مسلمانوں کا مردہ سڑا نہ کرے مگر یہ نہیں ہوا بلکہ تدبیر تعلیم فرمائیں جن کے ذریعے سے سڑنے سے حفاظت رہے اسی طرح وہ اعمال تعلیم فرمائے جن کے ذریعے دوزخ سے نجات رہے ہر تعلیم سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ ایسی شفقت ہے جیسے باپ کو بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہر موقع پر بیٹے کو وہی تدبیریں بتلاتا ہے جو اس کے نزدیک اعلیٰ سے اعلیٰ ہوں اور ذرا سی بھی تکلیف بیٹے کی نہیں دیکھ سکتا تو گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس نہیں مگر تدابیر نجات سب بتا گئے ہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت موجود نہیں۔ حالت حیات ہی کے ساتھ خاص تھی' نہیں بلکہ آپ کی شفقت

سب کو عام ہے حاضرین کو بھی غائبین کو بھی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اب تک ویسی ہی موجود ہیں اور قیامت تک رہے گی۔ یہ تو زندوں کا نفع بیان ہوا، تعجیل، تجہیز و تکفین میں اور ایک فائدہ کا بھی بیان ہوا کہ اگر مقتول ہے تو جلدی اپنے ٹھکانے پہنچا دیا جائے گا اور مردہ کا ایک نفع اور بھی ہے اور وہ ایک ذرا باریک بات ہے اس کے لیے اول ایک مقدمہ کی ضرورت ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باذن اللہ خبر دی کہ مردہ کو ایصال ثواب صدقہ خیرات وغیرہ کا ہوسکتا ہے اس طرح زندہ مردہ کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اور ایک دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ ارادہ ایصال ثواب کا جب ہوتا ہے جب مردہ سے محبت ہو اور مردہ میں تاخیر میں بدبو آ جاوے گی تو آپ کو اس سے اذیت اور نفرت ہوگی۔ پھر ہرگز ہرگز اس کے تصور کو بھی جی نہ چاہے گا ایصال ثواب تو کیسا۔ تو وہ غریب ایصال ثواب سے محروم رہے گا اس واسطے حکم دیا گیا کہ نفرت پیدا ہونے سے پہلے ہی دفن کر دو بلکہ مسلمانوں کے مردوں کو خوب دھونی دینی چاہیے، خوشبودار کافور بھی ملا جاتا ہے، کافور میں یہ بھی حکمت کہ اس سے کیڑے بھاگتے ہیں۔ اس کا خاص طور پر حکم ہے تا کہ کچھ دیر تک تو حفاظت رہے اور نظروں سے پوشیدہ ہونے کے وقت تک کوئی بات موجب نفرت نہ ہونے پائے غرض سینکڑوں مصلحتیں ہیں، جلدی دفن کرنے میں سب کی سب واقعی مصلحتیں ہیں۔ لے چلنے میں بھی جلدی کا حکم ہے اور نماز میں بھی جلدی کا حکم ہے۔ دیکھئے حق تعالیٰ نے ہماری کتنی حفاظت کی ہے اور ہمارے عیوب کس طرح ڈھانکا ہے اور زندگی میں گندگیوں کو ہمارے جسم میں اس حفاظت سے رکھا ہے کہیں کو پھوٹنے نہیں دیا اگر اتنی حفاظتیں نہ ہوں تو ہم کو اپنی حقیقت نظر آ جاوے۔ غرض یہ ہے کہ اگر اپنے یہ حالات ہم کو محفوظ رہیں تو کبھی کبر نہ آوے۔

تفکر کی ضرورت

مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگوں کو تفکر کی عادت نہیں اگر گاہ گاہ بھی غور کر لیا کریں تو یہ باتیں چھپی ہوئی یا دلیل کی محتاج نہیں بلکہ از قبیل مشاہدات ہیں جو ہر شخص کے نزدیک مسلم اور مشاہد ہیں ہاں ان کے استحضار کے لیے کچھ نہ کچھ قصد شرط ہے سو قصد کرنا چاہیے کہ اس تفکر سے اتنے بڑے مرض کا علاج ہوتا ہے جو ام الامراض ہے اور کچھ مشکل بھی نہیں نہ اس میں کچھ حرج ہوتا ہے

اور اگر اتنا سا کام اختیار و ارادہ سے کرنے میں بھی آپ کو تکلیف ہے تو میں آپ کو ایک مراقبہ بتاؤں جس کا بالاضطرار روزمرہ موقع پیش آتا ہے وہ یہ کہ پاخانہ میں ایک دفعہ ہر شخص کو جانا پڑتا ہے ذرا وہاں کی ہیئت کو خیال کیجئے کہ سب سے علیحدہ اپنے عیوب کو کھولے بیٹھے ہیں، ہیئت وہ ہے کہ کسی کے سامنے اس کے ساتھ نہیں آسکتے کام وہ ہے جس کے تصور سے بھی دل گھبراتا ہے گو کرنا ہر شخص کو روز پڑتا ہے ذرا اس ہیئت کو آئینہ سامنے رکھ کر دیکھئے۔ آپ کو خود ہی تعجب ہوگا کہ ہم چیز ہی کیا ہیں جو دوسرے وقت کہتے پھرتے ہیں کہ تم جانتے نہیں ہم کون ہیں، آپ یہ ہیں جو اس خاص حالت سے آئینہ کے اندر ہیں، پاخانہ میں بیٹھ کر اس کو سوچا کیجئے اور آج کل تو ایک مذاق یہ بھی نکلا ہوا ہے کہ پاخانہ میں بھی بے کار نہیں بیٹھتے، اخبار لے جا کر وہاں دیکھتے ہیں کیونکہ وقت بڑی فرصت کا ہے تو جب وہ وقت بھی بے کار ضائع جانا پسند نہیں تو اس کو اس مراقبہ میں صرف کرنا خلاف وضع کیوں ہے یہ بھی ایک کام ہے پاخانہ کے وقت اسی کو کر لیا کیجئے۔ ہاں جس کا یہ مذاق ہو کہ خاص خبروں ہی سے دل بہلانا چاہتا ہو تو اور بات ہے اس کو اس مراقبہ کی فرصت کہاں ہوگی یہ لوگ بھی کیا مذاق والے ہیں۔ اخبار بینی کے لیے کیسا وقت تجویز کیا ہے کہ اگر کبھی اخبار میں کوئی دلچسپ مضمون نظر پڑ گیا تو دیر سویر کا بھی خیال نہ رہے گا، گھنٹوں وہیں قید رہیں اور واقعی ان کی سزا یہی ہے کہ ایسی جگہ میں قید رہیں ورنہ قاعدہ عقلی یہ ہے۔ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ (ضروری بقدر ضرورت ہی ضروری ہے) پاخانہ میں تو صرف اتنی دیر بیٹھنا چاہیے جس میں قضائے حاجت ہو جاوے پاخانہ بھی صاف کھل کر جب ہی ہوتا ہے جب آدمی دوسرے شغل میں نہ لگے اور جب دوسرے شغل میں لگ گیا قضائے حاجت بہ تکلیف دیر ہوگی۔ یہ دیر اس شغل کی سزا ہے اور میں نے جو مراقبہ تجویز کیا ہے اس میں یہ خرابی نہیں کیونکہ اس میں تو پاخانہ کی حاجت ہی کا مراقبہ ہے اور اس کے وقت میں امتداد کا بھی احتمال نہیں کیونکہ وہ پاخانہ کے ساتھ ختم ہو جاوے گا، پاخانہ کی قید پر ایک حکایت یاد آئی، ایک عہدیدار ریل کے تیسرے درجہ میں سفر کر رہے تھے تیسرے درجے میں معمولی آدمی بیٹھتے ہیں، یہ سفید پوش آدمی تھے۔ اس واسطے سب لوگ ان کا لحاظ کرتے تھے انہوں نے بستر کھول کر تمام بنچ کو گھیر لیا اور اس روز مسافر زیادہ تھے، بہت لوگ کھڑے کھڑے جا رہے تھے یہ پیر پھیلائے مزے سے لیٹے تھے، بعض مسافروں نے خوشامد کی کہ منشی جی ذرا بیٹھ جاؤں انہوں نے ڈانٹ دیا، غرض سب کو پریشان کر رکھا تھا، خدا کی قدرت ان کو پاخانہ کی

ضرورت ہوئی اور وہ ریل کے پاخانہ میں گئے اتفاق سے ایسی صورت ہوئی کہ کوڑا بند کرنے میں چٹخنی سے باہر ایسی بند ہوئی کہ اندر سے کھل نہ سکی' اول تو انہوں نے اپنے تکبر کو نبھایا کہ خود کھٹ کھٹ کرتے رہے اور چٹخنی کے ساتھ زور لگاتے رہے مگر کہاں تک جب نہ کھلی تو آخر اندر سے آواز دی' اول سخت لہجہ میں کہا کہ ذرا چٹخنی کھول دینا' لوگوں نے آپس میں کہا کہ اب بدلہ لینے کا موقع ہے سسرے کو بند پڑا رہنے دو۔ ذرا دیر بیٹھنے کو جگہ تو ملے گی جب کسی سخت لہجہ سے نہ سنا تو انہوں نے کہا کہ کوئی صاحب چٹخنی تو کھول دے' اس پر بھی کسی نے نہ سنا تب آپ کا تکبر ٹوٹا اور خوشامد کی' غرباء رحم دل ہوتے ہیں کسی نے کہا کہ میاں کھول دو بہت دق کر لیا ہے دوسرے نے کہا کہ یوں نہیں' توبہ کرا کے کھولنا جب خوب توبہ کرالی تب کھول دی' اب تو ان کا شیطان اتر گیا اور بستر سمیٹ کر الگ بیٹھ گئے۔ وعدہ کے سچے نکلے یہ قید تو مجبوری کی تھی اور بعضے ہمارے بھائی ایسے ہیں کہ اپنے ہاتھوں پاخانہ کی قید میں بند رہتے ہیں قصداً اخباروں کو لے جاتے ہیں یہ کیا مذاق ہے خیر یہ تو مذاق تو تقلید بے جا سے حاصل ہوا ہے میں وہ کام بتاتا ہوں جو آپ کے لیے مفید ہو اور اتنے وقت کے لیے شغل بھی ہو جاوے وہ یہ کہ پاخانہ میں بیٹھ کر اپنی خوبصورتی اور شان کو ملاحظہ کیجئے یہ مراقبہ آپ کے کام کا ہے جو سامان تکبر کے ہیں وہ وہاں سب ندارد ہوتے ہیں۔ فیشن بھی ختم ہو جاتا ہے' پتلون رہے نہ لنگی وہاں تو ساری ہستی ننگی رہ جاتی ہے' آج کل تو لوگ کپڑوں سے بڑے بنتے ہیں اور پاخانہ میں اتر ہی جاتے ہیں اس وقت اپنی ہیئت کو دیکھئے کہ وہ واقعی وہ نقشہ ہے کہ بالقصد اس کو بتانا کبھی بھی کوئی گوارا نہ کرے' لباس انسان کے لیے زینت ہے وہ اترا ہوا ہے سب سے نکمی اور گندی جگہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ وہ حالت ہے کہ اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہو سکتی اور اگر مجبوری نہ ہوتی تو کوئی بھی اس کو اختیار نہ کرتا پھر ٹانگوں کے درمیان سے جس چیز کا خروج ہو رہا ہے وہ چیز ہے جس کا نام لینے سے بھی گھن آتی ہے جس سے وہ لوگ بھی گھبراتے ہیں جو اٹھاتے ہیں یعنی بھنگی۔ چنانچہ دیکھ لیجئے پاخانہ کے بعد آبدست وہ بھی لیتے ہیں گوہ میں سنا رہنا وہ بھی گوارا نہیں ان سب باتوں میں غور کیا کیجئے۔ گو یہ مراقبہ تو بڑا بے ڈھپ ہے مگر اخبار دیکھنے سے اچھا ہے کیونکہ وہ کارآمد نہیں اور یہ کارآمد ہے' ان سب باتوں کو نظر میں رکھ کر سوچئے کہ کیا میں برا ہوں کسی جاہل کا شعر ہے اللہ جسے کہتے ہیں واللہ میں ہی ہوں۔

ایک حقیقت

مولوی عبدالحق صاحب کانپور میں تھے وہ بڑے ظریف تھے۔ انہوں نے سنا تو فرمایا کہ کوئی پاخانہ میں جا کر اس ننگے کو سلام کرے کہ واہ میاں تم ہی اللہ ہو جو اس خوبصورت حال سے ہگ رہے ہو واقعی خوب جواب دیا۔ حق تعالیٰ نے نفی الوہیت مسیح پر اسی مضمون سے استدلال کیا ہے مگر اللہ اکبر قرآن کی کیا بلاغت ہے کہ نہایت پاکیزہ پیرایہ میں اس کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "**وكانا ياكلان الطعام**" یعنی مسیح اور ان کی والدہ خدا کیسے ہوتے یہ تو دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اس میں اول تو یہ بات بتلائی کہ کھانا کھانے والا بھوک سے زیادہ عاجز ہو کر غذا کا محتاج ہوتا ہے اور خدا محتاج اور عاجز نہیں ہوتا۔ دوسرے اس میں اس طرف سے بھی اشارہ ہے کہ کھانا کھانے والے کو بول و براز کی حاجت ہوتی ہے اور بول و براز کا کرنے والا خدا کیا ہوتا خدائی کی شان کے لائق یہی حرکات ہیں تو دیکھئے حاجت بول و براز کو کیسے لطیف پیرایہ میں اشارۃ ادا فرمایا' صراحتاً ذکر نہیں کیا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک عیسائی کے سامنے یہ مضمون پیش کیا تھا تو اس نے کہا کہ پیشاب پاخانہ کا نام نہ لو۔ حضرت مسیح کے ذکر میں ایسی گندگی باتیں لانا بے ادبی ہے' مولانا نے کہا پیشاب پاخانہ کا نام بے ادبی ہے تو بول و براز سہی الفاظ کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ اس حقیقت کا وجود الوہیت کے منافی ہے غرض پاخانہ میں بیٹھ کر اصلی حالت انسان کی کھل جاتی ہے اس وقت اپنے آپ کو دیکھ کر سمجھ جاؤ کہ ہم کیا چیز ہیں جو شخص دن رات میں دو تین مرتبہ نجاست میں آلودہ ہوتا ہے تو وہ کیا بڑا ہو سکتا ہے صفائی ستھرائی بھی جو کچھ نظر آتی ہے وہ بھی حق تعالیٰ کی ایک کارسازی ہے کہ پانی جیسی ایک ایسی چیز پیدا کر دی ہے جس سے گندگی کا ازالہ کر لیا جاتا ہے اگر پانی نہ ہو تو ہر وقت سنے ہی رہیں۔ اس وقت بڑائی معلوم ہو اب تو یہ ہے کہ پاخانہ میں تھوڑی دیر رہنا پڑتا ہے سب سے علیحدہ ہو کر جو کچھ گت بن گئی پھر پانی سے صاف ہو کر آ بیٹھے اگر نجاست دور کرنے کی کوئی ترکیب نہ ہو تو بدبو ہر وقت آیا کرتی اس وقت یہ بات خوب پھبتی کہ جانتا نہیں کہ ہم کون ہیں اگر چہ اس زمانہ میں سنا رہنا ہی بعض لوگوں کے نزدیک معیوب نہیں جو لوگ فیشن کے دلدادہ ہیں ان کو دیکھ لیجئے۔

فیشن پرستی

فیشن ایک عجیب بلا ہے جو آدمی کو اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے بعض لوگوں کو تو اس میں شغف ہے کہ دن بھر اور رات بھر ان کو فیشن بنانے سے فرصت نہیں ایک صاحب دیکھا کہ دن بھر فیشن ہی بناتے پاخانہ جانے کے کپڑے الگ تھے اور ملاقات کے کپڑے الگ تھے اور گھر میں بیٹھنے کے کپڑے الگ تھے کام پر جانے کے کپڑے الگ تھے ہر وقت کپڑے بدلنے میں رہتے تھے۔ پاخانہ جانے کی وردی عجیب تھی ان کو دیکھ کر مجھے بڑا رحم آتا کہ کس بیگار میں پکڑے ہوئے ہیں۔ ایک واقعہ یہ ہوا کہ جہاں میرا قیام تھا اس کے سامنے ایک ایسے شخص بھی ٹھہرے ہوئے تھے مجھ سے وہ ان ہی قیود کی وجہ سے کئی دن تک نہ مل سکے میں بیٹھا بیٹھا یہ تماشا دیکھا کرتا۔

صاحب! یہ کیا تہذیب ہے اور یہ کیسی زندگی ہے تقلید نے ایسا اندھا کیوں کر دیا ہمارے پاس کیا نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سب کچھ سکھا دیا۔ افسوس ہے کہ اس کو چھوڑ کر ان خرافات میں پڑ گئے۔ یہ لوگ اس قدر تو صاف ستھرے بنتے ہیں کہ پاخانہ جانے کے کپڑے الگ تک ہوتے ہیں لیکن ان کی صفائی کی حقیقت سنئے کہ پاخانہ میں سے اخبار وخبار سے پونچھ کر آ جاتے ہیں اول تو اس سے صفائی ایسی نہیں ہوتی جیسی ڈھیلے سے ہو سکتی ہے کیونکہ ڈھیلے میں قوت جاذبہ ہے اور کاغذ میں یہ بات نہیں ایک تو فیشن کی یہی غلطی لیجئے۔ اگر بجائے کاغذ کے کپڑا ہی اختیار کرتے تب بھی کچھ عقل کی بات تھی، کاغذ کا اختیار کرنا تو صریحاً بیوقوفی ہے کیونکہ کاغذ سے نجاست کی صفائی نہیں ہو سکتی پھر طرہ یہ کہ اس کے بعد پانی سے استنجا کرتے نہیں ہاں یہ صفائی بہت ہے کہ نہاتے روزمرہ ہیں اب اس صفائی کی حقیقت دیکھئے اس نہانے سے نہ نہانا اچھا تھا کیونکہ پہلے تو نجاست ایک ہی جگہ لگی ہوئی تھی اب سارا بدن اس میں سن گیا کیونکہ یہ لوگ ٹب میں بیٹھ کر نہاتے ہیں جس میں جسم سے پانی انفصال نہیں ہوتا اور مقام استنجا پہلے ہی سے دونوں جگہ سے ناپاک ہے تو ٹب میں بیٹھتے ہی وہ نجاست ساری پانی میں پھیل جاتی ہے جس سے وہ پانی سب ناپاک ہو گیا اسی کو اٹھا کر بدن پر ڈالتے ہیں حتیٰ کہ منہ میں بھی اسی کو لیتے ہیں اور اس سے کلی کرتے ہیں اس کے تصور سے بھی گھن آتی ہے یہ آج کل کا تمدن اور تہذیب ہے اور اسی کا نام صفائی "انا للّٰہ وانا الیہ راجعون"

بے حسی کی انتہا

خدا جانے حس کہاں گئی اگر کسی سے یوں کہہ دو کہ تم گوہ موت کھاتے ہو تو وہ لڑ پڑے اور فوجداری ہو جائے مگر کیا یہ گوہ موت کھانا نہیں ہے جب گوہ موت میں ملا ہوا پانی منہ میں چلا گیا تو گوہ موت کھانا اور کس کو کہتے ہیں۔ افسوس پاخانہ میں بھی دوسروں کی تقلید کرتے ہیں اور تعجب یہ ہے کہ پوری تقلید بھی نہیں کیونکہ وہ تو ان افعال کے کرنے میں اس بات کے پابند نہیں کہ دوسروں کی دیکھا دیکھی کوئی کام کرنے لگیں اور تم اس کے پابند ہو پوری تقلید تو جب ہوتی ہے کہ تم بھی ان کی طرح آزاد ہوتے اور بدون کسی کے دیکھا دیکھی کے ایسا کرتے مگر ان لوگوں نے تو ایسی آنکھیں بند کر کے تقلید کی ہے کہ اس چیز کے کھانے پینے کی نوبت آ گئی جس کے نام سے بھی آدمی گھنیاتا ہے نہا کر تولیے سے بدن پوچھتے ہیں اور اسی تولیہ سے کھانے کے بعد منہ پوچھتے ہیں۔ صاحبو! تعجب ہے آپ کو گھن نہیں آتی' دیکھنے میں تو صفائی کی یہ حد ہے کہ چینی کے برتنوں میں پاخانہ پھرتے ہیں اور ڈھکا رہتا ہے تا کہ بدبو نہ پھیلے اور بدبو سے بھی نفرت ہے لیکن تعجب ہے کہ ٹب میں نہاتے ہوئے جب نجاست پھیلتی ہے تو عین اس شے سے آپ کو نفرت نہیں۔ افسوس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ کر کن گندیوں میں جا پھنسے ذرا ان صفائی کے طریقوں اور طریقہ سنت کو ملا کر تو دیکھئے اصل یہ ہے کہ سنت سے انحراف کی سزا یہی ہے کہ جس غرض سے انحراف کیا تھا یعنی صفائی وہ بھی نصیب نہ ہوئی بلکہ اس کی ضد یعنی گندگی میں پڑ گئے' بعض خدمت گاروں سے تحقیق ہوا کہ چونکہ یہ لوگ، کاغذ سے استنجا کرتے ہیں جس میں قوت جاذبہ نہیں اس لیے ان کی پتلونوں میں پاخانہ سنا ملتا ہے' افسوس فیشن ایبل لوگ عام طور سے اس میں مبتلا ہیں افسوس مسلمانوں نے سب چیزیں اپنے یہاں کی چھوڑ دیں اور دوسروں کی اختیار کر لیں اور ہیں مسلمان اگر اسی کا نام اسلام ہے تو یہ وہ اسلام ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے "قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (آپ فرما دیجئے کہ یہ افعال بہت برے ہیں جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے اگر تم اب بھی اہل ایمان ہو) کیوں صاحبو! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی یہی اسلام تھا (نعوذ باللہ) کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی معاشرت تعلیم کی تھی' اسلام نے تو اس کی جڑ کاٹ دی تھی اور وہ کبر ہے اس تقلید کی اصل

یہی ہے کہ بڑا بننے کے لیے بڑوں کی معاشرت ہر کام میں اختیار کی جاتی ہے محض ان کی ریس کرتے ہیں حتیٰ کہ ہگتے اور موتتے بھی ہیں۔ ان ہی کی طرح تاکہ جیسے وہ بڑے ہیں یہ بھی بڑے کہلائیں اور شریعت اسلامی میں بڑا بننے کی گنجائش ہی نہیں۔ شرعی اصول سے معلوم ہوتا ہے کہ کبر اور ایمان گویا دو متضاد چیزیں ہیں جب اس تقلید متکبرین کی شریعت نے جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ جس پر یہ سب متفرع ہیں پھر ہم کو فرداً فرداً ایک ایک فرع پر کلام کرنا بے کار ہے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ معاشرت کی تبدیلی درحقیقت اسلام سے کس قدر دور ہے اور یہ درحقیقت اس چیز کا شعبہ ہے جو اسلام اور ایمان کے گویا مقابل ہے یعنی کبر یہ ام الامراض ایسا عام ہوا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ بھی اس سے خالی نہیں گو بعض آحاد خالی ہوں یہ وہ مرض ہے کہ تمام بڑے چھوٹے امراض اسی کے بچے ہیں۔

غصہ اور اس کے مضرات

اسی کبر سے غصہ پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ آدمی کو ہوش نہیں رہتا اور وہ مرض جو دل میں تھا، زبان پر آ جاتا ہے جیسا کہ اس شخص نے کہا تھا کہ جانتا نہیں کہ ہم کون ہیں، دیکھئے بعض وقت وہ مرض اتنا بڑھ جاتا ہے کہ دل میں سما نہیں سکتا اور ابل کر زبان تک نوبت آ جاتی ہے یہ بات اس شخص نے ضرور کبر سے کہی ہوگی کیونکہ ایسے شخص سے کہی جس کو اپنے آپ سے چھوٹا سمجھا، کوئی یہ نہ سمجھے کہ غصہ میں ہوش نہیں رہا تھا اور یہ بات بیہوشی کے اندر منہ سے نکل گئی کیونکہ اگر وہ مخاطب کو بڑا سمجھتا تو کبھی یہ بات منہ سے نہ نکلتی۔ مشہور ہے کہ غصہ عقلمند ہے چھوٹے پر ہی آتا ہے اور یہ واقعی بات ہے حضرت بڑے کی بات پر ناگواری تو ہو سکتی ہے جبکہ اس سے کوئی بات اپنے خلاف مزاج دیکھیں مگر جوش انتقام جو غضب کی تعریف میں داخل ہے وہ چھوٹے ہی پر آتا ہے، بڑے کے مقابلے میں جو ناگواری ہوتی ہے اس کا نام حزن اور صدمہ ہے، باقی غصہ جب آتا ہے اسی پر آتا ہے۔ جس کو اپنے سے چھوٹا سمجھے اور جب کسی کو اپنے سے کم سمجھا تو اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھا اسی کا نام کبر ہے غرض غصہ کبر ہی سے ہوتا ہے، نتائج اس کے یہ ہیں اگر ہم میں قدرت انتقام ہے تو بلا انتقام لیے دل ٹھنڈا نہیں ہوتا اور اکثر حالتوں میں ظلم ہو جاتا ہے، سزا بمقدار عمل پر بس نہیں ہوتی اور اس وقت نفس یہ توجیہ کرتا ہے کہ قصور تو اسی کا ہے ہم تو برائی کے

مقابلہ میں برائی کرتے ہیں اس میں کیا حرج ہے خود قرآن میں موجود ہے: "جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ" (برائی کا بدلہ برائی ہے) حالانکہ یہ محض نفس کی تسویل ہے۔ قرآن میں "جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ" کے ساتھ مِثْلُهَا (اس کی مثل) کی قید بھی ہے کہ اتنا ہی بدلہ لینا جائز ہے جتنی زیادتی اس نے کی ہو اب بتلایئے کہ کیا کوئی ایسا مستقل مزاج ہے جو غصہ میں اتنا ہوش رکھے کہ اس نے اتنی برائی کی ہے اور میں اتنا بدلہ لوں اول تو اسے سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے کہ دوسرے کی طرف سے زیادتی ہے یا نہیں غصہ کے وقت دوسرے کی بھلائی بھی برائی معلوم ہونے لگتی ہے پھر اس کی مقدار کا اندازہ رکھنا گو امکان عقلی کے درجہ میں تو ہے لیکن امکان عادی سے یقیناً خارج ہے غصہ میں یہ کسی کو ہوش نہیں رہتا کہ کتنی زیادتی ہم پر کی گئی ہے اور ہم جو سزا دیتے ہیں وہ اس کی برابر ہی ہوگی اور اگر واقعی اس میں غلطی نہ کی گئی ہو اور دوسرے نے واقعی زیادتی کی ہو اور صاحب غضب کو اتنی قدرت بھی ہو کہ غصہ سے مغلوب نہ ہو جائے اور سزا بقدر عمل پر بس کرنے کی پوری طاقت ہو تب قرآن شریف کا حکم یہ ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی کے ساتھ لینا جائز ہے اور یہ فتویٰ بھی ہمارے ضعف کی وجہ سے ہے۔

عفو و درگذر

ورنہ عزیمت تو یہ ہے جو اس کے آگے مذکور ہے: "فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ" (پس جس نے معاف کر دیا اور درگذر کی پس اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے) یعنی اعلیٰ درجہ اس وقت بھی یہی ہے کہ درگذر کرلے اور اس کو موکد کیا ہے۔ "اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ" (اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتے) سے گویا تہدید کر دی کہ بدلہ لو تو اس کا اہتمام کر کے لینا کہ ذرا بھی زیادتی نہ ہونے پائے اگر انتقام میں زیادتی ہوئی تو تم بھی ظالم ہو گے اور ظالم حق تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے اس کو سننے کے بعد جس کے دل میں حق تعالیٰ کی محبت ہے وہ ڈر ہی جائے گا اور رخصت پر عمل کرنے کی اسے جرأت ہی نہ ہوگی ایسا نہ ہو کچھ میری طرف سے زیادتی ہو جاوے اور میں محبوب حقیقی کی نظروں سے گر جاؤں بہت مشکل ہے کہ غصہ میں آدمی قابو میں رہے۔ اب "سيئة مثلها" (برائی اس کی مثل) کی صورت صرف یہی ہے جو اس حکایت میں ہے ایک بزرگ سے ان کے مرید نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ

بزرگوں کے شیون مختلف ہوتے ہیں۔ میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں انہوں نے کہا فلاں مسجد میں جاؤ وہاں تین بزرگ مشغول بیٹھے ہیں۔ ایک ایک دھول سب کے مارو اس نے ایسا ہی کیا ایک صاحب کے جو دھول ماری تو وہ اٹھے اور اس کا بھی ہاتھ پکڑ کر ایک دھول اسی طرح ماردی اور زبان سے کچھ نہ کہا اور جا کر بدستور ذکر میں مشغول ہو گئے۔ یہ ہے مثلھا ایک بات بطور جملہ معترضہ یہ بھی بیان کیے دیتا ہوں کہ یہ ان کا بدلہ لینا اس وجہ سے نہ تھا کہ ان سے ضبط نہ ہوا اور انہوں نے رخصت پر عمل کیا اور عزیمت کو چھوڑ دیا کیونکہ کاملین کو ضبط نفس پر کامل قدرت ہوتی ہے اور ان سب حضرات کا کامل ہونا ایک شیخ طریقت کی شہادت سے معلوم ہو چکا ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ بعض دفعہ بدلہ لے لینا ہی مصلحت ہوتا ہے کیونکہ بدلہ نہ لینے کی صورت میں دل میں غبار رہ جاتا ہے اور کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ آیت ذمیم خلق ہے جس سے اولیاء اللہ بہت ڈرتے ہیں اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ بدلہ نہ لیں تو حق تعالیٰ بدلہ لیتے ہیں اور جب حق تعالیٰ بدلہ لیں گے تو اچھی طرح لیں گے تو وہ حضرات شفقت کرتے ہیں کہ خود بدلہ لے لیتے ہیں اور اس شخص کو خدا تعالیٰ کے غصہ سے بچاتے ہیں یہ مصلحت ہے بعض بزرگوں کے بدلہ لے لینے میں جو میں نے بطور جملہ معترضہ بیان کردی۔ دوسرے بزرگ کے جو دھول ماری تو انہوں نے اس طرف دیکھا بھی نہیں ان کی نظر اس پر تھی کہ ہرچہ از دوست میرسد نیکوست تیسرے صاحب کے جو دھول ماری تو انہوں نے یہ کیا کہ اٹھ کر اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیا اور سہلانے لگا اور دم کیا کہ بھائی تمہارے ہاتھ میں چوٹ تو نہیں لگی، وہ اس شان کے تھے یہ بزرگوں کے شیون ہیں جن میں مثلھا کی صورت میں وہ ہے جو پہلے صاحب نے کیا۔ ہم جیسوں کے ساتھ یہ بات پیش آوے تو بدوں چار پانچ لگائے کب مانیں پھر اگر اپنے برابر کے ساتھ ایسا کیا جاوے کہ مثلھا پر اکتفا نہ کی جاوے بلکہ جوش ختم ہونے تک برابر مارے جائیں تب بھی خیر ہے کیونکہ وہ بھی کچھ بدلہ ضرور لے گا تو کچھ ادھر کی زیادتی رہے گی اور کچھ ادھر کی غضب تو یہ ہے۔

بچوں پر ظلم

کہ بعض دفعہ چھوٹوں پر بھی بری طرح غصہ کیا جاتا ہے اور وہ بالکل بے بس ہوتے ہیں ان کی طرف سے کچھ بھی بدلہ نہیں ہو سکتا، بچوں پر جو ظلم ماں باپ سے یا میانجی صاحبان سے

ہوتا ہے وہ اسی قبیل سے ہے بعضے ماں باپ ایسے قصائی ہوتے ہیں کہ بچوں کو اس طرح مارتے ہیں جیسے کوئی جانوروں کو مارتا ہے بلکہ جیسے کوئی چھت کوٹتا ہو اور جو کوئی کہے تو کہتے ہیں ہمیں اختیار ہے ہم اس کے باپ ہیں یاد رکھئے باپ ہونے سے ملک رقبہ حاصل نہیں ہوتی ورنہ یہ بھی ہوتا ہے کہ باپ بیٹے کو بیچ لیا کرتا باپ کا رتبہ حق تعالیٰ نے بڑا بنایا ہے نہ اس واسطے کہ چھوٹے اس کی ملک ہوں اور اس سے چھوٹوں کو تکلیف پہنچے بلکہ اس واسطے کہ چھوٹوں کی پرورش کرے اور ان کو آرام دے ہاں کبھی اس آرام دینے ہی کی ضرورت سے سزا اور تادیب کی حاجت بھی پڑتی ہے اس کی اجازت ہے اور "الضروری یتقدر بقدر الضرورة" (ضروری بقدر ضرورت ہی ضروری ہوتا ہے) کے قاعدہ سے اتنی ہی تادیب کی اجازت ہوسکتی ہے جو پرورش اور تربیت میں معین ہو نہ اتنی جو درجہ ایلام تک پہنچ جائے اور ماں باپ سے ایسی زیادتی قطع نظر گناہ ہونے کے انسانیت اور فطرت کے بھی خلاف ہے ماں باپ کو تو حق تعالیٰ نے محض رحمت بنایا ہے ان سے ایسی زیادتی ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ شخص انسانیت سے بھی خارج ہے اور میاں جی صاحبوں کی تو کچھ پوچھئے ہی نہیں انہوں نے تو ایک مثل یاد کرالی ہے کہ ہڈی ماں باپ کی اور چمڑی استاد کی نہ معلوم یہ کوئی قرآن کی آیت ہے یا حدیث ہے یا فقہ میں کہیں لکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ بعض دفعہ غصہ تو آتا ہے بیوی پر کیونکہ گھر میں لڑائی ہوئی تھی اب بیوی پر تو کوئی بس چلا نہیں وہ غصہ باہر بچوں پر اترتا ہے یہ تو عیسائیوں کا کفارہ ہو گیا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی میاں جی صاحبان یاد رکھیں کہ قیامت کے دن اس کا دینا ہوگا یہاں بچوں کی چمڑی آپ کی ہے وہاں آپ کی چمڑی بچوں کی ہوگی کیا تماشا ہوگا کہ وہ بچے جوان کے محکوم تھے علی روس الخلائق ان کو پیٹ رہے ہوں گے قطع نظر اس سے ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ زیادہ مارنا تعلیم کے لیے بھی مفید نہیں ہوتا بلکہ مضر ہوتا ہے ایک تو یہ کہ بچے کے قوے کمزور ہو جاتے ہیں دوسرے یہ کہ ڈر کے مارے سارا پڑھا لکھا بھی بھول جاتا ہے تیسرے جب بچہ پٹتے پٹتے عادی ہو جاتا ہے تو بے حیا بن جاتا ہے پھر پٹنے سے اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا اس وقت یہ مرض لاعلاج ہو جاتا ہے اور ساری عمر کے لیے ایک خلق ذمیم یعنی بے حیائی اس کی طبیعت میں داخل ہو جاتی ہے الغرض غصہ میں کبھی تو ظلم ہوتا ہے جبکہ انتقام کی قدرت ہو اور جب انتقام کی قدرت نہ ہو تو کینہ پیدا ہوتا ہے پھر اس سے طرح طرح کے امراض پیدا ہوتے

ہیں۔ مثلاً حسد پیدا ہوتا ہے پھر اس سے ایذا رسانی کی فکر ہوتی ہے پھر مکر وفریب کی عادت پڑ جاتی ہے یہ سب امراض ایک سے ایک بڑھ کر ہیں اور یہ سب اولاد ہے اسی ایک مرض کی جس کا نام کبر ہے اب تو آپ کو اس کی برائیاں معلوم ہوگئی ہوں گی۔

تکبر کی صورتیں

سب سے بڑھ کر بڑی بات تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی برائی جا بجا بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں: "اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ" (اللہ تعالیٰ متکبر فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے) اور "اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ" (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہیں) یہ تین صیغے ہیں مختال اور فخور اور مستکبرین اور تینوں کی نسبت لایحب (نہیں پسند کرتے) کا لفظ ہے کیا یہ جامع کلام ہے ان تین لفظوں کی شرح یہ ہے کہ کبر کے آثار کبھی تو ظاہر ہو جاتے ہیں اور کبھی تہذیب کی وجہ سے دل میں رہتے ہیں تو یہ مستکبر ہیں کیونکہ استکبار کے معنی ہیں بڑا سمجھنا اور یہ دل سے ہوتا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں: "اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ" (بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے) یعنی جن لوگوں کے دل میں تکبر ہے خواہ وہ ظاہر بھی ہو جاتا ہے مثلاً کوئی آدمی فیشن بناتا اور طرح طرح کی وضع اختیار کرتا ہے جن سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا چاہتا ہے اس کے متعلق ارشاد ہے: "اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ" (ہر غرور کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے) ایسا آدمی بعض دفعہ اس دھوکے میں رہتا ہے کہ مجھ میں تکبر نہیں ہے کیونکہ ان لوگوں نے اسی کا نام تکبر رکھا ہے کہ زبان سے برائی کا کلمہ کہا جائے حالانکہ یہ فیشن اور وضع بنانا سب تکبر ہی ہے زبان سے نہ سہی مگر انکی ہر رہ ادا سے تکبر ٹپکتا ہے بعضوں کی چال تو فیشن میں آ کر بالکل ایسی ہو جاتی ہے جیسے لقا کبوتر اپنی دم کو سنبھال کر حرکت کرتا ہے ایسی ہی چال یہ لوگ چلتے ہیں کہ قدم قدم پر دیکھتے جاتے ہیں کہ کہیں سے فیشن تو نہیں بگڑ گیا غرضیکہ ان افعال کا کرنے والا گو خود ان کو تکبر نہ سمجھے واقع میں ہیں سب تکبر ہی اور ان کے تکبر ہونے کو کیسا ہی چھپا دے مگر اہل فہم کو معلوم ہو جاتا ہے یہ سب مختال کے اندر داخل ہیں اور بعضوں کی زبان سے بھی تکبر کے

کلمات نکلنے لگتے ہیں ان کو فخور فرمایا، پس مختال تو وہ ہے جس کے دل میں تکبر ہو اور افعال سے بھی ظاہر ہو مگر اقوال سے ظاہر نہ ہو اور فخور وہ ہے جس کی زبان سے بھی ظاہر ہونے لگے تو تین مرتبہ ہوئے ایک مستکبرین ایک مختال اور ایک فخور تینوں کے واسطے لفظ لایحب فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ تکبر کا ظہور ہو یا نہ ہو یعنی زبان سے تکبر ہو یا قلب سے افعال سے سب کو ''اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ'' (اللہ تعالیٰ متکبر فخر کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتے) اور ''اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ'' (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے) سے منع فرمادیا ان میں سے ایک درجہ کی بھی اجازت نہیں دی اب یہ سمجھئے کہ اس مقام پر اس پر کسی عذاب کی وعید نہیں فرمائی۔ صرف لایحب (نہیں پسند کرتے ہیں) فرمادیا ہے سو اس کا جواب اول تو ہے کہ اس آیت میں نہ سہی دوسری آیتوں میں تکبر پر عذاب کی وعید بھی موجود ہے مثلاً ''اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًی لِلْمُتَکَبِّرِیْنَ'' (کیا غرور کرنے والوں کا دوزخ میں ٹھکانہ نہیں ہے) دوسرے یہ کہ یہ وعید کیا تھوڑی وعید ہے کہ لایحب فرمایا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہو۔ غور سے دیکھئے تو وعید کی اصل یہی ہے کیونکہ وعید اسی پر ہوتی ہے جو حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو مرضی کے خلاف ہونا کسی کام کا اور ناپسند ہونا ایک ہی بات تو ہے پس لایحب اصل ہوگئی وعید کی بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کو دشمنی ہے اس شخص سے جو متکبر ہے یا مختال ہے یا فخور ہے کیونکہ محبت گو لغت کے اعتبار سے عداوت کی ضد ہے نقیض نہیں لیکن محاورات میں جس پر اطلاقات قرآنیہ مبنی ہیں وہ عداوت کی نقیض ہے لایحب میں محبت کی نفی کر کے اس کی نقیض کا اثبات ہے تو یہ کہنا کہاں صحیح رہا کہ اس پر کوئی وعید نہیں آئی کیا عداوت کا اثبات وعید نہیں بلکہ یہ تو وعیدوں کا اصل الاصول ہے اگر کسی ایک معین عذاب کی وعید ہوتی وہ وعید کا ایک فرد خاص ہوتا اور اس میں تو کسی فرد کو عذاب کی خصوصیت نہیں رہی بلکہ وہ وعید فرمائی جو جڑ ہے تمام وعیدوں کی یعنی عداوت تو اس سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ اس کی جزاء میں کسی فرد عذاب کی خصوصیت نہیں ہر قسم کا عذاب بلکہ بڑے سے بڑا عذاب اس جرم پر ہوسکتا ہے۔

حب اور بغض

رہی یہ بات کہ لایحب سے اگر عداوت کا ثابت کرنا مقصود ہے تو پھر بجائے لایحب کے یبغض (بغض رکھتے ہیں) کیوں نہ فرما دیا تا کہ تصریح ہو جاتی سو اس میں ایک نکتہ ہے اسی وقت قلب پر وارد ہوا کہ جو زیادہ تر طالب علموں کے کام کا ہے اور اگر سمجھ میں آ جائے تو سب کے کام کا بھی ہے بات ہے کہ افعال کے تین مرتبہ ہیں ایک محبوب ایک غیر محبوب گو مبغوض بھی نہ ہو ایک مبغوض یعنی ایک تو کسی کام کا پسند ہونا اور ایک ناپسند ہونا گو ناگوار بھی نہ ہو اور ایک ناگوار ہونا ظاہر ہے کہ تکبر قسم اول کا عمل تو ہے نہیں یعنی محبوب قسمیں اخیرین میں سے کسی ایک قسم کا عمل ہے اور دوسری آیتوں اور نیز حدیثوں پر نہ کرنے کے بعد یہ ظاہر ہے کہ قسم اخیر ہی کا عمل ہے یعنی مبغوض ہے اس لیے کوئی طالب علم یہ کہہ سکتا ہے کہ اس جگہ لایحب کے بجائے یبغض ہونا چاہیے تھا سو اتنا تو مفسرین نے بھی لکھا ہے کہ بناءعلی المحاورات مراد لایحب سے یبغض ہے مگر یہ کہ اس میں نکتہ کیا ہے سیدھا لفظ یبغض کیوں نہ لایا گیا یہ کہیں نظر سے نہیں گزرا وہ نکتہ اس وقت سمجھ میں آیا جس کو وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو مذاق محبت رکھتا ہو دوسرا کوئی سمجھ نہیں سکتا اور مرتبہ علم میں کوئی سمجھ بھی لے تو اس کو حظ نہیں آ سکتا اس کا پورا حظ وہی شخص پا سکتا ہے جس کے دل میں محبت کی آگ لگی ہوئی ہو اس ہلکے لفظ کو اختیار کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ مبغوض ہونا تو بڑی بات ہے عاشق کے لیے تو لایحب کا لفظ بھی مر جانے کی بات ہے ہائے وہ بندہ کیسے زندگی بسر کرتا ہے جس سے خدا تعالیٰ کو محبت نہیں ہے' اللہ مر جانے کی بات ہے دنیا میں آدمی حکام کی اور محبوبین کی نظروں میں محبوب ہونے کے لیے کیا کچھ مصیبتیں اٹھاتا ہے دیکھئے سپاہی بادشاہ کے حکم سے جانبازی کرتے ہیں اور سر کٹواتے ہیں' صرف اس امید پر کہ بادشاہ ہم سے خوش رہے کسی نمک حلال نوکر کو جب یہ بات معلوم ہو جائے کہ آقا کو مجھ سے آج کل ہمدردی اور محبت نہیں ہے تو کیسا تعلق ہوتا ہے خاص کر اس نوکر کو جس سے آقا کو پہلے محبت رہی ہو اس کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھ سے محبت کچھ کم ہو گئی تو دیکھئے اس پر کیا گزرتی ہے حالانکہ اسے یہ تھوڑا ہی ثابت ہو گیا ہے کہ مجھ سے آقا کو دشمنی ہو گئی ہے بلکہ صرف اسی مرتبہ کی نوبت آئی ہے جس کے واسطے لفظ لایحب بولا جاتا ہے مگر یہی درجہ اس کی پریشانی کے لیے کافی ہے تو ایسے شخص کو اگر آقا کسی فعل سے منع کرنا چاہتا ہے تو ایسا لفظ نہیں

اختیار کرنا چاہتا جو بغض کا مرادف ہو بلکہ یہی لفظ انتہائی لفظ ہے کہ ہم کو یہ کام پسند نہیں اور انتہائی اس واسطے کہ اکثر تو ایسے نوکر کے لیے جس سے محبت کا برتاؤ رہا ہو اس لفظ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کسی لفظ کی بھی ضرورت نہیں، صرف آقا کی نظر کا پھرا ہوا ہونا کافی ہوتا ہے اسی سے اس کا دم فنا ہو جاتا ہے۔ یہ واقعات دن رات نظروں میں ہیں دیکھئے ایک پیش کار ایسا ہو جس سے کلکٹر کو کسی قدر انس ہو وہ اگر ایک دن اجلاس میں صرف اتنی بات نئی دیکھے کہ آج کلکٹر صاحب نے انس سے بات نہیں کی تو سہم کر رہ جاتا ہے اور احباب میں کہتا پھرتا ہے کہ آج صاحب کی نظریں کچھ پھری ہوئی معلوم ہوتی ہیں خدا خیر کرے معلوم نہیں کیا بات خلاف طبع ہوئی اس صورت میں اگر کلکٹر صاحب زبان سے کہہ دیں کہ ہم کو تمہارا فعل پسند نہیں پھر تو کیا کہنا مر ہی تو جاوے گا اور کبھی بھی اس کام کے پاس نہیں جائے گا اور یہ لفظ کہ ہم کو تمہارا فلانا کام پسند نہیں لایحب ہی تو ترجمہ ہے جو حقیقت لغویہ کے اعتبار سے بغض سے کم مرتبہ کا لفظ ہے مگر یہ اتنا اثر کیوں رکھتا ہے بات یہی ہے کہ جس کو تعلق ہے اس کے لیے تو یہی لفظ سب کچھ ہے اور تعلق نہ ہو تو کوئی لفظ بھی موثر نہیں یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ باتیں تو بڑے لوگوں کی ہیں جن کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت ہے ان کے واسطے تو یہ لفظ بیشک ایسا ہی ہے مگر ہم جیسے عوام کو اس لفظ سے کیا اثر ہو سکتا ہے۔

اللہ کی محبت

میں کہتا ہوں کہ بندہ کی غذا خواہ کسی قسم کا بندہ ہو خدا تعالیٰ کی محبت ہے خواہ مصدر کی اضافت فاعل کی طرف لے جاوے یعنی حق تعالیٰ کا بندہ کے ساتھ محبت کرنا، خواہ مصدر کی اضافت مفعول کی طرف لے جاوے یعنی بندہ کا حق تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنا دونوں بندہ کی غذائیں ہیں اور ان میں بھی اصل اول ہی ہے اور ثانی اس پر مرتب کیوں کہ غور سے معلوم ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ بندہ کا محبت کرنا بعد میں ہے اس کے پہلے یہی درجہ ہے کہ اس کے ساتھ محبت ہوئی دیکھ لیجئے۔ صاف موجود ہے: "وَمَا تَشَاءُ وْنَ اِلاَّ اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ" (اور تم کچھ نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہیں) یہ ثبوت تو آیت سے ہے کہ مشیت حق مقدم ہے مشیت عبد پر اور مشیت عبد میں مشیت محبت بھی داخل ہے وہ بھی موقوف ہوگی۔ مشیت حق پر پس اول حق تعالیٰ کی مشیت ہوئی کہ عبد مجھ سے محبت کرے اور حق تعالیٰ کا عبد کے ساتھ اس کی خیر کا ارادہ کرنا یہی

محبت ہے حق تعالیٰ کی عبد کے ساتھ میں ایک ثبوت اور دیتا ہوں اس بات کا کہ بندہ کو خدا تعالیٰ سے محبت ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اول حق تعالیٰ کو اس کے ساتھ محبت ہو۔ وہ ثبوت یہ ہے کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور معرفت تامہ خدا تعالیٰ کی ہو نہیں سکتی کیونکہ نہ خدا کو کسی نے دیکھا نہ خدا کے نمونہ کو کیوں کہ نمونہ ہے ہی نہیں۔ "ولیس کمثلہ شیء" (کوئی شے اس کی مثل نہیں ہے) مگر بایں ہمہ بہت آثار سے پتہ چلتا ہے کہ محبت عبد بالحق کا وجود ضرور ہے ایک ادنیٰ سا نمازی مسلمان لیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ تجھے ایک لاکھ روپیہ دیں گے ذرا ایک وقت کی نماز چھوڑ دے تو ہرگز منظور نہ کرے گا اس سے بخوبی سمجھ میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں لاکھ روپے سے زیادہ ہے ورنہ لاکھ روپیہ کیوں چھوڑتا۔ کوئی شاید یہ کہے کہ صلحاء مسلمین میں تو یہ بات ہے کہ جو نماز و دیگر عبادات کے پابند ہیں لیکن جو نماز ہی نہیں پڑھتے ان کی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو محبت حق تعالیٰ کی ہوا بھی نہیں لگی کیونکہ لاکھ روپے تو دور ہے وہ تو بلا کسی لالچ کے ہی نماز چھوڑے بیٹھے ہیں۔ میں کہتا ہوں ان میں بھی محبت خدا تعالیٰ کی ایسی ہے جیسے نماز پڑھنے والوں میں صرف ظہور میں فرق ہے ترک نماز کی عادت نے نماز سے غافل بنا دیا اس لیے نماز کے معاملہ میں تو ان سے محبت کا ظہور نہیں ہوتا مگر اس سے زیادہ کسی دوسرے موقع پر اس کا ظہور ہو جاتا ہے مثلاً دین کے لیے جان دینے کا موقع آن پڑے تو چاہے مسلمان کیسا ہی بے نمازی اور فاسق اور فاجر کیوں نہ ہو ہرگز تامل نہ کرے گا وہاں تو لاکھ روپیہ تھے یہاں تو جان کی پروا نہیں بلکہ بعض واقعات سے تو اس کا ثبوت ملتا ہے کہ نماز روزہ کرنے والوں سے زیادہ عام مسلمانوں نے جانبازی کی ہے یہ تو سوچتے ہی میں رہے کہ جان دینا چاہیے یا نہیں اور نہیں اور انہیں کچھ پروا نہیں ہوئی' اندھے باؤلے ہو کر کود پڑے۔ نیز ہر شخص کو اپنی اولاد اور بیوی سے کیسی محبت ہوتی ہے لیکن اگر ان میں کوئی خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہہ دے تو فاسق سے فاسق مسلمان کو بھی تاب نہیں ہوتی اور وہ اپنی اولاد کی گردن اتارنے پر تیار ہو جاتا ہے غرض ان سب حالات کے دیکھنے سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ مسلمان کو حق تعالیٰ کے ساتھ ضرور محبت ہے اور معمولی محبت نہیں بلکہ شدید محبت ہے جو بیوی بچوں سے کہیں زیادہ ہے جس کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب کوئی خدا کی شان میں کچھ کہہ دے اس وقت مسلمان کو بچوں کی بھی پروا نہیں ہوتی سو اتنی محبت بلا دیکھے اور بلا نمود دیکھے اور بلا آواز سنے کیوں کر ہوئی۔ یہ تو ظاہر کہ خدا تعالیٰ کو کسی نے دیکھا نہیں

اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ نمونہ بھی نہیں دیکھا کیونکہ خدا تعالیٰ کا نمونہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ حق تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ جیسا کہ وحی سے بتایا گیا ہے کہ حتیٰ کہ ملحد نے کہا تھا کہ مسلمان جیسا خدا کو مانتے ہیں وہ تو نہ ماننے کے حکم میں ہے کیونکہ جب اس کا کوئی نظیر ہی نہیں تو اس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ تصور نظیر ہی پر موقوف ہے اور جس کا تصور نہ ہوسکے اس کا ماننا ہی کیا ہے ہائے وہ الو کیا جانے خدا کیا چیز ہے یہ کیا ضرور ہے کہ جس کی نظیر نہ ہو اس کا وجود بھی نہ مانا جائے' آفتاب کی نظیر کون سی ہے کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ کسی جگہ دوسرا آفتاب بھی ہے یا کسی نے دیکھا ہے یا کسی زمانہ میں ہوا تھا۔ اسی طرح جس بات کو دلیل ثابت کرتی ہے اس پر یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ ہم نے دیکھا ہی نہیں اس لیے نہیں مانتے البتہ اگر اس پر اعتراض کرنا ہی ہے تو اس طرح کرو کہ دلیل کے کسی مقدمہ کو باطل کرو اور اگر مقدمات باطل نہ ہوسکیں تو نتیجہ کا ثبوت یقینی ہے خیر اس وقت اس ملحد کا جواب دینا مقصود نہیں۔ اس واسطے کلام کو کیوں طول دیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ "ماخطر ببالک فھو ھالک واللہ اعلیٰ من ذلک" (ہر وہ وسوسہ جو تمہارے دل میں گزرتا ہے فنا ہونے والا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے برتر ہیں)

اسی کا ترجمہ یہ ہے

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم   وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم

(اے اللہ آپ ہمارے خیال وقیاس گمان وہم سے برتر ہیں اور اس سے بھی جو کچھ ہم نے پڑھا ہے اور سنا ہے)

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر   ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(دفتر ختم ہوگیا اور عمر آخر پہنچی ہم ایسے ہی تیرے وصف اول کے بیان میں ہیں اور دوسرا ایک شعر ہے)

قلم بشکن سیاہی ریز وکاغذ سوز دم درکش   حسن ایں قصہ عشق سر در دفتر نمیگنجد

(قلم توڑ سیاہی کو پھینک کاغذ کو جلا اور خاموش رہ اے حسن یہ عشق کا قصہ ہے دفتر میں نہیں سما سکتا)

ایسی شان ہے حق تعالیٰ کی پھر جو چیز خیال میں بھی نہ آوے اس کی محبت کیسے ہوسکتی ہے حتیٰ کہ بعض اہل ظاہر نے تو کہہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت بالمعنی الحقیقی نہیں ہوسکتی بس ارادہ طاعت ہی محبت ہے اس لیے مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ ارادہ عقلی سے عبادت کیے جائیں اس پر

امام غزالی بہت خفا ہو کر کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی مثال غین کی سی ہے جو کہتا ہے کہ عورت میں کچھ لذت نہیں سو جب کہ واقعات اور آثار اس بات کے شاہد ہیں کہ قلوب میں محبت خداوند موجود ہے پھر اس کا کیسے انکار کر دیا جائے آخر ہم جو ایک انسان کی نسبت حکم لگا دیتے ہیں کہ اس کو کسی انسان سے یا کسی چیز سے محبت ہے تو یہ حکم کیسے لگا دیتے ہیں۔ محبت ایک قلبی شے ہے اس کے باوجود حکم لگا دینا صرف آثار ہی دیکھ کر تو ہوتا ہے پھر جب محبت خداوندی کے آثار موجود ہیں اور ایسے آثار موجود ہیں جو کسی دوسری چیز کی محبت میں نہیں ہو سکتے تو وجود محبت خدا وندی کا حکم لگانا غلط کیسے ہو سکتا ہے اور اگر یہ غلط ہے تو حیوانات اور انسانوں میں باہمی محبت کا حکم لگانا بھی غلط ہے کیونکہ اس کا مبنی بھی آثار ہی ہیں۔ کسی نے دل چیر کر تو دیکھا ہی نہیں اگر دھوپ دیکھ کر کوئی حکم لگاوے کہ آفتاب نکل آیا ہے تو اس کی تغلیط کیسے کی جا سکتی ہے یہ تو بداہت بلکہ جس کا انکار ہے اسی طرح محبت خداوندی کا وجود اہل اللہ میں تو اس طرح پایا گیا ہے کہ ان میں تو اس کے آثار تھے ہی بعض دفعہ ان سے متعدی ہو کر آس پاس تک کو گھیر لیا ہے۔

اثر محبت

حضرت سمنون محبؒ کا قصہ ہے کہ یہ کچھ محبت کا بیان کر رہے تھے کہ ایک چڑیا ان کے قریب آ بیٹھی اور تھوڑی دیر کے بعد ان کی گود میں آ بیٹھی اور تڑپنے لگی اور مر گئی دیکھئے کس درجہ محبت کا اثر ہے اب جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ بتائیں کہ کاہے کا اثر تھا جس نے جانوروں میں بھی آگ لگا دی وہ انسان میں آگ لگا دے تو کیا بعید ہے غرض اس کا انکار بالکل مکابرہ ہے ضرور اس کا وجود ہے اور ہر شخص میں ہے پھر اس کا ایک درجہ تو فطرۃ ہر چیز میں موجود ہے مگر انسان اس کا مکلّف ہے کہ اس درجہ کو حاصل کرے جو اس کے اختیار پر رکھا گیا ہے جو لوگ اس سے محروم ہیں کیسے ہی متقی ہوں ان کا تقویٰ ذرا سی بات میں ٹوٹ جاتا ہے بخلاف اہل محبت حضرات کے کہ ان کا تقویٰ بہت مستحکم ہوتا ہے کیونکہ محبت کے اثر سے اعمال ان کی عادت بن جاتے ہیں پھر عادت سے طبیعت ثانیہ اور روح بن جاتے ہیں اور جن میں یہ نہیں وہ جہاں رہ گئے وہاں رہ گئے محبت کے ساتھ خدا کا رستہ بہت قریب ہے اور بلا اس کے بہت بعید ہے اسی واسطے عراقی کہتے ہیں:

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(مجھ کو تو طریق عشق میں چلایئے نرا زہد خشک تو بہت دور دراز کا راستہ ہے) بلا محبت کے بڑے بڑے مجاہدوں سے بھی کبھی تو ایک ضعیف سا اثر ہو جاتا ہے جیسا کہ ادنیٰ درجہ کی محبت والے کو بلا مجاہدہ کے ہوتا ہے اور کبھی اتنا بھی نہیں ہوتا بلکہ ساری عمر اعمال ناقص ہی ادا ہوتے ہیں اس کی نسبت کہا گیا ہے:

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمین ندا بر آمد — کہ مرا خراب کردی تو بسجدہ ریائی

(جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی تو نے سجدہ ریا کا کر کے مجھ کو بھی خراب کیا)

بہ طواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند — تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

(خانہ کعبہ کے طواف کے لیے گیا تو حرم نے مجھے راستہ نہ دیا اور کہا کہ تو نے حرم کے باہر کیا کیا جو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے)

یہ تو اعمال کی حالت ہے اور احوال کی حالت یہ ہے کہ جن کو محبت نہیں وہ بہت جلد گھبرا اٹھتے ہیں ذرا سا ابتلا ہوا اور قدم اکھڑ گئے اور محبت والے کی یہ حالت ہوتی ہے۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ اس پر خنجر آزمائی کریں)

کسی کو تکلیف ہوتی ہوگی ان کو تو مصیبت میں بھی لطف آتا ہے یہ محبت ہی کے آثار ہیں اگر تم میں محبت نہ ہو تو اس کا انکار تو مت کرو اہل محبت کے آثار کو دیکھ کر ماننا پڑے گا کہ محبت الٰہی کا وجود ہے۔

گر نبودے نالہ نے راثمر — نے جہاں راپر نہ کردے از شکر

(اگر نالہ نے کا ثمرہ جو طلب ہے جس سے معرفت پیدا ہوتی ہے نہ ہوتا تو دنیا میں ہزاروں عارف بھرے پڑے ہیں کہاں سے آتے)

بندگان خدا محبت والے موجود ہیں اگر ان میں محبت نہیں تو دوسرے ان کی صحبت سے کیوں کر اہل محبت ہو جاتے ہیں یہ طاقت محبت ہی میں ہے کہ آس پاس تک کو لپیٹ لیتی ہے محبت آگ ہے آگ کے اندر جو کوئی جاتا ہے وہ تو جلتا ہی ہے اور جو کوئی آگ کے اردگرد ہوتا ہے گرم وہ بھی ہو جاتا ہے عقل میں اتنی قوت نہیں واللہ یہ قوت محبت ہی میں

ہے۔ چنانچہ ایک اہل دل نے دونوں کو آزما کر کہا ہے:

آزمودم عقل دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے عقل دوراندیش کو آزمالیا' جب اس سے کام نہ چلا پھر ہم دیوانہ بنے)

آزمودم عقل دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دوراندیش کو آزمانے کے بعد میں نے دیوانگی اختیار کی)

دیوانہ بنیں گے طعن سہیں گے' مصیبتیں جھیلیں گے مگر محبت وہ چیز ہے کہ کسی کا اثر نہ ہوگا اور یہی کہیں گے۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(اگر ہم مفلس قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا پرواہے' یہی دولت کیا کم ہے کہ محبوب حقیقی کی محبت سے مست ہیں)

دیکھئے ادنیٰ سی بازاری مرد اور عورت یا ایک امرد کی محبت میں آبرو وغیرت سب فنا ہوجاتی ہے نہ مال کی پروا رہے نہ جاہ کی جب ایک نام عشق میں یہ حالت ہے تو حق تعالیٰ کے عشق میں جو واقعی عشق ہے اور سچا عشق ہے کیا حالت ہونا چاہیے جو کچھ بھی ہوجاوے کم ہے کیونکہ

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　کوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہوا اس کی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے)

آثار محبت

غرض محبت کے آثار جہاں بھی ہوں وہاں کیسے قائل نہ ہوں کہ محبت کا وجود ہے تو یہ قول صحیح نہیں کہ خدا تعالیٰ کی محبت نہیں ہوسکتی دراصل ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی عظمت پر نظر کرکے یہ کہہ دیا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ محبت ایک تعلق کا نام ہے جس کے لیے موجود طرفین اور طرفین میں کچھ باہمی مناسبت کی ضرورت ہے اور بندہ اور خدا میں کیا مناسبت کہاں واجب اور کہاں ممکن غالباً یہ اصل ہوگئی ہے متکلمین کے انکار کی مگر اس کا حل یہ ہے کہ بندہ بیشک اس قابل نہیں ہے کہ اس کو واجب کے ساتھ ایک طرف میں رکھا جاوے لیکن محبت کا امکان اس طرح پر ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ بندہ کی محبت اس کے فعل سے نہیں بلکہ اس طرف سے

شروع ہوئی حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اس کے دل میں میری محبت ہو بس ہوگئی حق تعالیٰ کے ارادہ کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں اس لیے جس بندہ میں خدا تعالیٰ کی محبت دیکھو سمجھ لو کہ حق تعالیٰ کو بھی اس کے ساتھ محبت ہے مگر ظہور وخفا کا فرق ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

عشق معشوقاں نہاں است دستیر ۔۔۔۔۔ عشق عاشق بادوصد طبل و نفیر
(معشوق کا عشق پوشیدہ اور مخفی ہے عاشق کا عشق ظاہر اور آشکارا ہے)

لیک عشق عاشقان تن زہ کند ۔۔۔۔۔ عشق معشوقاں خوش و فربہ کند
(لیکن عاشقوں کا عشق دبلا کرتا ہے اور معشوقوں کا عشق موٹا اور فربہ کرتا ہے)

عاشق کی محبت پتہ دیتی ہے کہ حق تعالیٰ کو بھی اس سے تعلق ہے مگر وہاں کوئی انفعالی اثر نہیں کیونکہ واجب الوجود پر کیا اثر ہوتا اسی واسطے اس کو ستیر کہا یعنی وجود تو ہے مگر کوئی اثر ظاہر نہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں ۔۔۔۔۔ گو بہ نسبت ہست ہم ایں و ہم آں
(جس کو عاشق دیکھو اس کو معشوق سمجھو گو نسبت کے ساتھ یہ بھی ہے اور وہ بھی)

عارفین کے ان اقوال سے تائید ہوگئی ہے کہ بندہ کی محبت درحقیقت خدا تعالیٰ کی محبت ہے اور خدا تعالیٰ کی تو بڑی شان ہے اہل اللہ جو مظہر شان خداوندی ہیں ان کی بھی یہی کیفیت ہے کہ اگر تمہیں ان سے محبت ہے تو وہ درحقیقت تمہاری طرف سے محبت ہے ورنہ کیا مجال تھی کہ تم ان کے پاس بھی پھٹک سکتے اگر ان کو تم سے تعلق نہ ہوتا تو قیامت تک تمہیں ان سے تعلق نہ ہوتا بلکہ نفرت ہوتی۔

نفرت فرعون تو میداں از کلیم
(فرعون سے نفرت کرنا اللہ کی طرف سے سمجھتے رہو)

یعنی فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا نفرت تھی خود حضرت کلیم کو اس سے نفرت تھی اگر وہ کشش کرتے تو فرعون کو مجال انکار نہ تھی باقی ان کا کشش نہ کرنا یہ حکمت الٰہیہ پر مبنی ہے۔ ایک بزرگ سے ان کے مرید نے اپنی محبت کا اظہار کیا فرمایا تمہیں کیا محبت ہوتی ہم کو ہی تم سے محبت ہے اگر ہم اپنی توجہ ہٹالیں تو کبھی ہمارے پاس نہیں آسکتے چنانچہ مرید کی تنبیہ

تنبیہ کے لیے انہوں نے ایک بار توجہ ہٹالی' کئی مہینے تک پاس آنے کی توفیق نہیں ہوئی حالانکہ تھا اسی شہر میں پھر توجہ کی آموجود ہوا' فرمایا دیکھا بھی یہ ہے تمہاری محبت کی حقیقت اس پر ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ جب ثابت ہوا کہ تمہاری محبت دراصل ان مقبولین ہی کی محبت ہے جو تمہارے ساتھ ہے تو اس میں ایک اور بڑی بشارت ہے وہ یہ کہ معلوم ہوا کہ آپ ان کے دل میں رہتے ہیں اور ان کے دل تجلی گاہ حق ہیں تو تمہاری حالت کچھ بھی ہو مگر انشاء اللہ انوار تجلی سے محروم نہ رہو گے۔ اس واسطے کوشش کرو کہ کسی کے دل میں جگہ کر لو اور اس بات کا پتہ کہ محبت انہیں کی طرف سے ہوتی ہے ان کے برتاؤ سے پتہ چلتا ہے اتنی محبت مرید کی طرف سے نہیں ہوتی' جتنی ان کی طرف سے ہوتی ہے اہل اللہ اپنے متبعین پر گویا فدا ہوتے ہیں ہمارے حضرت نے ایک دفعہ فرمایا کہ اگر اب میں تھانہ بھون جاؤں تو کہاں ٹھہروں' پھر خود ہی فرمایا کہ اشرف علی کے ہاں ٹھہروں' دیکھئے کسی عزیز قریب کا نام نہیں لیا' لیا تو ایک خادم ہی کا نام لیا' یہ شفقت ہوتی ہے بزرگوں کے خدام پر ایک مرتبہ حضرت نے میری اہلیہ کو ایک کپڑا بطور تبرک دیا' اس پر ایک خادمہ نے عرض کیا کہ فلانی آپ کی رشتہ دار پوتی ہے اس کے لیے بھی دیجئے فرمایا ہم کسی بیٹی پوتی کو نہیں جانتے ہمارے پوتے وہی ہیں جن کو اللہ کے لیے ہم سے تعلق ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ اولاد اور رشتہ داروں سے ان کو تعلق نہیں ہوتا' ان کو تعلق سب سے ہوتا ہے چنانچہ اگر کوئی ان کے رشتہ داروں سے بدسلوکی کرے تو اول جوش انہیں کو ہو گا کیونکہ ادائے حقوق ضروری ہے اور اہل اللہ سے بہتر کوئی ادائے حقوق نہیں کر سکتا کیونکہ یہ حقوق کو شریعت کے موافق ادا کرتے ہیں اور شریعت سے بہتر کوئی حقوق کو نہیں جان سکتا اور وہ جوش بجا ہوتا ہے کیونکہ کسی شخص کے رشتہ داروں کے ساتھ بدسلوکی وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اس شخص کے ساتھ محبت نہ ہو' رشتہ دار تو بڑی چیز ہیں ادنیٰ تعلق جس چیز کو محبوب کے ساتھ ہوتا ہے محبّ کے نزدیک وہ بھی محبوب ہوتی ہے۔ دیکھئے سگ لیلیٰ کے ساتھ مجنوں نے کیا برتاؤ کیا اس کو گود میں اٹھا لیا' کسی نے کہا کہ یہ کیا حرکت ہے تو وہ کہتا ہے:

پاسبان کوچہ لیلیٰ است ایں

(یہ لیلیٰ کے کوچہ کا چوکیدار ہے)

محبت ایسی ہی چیز ہے یہ وجہ اہل اللہ کے اس غصہ کے بجا ہونے کی حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بیٹے کے ساتھ بعض خلفاء شیخ نے بدسلوکی کی تو شیخ کو بڑے غصہ کا خط ان کے پاس گیا' ان کا غصہ دراصل ان رشتہ داروں کی طرف داری سے نہیں ہوتا بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مدعی محبت کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہوا اس تصنع سے وہ بھڑک اٹھتے ہیں تو کوئی یہ نہ سمجھے کہ اہل اللہ کو اولاد سے کوئی تعلق نہیں یا ان کو ہم سے بھی زیادہ تعلق ہوتا ہے چنانچہ ہمارے وطن میں ایک معلّمہ کے پاس ایک لڑکی پڑھنے آئی' وہ لڑکی سیدہ تھی تو اس معلّمہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تشریف لائیں اور کہا ہماری بچی آئی ہے اس پر اچھی طرح توجہ رکھنا' دیکھئے کتنے بعید رشتہ کا یہ خیال ہے۔ غرض اہل اللہ کو عزیز واقارب سے بھی محبت ہوتی ہے اور متبعین سے بھی ہوتی ہے اور انہیں کی محبت کا عکس متبعین کی محبت میں دکھائی دیتا ہے اس کے ساتھ تمہاری محبت دراصل ان کی محبت تمہارے ساتھ ہے تو گو اس وجہ سے کوئی ظاہر پرست محبت کا انکار کردے کہ کہاں بندہ اور کہاں خدا۔ بندہ کا کیا منہ ہے کہ خدا سے تعلق جوڑے لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ تعلق بندہ نے نہیں جوڑا بلکہ خدا تعالیٰ نے جوڑا ہے تو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے غرض خدا کی محبت کا وجود قلوب میں ہے اور ضرور ہے اور خدا کی محبت تو بندہ کی غذا ہے خواہ محبت کو مصدر معروف کہو یا مجہول کہو کوئی صورت بھی محبت خدا بندہ کی حیات روحانی کے لیے شرط ہے جیسے غذا حیات بدنی کے لیے شرط ہے' بے غذا کے زندگی نہیں رہ سکتی۔ جب محبت بندہ کی غذا ٹھہری تو اس کی ضد یعنی بغض تو بڑی چیز ہے بلکہ عدم محبت بھی مرنے کے لیے کافی ہے جیسے مرنے کے لیے یہی ضروری نہیں کہ زہر کھالیا جاوے بلکہ غذا کا بند کردینا کافی ہے تو جس چیز کے لیے یہ کہا جائے کہ یہ محبت کی ضد یعنی بغض پیدا کرنے والی ہے وہ تو سب سے بدتر چیز ہوگی وہ چیز کبر ہے یہ حق تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے۔

تواضع

اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے) میں اسی کو بیان فرمایا گیا ہے ''لایحب بمعنی یبغض'' ہے اور نکتہ اس میں وہ ہے جو بیان ہوا کہ اپنی محبوبیت اور بندہ کی محبت پر نظر کرکے یہ یبغض کی ضرورت ہی نہیں لایحب ہی کو کافی قرار دیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ کبر مبغوض ہے اور بدترین چیز ہے جب یہ ایسا ہے تو اس کا مقابل

بہترین اشیاء اور حق تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہوگا اور وہ تواضع ہے تواضع فی نفسہ بھی محبوب ہے اور اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ تواضع کبر کا علاج ہے اور کبر کا علاج ضروری ہے کیونکہ یہ بدترین مرض اور ام الامراض ہے اور یہ مرض عام ہے تو بیان تواضع کا اختیار کرنا مفید عام مضمون ہوا۔ اس واسطے اس حدیث کو اختیار کیا گیا ہے حاصل یہ کہ کبر کا علاج تواضع ہے اب ضروری ہے کہ تواضع کے معنی بیان کیے جائیں۔

تواضع کی حقیقت

میں مختصراً اس کی حقیقت بیان کر کے ختم کرتا ہوں۔ تواضع کی حقیقت عوام جہلاء میں تو یہ ہے کہ مہمان کی خاطر کی جاوے' پان پتہ اس کے سامنے رکھا جاوے' کھانا کھلایا جاوے' نرم زبان سے بولا جاوے اس کے لیے دوسرا لفظ خاطر کرنا ہے' کہتے ہیں فلاں آدمی بڑی خاطر کا آدمی ہے اسی کو ذرا پڑھے لکھے مگر جاہل ہی یوں کہہ دیتے ہیں کہ فلانے کے یہاں مہمان کی بڑی تواضع ہوتی ہے۔ بہرحال یہ معنی تو عرفی ہیں اور حقیقی معنی سے یہ معمولی لیاقت کے لوگ بھی واقف نہیں حتیٰ کہ نئے لوگوں میں جو اعلیٰ درجہ کے نئے تعلیم یافتہ ہیں بی اے اور ایم اے والے وہ بھی اس حقیقی معنی سے بے خبر ہیں بلکہ وہ تو لفظ بھی صحیح نہیں بولتے کیونکہ اردو زبان کی شائستگی فارسی سے پیدا ہوتی ہے جس سے یہ لوگ بے بہرہ ہیں بلکہ اردو کا املا تک ان کا غلط ہوتا ہے چنانچہ ایک تعلیم یافتہ سب جج نے ایک فریق کے اظہار قلمبند کرنے میں اعتراض ز سے لکھا تھا' اس فریق نے دیکھ کر اعتراض کیا کہ اعتراض ز سے نہیں ہے کہا غلطی ہوئی ظ سے ہے تو یہ لوگ الفاظ تک غلط بولتے ہیں تواضع کو تو ازے بولتے ہیں۔ غرض اس کے صحیح معنی سے یہ لوگ سب کے سب نا آشنا ہیں جن میں بعضے تو ایسے ہیں کہ لفظ سے بھی نا آشنا اور بعضے لفظ جانتے ہیں مگر معنی سے نا آشنا ہیں اچھی طرح جان لیجئے کہ تواضع لفظ عربی ہے اور جن معنوں میں عوام نے استعمال کیا ان معنوں میں تو عربی زبان میں یہ لفظ کہیں آیا ہی نہیں اس پر ایک قصہ یاد آ گیا۔ ایک دیہاتی لڑکا تھا اس نے ایک استاد سے کریما شروع کی جب یہ شعر آیا

دلا گر تواضع کنی اختیار شود خلق دنیا ترا دوستدار

(یعنی اے دل اگر تواضع اختیار کرے تو تمام مخلوق تیری دوست بن جائے)

استاد نے پوچھا جانتے ہو تواضع کس کو کہتے ہیں کہا اجی ہاں یہی پان پتہ دے دینا یہ تو ایک گنوار کی بات ہے پڑھے لکھوں کے نزدیک جو معنی ہیں وہ بھی اسی کے قریب قریب ہیں' صرف لفظ دوسرے ہیں ان کے نزدیک تواضع کے معنی ہیں نرمی سے بولنا' جھک جھک کر سلام کرنا' جھوٹی باتیں بنانا' حقیقت سے دونوں دور ہیں۔ صاحبو! اس کے معنی حقیقت میں اپنے آپ کو پست سمجھنا ہیں' نہ پست بنانا' یہ جھک جھک کر سلام کرنا اور باتیں بہ تکلف پست بنانا ہے یعنی بناوٹ ہے نہ حقیقت بلکہ حقیقت میں تو آج کل تواضع تکبر ہے جو تواضع کی ضد ہے اور اس پر تعجب نہ کیجئے کیونکہ میں ایک امتحان بتاتا ہوں جس کسی کو آپ بہت متواضع دیکھیں جو بار بار جھک جھک کر سلام کرتے ہوں اور بہت ہی منکسر النفس ہوں اور ہر شخص سے آپ اور جناب سے بات کرتے ہوں اور اپنے آپ کو یہ کہتے کہ میں کس قابل ہوں میں تو محض نالائق ہوں تو جس وقت وہ یہ کہیں کہ میں نالائق ہوں اس وقت آپ ذرا کہہ دیجئے ہاں صاحب واقعی آپ تو نالائق ہیں پھر دیکھئے وہ کتنا ناچتے ہیں اور امید تو ہے کہ ساری عمر کے لیے دشمن ہو جائیں گے۔ اگر یہ بناوٹ نہ تھی اور جھوٹ نہیں تھا اور وہ دل سے یہ الفاظ کہتے تھے تو یہ غضب اور کینہ کیوں ہوا۔ معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو نالائق صرف اس واسطے کہا جاتا ہے تاکہ دوسرا ان کی زیادہ تعریف کرے کہ فلانے بڑے متواضع ہیں اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں تو صورت تو تواضع کی ہے مگر حقیقت میں بڑا بننا اور تکبر کرنا مقصود ہے جو تواضع کی ضد ہے اور جو واقعی متواضع ہیں وہ ایسے تصنع کے الفاظ کبھی نہیں کہتے اس لیے ان کی نسبت اکثر لوگ یہی کہتے ہیں کہ ان میں تواضع اور اخلاق نہیں ہیں کسی کو منہ ہی نہیں لگاتے۔ صاحبو! ان میں بناوٹ نہیں' سچے اخلاق ہیں جھوٹے نہیں' ان کو تو حکیمانہ قول یہ ہے کہ اگر کوئی منہ پر تعریف کرے تو اس تعریف سے نہ انکار کرو' نہ اس کو منع کرو کیونکہ اس سے اور زیادہ تعریف کرے گا اور دوسرے دیکھنے والے بھی تمہارے معتقد ہو جائیں گے بلکہ خاموش ہو رہو وہ اپنا سا منہ لے کر خود خاموش ہو جاوے گا اور سب سمجھیں گے یہ بالکل بے حس آدمی ہے جو تعریف سے کچھ بھی خوشی ظاہر نہیں کرتا' بت بن کر بیٹھ گیا' پھر آئندہ نہ کوئی تعریف کرے گا نہ عقیدت مند ہوگا' یہ ہے حقیقی تواضع۔

آج کل کا دستور

آج کل ایک اور طریقہ نکلا ہوا ہے پہلے لوگ تو جب کوئی ان کی تعریف کرتا تھا انکسار کے الفاظ کہتے تھے کہ جناب میں اس قابل کہاں ہوں آپ بناتے ہیں۔ من آنم کہ من دانم یہ اگر بناوٹ ہی تھی مگر خیر صورت تو تواضع کی تھی اور اب طریقہ نکلا ہے کہ اپنی تعریف کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ میں اس عنایت کا نہایت شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ کو ان القاب سے نوازا' مطلب یہ ہے کہ ایسے ہی الفاظ سے مجھے یاد کیا کیجئے اور میں اس قابل ہوں اس میں صورت بھی تواضع نہیں رہی کھلا ہوا تکبر ہے۔ غرض تکبر کھلا ہوا ہو یا ڈھکا ہوا چھپتا نہیں ہے۔ برتاؤ سے حال معلوم ہو جاتا ہے پھر جیسا واقع میں ہوتا ہے ویسا ہی حکم کیا جائے گا اگر واقع دل میں بڑا بننے چاہتے ہو تو چاہے نالائق بنو یا خاکسار بنو تکبر ہی کا حکم ہوگا اور اگر دل میں پستی اور انکسار ہے تو خواہ کوئی لفظ بھی زبان سے نہ کہو اور مدح سن کر متکبرین کی طرح خاموش ہی بیٹھے رہو' تب بھی تکبر نہیں تواضع ہی سے ہمارے ایک بزرگ استاد تھے' ان کی عادت تھی کہ جب کوئی ان کی تعریف منہ پر کرتا ہے تو خاموش محض ہو جاتے ہیں اس سے ناواقف دیکھنے والا یوں سمجھتا کہ یہ اپنے آپ کو اس تعریف کا اہل سمجھتے ہیں اور یہ تکبر ہے مگر دوسرے وقت ان کی یہ حالت تھی کہ دیوبند کے قریب املیا ایک گاؤں ہے اس میں آموں کی دعوت ہوئی۔ داعی نے سواری تک نہیں بھیجی یہ بزرگ مع رفقاء کے پیدل چلے گئے جب وہاں سے آم کھا کر چلنے لگے تب بھی بلانے والے نے سواری کو نہ پوچھا' پیدل ہی چلتے چلتے وقت گھر والوں کے واسطے اس نے آم دیئے۔ ظاہر ہے کہ مولانا کو اوروں سے زیادہ حصہ دیا ہوگا' مولانا نے اپنا حصہ لنگی میں باندھ لیا' مولانا دہلی میں شہزادوں کی گودوں میں پلے ہوئے تھے اور بہت نازک بدن تھے بوجھ لے چلنے کی عادت کہاں' اس گٹھڑی کو کبھی اس ہاتھ میں لیتے اور کبھی اس ہاتھ میں لیتے' بمشکل دیوبند کے قریب پہنچے۔ جب بازار کے قریب پہنچے تو تھک کر اس گٹھڑی کو سر پر رکھ لیا تو بڑا آرام معلوم ہوا۔ تو فرماتے ہیں کہ میاں پہلے سے یہ ترکیب سمجھ میں نہ آئی بڑے آرام سے آتے' سر پر گٹھڑی رکھے ہوئے چلے جاتے ہیں اور دونوں طرف سے سلام ہوتے جاتے ہیں اور مصافحے ہوتے جاتے ہیں اور مولانا بے تکلف چلے جاتے ہیں۔ مدرسہ تک اسی طرح چلے گئے راستہ میں معتقدین نے لینا بھی چاہا مگر کسی کو نہیں دیا۔

ہشاش بشاش ذرا طبیعت پر بار نہیں تھا۔ لوگ عموماً وضع کی پابندی کو اچھا سمجھتے ہیں اور اس کو ضروری کہتے ہیں اور کہتے ہیں کوئی عادت تاوقتیکہ خلاف شرع نہ ہو۔ گناہ کیا ہے میں کہتا ہوں اکثر اوضاع کی بناء ترفع پر ہے البتہ اگر کسی میں ترفع نہ ہو اور اس میں یہ بات پیدا ہوگئی ہو جو مولانا میں تھی کہ کسی وقت اپنی وضع کے خلاف کام کرنے پر نفس کو ذرا رکاوٹ نہ ہو تو وہ شخص متکبر نہیں اور اس کی عادات بھی بری نہیں ورنہ پابند وضع یقیناً متکبر ہے میں یہ نہیں کہتا کہ سب پانچ پانچ سیر بوجھ ہی لادو مگر کچھ تو کرو اخلاق کی اصلاح کی طرف کسی کو توجہ نہیں۔

صحبت بزرگان

ہماری طرف ایک بزرگ مولانا مظفر حسین صاحب تھے وہ اپنے معمولات کے بہت پابند تھے' تہجد سفر میں بھی قضا نہ کرتے تھے اس وقت ریل نہ تھی لوگ بہلیوں میں سفر کیا کرتے تھے۔ مولانا اس میں بھی تہجد پڑھتے تھے مگر کبھی اس ضرورت کے لیے بہلی کو ٹھہرایا نہیں کیونکہ اس سے دوسرے رفقاء کا حرج ہوتا یا کم از کم گاڑی بان کا تو حرج ہوتا اور عارفین کسی کی کلفت کو کبھی گوارا نہیں کرتے بس یہ کرتے کہ گاڑی سے آگے بڑھ جاتے اور دو رکعت پڑھ لیتے جب گاڑی نزدیک آتی آگے بڑھ جاتے پھر دو رکعت پڑھ لیتے' اسی طرح تہجد ختم کرتے۔ بھلا آج تو کوئی شیخ صاحب کر کے دکھاویں اور تو سفر میں تہجد ہی کون پڑھتا ہے اور کسی کو شوق ہوا تو بس بہلوان کمبخت کی مصیبت ہے کہ گھنٹہ بھر تک گاڑی رو کے کھڑا رہے' تہجد اور راحت رسانی مخلوق دونوں کو جمع کر کے دکھاؤ۔ ان ہی مولانا مظفر حسین صاحب ہی کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ مولانا دہلی سے کرایہ کی ایک بہلی میں چلے گاڑی بان سے دیہاتیوں کی طرح باتیں کرتے رہے تاکہ وہ مانوس ہوں کیونکہ رفیق سفر کو مانوس کرنا بھی حق رفاقت ہے پھر اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوگیا کہ یہ بہلی رنڈی کی ہے مولانا کو بڑی وحشت ہوئی کیونکہ آپ بڑے متقی تھے' ان کا تقویٰ مشہور ہے وہ ایسی گاڑی میں کیوں کر سوار ہوسکتے ہیں جو حرام کمائی سے تیار کی گئی ہو مگر کمال یہ ہے کہ آپ نے اترنے میں جلدی نہیں کی۔ سنتے ہی فوراً نہیں اتر پڑے اس خیال سے کہ گاڑی بان کی دل شکنی نہ ہو' تھوڑی دور جا کر پیشاب کے بہانے سے اترے پھر اس سے کہا کہ اب تو پیدل چلنے کو جی چاہتا ہے گاڑی بان سمجھ گیا اور عرض کیا کہ میں سمجھ گیا ہوں۔ اب بہتر ہے مجھ کو رخصت فرمائیے' فرمایا

یہ نہیں ہوسکتا' میرے کرایہ کے سبب ممکن ہے کہ کوئی کرایہ لوٹ گیا ہوتو یہ خسارہ مجھ کو گوارا نہیں' اسی طرح کاندہلہ تک بہلی لائے اور خود پیادہ تشریف لائے یہاں پہنچ کر پورا کرایہ دے کر رخصت کیا۔ یہ کمال یہ باتیں بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہیں۔ حضرت صحبت میں رہ کر دین آتا ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ کتابوں سے دین نہیں آتا' ضابطہ کا دین تو کتاب سے آ سکتا ہے مگر حقیقی دین بلا کسی کی جوتیاں سیدھی کیے بلکہ بلا جوتیاں کھائے نہیں آ سکتا۔ دین کسی کی خوشامد نہیں کرتا' دین ان ہی نخروں سے آتا ہے' اب جس کا جی چاہے لے اور جس کا جی چاہے نہ لے' اکبر ایک اچھے شاعر تھے ان کا کلام حکیمانہ ہوتا ہے اس کا مصرعہ ہے:

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

یہ بات بالکل سچ ہے اہل اللہ میں ایک کمال یہ ہوتا ہے کہ تقویٰ کے ساتھ کسی کی دل شکنی نہیں کرتے ان سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی ہاں اگر کوئی اصلاح کی استدعا کرے تو اس کی ضرورت سے تنبیہ اور پوری سیاست کرتے ہیں کیونکہ بلا اس کے اصلاح نہیں ہوسکتی یہ ایسا ہے جیسے فصاد زخم کا علاج کرتا ہے کہ جہاں چیرے کی ضرورت ہے اگر وہاں وہ زخم کرے تو باعث ضرر ہے اور ایسے زخم کی صورت میں فصاد کو رحم دل نہ کہا جائے گا بلکہ ظالم کہیں گے اس لیے جہاں اصلاح میں سیاست کی ضرورت ہو وہاں اہل اللہ پوری سیاست کرتے ہیں مگر سیاست میں بھی امکان بھر نرمی کا پہلو نہیں چھوڑتے۔ ان ہی بزرگوں کا یعنی مولانا مظفر حسین صاحب کا قصہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایک پہلوان مسجد میں آیا اور غسل کرنا چاہتا تھا۔ مؤذن نے اس کو ڈانٹا اور کہا نماز کے نہ روزے کے مسجد میں نہانے کے۔ لیے آ جاتے ہیں ان بزرگ نے ڈانٹنے والے کو منع کیا اور خود اس کے نہانے کا پانی بھرنا شروع کر دیا اور اس سے کہا ماشاء اللہ تم تو بڑے پہلوان معلوم ہوتے ہو ویسے تو زور بہت کرتے ہو ذرا نفس کے مقابلہ میں بھی تو زور کیا کرو' نفس کو دبایا کرو اور ہمت کر کے نماز پڑھا کرو۔ پہلوانی تو یہ ہے۔ بس وہ شخص پانی پانی ہو گیا اور بہت شرمایا' اسی وقت سے نماز کا پابند ہو گیا۔ اسی طرح ان ہی مولوی صاحب کا قصہ ہے کہ انہوں نے ایک رئیس سے کہا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے' انہوں نے کہا کہ نماز تو پڑھ لیں مگر وضو کی پخ ایسی ہے کہ ہمارے بس کی نہیں' بار بار واڑ کو اتار کر چڑھائے یہ رئیس واڑ ہی چڑھانے کے عادی تھے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ آپ بے وضو نماز پڑھ لیا کریں مگر پابندی کے ساتھ پڑھئے۔ رئیس نے کہا کہ بے وضو نماز پڑھنے سے گناہ تو نہ ہوگا فرمایا آپ

بے فکر رہیں اگر گنا ہوگا تو مجھے ہوگا' آپ تو میرے کہنے سے تو پڑھیں گے اب کیا تھا مجبوراً نماز شروع کرنا پڑی اور مولوی صاحب کی یہ برکت تھی کہ اول ہی وقت یہ بات خیال میں آئی کہ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ بدون وضو نماز نہیں ہوتی یہ تو ان کی شفقت تھی کہ مجھ کو راہ پر لگا دیا اور قطع حجت کے لیے یہ گنجائش دے دی تو بے وضو پڑھنے کی نوبت نہیں آئی اور خود مولوی صاحب کو بھی یہی مقصود تھا اور ان رئیس کے فہم پر اعتماد تھا تو وہ گنجائش صرف صورۃ تھی' حقیقتاً نہ تھی۔ پھر جب بار بار واڑ ہی چڑھانے میں دقت معلوم ہوئی اڑ ہی بھی چھوڑ دی' بس اہل اللہ میں اس قدر شفقت ہوتی ہے کہ خلق خدا کو اولاد کے برابر اور بھائیوں کے برابر سمجھتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھو کہ غیروں سے ہرگز سختی نہ کرو ہاں جس پر تمہاری حکومت ہو اس کے ساتھ سیاست سے کام لو ہر جگہ سختی نہ کرو' یہ شفقت ہی کا اثر ہے کہ اسلام اس قدر پھیلا۔

حقانیت اسلام

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کے متعلق ارشاد ہے: "وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ" یعنی اگر آپ بدگو اور سخت ہوتے تو کوئی بھی آپ کے پاس نہ پھٹکتا سب ادھر ادھر بھاگ جاتے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ آپ کے پاس مسلمانوں کا بہت اجتماع تھا تو معلوم ہوا کہ آپ بدگو اور سخت نہ تھے جیسا کہ تاریخ سے بخوبی ثابت ہے یہ وجہ ہے اجتماع کی اور حیرت ہے کہ آج کل بعض لوگ تاریخ کو بھی نہیں دیکھتے اور بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا اس کا جواب مولانا محمد قاسم صاحب نے خوب دیا تھا کہ شمشیر کے لیے شمشیر زن کہاں سے آئے تھے اگر وہ شمشیر زن بھی بزور شمشیر آئے تھے تو یہ سلسلہ تسلسل کو مستلزم ہے لامحالہ کہیں کہنا پڑے گا کہ شمشیر زنوں میں اسلام بلا زور شمشیر آیا تھا۔ جب کچھ لوگوں میں اسلام بلا زور شمشیر آیا تو اوروں میں اس طرح آنے سے کون چیز مانع ہے پس ثابت ہو گیا کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا اسلام تو اصلاح کے لیے اور تلوار رفع شر کے لیے ہے نہ کہ اصلاح کے لیے جہاد سے اشاعت اسلام مقصود نہیں بلکہ حفاظت اسلام مقصود ہے لوگ ان دونوں میں فرق نہیں سمجھتے اس کے لیے خواہ مخواہ اعتراض کرتے ہیں جن لوگوں کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بزور شمشیر اسلام پھیلایا۔ ان کے حالات دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام تلوار سے پھیلایا یا اپنی پاکیزہ تعلیم سے نہ حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلامی لشکر کے سردار تھے' ایک جگہ جنگ میں عیسائیوں سے عارضی صلح ہوئی ایام صلح میں لشکر اسلام کے سپاہی کے ہاتھ سے ان کے بادشاہ

کی تصویر کی آنکھ پھوٹ گئی' عیسائیوں کو سخت ناگوار ہوا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شکایت کی کہ اس وقت تو مسلمانوں کا پلہ ہر طرح سے غالب تھا۔ یہ ممکن تھا کہ ساعت بھی نہ کرتے بلکہ اس تصویر کو بھی اکھاڑ کر پھینک دیتے مگر اسلامی تعلیم کا اثر دیکھئے کہ انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور کہا کہ ہم نے قصداً ایسا نہیں کیا اور ہم اس کا بدلہ دینے کو تیار ہیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہو گئے کہ اس تصویر کے بدلے تم میری آنکھ پھوڑ لو۔ بس فوراً ہی مخالفوں کی گردنیں جھک گئیں' یہ اخلاق تھے جنہوں نے اسلام کو پھیلایا اور آنکھیں بند کر کے تو جس کا جی چاہے کہہ لے میں کہتا ہوں کہ تلوار کے زور سے اگر اسلام پھیلایا بھی جائے اور بزور کسی کو مسلمان بھی کیا جائے تو اس کا اسلام ایسا ہونا چاہیے کہ تلوار ہٹتے ہی ندارد ہو جائے وہ کون چیز تھی جو تلوار ہٹنے کے بعد بھی اسلام کو قلوب میں برقرار رکھتی تھی وہ اسلام کی حقانیت ہی تھی کہ ایک دفعہ کلمہ پڑھنے کے بعد جان جاتی رہے مگر اسلام نہیں چھوٹ سکتا اور پھیلانے کا ذریعہ اخلاق تھے جس کا نمونہ مولانا مظفر حسین صاحب کے بعض واقعات سے معلوم ہوا ہے انہی بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ راستہ میں ایک بوڑھے کو دیکھا کہ بوجھ سر پر لئے ہوئے آ رہا ہے اور تھک گیا ہے آپ سے نہ رہا گیا اس سے کہہ سن کر اس کا بوجھ اپنے سر پر رکھ لیا حالانکہ خود بھی جوان نہ تھے' اس نے کہا بھی کہ میاں جی تم بھی بوڑھے ہی ہو کہا کہ میں اول تو تجھ سے کم بوڑھا ہوں دوسرے تازہ دم ہوں اس کا بوجھ لئے دور تک چلے گئے اور اس سے باتیں کرتے رہے اس نے کہا کہ میں مولوی مظفر حسین سے ملنے کا بہت مشتاق ہوں سنا ہے کہ وہ آج کل ادھر آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں میں ان سے ملا دوں گا یہاں تک کہ جب اس کے گاؤں میں پہنچ گئے وہاں پہنچ کر پھر اس نے کہا کہ بھائی یاد رکھو مجھ کو مولوی مظفر حسین سے ضرور ملائیو اس وقت فرمایا کہ مظفر حسین تو میں ہی ہوں وہ نہایت شرمندہ ہوا اور ان کے قدموں میں لوٹنے لگا' مولانا نے کہا کہ بھائی شرمندگی کی کیا بات ہے ایک مسلمان کا کام کر دیا تو کیا ہو گیا اور انہی مولانا کی حکایت ہے جو بالکل اس کی مصداق ہے:

شنیدم کہ مردان راہ خدا　　دل دشمنان ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام　　کہ بادوستانت خلاف است و جنگ

(یعنی میں نے سنا ہے کہ مردان راہ خدا نے دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ نہیں کیا ہے تجھ کو یہ مرتبہ کب حاصل ہو سکتا ہے اس لیے کہ دوستوں کے ساتھ بھی تیری لڑائی اور ان سے مخالفت ہے)

ایک قصبہ ہے بیڈولی کسی سفر میں مولانا وہاں پہنچے اور سرائے میں ٹھہرے وہاں ایک مہاجن بھی مع اپنے لڑکے کے ٹھہرا ہوا تھا لڑکے کے ہاتھ میں سونے کے کڑے تھے' اس نے مولانا سے سب پتہ وغیرہ پوچھا جیسے آپس میں مسافر پوچھتے ہیں کہ آپ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے مولانا نے فرمایا کہ میں صبح کو فلاں جگہ جاؤں گا۔ چنانچہ مولانا شب کو تہجد پڑھ کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے اس بنیے کی جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا تو لڑکے کے ہاتھ میں کڑے ندارد' حضرت مولانا نہایت غریبانہ حالت سے دیکھ رہے ہیں' بنیے نے خیال کیا کہ ضروری غریب سا آدمی جو یہاں ٹھہرا ہوا تھا کڑے اتار کر لے گیا' اس نے پتہ تو مولانا سے پوچھ ہی لیا تھا' بس اٹھ کر سیدھے اس کی طرف کو ہولئے' مولانا جا ہی رہے تھے بنیے نے آواز دی' حضرت نے فرمایا کہ بھائی کیوں کیا ہے اس نے پاس جا کر ایک گھونسا لگایا اور کہا کڑے لے کر چلے آئے اور کہتے ہیں کیا ہے' چلو تھانہ کو اس پر حضرت نے جی میں کہا کہ تو کیوں ایسی حالت میں رہتا ہے جو اس کا تیری طرف ایسا خیال ہوا تیرا علاج یہی ہے۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ بھائی چل چنانچہ چلتے چلتے جھنجانہ کے قریب آئے تھانہ آبادی کے باہر تھا' تھانیدار مولانا کا معتقد تھا جوں حضرت مولانا کو دور سے دیکھا' سروقد تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا' اب تو بنیا گھبرایا اور سمجھا یہ کوئی بڑے آدمی ہیں' مولانا نے فرمایا ڈرو مت میں تجھے کچھ نہ کہنے دوں گا۔ چنانچہ تھانیدار نے جب اس کی خبر لینی چاہی تو مولانا نے کہا اگر اس سے کچھ بھی کہو گے تو مجھے سخت تکلیف ہوگی اور بنیے سے کہہ دیا جا بھاگ جا بھاگ جا پھر مولانا فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس واقعہ سے بڑا نفع ہوا' جب لوگ مجھ سے مصافحہ کرتے ہیں اور ہاتھ چومتے ہیں تو میں خیال کرتا ہوں کہ مظفر حسین اللہ پاک کا تجھ پر بڑا فضل ہے کہ تجھے ان لوگوں کی نظر میں معزز بنا دیا ہے ورنہ تیری حیثیت تو وہی ہے جو اس بنیے کی نظر میں تھی یہ ہیں اخلاق اہل اللہ کے اور یہ ہیں تواضع کہ دل دشمنان ہم نکردند تنگ (دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ نہیں کیا) کتاب میں تو پڑھا ہی ہوگا مگر یہ اس کی نظیریں اس زمانہ تک موجود ہیں۔

عزت کی قیمت

اب تو کسی کو ایک سخت لفظ کہہ دینے سے توہین کی نالش ہوتی ہے کہ میری ہتک عزت کی گئی ایک لاکھ روپیہ معاوضہ دلایا جائے' آج کل ان چیزوں کی بھی قیمت مقرر ہوئی ہے جو متقوم نہیں بس بات یہ ہے کہ ہر طرح روپیہ کی کمائی چاہیے' روپیہ ایسا مقصود بالذات ہوا ہے کہ ہر چیز

کا عوض بن سکتا ہے عزت کا عوض بھی روپیہ ہو گیا' کیا ادنیٰ چیز کو عزت کا عوض بنایا حالانکہ عزت تو بے بہا چیز ہے کیونکہ وہ عظمت خداوندی کی ایک جھلک ہے اس کو بھی اہل اللہ ہی سمجھ سکتے کہ عزت کی قیمت کیا چیز ہے مگر آج کل یہ مذاق ہو گیا ہے کہ مال کو عزت کی قیمت اور عوض بناتے ہیں ایک مذاق تو یہ ہے اور اہل تحقیق کا دوسرا مذاق یہ ہے انہوں نے ایک اور چیز کو اس کا عوض سمجھا وہ عوض یہ ہے کہ اس سے صفت تواضع کی تکمیل ہوگئی اور اس میں یہ فائدہ سمجھے کہ پھر ان کو ہاتھ واتھ چومنے سے عجب نہ ہوگا یہ کس قدر گراں بہا چیز ہاتھ آئی' یہ نعمت ملنا کس قدر رحمت خداوندی ہے اور جب مال عزت کی قیمت بن سکتا ہے تو رحمت خدا اس کی قیمت کیوں نہیں بن سکتی۔ رحمت خدا تو بڑی چیز ہے بس دونوں مذاقوں میں فرق یہ ہے کہ آپ لوگ تو مال ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں وہ رحمت خدا کو سب کچھ سمجھتے ہیں ان کی عزت تو ایسی ہے کہ مال کی کوئی مقدار بھی اس کا عوض نہیں بن سکتی اور رحمت خدا اتنی بڑی ہے کہ قلیل جزو بھی بڑی سی بڑی عزت کا عوض بن سکتا ہے اس لیے انہوں نے اس کو کافی معاوضہ سمجھا' اس واسطے اور کوئی تدارک نہیں کیا بلکہ اور کوئی تدارک کرتے ہوئے یہ خوف تھا کہ وہ معاوضہ نہ جاتا رہے تو اب اس کی مثال ایسی ہوگی کہ ایک بچہ کے ایک چپت ماریں پھر اس کو راضی کرنے کے لیے ایک پیسہ اور ایک اشرفی اس کے سامنے رکھیں اور اس سے کہہ دیں ان دونوں میں سے ایک لے لیں تو میں اب پوچھتا ہوں کہ اس کی عقلمندی کس صورت میں ہے جس شخص نے کبھی اشرفی نہیں دیکھی وہ تو یہ رائے دے گا کہ پیسہ لے لو کیونکہ پیسہ کام کی چیز ہے اس کی جلیبی آ سکتی ہے اور اشرفی اور ٹھیکرا اس کے نزدیک برابر ہے اور جس نے اشرفی دیکھی ہے وہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ پیسہ لے لے۔ وہ تو یہی کہے گا کہ ایسے ایسے صدہا پیسے اور بھی دے کر اشرفی مل جائے تو مت چھوڑنا' سو آج لوگوں کی نظر پیسے پر ہے کیونکہ پیسہ دیکھا ہے اشرفی کبھی دیکھی ہی نہیں جب گریں گے پیسہ ہی پر گریں گے۔

صاحبو! رحمت خدا وہ چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے لوگوں نے سلطنتیں چھوڑ دیں' پیسہ اور روپیہ کیا چیز ہے ایک خلق حسن کا حاصل ہونا بندگان خدا کے نزدیک دنیا اور مافیہا سے بھی زیادہ قیمتی ہے ان کو ایک گھونسا کھانے کے بعد یہ عوض مل گیا تو کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کو کھو دیتے اور اس سے بدلہ لے لیتے بلکہ وہ اس کے ممنون احسان ہوئے ہوں گے' دنیا کچھ کہا کرے ان کی نظر حق تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جو حق تعالیٰ کو اچھی لگے وہی ان کے نزدیک اچھا ہے ورنہ کچھ بھی

نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ تواضع ایک صفت حسن ہے اور نہایت ضروری کیونکہ مقابل کبر کا ہے اس کو جس طرح ممکن ہو حاصل کرنا چاہیے' مبتدی کے لیے اس کی تحصیل کا طریقہ یہی ہے کہ بہ تکلف وہ افعال کیے جاویں جو عرف کے خلاف ہوں' بازار سے سودا خود خرید لایا کرو' آج کل یہ بھی امیری کا جزو ہو گیا ہے کہ اپاہج بنے بیٹھے رہو اور تکلیف اٹھاؤ مگر خود سودا خریدنے بازار نہ جاؤ اور امیر تو امیر معمولی آدمی بھی اس کے عادی ہو گئے ہیں جس کے نتائج سے خود بھی نالاں ہیں اور زیر باری کے مارے مرے جاتے ہیں اور کہتے ہیں خرچ پورا نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے مال حرام لینا پڑتا ہے۔ صاحبو! یہ کیا خرافات ہے چھوڑ دان تکبر کی رسموں کو یہ عادت خود شریعت کے بھی خلاف ہے' بازار میں جانا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت۔ ہے خود قرآن شریف میں موجود ہے: "مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ" (اس رسول کو کیا ہوا کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے) اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بازار جایا کرتے تھے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ بازار جانے پر اعتراض کرنا مسلمانوں کا کام نہیں کیونکہ اس کو حق تعالیٰ نے مقولہ کفار کا بتلایا ہے اور کفار کی سی عادتیں اختیار کرنا اور ان کی باتیں کہنا معمولی بات نہیں کیونکہ آدمی کو جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے اسی کی بات پر تقلید کیا کرتا ہے اور حدیث شریف میں آ چکا ہے کہ آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اسے محبت ہو چنانچہ ارشاد ہے المرء مع من احب تو نتیجہ یہ ہوا کہ جس کے افعال کی تقلید کی جائے گی قیامت میں اسی کے ساتھ ہوگا۔ اب آپ سوچ لیجئے کہ یہ معمولی بات ہے یا خطرناک ہے۔

خدا کا حق

صاحبو! اس کو معمولی بات نہ سمجھئے گو دیکھنے میں یہ ذرا سی بات ہو لیکن بہت بڑی بات ہے۔ علاوہ تقلید کفار کے اس کا دوسرا منشا یہ ہے جس کی نسبت حق تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتے ہیں: "العظمة ازاری والكبرياء ردائی من ناز عنی فبهما قصمته"[1] (عظمت میرا تہ بند اور بڑائی میری چادر ہے جو کوئی ان دونوں کے بارے میں مجھ سے جھگڑا

[1] اتحاف السادة المتقين ۸: ۳۳۸' بلفظ آخر

کرے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا) یعنی عظمت اور بڑائی میری خاص صفت ہے جو کوئی اس میں میرا شریک بننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔ مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی کا قصہ ہے کہ حجام خط بنانے کو آیا تو مولانا اس وقت چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھے تھے' مولانا نے سرہانے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ بھائی بیٹھ جا اس نے سرہانے بیٹھنے سے انکار کیا' مولانا نے فرمایا تو تو کھڑا ہے تیرے ساتھ سب جگہوں کی برابر نسبت ہے پھر تو خالی جگہ میں نہیں بیٹھتا اور میں بیٹھا ہوا ہوں مجھے کیا ضرورت ہے کہ بیٹھا ہوا اٹھوں' حجام نے عرض کیا کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ سرہانے بیٹھوں' مولانا نے فرمایا کہ پھر بھائی تو حجامت بنا بھی دے یہ تو اٹھیں گے نہیں' اب تو یہ حالت ہے کہ سرہانے بٹھانا کیسا اگر حجام السلام علیکم بھی کہے تو جوتیاں پڑیں' حجام کو سرہانے بٹھانا تو بڑوں کا کام ہے ہر شخص سے اتنا نہیں ہوسکتا مگر جن باتوں میں شریعت نے سب کو برابر رکھا ہے ان میں حدود شریعت کے اندر رہنا چاہیے جیسے سلام و مصافحہ وغیرہ کہ ان امور میں شریعت نے چھوٹے بڑے میں تفضیل نہیں کی ان میں اپنی طرف سے فرق کرنا گویا شریعت میں اصلاح دینا ہے جس کا اصل منشا تکبر ہے مثلاً جماعت میں چھوٹوں کے ساتھ کھڑے ہونے سے عار نہ کرنا بعض لوگ مسجد میں نماز اس لیے نہیں پڑھتے کہ گھٹیا لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا۔ یہ کیا خرافات ہے ان کو چاہیے کہ پھر اس دنیا میں نہ رہیں جس میں گھٹیا لوگ آباد ہیں اور قیامت کے دن اس جنت میں بھی نہ جاویں جس میں گھٹیا لوگ غرباء جاویں گے بلکہ امراء سے زیادہ جاویں گے' کچھ حد ہے اس خودداری کی آجکل ایسا مذاق بگڑا ہے کہ ایک حکیم صاحب کے بچے نے ان کی گود میں ہم لوگوں کے آنے کے وقت کہا السلام علیکم تو اس پر اس کو سرزنش کی گئی کہ آداب عرض کہا کرو اس کا مقابلہ تو دیکھئے جی تو چاہتا ہے کہ یوں کہوں کہ خدا کی مار ہو اس تعلیم کرنے والے پر مگر خیر بجائے اس کے یہ کہتا ہوں کہ خدا کی سنوار ہو اللہ اصلاح کرے شریعت نے صیغہ سلام میں چھوٹے بڑے میں کچھ تفضیل نہیں رکھی' ہاں لہجے میں فرق ہونا چاہیے یہ توقیر کبیر میں داخل ہے جس کی تعلیم شریعت میں ہے جس کی ایک جزئی یہ بھی ہے کہ چھوٹے بڑے

کے سامنے دبی ہوئی آواز سے اور نیاز مندانہ لہجہ سے بولے اور کچھ سلام ہی پر موقوف نہیں ہر قسم کے کلام میں اس کا خیال رکھے، پس جب کوئی تم سے عمر میں یا رتبہ میں چھوٹا ابتداء بالسلام کرتا ہے اور اپنے رتبہ کے مواقف نیاز مندانہ لہجہ سے سلام کرتا ہے تو یہ فرق حفظ مراتب کے لیے کافی ہے اتنے فرق کی شریعت نے اجازت دی ہے اس سے آگے بڑھنا تکبر ہے اب حجام چھوٹا بنتا ہے اور نیاز مندی سے سلام کرتا ہے تب بھی اس پر اعتراض ہے واللہ تکبر نے قلوب کو چر لیا۔ آج کل کے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے سامنے ایسے رہیں جیسے جماد محض خدا نے تو ان کو انسان بنایا اور یہ ان کو جماد بنانا چاہتے ہیں یہ تو حق تعالیٰ کے کام میں اصلاح دینا۔ ہے حجام تو آپ کی اصلاح سے گھٹیا ہو یا نہ ہو مگر آپ اس اصلاح سے ضرور گھٹیا ہو جاویں گے اور عنداللہ شر الخلائق قرار دیئے جاویں گے، حجام کو سرہانے نہ بٹھایا نہ سہی پائنتی ہی بٹھاؤ مگر جس بات میں شریعت نے فرق نہیں کیا تو اس میں تو فرق نہ کرو بلکہ ہر جگہ چھوٹوں کو سراہنے بٹھانا مناسب بھی نہیں کیونکہ اس میں ان کا بھی نقصان ہوگا ان میں تکبر پیدا ہو جاوے گا اس سے ان کا دین بھی غارت ہوگا اور دنیا کا بھی نقصان ہوگا کہ کہیں سرہانے بیٹھنے سے پٹ نہ جاویں ہاں اگر اس کا اطمینان ہو کہ وہ سرہانے بیٹھنے سے متکبر نہ ہو جاویں گے تو مضائقہ نہیں غرض تکبر ایسا مرض ہے جس کے علاج سے غفلت نہ چاہیے یہ مرض صرف جہلا اور عوام ہی میں نہیں بلکہ اچھے اچھے ثقہ لوگوں میں بھی موجود ہے اور اس کا علاج تواضع ہے اور اس مرض اور علاج کی ہر وقت نگرانی کرنا چاہیے۔ بعض باتیں بہت خفیف ہوتی ہیں مگر منشاء ان کا یہی ام الامراض یعنی کبر ہوتا ہے اس وقت اس کے معالجہ کے لیے کوئی صورت تواضع کی بالقصد اختیار کرنا چاہیے۔

تدابیر اصلاح

میں ہر شخص کے لیے تواضع کی تدابیر کہاں تک بتاؤں علاج مشترک یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی محقق مبصر کے سپرد کر دو اور اس کو تمام حالات کی اطلاع کیا کرو اور وہ جس موقع و محل میں جو تدبیر کرے اس کو اختیار کرو اس طرح تواضع حاصل کرو یہ کبر ایسی چیز نہیں ہے جس سے غفلت

کی جائے اللہ والوں نے اس کے علاج کے لیے بڑے بڑے مجاہدے کیے ہیں۔ مولانا اسماعیل صاحب مسجد میں سو جاتے مسافروں کے پیر دبایا کرتے تھے صرف اسی واسطے کہ تواضع اور تذلل پیدا ہو ایک دفعہ مولانا سفر میں لشکر سے نکل کر شہر کی کسی مسجد میں جا ٹھہرے مؤذن عام طور سے مسافروں سے جلا کرتے ہی ہیں ان کو بھی منع کیا' مولانا نے اس کا کہنا نہ مانا اس نے دھکے دے کر ان کو نکال دیا۔ مولانا تھوڑی دیر میں پھر اسی مسجد میں آ گئے' اس نے پھر نکال دیا کئی دفعہ ایسا ہی ہوا' آخر اس نے تنگ ہو کر کہا اچھا بھائی بیٹھ تھوڑی دیر میں لشکر سے دو سوار مولانا کو ڈھونڈتے ہوئے آئے اب تو مؤذن کے ہوش خطا ہوئے اور سمجھا کہ اب پٹوں گا یہ کوئی بڑے آدمی ہیں۔ مولانا نے کہا کہ ڈر مت تجھے کوئی کچھ نہ کہے گا میں جاتا ہوں تجھے کھانا بھی بھجوا دوں گا وہ پیروں میں گر گیا اور معافی چاہی پھر پوچھا آپ نے ایسا کیوں فرمایا' یہ میں نے اپنا علاج کیا مجھے کسی وجہ سے خیال ہو گیا تھا کہ لوگ مجھ کو بڑا سمجھتے ہیں اس کبر کا یہ علاج کیا کہ دھکے کھائے یہ اس مادہ فاسدہ کا مسہل ہو گیا' اہل اللہ اس طرح اس کا علاج کرتے ہیں وہ اس کو امراض جسمانی کی طرح بلکہ اس سے بھی اشد سمجھتے ہیں' دیکھئے جو لوگ محتاط ہیں اور حفظ صحت کے شوقین ہیں وہ بلا ضرورت بھی ہر فصل میں جاڑے بخار کا علاج بطور حفظ ماتقدم کیا کرتے ہیں اسی طرح اہل اللہ نے ادنیٰ مظنہ کے موقع پر کبر کا علاج ضرور کر لیا ہے تاکہ نوبت اس کے وقوع کی آوے ہی نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک مرتبہ دیکھا گیا کہ کمر پر مشک لادے ہوئے مسلمانوں کو پانی پلاتے پھرتے تھے' پوچھا گیا کہ اے امیر المومنین یہ کیا ہے کہا کچھ لوگ بطور وفد آئے تھے میری مدح کی اس سے نفس میں انبساط پیدا ہوا اس کا میں نے یہ علاج کیا' حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کرتا پہنا' وہ اچھا معلوم ہوا تو آپ نے اس کی آستین بالشت بھر کاٹ دیں تاکہ عیب پڑ جائے اور بدنما ہو جائے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن سے زیادہ کامل النفس کوئی نہیں ہو سکتا ان کو اتنا اہتمام اس مرض کا تھا اس بھروسہ پر نہ رہتے تھے کہ ہم نے تہذیب نفس کر لی ہے اور ایک دم بھی غوائل نفس سے غفلت نہ کرتے تھے ہم کس خیال میں ہیں کہ ذرا ذکر شغل کر لیا اور مطمئن ہو گئے کہ اب ہم نفس و شیطان کے کید میں نہیں آ سکتے یاد رکھو کہ جس وقت آدمی اپنے آپ کو اچھا لگتا ہے اس وقت خدا کو برا لگتا ہے یہ حضرات عشرہ مبشرہ میں

سے ہیں جن کی نسبت پورا اعتماد ہے کہ جنت میں ضرور جائیں گے مگر پھر بھی ان کی یہ حالت ہے کہ غوائل نفس سے غافل نہیں تھے تابماچہ رسد (ہماری تو کیا حقیقت) اگر ہم مان بھی لیں کہ کسی نے تہذیب نفس کامل ہی کر لی تب بھی اس کو بے فکر ہو جانا کیا معنی تہذیب کامل ہو جانے کے وقت وہ بے شک تندرست ہے پھر کیا تندرست ہمیشہ کے لیے تندرست رہا کرتا ہے کیا ہم کو تندرستی کے بعد بیماری نہیں آتی کیا ممکن نہیں کہ کسی وقت کامل کو بھی تکبر کا مرض پیدا ہو جائے جیسے ہم کو تندرستی کے بعد بیماری آ جاتی ہے اور یہ علی سبیل التنزیل کہا جاتا ہے ورنہ ہم تندرست ہی کون سے ہوئے تھے ہمیشہ بیمار ہی رہے اور بیماری بھی ایک نہیں ہے مرض کے اندر مرض' مرض کے اندر مرض بھرے پڑے ہیں ہم تو پچ مچ گند در گند ہیں' ان امراض کی شرح کہاں تک کی جاوے بس اس کی اصلاح کی تدبیر یہی ہے کہ اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دو وہ تفصیل جانتا ہے ہر موقع و محل پر مناسب تدبیر بتادے گا آپ کو تفصیل وغیرہ یاد رکھنے کے بارے سے سبکدوشی رہے گی' اگر کسی وجہ سے یہ میسر نہ ہو تو اس فن کی کتابیں ہی دیکھو اور متواضعین کی حکایت پڑھتے ہی رہو' یہ ہے ابتدائی علاج اس حدیث میں بصورت اخبار اس کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس طرح پر کہ اس پر ایک وعدہ بھی کیا گیا ہے "من تواضع لله رفعه الله" یعنی جو کوئی تواضع اختیار کرے اس کو حق تعالیٰ رفعت عطا فرمائیں گے اس کے یہ معنی نہیں کہ تواضع عند الشرع کوئی مطلوب چیز نہیں اگر کسی کو رفعت کی خواہش ہے تو وہی اس کو اختیار کرے بلکہ اس کا واقعی نتیجہ بتلایا گیا ہے رہا تواضع کا مطلوب اور مامور بہ ہونا وہ بجائے خود ثابت شدہ چیز ہے' ثمرات کا بیان اس واسطے کیا جاتا رہا ہے تا کہ اس سے زیادہ شوق پیدا ہو' مطلب یہ کہ قطع نظر اس کے ضروری ہونے سے اگر رفعت چاہتے ہو تو وہ بھی اسی سے پیدا ہوگی۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزت شو　　　کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

(اگر تجھ کو شہرت کی ہوس ہے تو گوشہ نشینی اختیار کر اس لیے کہ گوشہ گیری نے عنقا کے نام کو مشہور کر دیا)

پس اگر رفعت کی تحصیل کی خواہش ہے تو اس کی تدبیر بھی تکبر نہیں ہے۔ جیسا کہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اس کی تدبیر بھی یہی ہے تواضع اختیار کرو مگر اللہ کی قید بھی یاد رہے کہ اللہ کے واسطے

تواضع اختیار کرو نہ بقصد شہرت و رفعت دے گا۔ یہ حدیث کا وعدہ ہے اور حدیث میں دنیا و آخرت کی بھی قید نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ دونوں جگہ رفعت نصیب ہوگی۔ ذوقی نے خوب کہا ہے:

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا آسمان آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

(اللہ تعالیٰ تواضع کرنے والے کو دنیا میں بھی بڑائی دیتا ہے اور آخرت میں تو ہے ہی) چنانچہ دنیا میں تعریف ہوتی ہے کہ فلاح شخص بڑے منکسر المزاج ہیں اپنے آپ کو کھینچتے نہیں ہر شخص سے لپے جالے ہیں اور جب اس میں بناوٹ نہیں دیکھتے تو اس کی محبت اور وقعت قلوب میں ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ بڑے سے بڑے حاکم اور بادشاہ کی بھی نہیں ہوسکتی، کوئی اس کا مخالف نہیں رہتا، ہر شخص کو اس کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے پھر ایسے شخص کی زندگی کیسی اچھی زندگی ہوگی چونکہ اس مضمون کی عام ضرورت تھی اس واسطے بیان کیا گیا (یہاں پہنچ کر عصر کی اذان ہوئی تو سکوت کیا اور فرمایا میں بیان کو دو منٹ میں ختم کرتا ہوں) بعد اذان فرمایا میں بیان ختم کر چکا صرف نام رکھنا باقی ہے اس وقت تحصیل رفعت کا طریقہ بیان ہوا ہے اور مقام کا نام قنوج ہے تو وعظ کا نام رفعت قنوج ہونا چاہیے تھا مگر لفظی رعایت کے لیے رفعت کا ترجمہ اوج کر دیا جائے تو اوج قنوج کا نام مناسب ہے اور راز اس نام میں یہ بھی ہے کہ قنوج اس وقت بہت پستی کی حالت میں ہے حالانکہ کسی وقت بہت بڑی جگہ تھی۔

اور اس پستی کی تمام تر وجہ نا اتفاقی ہے اور نا اتفاقی کی وجہ کبر ہے اور ظاہر ہے کہ علاج بالضد ہوا کرتا ہے کبر کی ضد تواضع ہے جس کا آج بیان ہوا، کبر کا اختیار کرنا باعث ہوا پستی کا تو اس کے ضد کا اختیار کرنا باعث ہوگا رفعت کا تو اس بیان پر عمل کرنا باعث ہے اوج و رفعت کا زمانہ کے عقلاء ترقی کی وہوم مچاتے ہیں اور اس کی صورتیں سکھلاتے ہیں مگر ترقی کی جڑ نہیں سکھلاتے وہ جڑ تواضع ہے جس پر اس وقت مفصل بحث ہوئی۔ لہٰذا اوج قنوج نام رکھا جاتا ہے اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم دین اور عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔

خلاصہ وعظ

"من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰه"[1] (جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بلندی و رفعت عطا فرماتے ہیں) امراض بہت ہیں جن کی تفصیل دشوار ہے مگر

---

[1] کنز العمال: ۵۷۳۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۱۱۹، مجمع الزوائد ۸: ۸۲

ام الامراض کبر ہے اس کا علاج اس حدیث میں ہے۔ یہ حدیث اس واسطے اختیار کی گئی ہے کہ یہ مرض عام ہے ہر قسم کے لوگوں میں حتیٰ کہ اہل علم میں بھی یہاں تک کہ بعض اپنے جہل پر قرآن وحدیث سے شہادت لاتے ہیں۔ مثلاً: "قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ" (آپ کہیے کیا عالم اور غیر عالم برابر ہو سکتے ہیں) ان کو وہ آیات واحادیث بھی یاد کرنی چاہیے جو عالم بے عمل کی مذمت میں وارد ہیں علاوہ براں کسی عامی کو بھی حقیر سمجھنا چہ معنی تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد (یار کس کو چاہتا ہے اور اسکا میل کس کی طرف ہو جاتا ہے) شبہ کیا خدائے تعالیٰ کے یہاں بھی کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں اس طرح تو نیکوکار اور بدکار سب برابر ہو جاتے ہیں اور وعدہ وعید کوئی چیز نہ رہا حالانکہ نصوص اس کے خلاف ہے جواب وعدہ اور وعید صحیح ہیں لیکن اعمال اگر چہ آپکے ارادہ پر ہیں تاہم ارادہ کا پلٹ دینا حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور یہی خوف کی وجہ ہے وعدہ اور وعید پر یقین چاہتے اور قدرت ارادہ سے خود (جیسا کہ ایک پابند قانون حاکم کے سامنے جانے سے خوف ہوتا ہے) ناز و انداز انکشاف و عظمت خداوندی نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ہمارے اعمال حق تعالیٰ کے سامنے کیا ہیں علاوہ ازیں ناز مکتسب چیز پر ہوتا ہے اور ہمارے اعمال کسی درجہ میں مکتسب سہی مگر درحقیقت علت ان کی مشیت حق ہے۔ ایک بزرگ نے ذکر اللہ کرنا چاہا مگر نہ کر سکے یاد آیا کہ جوانی میں ایک کلمہ بیہودہ زبان سے نکلا تھا یہ اس کی سزا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا ایک مرید ایک امرد پر نظر کرنے سے قرآن مجید بھول گیا جس کو علم پر ناز ہو وہ اس آیت کو یاد کرے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ہے:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا.

(یعنی اگر ہم چاہیں تو وہ تمام علوم جو آپ کو دیئے ہیں دفعۃً سلب کر لیں پھر آپ کا کوئی کارساز نہیں ہو سکتا، بس رحمت خدا ہی ساتھ دے سکتی ہے اللہ کا فضل آپ پر بڑا ہے) غرض مختلف طریقوں سے کبر قلوب میں موجود ہے اور یہ مرض ام الامراض ہے تمام عیوب اسی سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً غصہ حتیٰ کہ بعض وقت زبان سے ظاہر ہونے لگ جاتا ہے

چنانچہ بعض آدمی کہنے لگ جاتے ہیں تو جانتا نہیں کہ میں کون ہوں ایک ایسے ہی شخص کے جواب میں ایک بزرگ نے کہا کہ جانتا ہوں "**اولک نطفة مذرہ واخرک جیفة قذرہ وانت بین ذلک تحمل العذرہ**" (تو تو ایک پلید نطفہ تھا اور انجام کار ایک گندہ مردار ہو جائے گا اس کے درمیان یہ حالت ہے کہ نجاست کو پیٹ میں لیے پھرتا ہے) اور یہ واقعی بات ہے غلاظت سے کسی کا پیٹ بھی خالی نہیں حق تعالیٰ کی ستاری ہے کہ اس کو مستور کر دیا ہے مرض گندہ دہنی میں اس مستوری کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

تفریع بر گندہ دہنی

دین کے حقیقت شناس دو گروہ ہیں فقہاء اور صوفیاء فقہاء نے لکھا ہے کہ جس مریض سے جماعت کو ایذا ہو وہ نماز علیحدہ پڑھ لے تکثیر جماعت مہتم بالشان ہے اسی کی ضرورت سے امام کی صفات میں یہاں تک لکھا ہے کہ خوبصورت بیوی والا بھی گونہ ترجیح کے قابل ہے اور مقتدی کو لہسن اور پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مجذوبہ کو طواف سے منع کر دیا تھا حق تعالیٰ نے حیات میں پردہ ڈھکا ہے اور بعد موت بھی جنازہ کی تجہیز و تکفین میں تعجیل اور خوشبو لگانے میں یہی حکمتیں ہیں ایک نفع اس تعجیل میں یہ بھی ہے کہ مردے سے نفرت نہ ہو کہ وہ ایصال ثواب سے مانع ہو جاوے اس سے یہ بات بھی نکلی کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کے دماغوں کی حفاظت کی ہے تو ان کو جہنم میں کیسے چھوڑ دیں گے اگر ہم کو اپنی گندہ حالت یاد رہے تو کبھی تکبر نہ آئے اگر ویسے یاد نہ رہے تو ایک سہل مراقبہ روزمرہ کا یہ ہے کہ پاخانہ میں بیٹھ کر اپنی حالت کو دیکھا کیجئے اس وقت کی ہیئت میں غور کیا کیجئے اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہم کون ہیں اگرچہ بعض لوگ پاخانہ میں دلچسپی کا سامان لے جاتے ہیں یعنی اخبار دیکھتے ہیں خیر ان کی سزا یہی ہے کہ پاخانہ میں بند رہیں۔ آپ بجائے اس شغل دلچسپی کے اپنی حالت کا مراقبہ کیا کیجئے کہ یہ کیا ہیئت ہے اور ٹانگوں کے بیچ میں سے کیا نکل رہا ہے یہ بات ہے تو بیہودہ مگر کار آمد اس قدر ہے کہ حق تعالیٰ نے الوہیت مسیح کی نفی پر آیت "كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ" (وہ دونوں کھانا کھاتے تھے میں اسی استدلال کی طرف اشارہ کیا ہے) غرض اپنی اس حالت کو دیکھ کر یہ سمجھے کہ جو شخص دن میں دو تین مرتبہ نجاست میں مبتلا ہوتا ہے وہ کیا بڑا ہے اگر پانی پیدا نہ ہوا ہوتا تو ہر وقت سنے ہی رہتے۔ (اگرچہ سنا رہنا بھی

بعضے بھدی مذاق والوں کے نزدیک عیب نہیں رہا جیسا فیشن والوں میں مشاہدہ ہے کہ کاغذ سے استنجا کرتے ہیں جس سے صفائی نہیں ہوسکتی اوران کی پتلونیں سنی ہوئی ملتی ہیں پھر ٹب میں بیٹھ کر نہاتے ہیں اور وہ نجاست منہ تک میں جاتی ہے۔ طریقہ سنت چھوڑنے کی سزا یہی ہے پس جب ہمارے اندر یہ گندگیاں بھری ہوئی ہیں تو کیا بڑائی اور کس بات پر غصہ آوے اور غصہ خود بھی بری چیز ہے غصہ کے نتائج یہ ہیں کہ اگر قدرت انتقام ہو تو ظلم ورنہ کینہ اور حسد اور ایذا رسانی پھر مکر وفریب غرض یہ غصہ کبر کی فرع ہے تو کبر کا قبح اس سے زیادہ ظاہر ہوگیا۔ اسی کبر کے باب میں اور قرآن شریف میں ہے: "اِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ" (اللہ تعالیٰ متکبر شیخی باز کو پسند نہیں کرتے) اور "اِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ" (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے) یہ تین لفظ اس واسطے ہیں کہ کبر قلبی کبھی تہذیب کی وجہ سے مخفی رہتا ہے اس کے واسطے لفظ مستکبرین ہے اور تہذیب کی کمی سے اس کا ظہور ہونے لگتا ہے پھر اگر زبان سے ظہور ہو تو اس کی نسبت لفظ فخور ہے اور اگر صرف افعال سے ہو اس کے لیے مختال ہے فیشن بنانا بھی مختال میں داخل ہے۔ اس تکبر پر وعیدیں بہت ہیں مگر اس آیت میں لایحب آیا ہے یہ بھی کچھ کم نہیں بلکہ سب سے زیادہ ہے کیونکہ تمام وعیدوں کی انتہاء اسی پر ہوتی ہے اور اس میں بجائے یبغض کے لایحب فرمایا گیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ جملہ کاموں میں تین مرتبے ہیں، پسند ہونا اور پسند نہ ہونا اور گو برابر بھی نہ سمجھا جائے اور برابر سمجھنا ظاہر ہے کہ کبر قسم اول کا عمل تو یہ ہے نہیں اور قسمیں اخیرین میں سے بھی اخیر کا ہے مگر اس کے واسطے بجائے یبغض کے درمیانی قسم کا لفظ یعنی لایحب فرمایا اس میں اشارہ ہے کہ محبّ خدا کو تیسری قسم کے لفظ سنانے کی نوبت بھی نہیں آسکتی' درمیانی لفظ بھی اس کے مرجانے کے لیے کافی ہے' دیکھئے حکام کی نظر پھری ہوئی دیکھ کر اہل کاروں پر کیا گزر جاتی ہے اور محبّ خدا ہر مسلمان ہے خواہ وہ کیسا ہی عاصی اور گناہ گار کیوں نہ ہو اس محبت کا ظہور عوام سے بھی جانبازی کے وقت ہوتا ہے کہ خواص سے بھی زیادہ کام کر جاتے ہیں تو مسلمان کے لیے لایحب انتہائی لفظ ہے کیا بلاغت ہے اور ہر مسلمان کو جو میں نے محبّ خدا کہا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اول حق تعالیٰ کو عبد سے محبت ہوتی ہے پھر اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ عبد کو حق تعالیٰ سے محبت ہوجاتی ہے اور اس اولیت کی دو دلیلیں ہوتی ہے ایک نقلی ایک عقلی نقلی تو یہ ارشاد: "وماتشاء ون الا ان یشاء اللّٰہ" (ہم نہیں چاہ سکتے مگر جو اللہ چاہیں) تو اول ادھر سے توجہ ہوئی اور عقلی اس طرح کہ محبت

موقوف ہے معرفت پر اور معرفت تامہ حق تعالیٰ کی ہو نہیں سکتی کیونکہ وہ مرئی نہیں نہ اس کا کوئی نمونہ ہے "لیس کمثلہ شیء" (اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے) اور آثار سے پتہ چلتا ہے کہ انسان میں محبت خدا ضرور ہے تو ضرور وہ بارادہ وتوجہ باری تعالیٰ ہوئی یہاں سے اہل ظاہر کا بھی جواب ہو گیا انہوں نے محبت خدا کا انکار کیا ہے بدلیل مذکور یعنی وہ مرئی نہیں نہ اس کا کوئی مماثل ومشابہ ہے نیز اس واسطے کہ محبت نام ہے خاص تعلق کا جو موقوف ہے طرفین کی مناسبت پر اور ممکن اور واجب میں مناسبت نہیں تو انکی محبت کیسے ہو سکتی ہے جواب یہ ہوا کہ محبت محال جب ہی ہے کہ بندہ کی طرف سے مانی جاوے اور جبکہ حق تعالیٰ کی طرف سے مانی جاوے تو محال نہیں تو قدرت کے سامنے کوئی چیز محال نہیں اور حق تعالیٰ کی تو بڑی شان ہے اہل اللہ سے محبت بھی انہی کی طرف سے شروع ہوتی ہے اس کا شاہد یہ ہے کہ مرید کو اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا انکو ہوتا ہے غرض محبت حق بندہ کی غذا ہے تو اسکی ضد یعنی بغض تو بہت دور ہے بندہ کے مرجانے کے لیے تو عدم محبت ہی کافی ہے جو ترجمہ ہے لا یحب کا جیسے مرنے کے لیے یہی ضروری نہیں کہ زہر کھایا جاوے بلکہ منع غذا بھی قاتل ہے۔ یہ بیان ہے لا یحب کے انتہائی لفظ ہونے کا پس جبکہ کبر مبغوض ہوا تو اسکی ضد یعنی تواضع محبوب اور محمود ہوئی نیز تواضع علاج بھی ہے کبر کا اس وجہ سے بھی ضروری ہے مگر تواضع کے معنی سے لوگ علی العموم ناواقف ہیں جہلاء تو خاطر داری کو کہتے ہیں اور نئے تعلیم یافتہ اکثر تو لفظ تک بھی صحیح نہیں جانتے اور جو جانتے بھی ہیں وہ تصنع اور جھک جھک کر سلام کرنے کو سمجھتے ہیں حالانکہ تصنع تواضع نہیں بلکہ درحقیقت تکبر ہے جو ضد ہے تواضع کی تواضع کے حقیقی معنی پستی اور انکساری اختیار کرنا نہ صرف ظاہراً بلکہ قلب سے اسی لیے متواضعین جھک جھک کر سلام نہیں کرتے بلکہ کوئی ان کی مدح کرے تو اس پر بھی انکار نہیں کرتے تاکہ وہ خود ان کو بے حس یا مغرور سمجھ کر خاموش ہو جائے نہ نئے مذاق کی طرح کہ مدح کرنے پر شکریہ کیا جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسے ہی مدح کیا کرو اور اسی کا مستحق ہوں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کا یہی معمول تھا کہ مادح کے مدح پر خاموش ہو جاتے گویا متکبر ہیں کہ مدح پر انکار نہیں مگر تکبر کا نام ونشان نہ تھا ایک بار آموں کو دعوت میں سے سر پر رکھ کر بے تکلف لے آئے مگر اب تکبر کا نام وضع داری رکھا ہے جو حدود شرعیہ کے اندر مستحسن ہے لیکن اکثر وضاع کی بناء اس وقت کبر پر ہے تاوقت کہ مولانا کی طرح اصلاح نہ کر لی گئی ہو مگر آج کل خود اصلاح اخلاق ہی طرف توجہ نہیں ہے حالانکہ بزرگوں نے اس کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ مولانا مظفر حسین

صاحب کرایہ کی بہلی میں سے صرف اسی لیے اتر پڑے کہ وہ رنڈی کی تھی لیکن دل شکنی کے خیال سے اس کو واپس نہ کیا اور کرایہ دیا یہ ہے حقیقی دین باقی کتابوں سے صرف ضابطہ دین کا آتا ہے اور ایسا حقیقی دین کسی کی جوتیاں سیدھی کرنے بلکہ جوتیاں کھانے سے آتا ہے چنانچہ اہل اللہ تمام اخلاق کی تکمیل کرتے ہیں تقویٰ کے ساتھ دل شکنی بھی نہیں کرتے نیز نرمی کے ساتھ کام لیتے ہیں مگر جبکہ اصلاح بغیر سختی کے نہ ہو سکے اس وقت سختی بھی کرتے ہیں ان ہی مولانا مظفر حسین صاحب نے نرمی سے ایک پہلوان کو نمازی بنادیا' ان ہی بزرگوں نے ایک رئیس کو بے وضو نماز کی صورت اجازت دی مگر وہ انکی برکت سے باوضو پڑھنے لگا تو غیروں پر سختی نہ کرنا چاہیے ہاں جس پر حکومت ہو اس پر باضرورت مضائقہ نہیں یہی اخلاق ہیں جن سے اسلام پھیلا ہے نہ بزور شمشیر کیونکہ شمشیر زنی کے لیے شمشیر زن کہاں سے آئے تھے اسی اخلاق سے واقعات اس کے شاہد ہیں جن سے اسلام پھیلا ان کی یہ حالت تھی کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کافر بادشاہ کی تصویر کی آنکھ کے بدلے صلح کی بناء پر اپنی آنکھ پھوڑ وانے کے لیے تیار ہو گئے حالانکہ کفار پر غالب تھے بس ان اخلاق سے اسلام پھیلا ہے نیز شمشیر سے رفع شر ظاہر ہوتا ہے نہ کہ اصلاح قلبی اور اسلام نے اصلاح کی ہے نیز اگر اسلام بزور شمشیر کسی سے قبول بھی کروالیا جائے تو اس کو بقا کس چیز سے ہو سکتی ہے سوائے حقانیت کے وہ حقانیت اخلاق ہی سے قلب میں گھستی ہے۔ ان ہی مولانا کی تواضع کی یہ حالت تھی کہ ایک بوڑھے کا بوجھا اپنے سر پر رکھ کر گاؤں تک پہنچا دیا اور ایک بنیے کی سختی پر صبر کر لیا جس نے ایک شبہ میں سختی کی تھی اور باوجود قدرت انتقام کے کچھ بھی نہ کہا بلکہ خوش ہوئے کہ اب مجھ میں مصافحہ میں ہاتھ چومے جانے کے وقت عجب پیدا نہ ہوگا اسی سختی کو یاد کرلوں گا غرض تواضع کی ایک صفت حسنہ ہے جو کبر کا مقابل ہے اس کی تحصیل کی تدبیر کرنی چاہیے' بازار سے خود سودا خرید لایا کرو اور نفس کو عار ہو تو سر پر لادو امیروں کی طرح اپاہج مت بنو تا کہ تکبر نہ پیدا ہو اور اس سے دنیوی ضرر بھی تو ہے چنانچہ تکبر کے آثار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خرچ بڑھتا ہے اور مال حرام کمائی کی ضرورت پڑتی ہے جو دنیا میں بھی مضر ہے اور تواضع کی جو تدبیر اوپر بتلائی گئی کہ بازار سے سودا لے آیا کریں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اس پر اعتراض کفار کا کام ہے: "قال الله تعالىٰ وَقَالُوا مَا لِهٰذَا الرَّسُوْلُ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ" (یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے) اور ان باتوں میں کفار کی تقلید کرنا صرف

صورت معاشرت ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ محبت کی دلیل ہے اور بموجب حدیث المرء مع من احب قیامت میں کفار کے ساتھ ہونے کا اندیشہ ہے غرض کبر کے احتمال سے بھی بچے خواہ وہ ظاہر میں چھوٹی سی بات ہو بعضی چھوٹی بات کا منشاء بھی کبر ہوتا ہے۔ مولانا محمد مظہر صاحب خط بنوانے کے لیے پائنتی سے سرہانے کو نہ بیٹھے آخر حجام نے اس طرح بنایا اگر ہم سے یہ نہ ہو سکے تو حدود شریعہ کے اندر رہنا چاہیے اور کبر کے سبب ان باتوں میں تو فرق نہ کرنا چاہیے جن میں شریعت نے چھوٹے بڑے کو برابر رکھا ہے جیسے لفظ سلام یا جماعت ہاں لہجہ میں فرق ہونا چاہیے کہ چھوٹے نیازمندی کے لہجہ سے سلام کریں اور بڑے ان کو حقیر نہ سمجھیں لیکن ان کی مصلحت سے ان کو ان کی حد سے بھی نہ بڑھا دیں چنانچہ چھوٹوں کو بعض وقت سرہانے بٹھانے میں ان کی دنیاوی اور دینی مضرت ہے دنیوی تو یہ کہ کہیں پٹ نہ جائیں گے اور دینی یہ کہ وہ متکبر ہو جائیں گے غرض تکبر نہایت سخت مرض ہے اور علاج اس کا تواضع ہے تواضع کی تفصیلی تدابیر کی ہمت نہ ہو تو یہ مشترک علاج کر لے بڑے بڑے مجاہدے کیے ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید مسافروں کے پیر دباتے تھے۔ ایک دفعہ ایک مسجد میں باوجود دھکے کھانے کے پڑے رہے اور فرمایا کہ یہ مادہ کبر کا مسہل تھا اور مبتلاء کو تو علاج ضروری ہی ہے غیر مبتلاء کو بھی بطور حفظ صحت کبر کا علاج چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے اسی کے لیے مشک بھر کر پانی پلایا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی لیے کرتہ کی آستین پھاڑ دی اور حدیث من تواضع للہ رفعه الله میں بجائے صیغہ امر کے طور پر اخبار و وعدہ حکم کیا گیا ہے کیونکہ ایسے وعدہ سے ہمت ہوتی ہے اور رفعت موعودہ تواضع کا لازمی نتیجہ ہے سو اگر کسی کو رفعت ہی مطلوب ہو اس کے حصول کے لیے بھی تواضع چاہیے مگر للہ کی قید بھی یاد رہے اور حدیث میں وعدہ رفعت کے ساتھ دنیا یا آخرت کی قید نہیں اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ رفعت ہوگی اور مشاہدہ بھی ہے کہ متواضع سے ہر شخص کو محبت ہوتی ہے اور اس کا کوئی مخالف نہیں ہوتا تو اس کی زندگی بہت اچھی ہوتی ہے۔

استغناء و تواضع کو جمع کرو اور تذلل و تکبر سے بچو حب مال و حب جاہ کو چھوڑو اور لباس اور وضع کے فضول تکلفات کو جو کہ حب جاہ سے ناشی ہوتے ہیں قطع کرو مدارس عربیہ میں اخلاقی کتابوں میں سے کوئی کتاب ضرور داخل درس کی جائے اور تعلیم کے بعد کسی بزرگ کی صحبت بھی ضروری ہے۔

دستور سهارنپور

سہارنپور دارالطلبہ میں تکبر وتذلل سے اجتناب کے عنوان سے ربیع الاول ۱۳۲۵ھ کو یہ وعظ ہوا۔
سامعین کی تعداد تقریباً ۱۰۰ کے قریب تھی جن میں سے اکثریت اہل علم کی تھی۔
اس وعظ کو مولوی اسعد اللہ صاحب مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ۔[۱]

ترجمہ: (ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص اللہ تعالیٰ کیلئے تواضع اختیار کرتا ہے حق سبحانہ وتعالیٰ اسے رفعت اور بلندی عطا فرماتے ہیں)

تمہید: یہ ایک مختصر و جامع حدیث ہے جس میں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مضمون ارشاد فرمائے ہیں یعنی بصیغۂ ترغیب دو باتوں کا امر ہے اور دو باتوں میں جو امرین مذکورین کی ضد ہیں نہی ہے ہر چند کہ اس حدیث شریف کا بیان اس سفر میں ایک جگہ ہو چکا ہے لیکن چونکہ اس مرض میں جس کا علاج اس حدیث میں مذکور ہے ابتلاء عام ہے اس لیے ہر موضع اور ہر مقام پر اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کو بیان کیا جائے کیونکہ شاذ و نادر ہی کوئی خدا کا بندہ ایسا ہوگا کہ اس وبائے عام میں مبتلا نہ ہوا اور اس مرض سے محفوظ ہو صرف زاہد متقی متورع خالص مخلص اس مرض جانکاہ سے سالم رہ سکتا ہے ورنہ کس کی مجال ہے کہ اس سے بچا رہے۔ بغالب احوال ہر شخص کم و بیش اس مرض روحانی میں ضرور مبتلا ہے اس لیے اس کے بیان کی بار بار حاجت ہے اور اس کی ضرورت تا اختتام عمر ختم نہ ہوگی کیونکہ جب امراض عمر بھر ساتھ نہ چھوڑیں گے تو ان کے معالجات کی بھی عمر بھر ہی ضرورت و حاجت ہوگی

---

[۱] (کنز العمال: ۵۷۳۰، مشکوۃ المصابیح، ص ۴۱۱۹، مجمع الزوائد ۸: ۸۲)

اور چونکہ ایک بیان وتقریر کے مکرر ہونے کی مختلف اسباب ومختلف وجوہ ہوا کرتے ہیں اس لیے اس کو تکرار محض نہ کہا جائے گا اور اگر چشم حقیقت میں سے دیکھا جائے تو تکرار بھی مضر نہیں، غرض یہاں اول تو تکرار ہی نہیں اور اگر تسلیم بھی کرلیں تو کوئی نقصان نہیں کیونکہ عبث وہ تکرار ہے جس میں کچھ نفع متصور نہ ہو کسی قسم کا نیا فائدہ حاصل نہ ہو اور یہ تکرار ایسا نہیں ہے کیونکہ اس سے تاکید مزید حاصل ہوتی ہے، تکرار علی اللسان سے تقرر فی القلب ہوتا ہے۔

آیات کا تکرار

قرآن شریف میں غور وتامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مقامات پر تھوڑے تفاوت سے بعض آیات کو مکرر بیان فرمایا ہے اور بعض مواضع میں مضمون واحد کو بعبارۃ مکرر نقل فرمادیا ہے اور حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اس کی علت بھی بیان فرمائی ہے کہ مضامین کو کیوں مکرر بیان کیا جاتا ہے۔ "وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوْا" یعنی تاکہ تم اس سے عبرت حاصل کرو۔ اس کو قلب میں جگہ دو اس کو اپنا پیشوا اور رہنما بناؤ، نصیحت حاصل کرو اور امر کو بجالاؤ نواہی سے پرہیز کرو۔ البتہ یہ طرز مصنفین کا نہیں ہے ان کو تو ایک مضمون کے مکرر بیان کرنے سے عار آتی ہے وہ تکرار سے اپنی شان تصنیف کی ہتک سمجھتے ہیں اسی لیے جدید اور نئے مضامین تجویز کرتے ہیں۔ نئی نئی عبارتوں میں مطالب ادا کرتے ہیں ایک مضمون کو دوبارہ کبھی نہیں بیان کرتے اور کسی مقام پر سہواً یا عمداً ایسا ہوجائے تو اس طبقہ میں وہ موجب اعتراض ہوتا ہے چونکہ مقصود مصنفین کا امر آخر ہوتا ہے اس لیے تصنیف کا طرز قرآن کے طرز سے مختلف ہوگیا۔ مصنفین کا مقصود محض ضبط مسائل ہے یہ مقصود نہیں کہ مخاطب کے ذہن میں یہ مضامین جم جائیں اور ظاہر ہے کہ تکرار اس مقصد کے ضرور منافی ہے اور حق تعالیٰ کا مقصود تنزیل قرآن سے محض ضبط مسائل یا واقعات کا جمع کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود بندوں کی اصلاح ہے اور اصلاح جب ہی ہوتی ہے کہ مخاطب کے ذہن میں نصیحت کے مضامین خوب جم جائیں اور بعض بات ذہن میں ایک دفعہ کہنے سے نہیں جمتی بلکہ بار بار کہنے سے جمتی ہے اس لیے قرآن میں تکرار واقع ہوا۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے جو بعض جگہ تکرار فرمایا ہے یا احادیث میں مکرر جملے واقع ہوئے ہیں اس کا منشاء محض عطوفت وشفقت ہے کہ مخاطب کے ذہن میں مضمون اچھی طرح جم جائے دل میں بالکل اتر جائے کوئی خدشہ نہ رہے۔ مصنفین اس شفقت سے کالے کوسوں دور ہوجاتے ہیں، ان کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی اس لیے وہ تکرار سے بچتے ہیں

اور فی الحقیقت قرآن و حدیث کا یہ تکرار محض صورۃ ہی ہے کیونکہ جب اس سے مزید تاکید حاصل ہوگئی تو ایک نیا نفع حاصل ہوا اور جس کلام سے نیا فائدہ حاصل ہو وہ تکرار محض سے منزہ ہے۔ گویا اس میں دو پہلو ہیں ایک تاسیس کا کہ وہ باعتبار زیادت تاکید و زیادت نفع کے ہیں' دوسرا تاکید کا کیونکہ یہ مضمون لفظاً تو مضمون اول ہی ہے لہٰذا یہ صورت جامع تاکید محض و تاسیس محض دونوں سے اولیٰ ہے کیونکہ یہ دونوں باتوں کے لیے جامع ہے اور ظاہر ہے کہ مجموعہ امرین امر واحد سے اولیٰ و انفع ہوتا ہے اور اگر اس تکرار صوری میں مضامین بھی کچھ بدل جائیں اور مطالب و مارب بھی مختلف ہوجائیں تب تو وہ تکرار صوری بھی نہیں رہتا' اس وقت میرے بیان کی یہی شان ہوگی کہ متن مضمون تو وہی ہوگا جو پہلے بیان ہو چکا ہے مگر اس کی شرح و تفصیل میں مضامین سابقہ کا بعینہ اعادہ نہ ہوگا بلکہ طرز بیان بھی جدا ہوگا اور انشاء اللہ مضامین بھی بہت سے نئے ہوں گے پس یہ تکرار محض سے اس طرح بھی نکل گیا گو مضامین سابقہ کے بعینہ اعادہ سے بھی تکرار محض نہ ہوتا کیونکہ اس وقت تاکید محض کا فائدہ حاصل ہوتا مگر اب تو بالکل تکرار نہ رہا۔ صرف آیت یا حدیث کی تلاوت کا تکرار رہ جاتا ہے جو کسی درجہ میں بھی موجب جرح نہیں کیونکہ یہ محض چند الفاظ و کلمات و حروف کا تکرار ہے مضمون کا نہیں لہٰذا بیان سابق اس بیان لاحق کے لیے مانع نہ ہو نیز میں سفر دور و دراز کی وجہ سے مضمحل بھی ہو رہا ہوں' بدن پر تکان بہت ہے اس حدیث کے بیان کرنے میں آسانی و سہولت بھی ہوگی کچھ تکلف نہ کرنا پڑا اور نہ تکلف سوچنا پڑا کہ کس مضمون کو بیان کروں' کون سی آیت یا حدیث کے متعلق وعظ کہوں لیکن باوجود اتحاد حدیث کے مضمون بالکل نیا ہوگا وہ پہلا وعظ بھی قلم بند ہو چکا ہے بعد طبع کے موازنہ و مقابلہ سے معلوم ہو جائے گا کہ اس کے مضامین اور اس کے مضامین سے بالکل جدا و ممتاز ہیں' صرف تلاوت حدیث ہی کا تکرار ہے جو کہ علاوہ فوائد مذکورہ کے موجب خیر و برکت بھی ہے۔

امراض ظاہری و باطنی

اس حدیث شریف میں امراض عامہ کو بتایا گیا ہے اور ان کے معالجہ کی تعلیم فرمائی گئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بظاہر تو ایک ہی بات کی ترغیب فرمائی ہے لیکن اگر فکر سے کام لیا جائے اور عقل پر زور دیا جائے تو دو باتوں کی ترغیب معلوم ہوتی ہے اسی طرح مقابلہ میں بظاہر ایک امر سے ترہیب معلوم ہوتی ہے لیکن نظر تعمق و

خوض سے دو امر مرہوب عنہ معلوم ہوتے ہیں امر ترغیبی ایک تو تواضع میں مصرح اور دوسری کا انکشاف اللہ کی قید سے ہوتا ہے پس من تواضع سے تو تواضع کا محمود مرغوب ہونا اور اس کا واجب العمل اور مامور بہ ہونا معلوم ہوتا ہے اور للہ سے اس میں اخلاص کی طلب معلوم ہوتی ہے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضع کو اللہ سے مقید فرمایا ہے اس قید کے اجتماع وارتفاع کے احتمال سے دو قسمیں پیدا ہوگئیں اول تواضع للہ ثانی تواضع بغیر اللہ اور تواضع کی اس قسم یعنی تواضع لغیر اللہ میں جو لفظ غیر ہے اس سے اس کے لغوی معنی مراد نہیں ہے اور نہ مصطلح مناطقہ وفلاسفہ مراد ہے لغوی معنی بھی اسی اصطلاحی معنی کے قریب قریب ہیں یعنی یہ کہ دو چیزوں کے مفہوم میں تباین ہو مصداق میں تفارق مانع عن الحمل ہو۔ بلکہ غیر سے مراد وہ غیر ہے جو اصطلاح متکلمین میں مستعمل ہے یعنی جو لفظ غیر کے صفات الٰہیہ کی بحث میں واقع ہوا ہے کہ صفات لاعین ولا غیر ہیں جو اس غیر کے معنی ہیں اور وہ معنی مذکور کے علاوہ ہیں کیوں کہ اگر یہاں غیر سے لغوی یا منطقی معنی مراد کے لیے جاویں تو صریح الاستحالہ ہے بداہتہ قول بارتفاع النقیضین ہے بلکہ یہاں وہ غیر مراد ہے جو نصوص شریعہ و آثار نبویہ میں واقع ہوا ہے اور وہی محاورات مشہورہ واطلاقات عرفیہ میں مستعمل ہوتا ہے چنانچہ ہماری زبان اردو ہی میں بولتے ہیں کہ آپ تو بہت فرماتے ہیں۔ اس کی کیا حاجت ہے ہم اور آپ غیر تو نہیں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم میں اور آپ میں تغائر ذاتی ہے اتحاد مصداق ہے ہمارا آپ کا ایک دوسرے پر حمل ہوسکتا ہے بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم بے تعلق نہیں ہیں ہم سے تمہارا قوی تعلق ہے محاورات میں غیر کے معنی یہی مراد ہوتے ہیں اور یہی صفات کے لا غیر کہنے میں مراد ہیں یعنی ذات ہے بے تعلق نہیں پھر اسی تعلق سے عینیت کی نفی فلاسفہ کے مذہب کی نفی کے لیے کی گئی اسی طرح تواضع بغیر اللہ میں بھی غیر کے یہی معنی مراد ہیں یعنی ایسی تواضع جس میں حق تعالیٰ جل جلالہ عم نوالہ سے تعلق نہ ہو اس کی ذات یا برکات سے علاقہ نہ ہو۔ بلکہ اغیار مقصود ہوں۔ حق تعالیٰ شانہ کا اس میں لحاظ نہ ہو علی ہذا القیاس تواضع للہ میں بھی یہی گنجائش اور وسعت ہے کہ تواضع للہ بلا واسطہ ہو جیسے صوم صلوٰۃ و حج وغیرہ من الفرائض والواجبات والسنن یا تواضع للہ بواسطہ ہو یعنی گو مخلوق کے

لیے خفض جناح کیا جاوے لیکن حق تعالیٰ کے واسطے حق تعالیٰ کے امر کی وجہ سے تاکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضا حاصل ہو اس کا سبب حق تعالیٰ شانہ کی ذات والاصفات سے تعلق ہو اس کا محرک کوئی غیر نہ ہو تو وہ بھی حکماً تواضع للہ ہی ہے اگرچہ بظاہر لغیر اللہ ہے جیسے والدین کے ساتھ تواضع استاد کے ساتھ تواضع مرشد وپیر کے ساتھ تواضع ہے اور اپنے ہر بزرگ سناً یا عقلاً کے ساتھ تواضع کرنا اس کے سامنے اپنے آپ کو پست بنانا خفض جناح ونرمی سے کام لینا یہ سب تواضع للہ کے افراد ہیں اور والدین واستاد ومرشد وغیرہ تو بڑے اور بزرگ ہونے کی وجہ سے قابل التعظیم واجب التکریم ہیں۔

تکبر وتذلل سے اجتناب

حق تعالیٰ نے تو جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عام مسلمانوں کے ساتھ بھی خفض جناح اور تواضع کا حکم فرمایا ہے۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی افادہ میں بھی تواضع مطلوب ہے جیسے استفادہ میں تواضع مرغوب ہے افادہ اور استفادہ دونوں میں اس کی احتیاج ہے یہ تواضع بھی لغیر اللہ کے نہیں اس میں بھی حق تعالیٰ سے تعلق ہے اس سے بھی اس کی رضا مطلوب ہے اس کا باعث بھی وہی ذات ہے اور تواضع للہ اور تواضع لغیر اللہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ تواضع کا محرک ومحرض اگر امر شرعی ہے تو وہ تواضع للہ ہے اور اگر امر آخر ہے تو وہ تواضع لغیر اللہ ہے جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے للہ کی قید سے تواضع لغیر اللہ سے نہی فرمادی اور تواضع للہ کا مامور بہ ہونا بتادیا یہاں میں طلبہ کو اس پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس حدیث شریف میں بظاہر امر نہیں معلوم ہوتا محض شرط وجزاء میں لزوم کا حکم ہے اور وہ موضوع للامر نہیں مگر تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں امر موجود ہے لیکن وہ امر مضمر ومستتر ہے کنایۃً ثابت ہوتا ہے والکنایۃ ابلغ من التصریح یعنی حدیث شریف میں سے واضع للہ کا مرغوب فیہ ہونا مستنبط ہوتا ہے جیسا کہ اس کی ضد تواضع لغیر اللہ کا مرغوب عنہ ہونا معلوم ہوتا ہے اور کسی شے کا مرغوب فیہ ہونا مستلزم ہے اس کے مامور بہ ہونے کا جیسے کسی کا مرغوب عنہ ہونا اس کے منہی عنہ ہونے کے مستلزم ہے البتہ اس سے نہی وامر کے درجے ورتبے کی تعیین نہیں ہوئی سو وہ اور دلائل وبراہین سے معلوم ہو جائے گی اور عدم

تعیین مضرت رساں بھی نہیں ہے کیوں کہ مقصود بہر حال حاصل ہے یعنی ترغیب وترہیب رہا یہ کہ جب مقصود کوامر کرنا تھا تو اس کے لیے صیغہ امر کیوں نہ اختیار کیا گیا ترغیب کا صیغہ کیوں اختیار کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ مقاصد کے اختلاف سے ایک ہی شے کے لیے مختلف عبارات اور مختلف عنوانات اختیار کئے جاتے ہیں چنانچہ کسی جگہ پر مقصود اظہار شفقت ہوتا ہے کسی مقام پر مقصود ترغیب ہوتا ہے علی ہذا مختلف مواقع پر مختلف مقاصد ہوتے ہیں مختلف حکمتیں اس پر مرتب ہوتی ہیں کسی امر کے لیے گاہے صیغہ امر استعمال کرتے ہیں گاہے ضد سے نہی کرتے ہیں کبھی مجموعہ امرین کا بیان ہوتا ہے اس طرح کے امر کی نہی کے لیے یا تو صراحتاً ممانعت ہوتی ہے یا اس کی ضد کی طلب سے اس کا نہی عنہ ہونا بتلا دیا جاتا ہے یا مجموعہ امرین کوذکر کرتے ہیں اوران عنوانات کے تفنن سے معلوم واستاد کی شفقت وعنایت کا حال معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عنان توجہ ہماری جانب منعطف رہے وہ چاہتا ہے کہ ہم کسی طرح کسی عنوان سے بات سمجھ جائیں اورسب سے بڑے ہمارے شفیق معلم جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کا مقصود یہ تھا کہ مخاطبین کسی طرح سمجھ جائیں اس لئے کسی جگہ ایک بات کوشفقت کے عنوان سے فرمادیا کہیں عنوان امر سے آمادہ کیا کبھی ترغیب سے اشارہ فرمایا حالانکہ مال سب کا واحد ہے۔ عبارا تنا شتی وحسنک واحد

تواضع واستغنا کی اہمیت

پس اسی اصل پر یہاں امر بالتواضع کی بصیغہ ترغیب بیان فرمایا گو ترغیب بذاتہٖ وصیغۃ امر نہیں لیکن مرغوب فیہ کے مامور بہ ہونے کے لیے مستلزم ضرور ہے پس امر حکماً ہے حاصل یہ کہ اس جگہ ایک امر حکمی تو مقید یعنی تواضع میں ارشاد فرمایا ہے دوسرا امر حکمی قید میں ارشاد فرمایا ہے جو کہ للہ ہے تواضع کو للہ کی قید سے مقید کرنا شعر ہے کہ مقصود یہ ہے کہ مقید یعنی تواضع میں قید کی رعایت کرو اس کا لحاظ رکھو یعنی للّٰہیت کو ہاتھ سے نہ جانے دو گو وہ تواضع بظاہر لغیر اللہ ہی ہو لیکن اس میں بھی اخلاص لوجہ اللہ وللّٰہیت کی شان پائی جانی چاہیے۔ اس سے قطع نظر نہ کرنا چاہیے اہل محاورہ اس عنوان سے جو حدیث میں اختیار کیا گیا ہے ان معنی کو خوب جانتے ہیں روزمرہ کی بول چال میں نظر کرنے سے یہ مطالب خوب سمجھ میں آتے ہیں اہل لسان کو کسی قسم

کا خدشہ اور کوئی خلجان اس کے سمجھنے میں نہیں ہوتا بلکہ وہ اس عنوان سے بالکل صحیح مطلب ترغیب کا سمجھتے ہیں بس یہاں پر تواضع کا مع لحاظ للّٰہیت امر ہوا ہے اور امر بالشی مستلزم ہوا کرتا ہے نہی عن ضدہ کو یعنی جس شے کا حکم ہوتا ہے اس کے خلاف سے نہی ہوتی ہے پھر جس درجہ کا وہ امر ہے اسی درجہ کی اس مقابل میں نہی ہوگی مثلاً اگر امر وجوب کے لیے ہے تو اس کی ضد اور اس کا خلاف حرام یا مکروہ تحریمی ہوگا اور ان دونوں میں یہ فرق لفظی فرق ہے ادباً واحتیاطاً اس کو کراہت تحریمہ سے تعبیر کر دیتے ہیں ورنہ درجہ معنون میں اتحاد بالذات ہے دونوں میں کچھ متعد بہ فرق نہیں ہے اور اگر امر استحبابی ہے تو اس کی ضد کے لیے کراہت تنزیہی کا ثبوت ہوگا یا اس سے بھی کم یعنی محض غیر اولی ہونا معلوم ہوگا چنانچہ تواضع کا امر مستلزم ہے کہ اس کی ضد سے نہی ہو اور جس درجہ میں تواضع کا امر ہے اسی درجہ میں اس کی ممانعت ہوگی اور تواضع کی ضد ہے تکبر تو امر بالتواضع سے جیسے تواضع کا مرغوب فیہ اور مامور بہ ہونا معلوم ہوتا ہے ایسے ہی اس سے تکبر کا مرغوب عنہ و منہی عنہ ہونا مستنبط ہوتا ہے اسی طرح جیسے قید للہ سے شان للّٰہیت و اخلاص کا تواضع میں مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے ایسے ہی اسی درجہ میں تواضع لغیر اللہ سے جو کہ تواضع للہ کی ضد ہے ممانعت معلوم ہوتی ہے اور تواضع لغیر اللہ سے ممانعت کا حاصل یہ ہے کہ استغناء عن غیر اللہ مطلوب ہے اور استغنا عن غیر اللہ ایک طویل لفظ ہے لہٰذا میں اس کو مختصر کر کے اس کے مرادف کے ساتھ تعبیر کرتا ہوں یعنی تذلل کی ممانعت ہے پس حق تعالیٰ کے لیے تواضع اور خفض جناح اختیار کرنا حسب وعدہ رفعہ اللہ موجب عزت باعث حرمت اور سبب وقعت ہے اور تواضع لغیر اللہ باعث ذلت موجب ہتک شان و بے حرمتی ہے جس کو تذلل سے تعبیر کیا جاتا ہے البتہ جہاں شرعی مصلحت ہو وہاں تذلل کی اجازت ہے کیونکہ وہ فی الحقیقۃ تذلل نہیں بلکہ صورت تذلل ہے اور حقیقت میں باعث ہے کیونکہ شرعی مصلحت سے اس میں لوجہ اللہ کی شان موجود ہے اور جو کام لوجہ اللہ ہو اس سے ذلت نہیں ہوا کرتی بلکہ خدا کے ہاں عزت بڑھتی ہے گو دنیا کچھ بھی کہے! حاصل یہ ہے کہ حدیث میں تواضع واستغنا عن غیر اللہ کی ترغیب اور امر ہے اور تکبر اور تذلل تنفیر اور نہی ہے بس وہ دونوں مامور بہ ہیں اور یہ دونوں منہی عنہ ہیں حاصل کلام یہ ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو تواضع کا امر فرمانا اور تکبر سے نہی فرمانا مقصود تھا مگر اس خیال سے کوئی شخص اپنی کج فہمی سے تذلل کو مامور و

مرغوب بہ سمجھ لے اللہ کی قید کا اضافہ کیا گیا تا کہ تواضع کا مامور بہ ہونا اور تذلل کا کہ وہ تواضع لغیر اللہ ہے منہی عنہ ہونا ظاہر ہو جائے اسی طرح صرف استغناء کی امر سے یہ اندیشہ تھا کہ لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو کہیں عوام افتخار کو بھی استغناء سمجھنے لگیں تکبر کو بھی استغناء عن غیر اللہ میں داخل کر لیں اس لیے امر استغناء کے ساتھ امر تواضع کو بھی جمع کر دیا اور وجہ اس اندیشہ غلط کے کہ اخلاق حمیدہ اوصاف حسنہ بعض دفعہ اخلاق وذمیمہ وخصال رذیلہ سے مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بعض جگہ دونوں کی صورت یکساں ہوتی ہے چنانچہ تواضع اور تذلل کی صورت ایک ہے استغناء اور تکبر بظاہر یکساں نظر آتے ہیں اسی لیے بعض لوگ تذلل کو تواضع سمجھنے لگے ہیں تکبر کو استغناء تصور کر لیتے ہیں' اتحاد صوری تغایر ذاتی پر پانی پھیر دیتا ہے اور اس کا ادنیٰ اثر یہ ہوتا ہے کہ اپنی جانب حسن ظن بڑھتا جاتا ہے اور دوسروں کی طرف سے سوء ظن ترقی پر ہوتا ہے اپنے تو تذلل کو تواضع خیال کرتے ہیں اور دوسرے کی تواضع بھی تذلل پر محمول ہوتی ہے اسی طرح اپنا تکبر وافتخار بھی استغناء عن غیر اللہ معلوم ہوتا ہے۔

اخلاق حمیدہ وذمیمہ

دوسرے کا استغناء بھی افتخار وتکبر سمجھا جاتا ہے حاصل یہ کہ اخلاق حمیدہ واخلاق ذمیمہ کو اخلاق حسنہ خیال کر لیتا ہے دوسری غلطی اوروں کے متعلق ہوتی ہے کہ ان کے امور حسنہ کو امور سیئہ سمجھتا ہے ان کی حسنات کو سیئات خیال کرتا ہے حالانکہ غلطی اور خطا کا احتمال وجود دونوں جانب میں مشترک ہے مگر اس کی کیا وجہ کہ اپنی تو ہر بات بھلی ہو اور دوسروں کی ہر بات بری مثلاً بخل واقتصاد ان دونوں کی صورت ایک ہے اس لیے کبھی تو انسان بخل کو میانہ روی واقتصاد سمجھتا ہے کبھی اقتصاد و میانہ روی کو بخل سمجھ جاتا ہے اسی طرح اسراف وسخا میں التباس ہو جاتا ہے اس لیے کبھی فضول خرچی واسراف کو سخاوت جود تصور کرتا ہے کبھی سخا بھی اسراف خیال کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ کتب تصوف میں احادیث سے اخذ کر کے اس بحث کو مفصلاً بیان کیا گیا ہے مگر باوجود اس قدر تفصیل کے پھر بھی اشتباہ ہونے کی وجہ کیا ہے سو زیادہ وجہ یہ ہے کہ علم اخلاق ومعاشرت وتصوف کی کوئی کتاب درس میں داخل نہیں اور مطالعہ کی نوبت بھی کم آتی ہے نیز محض مطالعہ سے حقیقت کا انکشاف بھی نہیں ہوتا صحبت کی ضرورت ہوتی ہے جس کا اہتمام ہی

مفقود ہے اور اگر فرض بھی کر لیا جاوے کہ کوئی شخص اپنی ذہانت و ذکاوت سے حقیقت تک پہنچ بھی جائے مگر پھر اس کو اپنی حالت پر منطبق کرنا بہت مشکل ہوتا ہے انطباق کا حال بغیر معلم و مرشد کے نہیں معلوم ہو سکتا بعض اوقات اپنی حالت کے مطابق سخت حیرت ہوتی ہے کہ یہ بخل ہے یا اقتصاد ہے سخاوجود ہے یا فضول خرچی و اسراف اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ اپنی ذات سے حسن ظن کر کے بخل کو اقتصاد سمجھتے ہیں اور اسراف کو سخاوت کیونکہ ہوائے نفسانی غالب ہے شہوت کا غلبہ ہے اتباع نفس محیط ہے اپنے ساتھ حسن ظن ہے مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے اقتصاد کو بخل سمجھتے ہیں اور سخاوت کو بھی اسراف پر محمول کرتے ہیں تحدیث بالنعمۃ کو ریاء سمجھتے ہیں مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنی اوصاف حمیدہ کو اخلاق ذمیمہ سمجھیں' زیادہ تو قسم اول ہی کے افراد ہوتے ہیں باقی سب دوم کے لوگ ہیں کہ اپنے اخلاق حمیدہ کو بھی اخلاق ذمیمہ سمجھتے ہیں گو ان کی شان میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ.

(یعنی جو لوگ دیتے ہیں اور جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل اس سے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں) ان اصحاب کو اپنے نفس پر کبھی حسن ظن نہیں ہوتا کبھی اپنے کو متصف بصفات حمیدہ نہیں سمجھتے ہمیشہ یہ خوف و اندیشہ رہتا ہے کہ شاید کچھ بھی مقبول نہ ہو مگر اس خوف کا بھی ایک درجہ ہے وہ یہ کہ خوف صرف اتنا ہونا چاہیے کہ جس سے انسان معاصی سے بچ سکے یہ درجہ تو محمود اور مامور بہ ہے اور ایک درجہ خوف خشیت کا وہ ہے جو مودی الی الیاس ہو جاتا ہے یہ درجہ مذموم و منہی عنہ ہے یعنی ایسا شخص نماز پڑھتا ہے' روزہ رکھتا ہے حج کرتا ہے زکوٰۃ دیتا ہے ذکر اللہ میں مشغول رہتا ہے مگر غلبہ خشیت سے یہ سمجھتا ہے کہ مقبول نہیں ابتداء میں تو صرف خوف کے علامات و امارات اس کے بشرے سے ظاہر ہوتے ہیں مگر آخر میں یاس کا غلبہ ہو جاتا ہے اور سب کچھ چھوڑ بیٹھتا ہے اس کی ابتدائی حالت تو بظاہر محمود معلوم ہوتی ہے کہ اس کو اپنے نفس سے سوء ظن ہے مگر انتہاء میں اس کے آثار مذموم ہو جاتے ہیں اپنے ساتھ سوء ظن بے شک مفید و محمود ہے لیکن جب تک اپنی حد تک رہے جب

اپنی حد سے متجاوز ہو جائے گا مذموم ہو جائے گا ہر شے میں یہی ضابطہ ہے کہ جب تک اپنی حد اور درجہ میں رہے گی' محمود ہوگی اور جب متجاوز عن الحد ہوگی مذموم ہوگی اس غلو فی الخوف سے ابلیس شیطان کم بخت راہ پاتا ہے اور عابد وزاہد سے کہتا ہے کہ جب تیرے اعمال مقبول ہی نہیں اور طاعت عبادت سب مردود ہے تو اس عبادت اور مشقت سے کیا فائدہ اس اٹھک بیٹھک کا کیا نتیجہ' بھوکے مرنے سے کیا حاصل' مال دینے سے کیا نفع سفر سے کیا سود شیطان کے اس مکائد سے رہی سہی آس بھی یاس سے بدل جاتی ہے اور اس کا انجام تعطل ہوتا ہے۔

طہارت ظاہری و باطنی

اور اس غلو فی الخوف کے ساتھ ایک اور سبب بھی تعطل کا یاد آ گیا یعنی جیسے ان لوگوں کو یاس معطل کر دیتی ہے اسی طرح بعض لوگ غلبہ وہم کی وجہ سے معطل ہو جاتے ہیں چنانچہ بعض لوگ بیماری و مرض کی حالت میں نماز چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ احتلام کی وجہ سے ناپاک ہیں' اولیٰ کے زعم میں تیمّم سے ان کی طہارت ہوگی نہیں کیونکہ بدون غسل کے عرف تیمّم سے طہارت میں شک رہتا ہے پھر تیمّم بھی کرنا چاہیے تو مٹی میں شک ہوتا ہے کہ پاک ہے یا ناپاک ہے حالانکہ بعض آثار کے اعتبار سے پانی سے تیمّم بڑھا ہوا ہے کیونکہ پانی سے اولاً ظاہر پاک ہوتا ہے اور ثانیاً باطن بھی پاک وصاف ہو جاتا ہے کیونکہ وضو سے خطائیں بھی جاتی رہتی ہے ہر ہر عضو سے گناہ نکل جاتے ہیں اور تیمّم میں اولاً بالذات ہی باطن پاک ہوتا ہے اور ثانیاً اعضاء ظاہری سے بھی نجاست حکمیہ دور ہو جاتی ہے کیونکہ مٹی کے استعمال سے اپنی خاکساری مستحضر ہو جاتی ہے۔ فنا کا منظر سامنے آ جاتا ہے کہ ایک دن ہم مٹی میں مل جائیں گے پس تیمّم میں بالذات باطن کی طہارت ہے اور پانی میں بالذات ظاہر کی طہارت ہے کہ باطن ظاہر سے بڑھا ہوا ہے پس تیمّم کی طہارت پر شک کرنا اول نمبر کی نادانی ہے تمام تر وجہ یہ ہے کہ مسائل شرعیہ تو معلوم ہیں نہیں اپنی عقل و اجتہاد سے کام لیتے ہیں اور احکام جانتے ہیں وہ ذرہ برابر بھی اپنے رائے سے حس و حرکت نہیں کرتے کچھ بھی چوں و چرا نہیں کرتے' حدیث میں تصریح ہے کہ جو شخص قیام پر قادر نہ ہو بیٹھ کر فریضہ صلوٰۃ کو ادا کرے جو قعود پر قادر نہ ہو' اضطجاع میں نماز ادا کرے یہ بھی نہ ہو سکے اشارہ سے ادا کرے۔ غرض اسی

حالت میں نماز پڑھ لے جب خدا کا حکم ہے کہ ایسی حالت میں نماز ادا کرو اور ہم اس کے بندے ہیں، پھر شکوک پیدا کرنا اور بے فائدہ شبہات وخلجانات میں پڑنا کیا معنی: جس کا سبب حماقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بعض لوگ انہیں بے بنیاد وہموں کی وجہ سے نماز وغیرہ چھوڑ دیتے ہیں یہی آثار وثمرات ہیں۔ تجاوز عن الحد کے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے نفس سے سوظن نہ رکھو اپنے کو بزرگ سمجھو نہیں سوظن ضرور رکھو مگر اس کی بھی حد ہے اتنی بدگمانی نہ ہونا چاہیے جو کفران تک مودی ہو جائے خوف وخشیت بھی ایک صفت محمود ہے مگر اسی شرط سے کہ وہ اپنی حد میں رہے جیسے تفریط مضر ہے اسی طرح افراط بھی موجب مفاسد ہے جو خوف اپنی حد شرعی سے زیادہ ہوگا وہ واجب الاحتراز اور منہی عنہ ہوگا۔ اس کی مذمت میں کچھ شبہ نہیں وہ بے شک قابل الترک ہے خوف محمود کے درجہ کی تعین جناب فخر کائنات باعث موجودات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمادی ہے۔ چنانچہ ایک دعا میں فرماتے ہیں: "اسئلک من خشیتک ماتحول به بیننا وبین معاصیک[1]" یعنی اے اللہ میں آپ کا اتنا خوف طلب کرتا ہوں جو مجھے معاصی سے روک دے اس قید سے صاف صاف معلوم ہوا کہ خوف اسی درجہ تک مطلوب ہے جو ارتکاب معاصی سے مانع ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ خوف کا ہر درجہ مقصود بالذات نہیں بلکہ خشیت مقصود وہ صرف وہ ہے جس سے ترک وآثام وذنوب پر قادر ہوا اپنے دامن عصمت وعفت کو صغائر وکبائر سے آلودہ نہ ہونے دے، دنس معصیت سے محفوظ رکھے اور وہ خوف مقصود نہیں جو یاس پیدا کر دے جس کا اثر بجز تعطل کے کچھ نہیں بلکہ اس خوف کا ثمرہ کبھی کفر ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے اولاً یاس پیدا ہوتی ہے پھر اعمال و طاعات کے فضول ہونے کا خیال ہوتا ہے اور یاس خود کفر ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "انه لاییئس من روح الله الا القوم الکافرون" (کافروں کے علاوہ کوئی شخص اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا) نص صریح ہے کہ یاس کفر ہے یاس کے آثار کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک شخص میرے ہم نام کانپور میں وکالت کیا کرتے تھے۔ فارغ اوقات میں احیاء العلوم بھی دیکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کتاب الخوف کو دیکھا تو ان پر تعطل کے آثار ظاہر ہونے لگے، حضرت امامؒ جس مضمون کو بیان کرتے زوردار الفاظ میں بیان کرتے ہیں اسی

---

[1] لم اجد الحدیث فی موسوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف

لیے اس کتاب کا مطالعہ عوام کا کام نہیں۔ محققین کا کام ہے غرض وہ میرے پاس کتاب لائے اور کہا کہ بس اس حالت میں صوم وصلوٰۃ سے کیا فائدہ اور وہ عبارت نکال کر پڑھنا شروع کی مگر خوف کی وجہ سے اس کے منہ سے الفاظ تک نہیں نکلتے تھے۔ بالکل حواس باختہ ہو رہے تھے۔ غرض میں نے اس مضمون کی سہل اور نرم الفاظ میں تقریر کی سن کر بہت خوش اور ایک گونہ تسلی ہوئی۔ فرمانے لگے کہ اس مضمون کو تحریر فرما دیجئے تا کہ اس کو مکرر سہ کرر دیکھوں اور جو شبہ پیدا ہوا اس سے رفع کروں۔ چنانچہ میں نے مختصراً لکھ بھی دیا تھا اور وہ تقریر خاتمہ بالخیر کے نام سے طبع بھی ہو چکی ہے اس مناسبت سے اس کا نام خاتمہ بالخیر رکھا ہے۔

شیطان کی چالیں

خلاصہ یہ ہے کہ آج کل ہمارے اندر دو غلطیاں ہیں ایک غلطی کا منشار تو جس ظن میں غلو ہے اور دوسری غلطی سوظن کے غلو سے پیدا ہوتی ہے' اول غلطی اکثر عوام کو پیش آتی ہے اس مرض میں اکثر وہی مبتلا ہوتے ہیں اور دوسری غلطی یعنی سوظن میں غلو میں یہ اکثر خواص اتقیاء کو پیش آتی ہیں اور یہ غلطی اول غلطی سے بھی بدرجہا دشوار وسخت ہے اس میں اکثر خوف رجاء پر مستولی ہو جاتا ہے پھر اس کے شہادت کا رفع ہونا ایک مشکل اور مہتم بالشان کام ہو جاتا ہے اس مرض کا مریض اپنی استغناء کو تکبر سمجھتا ہے اپنی تواضع کو تذلل سمجھتا ہے اپنے وجود کرم کو اسراف خیال کرتا ہے اپنی ہر حمیدہ خصلت کو ذمیمہ پر محمول کرتا ہے۔ یہ سب قصہ شیطان ملعون کی وجہ سے ہوتا ہے یہ کم بخت اپنے حملہ سے کہیں باز نہیں آتا' اپنی چال سے کہیں نہیں رکتا' ہر شخص کو اس کے رنگ میں مارتا ہے خواص کو خواص کے رنگ میں مارتا ہے' عوام کو عوام کے رنگ میں فریب دیتا ہے۔ اہل اتقاء کو صورت اتقاء میں اپنے مکر سے زیر کرتا ہے اور فساق کو صورت فسق میں مغلوب کرتا ہے اور گو محققین اہل اللہ پر اس کا مکر نہیں چل سکتا۔ وہ اس کی رگ ریشہ سے واقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: "اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ" (یقیناً اس کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں) لیکن پھر بھی یہ اپنی کرنی سے نہیں چوکتا خواہ اثر ہو یا نہ ہو یہ کم بخت یہی چاہتا ہے کہ میرے دام فریب سے کوئی فرد بشر نہ نکلے ہر شخص میرے مکر کا شکار ہو جائے۔

ناوک نے ترے صید نچھوڑا زمانہ میں   تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

وار ہر شخص پر کرتا ہے لیکن معصومین و محفوظین حق تعالیٰ کے افعال وانعامات کی وجہ سے محفوظ رہتے ہیں اور اس کے دام تزویر میں نہیں پھنستے اور یہ خود بھی جانتا ہے قطعاً اس کو معلوم ہے کہ معصومین و محفوظین پر میرے اغوا واضلال کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے خود ہی کہا تھا: ''لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ'' کہ اے رب العالمین تیرے سب بندوں کو بہکاؤں گا اور راہ حق سے دور کروں گا' بجز ان کو جو مخلص ہیں جن پر تیرے خاص خاص انعامات ہیں یعنی ان کو گمراہ نہ کرسکوں گا۔ (پس یہ استثناء اثر کے اعتبار سے ہے۔ یعنی شیطان علیہ اللعنۃ کے اغوا و اضلال کا اثر عباد مخلصین پر نہیں ہوسکتا۔ یہ مطلب نہیں کہ یہ ان کے بہکانے کی کوشش بھی نہیں کرتا' کوشش تو ان پر بھی کرتا ہے مگر ان پر بس نہیں چلتا۔ چنانچہ یہی مطلب ہے حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا: ''اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ الخ'' (یقیناً اس کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا) کہ اس میں حق تعالیٰ نے کاملین پر سلطان کے غلبہ کی نفی کی ہے ارادہ اضلال وسعی کی نفی نہیں کی اور ارادہ ان کے گمراہ کرنے کا بھی کرتا ہے مگر اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا ہے اس لیے اس نے اپنی عزت قائم رکھنے کے لیے پہلے ہی سے استثناء کردیا تھا کہ تیرے عباد مخلصین کو نہ بہکاؤں گا اور اس کا یہ کہنا کہ عباد مخلصین کو نہ بہکاؤں گا اس میں بھی ایک قسم کی شیخی ہے گویا ان پر احسان کرکے اس نے چھوڑ دیا ہے یہ کم بخت احسان کرکے کس کو چھوڑنے والا تھا وہ خود اس کے بہکانے میں نہیں آتے' یہ کیا نہ بہکاتا بلکہ ان کو بہکا ہی نہیں سکتا۔ یعنی اس کے بہکانے کا ان پر اثر ہی نہیں ہوتا اور یہی اس کی مراد بھی تھی اور نہ یہ کم بخت اپنے حملوں سے کہیں باز نہیں رہتا باوجود یہ کہ انبیاء کی عصمت جانتا ہے مگر اپنی چالوں سے وہاں بھی نہیں چوکا' گو ناکام رہا۔ مگر ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا مگر خدا تعالیٰ کی حفاظت ہے کہ اہل اللہ کاملین اس کے قابو میں نہیں آتے البتہ ہم جیسوں پر پوری امید باندھ کر حملہ کی ہمت کرتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک شخص کا ہمزاد اس کے تابع تھا' ایک دن وہ جارہا تھا' سامنے سے ایک قصائی جو اس کا دشمن تھا' ملا اس نے ہمزاد سے کہا کہ اس کو مارڈال' ہمزاد نے کہا کہ اس کے پاس تو چھریاں ہیں ہاں یہ بنیا جو مرمروں کا تھیلا لیے جارہا ہے کہو تو اس کی گردن مروڑ دوں' اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں' اصل کام تو چھریوں والے کا ہے' اسی طرح یہ شیطان بھی بنیوں سے یعنی عوام سے نہیں ڈرتا'

چھریوں والوں سے یعنی خواص اہل اللہ سے ڈرتا ہے مگر باوجود ڈرنے کے ان کے اغوا و اضلال کی کوشش میں بھی مصروف رہتا ہے اس میں شک نہیں کہ ہے بڑا بلند ہمت باوجود یہ کہ یقیناً وقطعاً جانتا ہے کہ انبیاء کی عصمت میں اولیاء کی حفاظت میں میرے اغوا کا برائے نام بھی اثر نہیں ہو سکتا مگر ہمت سے پھر باز نہیں آتا قصد کرتا ہے گو منہ کی کھاتا ہے مگر اپنے عزائم پر جما ہوا ہے اور اس کی یہ ہمت گو اپنے متعلق کے اعتبار سے بری اور واجب الترک ہے لیکن اگر نفس ہمت وعزم کو دیکھا جائے تو اس قابل ہے کہ اس سے سبق لیا جائے اور مصرف کو بدل کر اس سے کام لیا جائے مگر اس نے اس ہمت کو برے کام پر خرچ کیا ہے تم نیک کام میں خرچ کرو۔ یہ قصہ مشہور ہے کہ حضرت جنیدؒ نے ایک شخص کو سولی پر چڑھا ہوا دیکھا' دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے اور کیا قصہ ہے' لوگوں نے کہا یہ ایک بڑا نامی گرامی چور ہے اول مرتبہ گرفتار ہوا تو اس کا ہاتھ کاٹا گیا پھر باز نہیں آیا' دوبارہ گرفتار ہوا تو پیر کاٹا گیا' پھر بھی چوری کرتا رہا' غرض دست و پا کٹنے کے بعد بھی چوری سے باز نہ آیا تو اس کو سولی دینے کا حکم ہوا اور دار پر لٹکا دیا گیا کہ اور لوگ خوف کریں اور اس سے عبرت حاصل کریں۔ حضرت جنید نے آگے بڑھ کر اس کے قدم چوم لئے' لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ کیا کیا یہ فاسق' بدکار اس قابل ہے کہ آپ اس کے پیر چومیں' فرمایا میں اس کے فسق کے پیر نہیں چومتا ہوں بلکہ اس کی ہمت و استقلال کے پیر چومتا ہوں جو استقلال اس کو عصیاں و نافرمانی میں تھا افسوس ہم کو طاعات میں بھی وہ استقلال نصیب نہیں اگر حق تعالیٰ ہم کو طاعات وعبادت میں یہ استقلال عطا فرما دیں تو ہمارا یہ حال ہو جاوے۔

دست از طلب ندارم تا کام من برآید ۔۔۔ یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(جب تک میرا مقصود نہ پورا ہو جائے طلب سے باز نہ آؤں گا یا تو جسم محبوب حقیقی تک پہنچے یا روح جسم سے نکل جائے)

عبرت کا حصول

اہل اللہ حکیم ہوتے جو شے اچھی دیکھتے ہیں اسے اختیار کر لیتے ہیں جو بری ہوتی ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں اور جو دونوں سے مخلوط ہو اس میں سے اچھی چیز کا انتخاب کر لیتے ہیں' بری سے اجتناب کرتے ہیں۔ "خذما صفا ودع ما کدر" (جو صاف ہے اس کو لے لو اور جو گدلا ہے اس کو

چھوڑ دو) پر ان کا پورا عمل ہوتا ہے۔ غرض بمصداق "کلمة الحکمة ضالة المومن" (دانا کی بات مؤمن کی گم شدہ چیز ہے) اچھی اچھی چیزوں کو خواہ کہیں بھی ہوں حاصل کر لیتے ہیں۔

نگوئیداز سرباز بچہ حرفے کزاں پندے نہ گیرد صاحب ہوش

(یعنی قصہ اور کھیل سے بھی جو لوگ بات کہتے ہیں اس سے بھی عقلمند نصیحت حاصل کرتے ہیں)

کتب ادب میں لکھا ہے کہ ایک حکیم نے دعویٰ کیا کہ میں نے ہر چیز سے کوئی نہ کوئی اچھی چیز اخذ کر لی ہے، لوگوں نے پوچھا کہ کتے سے آپ نے کیا اچھی چیز اخذ کی ہے، کہا اپنے محسن کا احسان بہت مانتا ہے، پوچھا گیا کہ بلی سے کیا اخذ کیا گیا، کہا شکار کے لیے داؤ خوب لگاتی ہے اور یہ طبع سلیم اور عقل کامل کا کام ہے کہ حیوانات سے بھی سبق لے لے، کسی اور بزرگ سے دریافت کیا گیا کہ یزید کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے فرمایا شاعر اچھا تھا۔ اہل اللہ کی نظر برائی پر جاتی ہی نہیں، ان کے پیش نظر ہمیشہ محاسن ہوتے ہیں، کسی معایب کا خیال بھی نہیں آتا اور بات ہے کہ جس شخص کو کام کرنا ہوتا ہے وہ ہمیشہ محاسن پر نظر رکھتا ہے، مساوی معایب پر اس کی نظر نہیں جاتی البتہ جس شخص کو کام نہ کرنا ہو، وہ بے شک برائیوں کو جانچے گا، قبائح پر نظر ڈالے گا، پس ہر شخص کو لازم ہے کہ ہر امر سے عبرت حاصل کرے، ہر بات سے نصیحت نکالے، ایک شخص نے خوب کہا ہے کہ جب برا آدمی تمہاری نصیحت و وعظ سے اپنی برائی سے باز نہیں آتا تو تم اپنی بھلائی کو کیوں چھوڑو، یعنی جب فاسق کو برائی پر اس قدر اصرار ہے تو تم کو نیکی پر اس سے زیادہ اسرار کیوں نہ ہو وہ اپنی ہٹ سے برائی کو نہیں چھوڑ سکتا تو تم بھائی کس طرح ترک کرتے ہو وہ شیطان کی محبت کو نہیں چھوڑتا تم رحمان کی محبت کو کس طرح چھوڑتے ہو، غرض یہ کہ شیطان کم بخت رہزنی ضرور کرتا ہے اور اس میں اس کی ہمت قابل داد ہے لیکن حق تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اس کے داؤ سے محفوظ رکھتا ہے مگر یہ پھر بھی رہزنی سے باز نہیں آتا البتہ رہزنی مختلف طرق سے ہوتی ہے عوام کی نظر میں اخلاق حمیدہ کو اخلاق ذمیمہ کر کے دکھاتا ہے، جس کا سبب غلو فی الخشیۃ ہے۔

نظر و فکر کی ضرورت

جن خواص پر خشیت کا حال حد سے زیادہ غالب ہو جاتا ہے بعض اوقات اخلاق حمیدہ ان پر ملتبس ہو جاتے کہ ان کو اخلاق ذمیمہ سمجھنے لگتے ہیں اور فی الواقع اس میں شک نہیں کہ

اخلاق حمیدہ و اخلاق ذمیمہ میں التباس سے محفوظ رہنا ہے بھی بہت مشکل ہے کیونکہ بعض دفعہ دونوں کی صورت یکساں ہوتی ہے یہ دونوں بحر ذخار نا پیدا کنار ہیں کہ انسان کے نفس کے اندر جاری ہیں اور ملے جلے چل رہے ہیں۔ ظاہر میں دونوں ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں دونوں کے درمیان ایک قوی فاصل ہے جو اختلاط حقیقی سے مانع ہے اس فاصل کو کاملین ادراک کرتے ہیں چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں　　درمیان شان برزخ لایبغیان

(بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہوتے)

اس شعر میں اشارہ ہے آیت "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ" (اسی نے دریاؤں کو ملا دیا کہ باہم ملے ہوئے ہیں ان دونوں کے درمیان ایک حجاب ہے کہ دونوں بڑھ نہیں سکتے) کی طرف بحر تلخ سے مراد اخلاق رذیلہ ہیں اور بحر شیریں سے مراد اخلاق حمیدہ مطلب یہ کہ دونوں دریا ساتھ ساتھ انسان کے اندر چل رہے ہیں مگر درمیان میں ایک برزخ اور فاصل بھی ایسا موجود ہے جس سے کسی ایک کی مجال نہیں کہ دوسرے میں خلط ہو جائے اور مولانا مرحوم نے ان اشعار میں آیت کریمہ کی تفسیر نہیں کی تا کہ "من قال برائه الخ" کا مصداق ہو جائے بلکہ محض تشبیہ مقصود ہے کہ انسان کے نفس میں بھی اخلاق ذمیمہ اور اخلاق حمیدہ کا اجتماع ایسا ہی ہے جیسے محسوسات میں بحر تلخ و بحر شیریں کا اجتماع ہوا کرتا ہے اور جیسے کہ حسی دریاؤں کے متعلق "بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ" میں ارشاد ہے اسی طرح ان معنوی دریاؤں کے درمیان بھی ایک برزخ موجود ہے جو کاملین کو نظر آتا ہے ناقصین کو نظر نہیں آتا' ان کو دونوں مخلوط نظر آتے ہیں اس خلط سے محفوظ رہنے کے لیے نظر و فکر کی ضرورت ہے' اخلاق کی کتابوں میں غور کرنے سے اس کا حال معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ ہم لوگ ناواقف ہیں حتیٰ کہ درس میں بھی کوئی اخلاقی کتاب داخل نہیں اور غیر درسی کتاب کا مطالعہ کرتے نہیں اس لیے خلط میں پھنسے رہتے ہیں اور بعضے لوگ جو کتب تصوف کا بعد الفراغتہ یا قبل الفراغ مطالعہ کرتے بھی ہیں ان کے لیے بھی امراض و احوال کا اپنے نفس پر منطبق کرنا مشکل ہوتا ہے یہ

انطباق بھی دوسرا ہی کر سکتا ہے اپنے آپ کو اپنے عیوب کم نظر آتے ہیں اس لیے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اخلاقی کتابوں میں سے کوئی کتاب ضرور درس میں داخل کی جائے۔

مرشد کامل کی رہبری

اسی طرح یہ امر بھی قابل توجہ وضروری عمل ہے کہ تعلیم کے بعد کسی شیخ و بزرگ کی صحبت بھی اختیار کرنا چاہیے باوجود اس کے کہ یہ امر بہت مہتم بالشان ہے لیکن لوگ اس سے اس درجہ غافل ہیں کہ اس کو امر فضول سمجھتے ہیں اور بعضے لوگ جو کسی درجہ میں ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی محض برائے نام یعنی چار ہی دن کے لیے آتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھئے کہ کس واسطے تشریف لائے ہو فرمائیں گے اصلاح نفس کے لیے کتنی مدت قیام ہوگا جواب میں ارشاد ہوتا ہے چار دن یعنی اصلاح نفس کے حرفوں کی برابر بھی تو دن تجویز نہیں کرتے بلکہ دو دو حرفوں کے مقابلہ میں ایک ایک دن مقرر کرتے ہیں نہ معلوم اصلاح نفس کو کچھ کھیل سمجھ رکھا ہے یا محض آمد و رفت ہی کا نام اصلاح نفس رکھ لیا ہے بعض آٹھ دن کے لیے آتے ہیں بعض نے بہت ہمت کی تو مہینہ دو مہینہ کو آ گئے' بھلا تمام عمر کے کہنہ اور جبلی امراض اور ان کے معالجہ کے لیے چار دن یا ایک ہفتہ یا ایک دو مہینہ تجویز ہوتے ہیں نہ معلوم یہ کس امر کا مقتضاء ہے دیکھئے کوئی شخص اگر چار سال میں تپ دق میں مبتلا ہو اور طبیب کے پاس علاج کرانے جائے اور کہے کہ چار دن میں چار سال کے مرض کا علاج ہو جائے تو طبیب کیا اس بات کی سماعت کرے گا یا اس کی جانب التفات و توجہ کرے گا ہرگز نہیں بلکہ بات بھی نہ کرے گا' کہے گا اس کو خلل دماغ ہے کہ چار برس کا مرض چار دن علاج کرانا چاہتا ہے جب اطباء ظاہری سے ان امراض ظاہری میں جو قلیل عرصے سے صحت کو خراب کر رہے ہیں ایسے شخص کے علاج کرنے کی توقع نہیں تو اطباء روحانی تمہارے ان امراض باطنی کا جو عمر بھر سے تمہاری صحت روحانی خراب کر رہے ہیں کس طرح چار دن میں علاج کر دیں گے۔ حیرت ہے کہ تعلیم الفاظ میں تو آٹھ آٹھ دس دس سال خرچ کر دیتے ہیں اور اصلاح نفس معالجہ روحانی کے واسطے ایک سال رہنا بھی دشوار اور مشکل معلوم ہوتا ہے حالانکہ علم الفاظ آلہ اور مقدمہ ہے اور اصلاح نفس مطلوب بذاتہ و مقصود ہے کہ مقصود ہمیشہ مقدمات و مبادی سے

اولیٰ وافضل ہوا کرتا ہے۔ قیاس کا تو مقتضی یہ تھا کہ اگر تعلیم رسمی میں ایک سال صرف ہوا ہے تو تعلیم مقصود میں چار سال تو خرچ ہوں گے لیکن یہاں اس کے عکس کی بھی نوبت نہیں آتی کہ آٹھ سال میں اگر تعلیم سے فارغ ہوں تو دو ہی سال اصلاح نفس ومجاہدہ وریاضت میں صرف کریں بلکہ بعض حضرات تو اصلاح نفس کے لفظوں کی برابر آٹھ روز مقرر کرتے ہیں کہ بس ایک ہفتہ میں مشیخت کی گٹھڑی ہاتھ آ جائے گی اور بعض افراد ۴۰ دن متعین فرماتے ہیں کہ ایک چلہ میں تکمیل ہو جائے گی، نہ معلوم یہ زچہ عورت ہیں کہ چالیس روز میں چلہ نہا کر پاک صاف بن جائیں گے تمام امراض سے صحت بھی ہو جائے گی اور بچہ بھی مل جائے گا وہ بچہ کیا ہے مجاہدہ وریاضت کا اثر اور نتیجہ یعنی نسبت مع اللہ افسوس اس گوہر نایاب کی کیسی بے قدری کی جارہی ہے اے صاحبو اس کے حاصل کرنے کے لیے کم از کم اتنی مدت تو تجویز کی ہوتی جس میں رضاعت وفطام وغیرہ کا طریقہ تو معلوم ہو جاتا لیکن اتنی فرصت کہاں بس چالیس روز میں شیخ کامل ہونا چاہتے ہیں، بعض صاحب چھ ماہ اصلاح نفس کے لیے وقف کر دیتے ہیں جو کہ اولیٰ مدت حمل ہے یعنی چھ ماہ میں بچہ یعنی وہی نسبت مع اللہ ضرور ہو جانا چاہیے۔ کیا مطلب چھ ماہ میں پیری وراہ گیری کی سند مل جانی چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ اچھا چھ ماہ میں حمل ٹھہر بھی گیا لیکن اگر وہ پیٹ کے اندر مر گیا تو اب بتلاؤ اسے کون جنا دے تم تو حمل ٹھہرنے کے بعد چھ ماہ میں چل دیئے اب وہ مردہ بچہ اندر سے کیونکر نکلے گا، پس وہ تو اپنے سمیت تم کو ہلاک ہی کرے گا۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح نفس کا نام بدنام ہی کرنے کے واسطے لیا جاتا ہے اصل مقصود محض ریاء وسمعاً نمود وشہرت ہوتی ہے کہ وطن جا کر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جناب عالی مولوی مولانا بھی ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ درویش وشیخ بھی بن گئے ورنہ حقیقت میں آج کل جو اصلاح نفس یا تربیت باطن زبان سے کہا جاتا ہے ان لفظوں کا کچھ بھی ملول نہیں محض بے معنی الفاظ ہوتے ہیں۔ ایک شخص میرے پاس پانی پت سے آئے، فرمایا میں قاری صاحب سے تجوید پڑھتا ہوں، آج کل قاری صاحب دو مہینے کے واسطے باہر گئے ہیں میں بے کار تھا لہٰذا اصلاح نفس کے لیے آیا ہوں، دیکھئے ایسا فضول اور زائد کام سمجھا کہ آؤ آج کل بے کار ہیں اسے ہی کرلو، تفریح بھی ہو جائے گی افسوس میں نے کہا کہ مجھے معاف فرمائیے میں اس کام کو انجام نہیں دے سکتا،

جناب کو یکسوئی نہ ہوگی کبھی یہاں کا خیال ہوگا کبھی وہاں کی فکر ہوگی' کشمکش میں اصلاح نفس نہیں ہوا کرتی دوسری اتنی مدت میں ہو بھی کیا سکتا ہے۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے　　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(یعنی صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے' پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

بھائی تم تو اپنی طرف سے اس مہتم بالشان امر کے لیے ایک وسیع وقت نکالو' گو شیخ کی توجہ اور اللہ تعالیٰ شانہ کے فضل وکرم سے تھوڑے ہی دنوں میں کام ہو جائے' مطلب برآئے لیکن تمہارا عزم تو وسیع ہونا چاہیے اپنی طرف سے تو کوتاہی نہ کرو۔ جب انسان کوئی کام کرنا چاہے تو اول اس کو معلوم کر لینا چاہیے کہ اس کام کے لیے کس قدر وقت کی ضرورت ہے اور کتنی مقدار زمانہ کی اس کام کے لیے کافی ہے لیکن چونکہ یہاں کام کرنا مقصود ہی نہیں محض نام ہی مطلوب ہوتا ہے اس لیے دل بھی نہیں لگاتا اور زیادہ مدت بھی نہیں دی جاتی۔ الحاصل اخلاق حمیدہ واخلاق ذمیمہ کے التباس کے سبب انسان کبھی ایسی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے خلاصی محال معلوم ہونے لگتی ہے۔ پھر کبھی تو اس پریشانی میں صرف ایمان کا اندیشہ ہوتا ہے اور گاہے جان کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ اللہ اکبر اکثر لوگوں نے تو خودکشی کر لی ہے اسی صدمہ ورنج میں جان دیدی ہے لہٰذا ضرورت ہے ایک شیخ کامل ومبصر کی کہ اخلاق ذمیمہ کو اخلاق ذمیمہ بتادے اور ان کے معالجہ میں کوشاں ہو اور اخلاق حمیدہ کو اخلاق حمیدہ بتادے اور ان کے بقاء ودوام کی کوشش کرے' دودھ کا دودھ علیحدہ کر دے اور چھاچھ کی چھاچھ کو امر مشتبہ ومتلبس نہ رہے' روز روشن کی طرح سب معاملہ صاف ہو جائے۔ غور کیجئے مثلاً ایک شخص مرض دق میں مبتلا ہے اور اپنے آپ کو مریض نہیں سمجھتا بلکہ صحیح خیال کرتا ہے جس طرح یہ شخص ایک بڑی غلطی میں مبتلا ہے اسی طرح اس کا مقابل بھی اس سے زیادہ غلطی میں گرفتار ہے یعنی جو شخص کہ اچھا خاصا ہو لیکن ایک دن جو گرمی میں زیادہ پسینہ آ گیا اور حرارت شمس کی وجہ سے بدن گرم ہو گیا تو وہ یہ سمجھ گیا کہ مجھے بخار ہو گیا' لگا ہائے ہو کرنے' قبل از مرگ واویلا شروع کر دیا' گھر آتے ہی بیوی پر غصہ شروع کر دیا' مردار تو ادھر ادھر پھرتی ہے' میں بخار میں مر رہا

ہوں، میرا برا حال ہے، کوئی دم کا مہمان ہوں اس نے کہا کہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ تم کو تو بخار و خارخاک بھی نہیں، محض وہم ہے اس کا کیا علاج، جواب میں کہا تیرا کیا ہے اگر میں مر جاؤں گا، تو ظاہر ہے کہ اس شخص کی غلطی پہلے شخص سے بھی زیادہ ہے اور اس کا رفع ہونا بہت مشکل ہے بعض اکابر نے فرمایا ہے: "ان تمارضتم تمارضوا" کسی شاعر نے کہا ہے: مزن فال بدکآورد حال بد (بری فال مت دو اس سے برا حال پیدا ہوگا)

بدگمانی سے احتراز

فال بد کی ممانعت اس وجہ سے نہیں کہ اس میں کچھ اثر ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ کے ساتھ سوظن و بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کوئی بلا ضرور بھیجیں گے۔ "وانا عند ظن عبدی بی[1]" اس نے خدا تعالیٰ سے بدگمانی کی وہ بھی بعض دفعہ اس کی سزائیں ویسا ہی کر دیتے ہیں جیسا اس نے گمان کیا تھا۔ ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دہلی میں مومن خان شاعر تراویح میں قرآن شریف سننے آیا کرتے تھے ایک ڈوم بھی قرآن شریف سننے آیا کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ خان صاحب جس روز وہ سورت آئے جس کا نام نہیں لیا کرتے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے تو مجھے بتا دینا میں اسے نہیں سنوں گا۔ یعنی سورۃ یٰسین، عوام جہل سورۃ یٰسین کا نام سننے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اس کو موت کی علامت سمجھتے ہیں خان صاحب شاعر آدمی تھے، آپ کو مذاق سوجھا، اپنی چلبلی اور شوخ طبیعت سے نہ رہ سکے، گو وہ بڑے متقی اور متورع شخص تھے۔ خدا معلوم سچ یا جھوٹ کہہ دیا کہ وہ تو رات پڑھی بھی گئی اس کو تو تو نے سن لیا۔ اس کو ہنسی ہوگئی اور اس کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرنے لگا، ہوش اڑ گئے، حواس باختہ ہوگیا، روح تحلیل ہونے لگی۔

لکھ کر ہمارا نام زمین پر مٹا دیا ان کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

غرض وہ دوسرے یا تیسرے روز مر گیا۔ غرض صحت کو بیماری سمجھنا بھی غلطی ہے۔ اس غلطی میں جان کا بھی اندیشہ، ایمان کا بھی خطرہ، روحانی نقصان بھی، جسمانی زیاں بھی، اس قسم کی غلطیوں سے لوگوں نے خودکشی کر لی ہے۔ ایسے وقت میں مرشد کامل رہبری نہ کرتے تو

---

[1] مسند احمد ۲: ۳۱۵، ۴: ۱۰۶، الترغیب والترهیب للمنذری ۴: ۳۹۳، اتحاف السادة المتقین للزبیدی ۵: ۲۵، ۷

انسان بجز جان دینے کے اور کچھ چارہ ہی نہیں دیکھتا' جان اور ایمان کے لفظ پر محض لفظی مناسب سے مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ میں مکہ شریف سے واپس آ رہا تھا' بمبئی میں کموسیٹھ کے مسافر خانہ میں قیام ہوا' وہاں کے لوگوں کو میرے آنے کی اطلاع ہوئی اور سب نے وعظ کی درخواست کی۔ میں نے کہا مجھے معاف کرو میں یہاں وعظ نہیں بیان کروں گا کیوں کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو ناحق کہوں گا تو ایمان کا اندیشہ یا حق کہوں گا تو جان کا اندیشہ لہٰذا میں جان و ایمان کو خطرے میں نہیں ڈالتا اور بمبئی میں وعظ نہیں کہتا' مجھے جان و ایمان دونوں محبوب ہیں اور شرعاً دونوں کی حفاظت ضروری ہے البتہ تم کو اگر ایسا ہی شوق ہے تو یہیں مسافر خانہ میں کہہ دوں گا جس کا دل چاہے آ کر سن لے چنانچہ وہیں مسافر خانہ میں بیان کیا' اتفاقاً مجمع بہت زیادہ ہو گیا تھا' غرض جان جیسے طبعاً وعقلاً عزیز ہے اسی طرح شرعاً بھی واجب الحفظ ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی نعمت ہے۔ نیز ارشاد ہے: "لَاتَقْتُلُوْآ اَنْفُسَكُمْ" اگر جان ہماری چیز ہوتی تو ہم کو اس میں تصرف کرنے سے منع نہ کیا جاتا۔

جان وایمان کی حفاظت

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: "لَاتُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" کہ اپنی جان کی حفاظت کرو مصائب نوائب سے بچو اپنی نفوس کو قتل مت کرو جان بوجھ کر مصیبت میں نہ پھنسو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "ان لنفسک علیک حقا ان لعینک علیک حقا"[1] (بے شک تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے' تیری آنکھ کا تجھ پر حق ہے) جب نفس اور جان کا ہم پر حق ہے تو اس کی حفاظت کیوں نہ ضروری ہوگی' انسان جان اور زندگی ہی کے ذریعے سے مدارج کمالات کو طے کرتا ہے ہر دنیوی و دینی طبعی و شرعی ترقی اسی پر موقوف ہے تمام افعال و اعمال کا موقوف علیہ یہی ہے تو اس کی حفاظت کیسی کچھ ضروری ہوگی اس طرح وہ پریشانی بھی ممنوع ہے جس سے اعضاء ظاہری و باطنی قلب وغیرہ پر کچھ برا اثر ہو ان کی حفاظت بھی ضروری ہے کیونکہ یہ اعضاء مقدمہ و آلہ ہیں روح اور جان کے ساتھ مقصود اصلی مرغوب ہوتا ہے اسی طرح اس کے مقدمات بھی ہوتے ہیں' مقدمات کا احترام اور ان کی نگہداشت مقصود ہی

[1] مسند احمد ۶: ۲۶۸' المستدرک للحاکم ۴: ۶۰' اتحاف السادۃ المتقین ۴: ۱۵۲

کی نگہداشت ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں کسی شخص نے تسبیح دیکھی، کہا حضرت آپ کو تسبیح کی کیا حاجت ہے یہ تو مبتدیوں کے واسطے موزوں ہے، فرمایا اسی کی بدولت تو ہم کو یہ دولت ملی ہے اسی کی وجہ سے تو آج واصل الی اللہ ہوئے ہیں اور اسی کو چھوڑ دیں، ایسے رفیق کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ تو کفران اور ناشکری ہے کہ جس چیز کی وجہ سے نعمت غیر مترقبہ حاصل ہو اس سے ہی اعراض کیا جائے اسی طرح یہ اعضاء اور نفس مطلوب بالذات یعنی قرب حق کے لیے آلہ ہے لہٰذا ان کی حرمت و عزت بھی ضروری ہے، خوب کہا ہے

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است ۔۔۔ افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را ۔۔۔ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرا جمال دیکھا ہے اور میں اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہنچے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو ہزار بوسہ دیتا ہوں کہ ان سے تیرا دامن پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ہے)

غرض چونکہ وہ نفس اور اعضاء وسیلہ اور ذریعے ہیں مقصود کے لیے ان کی حفاظت گو آلہ ہی کے درجے میں سہی لیکن ضروری تو ہے اور ایمان کی حفاظت میں تو کسی قسم کا شبہ وشک ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی حفاظت تو جان سے بھی بدرجہا زیادہ اولیٰ ہے کیونکہ یہ تو خود مقصود ہے اس کی حفاظت مقصود کے درجہ میں ہوگی اور ظاہر ہے کہ مقصود ہمیشہ مقدمات سے ہر اعتبار سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اب سمجھ لیجئے کہ اس غلطی سے جو پریشانی ہوگی وہ کس قدر زیادہ سخت ہے، حق تعالیٰ شانہ محفوظ رکھیں اور اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ جمعیت شرعاً بھی مطلوب ہے اور پریشانی سے جس پر یہ مضرتیں مرتب ہوں بچنا ضروری ہے۔ شریعت مقدسہ میں اس کی تعلیم اہتمام سے دی گئی ہے چنانچہ جو شخص محزون و غمگین ہو اس کی تعزیت مامور بہ ہے، جس کے معنی تسلی دینے کے ہیں یعنی اس کو دلاسہ دیا جائے۔ اس کی جمعیت خاطر میں کوشش کی جائے، احادیث میں اس کی بہت فضیلت ہے کہ اپنے بھائی مسلمان کی پریشانی دور کی جائے، اس کی حاجت رفع کی جائے، نیز جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی وطمانیت ہی کے لیے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک طویل عریض خط لکھا ہے وہ خط حصن حصین میں منقول ہے۔

مصائب سے نجات

اورخود حق تعالیٰ جل جلالہ عم نوالہ فرماتے ہیں: "وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُصِیْبَةٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ" یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ان لوگوں کو مژدہ سنا دیجئے جو صابر ہیں اور مصیبت اور سختی کے وقت حق تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ انا للّٰہ پڑھتے ہیں اس میں حق تعالیٰ نے رنج وغم اور پریشانی دور کرنے کا ایک طریقہ بتلایا ہے جس کا عنقریب بیان آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو مسلمانوں کی پریشانی گوارا نہیں جب ہی تو اس کے رفع کا طریقہ بتلایا ہے اور وہ طریقہ تسلی وتشفی میں دو وجہ سے مؤثر ہے ایک تو اس وجہ سے کہ وہ ذکر ہے اور پریشانی کے وقت خدا کی یاد میں لگ جانا پریشانی کے دفع کرنے میں کافی ووافی ہو جاتا ہے جس میں کچھ انا للّٰہ کی تخصیص نہیں بلکہ ہر ذکر میں یہی خاصہ ہے جیسے: "لاالہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ سبحان اللّٰہ استغفر اللّٰہ لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم" (یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور کوئی معبود نہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہیں، میں ان سے مغفرت طلب کرتا ہوں، گناہوں سے بچنے کی ہمت اور نیکیوں کی توفیق اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں) وغیرہ لیکن مصیبت و پریشانی کے وقت ساتھ انا للّٰہ کو ایک تعلق ہے وہ یہ کہ اس میں علاوہ ذکر کے مضمون میں ایسا ہے کہ اس کا استحضار پریشانی کا استیصال کرنے والا ہے کیونکہ حاصل آیت کا یہ ہے کہ غم میں دو باتوں کا خیال رکھے ایک تو انا اللہ کہ ہم ہر اعتبار سے خدائے قادر کے مملوک بندے ہیں، وہ ہم میں جس طرح چاہے تصرف کرے اسے اختیار ہے دوسرے "انا الیہ راجعون" (بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) کہ ہم سب کا مرجع ومآل وہی ایک ذات ہے۔ انا للّٰہ میں تو اس امر کی تعریف ہے کہ اپنے واسطے اپنی عقل ورائے سے کچھ تجویز نہ کرے بس اس پر جمارہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ہیں وہ جو چاہے کرے اس کے فعل میں چون وچرا کا کسی کو حق نہیں اور جب یہ حالت راسخ ہو جائے گی تو کبھی بھی رنج نہ ہوگا۔ پریشانی کا نام بھی نہ آئے گا، پریشانی تو جب ہی ہوتی ہے کہ ہم خود اپنے لیے کچھ سے کچھ تجویز کر لیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہمارا مال ہمیشہ ہمارے پاس رہے، ہماری اولاد ہمیشہ زندہ رہے، ہم ہمیشہ تندرست رہیں، ہمیشہ برسر ملازمت ہیں، کبھی برخاست نہ ہوں وغیرہ وغیرہ

اوراس کے خلاف ہونے غم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہائے یہ کیوں ہوا وہ کیوں ہوا' ہائے میری تو ساری امیدیں خاک میں مل گئیں تو کیا سوچ رہا تھا اور ہو کیا گیا۔ صاحبو! قصر آمال کو اتنا بلند ہی کیوں کرتے ہو اس کے انہدام سے مرجاؤ حق تعالیٰ کے جناب میں تو تفویض محض ہونا چاہیے اور جن لوگوں کو یہ دولت حاصل ہے ان سے راحت اور سامان راحت کا حال پوچھو' حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''فوضت فاسترحت'' یعنی جب تک سارے کاموں کو اپنے ذمہ رکھا پریشان و حیران رہا اور جب سے سب امور کو حق تعالیٰ شانہ کے سپرد کر دیا ہے راحت و آرام میں ہوں' کسی بزرگ نے حضرت بہلول سے دریافت کیا کیا حال ہے کیسے ہو فرمایا اس شخص کی کیا حالت پوچھتے ہو جس کی خواہش کے موافق تمام نظام عالم چل رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص تو خوش وخرم رہے گا۔ سائل نے کہا ذرا اس کی شرح فرمائیے' مطلب سمجھ میں نہیں آیا' فرمایا میں نے اپنا ارادہ حق تعالیٰ شانہ کے ارادہ میں فنا کر دیا' اب جو اس کا ارادہ ہے وہی بعینہ میرا ارادہ ہے اور ظاہر ہے جو کام ہوتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے ارادہ کے موافق ہوتا ہے' پس جب میں نے اپنے ارادہ کو اس کے ارادہ میں فنا کر دیا تو جس طرح ہر واقعہ ارادہ حق کے موافق ہے اسی طرح میرے ارادہ کے موافق ہے اس لیے میں ہمیشہ خوشحال فارغ البال رہتا ہوں۔ حضرت سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ عالم ارواح میں سب کو جمع کر کے پوچھا گیا کیا چاہتے ہو کسی نے کچھ مانگا' کسی نے کچھ مانگا:

حتی دارت النوبة الی هذا اللاشئ احمد نقلت یارب ارید ان لا ارید وان لااختار فاعطانی مالا عین رات ومالا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر من اهل هذا العصر

(یہاں تک کہ اس لاشئی احمد کی باری آئی میں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں ارادہ کرتا ہوں کہ کچھ ارادہ نہ کروں اور اختیار کرتا ہوں کہ کچھ نہ اختیار کروں پس اللہ تعالیٰ نے مجھ کو وہ عطا کیا جس کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا) اور کلمہ استرجاع یعنی ''انا للّٰہ وانا الیه راجعون'' (بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) کا حاصل بھی یہی ہے کہ ہم کو کوئی تجویز نہ کرنا چاہیے بلکہ تمام امور خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینے چاہئیں اور ہم کو تجویز کا حق ہی کیا ہے جب خدا تعالیٰ کے محکوم اور غلام ہیں بھلا غلام کو

بھی کسی تجویز کا حق ہوتا ہے' آقا کے سامنے پس کسی شق کی تعیین کرنا ہمارے لیے مضر ہے،ہم سے محض تسلیم مطلوب ہے' آگے دوسرا جملہ ہے''انا الیہ راجعون'' (بے شک ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اس میں بہت ہی کام کی چیز مذکور ہے۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ جب اناللّٰہ کے سمجھ لینے سے غم تو رفو چکر ہوگیا' طبعیت سے رنج دور ہوگیا' اب حق تعالٰی صرف غم ہی دور کرنے پر بس نہیں فرماتے بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ تم خدا کے پاس جانے والے ہو اس وقت تم کو دارالجزاء دارالثواب میں صبر کی وجہ سے درجہ ہے کہ انسان اگر چہ صاحب حال بھی نہ ہو جس سے غم غالب نہیں آسکتا لیکن وہ پھر بھی اپنا کیمیائی اثر دکھا کر رہتی ہے اس کا نفع ضرور بالضرور ہوتا ہے آدمی ثواب کی امید میں تمام پریشانیوں سے قطع نظر کر لیتا ہے کوئی مشکل اس کو مشکل نہیں معلوم ہوتی' ہم دیکھتے ہیں کہ دنیاوی منافع کی امید پر لوگ مصائب کو مصائب نہیں سمجھتے' بے تکلف مشقتیں برداشت کرتے ہیں' زحمتیں جھیلتے ہیں' دیکھئے ملازمین ایک ماہ تک کار ملازمت کو انجام دیتے ہیں محض اس امید پر کہ ختم ماہ پر تنخواہ ملے گی' مزدور دن بھر ڈلیا ڈھوتا ہے کہ شام کو مزدوری ملے گی' قلیوں کو دیکھ لیجئے کہ مسافر کی صورت دیکھتے ہی آگھیرتے ہیں اور زبردستی اسباب سر پر رکھ لیتے ہیں' صرف اس وجہ سے کہ چار پیسے مل جائیں گے ورنہ بظاہر تو سر پر بوجھ لئے ہوتے ہیں۔ مصیبت میں گرفتار ہیں لیکن پیسوں کی امید اس مشقت پر غالب آجاتی ہے اور اس کو اس بارگراں کے تحمل پر راضی کر دیتی ہے اسی طرح ''وانا الیہ راجعون'' (یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے استحضار سے ثواب کی توقع ہو جاتی ہے تو یہ رنج و غم سب کافور ہو جاتا ہے اور ثواب کی توقع اس رنج پر غالب آنے سے یہ اثر ہوتا ہے کہ جان کو پریشانی سے محفوظ رکھتا ہے۔ غرض حق تعالٰی کو یہ مقصود ہے کہ اس کی مخلوق پریشان نہ ہو جہاں تک ہو دارین میں راحت و آرام سے رہیں جو شخص صراط مستقیم پر چلے گا یعنی شریعت مقدسہ مطہرہ پر عمل کرے گا وہ ہرگز ہرگز ابدالاباد تک پریشان و سرگرداں نہ ہوگا۔

وساوس کا اثر

جناب فخر دارین رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی مطلوب ہے کہ آپ کا کوئی امتی حیران و پریشان نہ ہو لیکن اگر کوئی شخص خواہ مخواہ پریشانی میں گھسے' مصیبت میں پھنسے تو اس کا کیا علاج' مثل مشہور ہے خود کردہ را علاج نیست اسی طرح باطنی معاملات میں بعض

دفعہ سالک کو وساوس اور توہمات سے پریشانی ہوتی ہے۔ مثلاً کفر کے خیالات آنے لگتے ہیں جس سے یہ اپنے آپ کو کافر سمجھنے لگتا ہے حالانکہ یہ غلطی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمادیا ہے: "ان اللہ تجاوز عن امتی ما وسوست به صدورها" [۱] (یقیناً اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمادیا' میری اُمت کو ان وسوسوں سے جو ان کے دلوں میں صادر ہوتے ہیں) پس کفر کے وسوسہ سے آدمی کافر نہیں ہوتا بلکہ مومن کامل رہتا ہے اس میں مبتلا ہونے والوں کی بالکل ایسی مثال ہے کہ کسی شخص کا دھوپ میں چولہے کے پاس بیٹھنے سے ہاتھ گرم ہوجائے بس اس کی روح نکلنے لگے کہ اب جان گئی مصیبت آئی' اب بچنا دشوار ہے' جھٹ پٹ حکیم صاحب کے پاس جائے کہ میں سخت مرض میں مبتلا ہوں علاج کردیجئے' حکیم صاحب نے نبض دیکھی کہا ارے میاں تم تو اچھے خاصے تندرست ہو تم کو بیمار کس نے کہا ہے یہ تو محض تمہارا وہم ہے کہا واہ صاحب میں تو سخت مریض ہوں بخار چڑھا ہوا ہے مجھے تو خدا کے واسطے جلاب و مسہل دو تاکہ مادہ کا خروج ہوجائے۔ حکیم صاحب نے کہا تم کو تو یہ حرارت عارضی ہے خود جاتی رہے گی' کچھ فکر کی بات نہیں لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو گو مرض نہیں لیکن خود وہم کیا تھوڑا مرض ہے اور اس وہم کا منشاء محض ناواقفیت ہے اس طرح سالک ناواقف کو وساوس سے وہم اور وہم سے غم پیدا ہوجاتا ہے جو کہ گور میں جا سلاتا ہے۔ صاحبو! وسوسہ کا علاج تو صرف بے فکر اور بے التفات ہو کر مسرور و خوش ہونا ہے نہ کہ غم کو لے کر بیٹھ جانا ہے' جتنا فکر کرو گے' اتنا ہی غم بڑھتا جائے گا' مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے وساوس و خطرات کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا: "وجد تموہ قالو انعم قال ذا الصریح الایمان" [۲] (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم ان وساوس و خطرات کو پاتے ہو' صحابہؓ نے عرض کیا ہاں' آپؐ نے فرمایا یہ صریح ایمان ہے) سبحان اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وسوسہ کے غم کا کیا عجیب علاج فرمایا کہ وہ تو پریشان آئے تھے آپؐ نے بشارت کمال ایمان کی سنا کر مسرور واپس کردیا۔ عارفین وصوفیاء کرام نے اس سے مستنبط کیا ہے کہ وسوسہ کا علاج مسرور رہنا ہے جس کو یہ مرض لاحق ہو اس کے لیے لازم ہے محزون نہ ہو ہمیشہ مسرور و

---

۱ مشکوٰۃ المصابیح: ۶۳' شرح السنۃ للبغوی ۱:۱۰۸' حلیۃ الاولیاء ۲:۲۵۹

۲ الصحیح لمسلم کتاب الایمان باب: ۶۰' رقم: ۲۰۹' سنن ابی داؤد کتاب الادب باب: ۱۱۹' کنز العمال: ۱۲۵۷

خوش رہے تاکہ حدیث پر عمل ہو اور اس کی حالت سنت کے موافق ہو اور اس مسرور رہنے سے وسوسہ دفع ہونے کا راز یہ ہے کہ شیطان انسان کو محزون و غمگین رکھنا چاہتا ہے۔ جب تم اس کے خلاف کرو گے اور اس کو اس کی سعی و کوشش میں کامیاب نہ ہونے دو گے یعنی اپنے کو خوش و خرم رکھو گے رنج و غم نہ کرو گے تو وہ مایوس ہو جائے گا اور تم کو نہیں ستائے گا' سمجھے گا کہ وساوس ڈالنے سے یہ تو الٹا خوش ہوا اور اس کو خوش ہونا گوارا نہیں اس لیے وسوسے ڈالنا چھوڑ دے گا۔ یاد رکھو یہ شیطانی وسوسے اس وجہ سے نہیں کہ اپنے نفس سے سوء ظن پیدا ہو اور تم معاصی سے بچنے لگو بلکہ یہ کم بخت پرانی دشمنی کی وجہ سے دل میں اس لیے وسوسے پیدا کرتا ہے تاکہ تم کو یاس ہو جائے' پس کافر بن جاؤ۔ اس سے بھلائی کبھی متصور نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ اگر یہ کوئی اچھا کام بھی کرتا ہے تو اس میں بھی برائی کا پہلو ضرور مضمر ہوتا ہے اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شخص شیطان پر ہر روز ایک ہزار مرتبہ لعنت بھیجا کرتا تھا ایک روز یہ دیوار کے نیچے سو رہا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہا جلدی اٹھو فوراً یہاں سے علیحدہ ہو جاؤ جیسے ہی وہ علیحدہ ہوا معاً دیوار گر پڑی اس نے کہا آپ صاحب کون ہیں' نام کیا ہے:

چہ نامی کہ مولائے نام تو ام   درم نا خریدہ غلام توام

(تمہارا کیا نام ہے کہ تمہارے نام کا غلام ہوں' تمہارے غلام کا درم ناخریدہ ہوں)

اس نے کہا جب آپ کو معلوم ہو جائے گا تو پھر احسان نہ مانو گے میرا نام نہ پوچھو' کہا نہیں ضرور نام بتلایئے کہا میرا نام ہے ابلیس جس پر ہر روز ہزار مرتبہ لعنت کیا کرتے ہو' اس نے کہا پھر تو تو میرا دشمن تھا' تو نے مجھ پر یہ احسان کیوں کیا' کہا خدا نہ کرے جو میں تجھ پر احسان کروں' میں نے تجھ کو ایک خیر سے روک دیا کیونکہ اگر وہ دیوار تجھ پر گرتی تو تو مرجاتا اور جو شخص ہدم الجدار سے مرجائے وہ شہید ہوتا ہے اس لیے میں نے تجھ کو بیدار کر دیا تاکہ ایک نعمت عظمیٰ سے محروم رہے اور تجھ کو شہادت نصیب نہ ہو۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکایت لکھی ہے نہ معلوم کہاں سے نقل فرمائی کہ ایک دفعہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نماز کے لیے شیطان نے آ کر بیدار کیا اور کہا حضرت صلوۃ تہجد سے فارغ ہو جایئے' وقت جا رہا ہے' آپ نے دریافت کیا تو کون ہے کہا میں ابلیس ہوں' فرمایا تو نے مجھ کو کیوں بیدار کیا کہا پرانے جذبہ کی وجہ سے بیدار کر دیا کیونکہ میں بھی عابد تھا'

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ یہ صحابی تھے اس کی چال میں کب آنے والے تھے، فرمایا بس بس کیوں بہکاتا ہے سچ سچ بتا میں تیری ایک نہیں سنوں گا، کہا حق یہ ہے کہ میں نے فلاں روز آپ کی صلوۃ تہجد فوت کرادی تھی، اس پر آپ نے بے حد تاسف و افسوس کے ساتھ آہ کی جس کی وجہ سے آپ کے درجات میں بہت ترقی ہوئی جو تہجد سے کبھی نہ ہوسکتی تھی اس لیے میں نے آج اول ہی سے بیدار کردیا کہ آپ کو دوبارہ ایسی ترقی نہ ہو اور تہجد ہی تک درجہ رہے۔ یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھ بیٹھے، سوئے نہیں اور تہجد میں مشغول ہو گئے۔ اگر کوئی جاہل ہوتا تو مخالفت شیطان کی بنا پر سو رہتا، یہ محقق تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ تھے۔ حق بات سن کر عمل کرنے لگے تو حاصل یہ ہے کہ شیطان انسان کے پیچھے لگا ہوا ہے جب اسے موقع مل جاتا ہے تو نیش زنی کرتا ہے اس کا علاج مخالفت ہے۔ پس جب یہ وسوسہ ڈالے اور محزون و غمگین کرنا چاہے تو زیادہ مسرور خوش ہونا چاہیے وہ ناامید ہو کہ خود ہی تم کو چھوڑ دے گا۔

خلاصہ یہ کہ وسوسہ کا مرض مضر نہیں بلکہ محمود و مرغوب ہے لیکن بعض لوگ شیطان کے دھوکہ میں آکر وسوسہ کو مرض سمجھ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

غلطیوں کا احساس

اسی طرح صدہا چیزیں اشتباہ و التباس کی ہیں۔ مثلاً تواضع و تذلل استغناء و تکبر جن کا میں بیان کر رہا ہوں ان میں بھی بعض اوقات التباس ہو جاتا ہے جس کے امتیاز کے لیے سالک کی رائے کافی نہیں بلکہ ضرورت ہے ایک شیخ کامل مبصر کی کہ مراحل سلوک میں جانچ پڑتال کرتا رہے جو غلطی محسوس ہو اس کا ساتھ دفعیہ کرتا جائے مگر شیخ کی تنبیہ کے نافع ہونے کی شرط یہ ہے طالب ہیں انقیاد ہو جس کو وہ غلطی بتلا دے۔ طالب اس کو غلطی مان لے تاویل نہ کرے، خصوص علماء طلباء کو اس انقیاد اور تسلیم کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ انمیں یہ مرض استنکاف اور تاویل کا زیادہ ہے چاہیے تو یہ تھا کہ علم کے بدولت ان میں یہ رذائل کم ہوتے کیونکہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں "هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ" (کیا برابر ہوسکتے ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو علم نہیں

رکھتے) لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ آج کل ان امراض میں زیادہ تر مولوی صاحبان ہی مبتلا ہو رہے ہیں، خصوصاً کبر میں کہ اپنی خطا اور غلطی ماننے سے ان کو عار آتی ہے، طالب علمی کی ابتداء سے تاویل و توجیہ کی عادت ہوتی ہے ہر غلطی میں توجیہ کی پچر لگا دیتے ہیں کبھی غلطی و خطا کا اقرار نہیں کرتے، میرے پاس جو لوگ طالب حق آتے ہیں ان میں مولوی صاحبان بکثرت غلطیوں کی تاویلیں کیا کرتے ہیں، خطا کا اقرار کرتے ہوئے موت آتی ہے جہاں کسی امر خلاف شان پر متنبہ کیا فوراً تاویل گھڑ دی، میں تو کہہ دیتا ہوں جب تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو کہ میں تو ایک بات کو مرض کہوں تم اس کو صحت بتلاتے ہو تو یہاں آنے کی کیا حاجت تھی، گھر بیٹھے تاویلوں توجیہوں سے اصلاح نفس کر لی ہوتی، غرض میرا تجربہ و مشاہدہ ہے کہ عیب پر تنبیہ کرنے کے وقت مولوی صاحبان خطا پر زیادہ اصرار کرتے ہیں یہ کبھی توجیہ سے نہیں چونکتے۔ گویا ان کے اندر کوئی عیب ہی نہیں پایا جا سکتا بالکل بے عیب ہیں۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ ہر شے اپنی حد تک پسندیدہ و مرغوب خاطر ہے جب افراط تفریط سے کام لیا جائے گا، ہمیشہ غلطی میں مبتلا ہو گا اور مبنی ایسی غلطی کا اکثر اشتباہ بین الامرین ہوتا ہے، دو ضدوں میں تمیز نہ کرنے سے انسان کو غلطی ہوا کرتی ہے مثلاً تکبر و استغناء میں التباس ہو کر کبھی تکبر کو استغناء سمجھا جاتا ہے اور گاہے استغناء کو تکبر سمجھا جاتا ہے اسی طرح تذلل کو تواضع سمجھتے ہیں اور تواضع کو تذلل، اسراف کو سخاوت و بالعکس حالانکہ ان میں دن رات کا فرق ہوتا ہے اور اس فرق کا زیادہ تر مدار تعلیم شیخ و تنبیہ شیخ پر ہے خود بہت کم محسوس ہوا کرتا ہے اس لیے میں نے بقدر ضروریات تواضع کی حقیقت بتلا دی باقی پورا انکشاف کسی کی صحبت میں رہ کر ہو سکتا ہے۔ زیادہ تفصیل و تطویل کی احتیاج نہیں اس وقت اتنا سمجھ لو کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دو اخلاق ذمیمہ سے منع فرمایا ہے، ایک تکبر دوسرے تذلل کہ ان سے بچو یہ دونوں منہی عنہ ہیں اور دو اخلاق حمیدہ کا حکم فرمایا ہے ایک تواضع دوسرے استغناء کہ ان کو اختیار کرو۔ یہ دونوں مامور بہ ہیں البتہ امر و نہی کا درجہ متعین نہیں ہوا کہ امر وجوب کے واسطے یا استحباب وغیرہ کے لیے ہے ایسے ہی نہی حرمت کے لیے ہے یا کراہت وغیرہ کے لیے ہے تو درجہ کی تعیین دوسرے نصوص و دلائل سے ہو جائے گی اب تو ان دلائل کو سنئے۔

تکبر حرام ہے

حق تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ فرماتے ہیں: "اِنَّ اللّٰهَ لَایُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ" (اللہ تعالیٰ کسی متکبر فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے) نیز صحیح مسلم میں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کے قلب میں رائی برابر تکبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا حق تعالیٰ نے حدیث قدسی میں فرمایا ہے "الکبریاء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی فیھا قصمته"[1] (بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری تہ بند ہے پس جو شخص ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا) ان نصوص سے معلوم ہوگیا کہ تکبر حرام ہے اب اس میں خوشامد کرتے ہیں ہر قسم کی ذلت برداشت کرتے ہیں وہ بھی دنیا ہے حالانکہ اذلال النفس منھی عنہ ہے اس لیے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "لَایَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" (وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے) یعنی مانگنے میں اصرار و ابرام نہ کر لوگوں پر بوجھ نہ ڈالو دیں دیدیں اور نہ دیں تو کچھ زور نہیں اجارہ نہیں آج کل کے مدعی درویشوں کو دیکھئے پیٹ کے لیے الحاف کو گوارا کرتے ہیں' اکثر لوگ ان کے سوال سے خواہ تہذیب سے ہو یا بے تہذیبی سے تنگ ہوتے ہیں' یہی الحاف ہے میرے خیال میں اگر حاجت بھی ہو تو صلحاء غرباء سے سوال کر لے اور ان رؤسا امراء کے تو پاس بھی نہ پھٹکے' ان سے تو دور ہی رہنا مصلحت ہے ان میں محض ظاہری تہذیب ہوتی ہے ورنہ دل میں حقیر سمجھتے ہیں ان کو چھوڑنا چاہیے۔ البتہ اگر ان سے ملنے میں کوئی شرعی مصلحت ہو اور وہ واقع میں مصلحت ہو تسویل نفس نہ ہو تو ملنے کا مضائقہ نہیں بلکہ اگر ذلت کا احتمال نہ ہو تو ترغیب چندہ میں بھی حرج نہیں' غرض یہ کہ تذلل حب مال سے ہوتا ہے اور تکبر حب جاہ سے ہوتا ہے اور دونوں زہر قاتل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "ماذئبان جائعان ارسلا فی قطیع غنم"[2] الحدیث کہ اگر دو بھوکے بھیڑیئے بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے جائیں تو وہ بکریوں کو اتنا ضرر نہیں پہنچاتے جتنا ضرر انسان کو حب مال وحب جاہ پہنچاتے ہیں۔ ہم لوگ بکثرت ان دونوں مرضوں میں مبتلا ہیں۔ اسی وجہ سے اس مضمون کو اختیار کیا گیا ہے اور

---

[1] مسند احمد ۲:۴۱۴' المستدرک للحاکم ۳:۴۵۳' اتحاف السادة المتقین ۸:۳۳۷

[2] سنن الترمذی ۶:۲۳۷' مسند احمد ۳:۴۵۶' ۴۵۷' سنن الدارمی ۲:۵۰' مشکوٰۃ: ۵۱۸۱

عوام کی کیا شکایت اس مرض میں بکثرت خواص کو بھی ابتلاء عام ہے عوام الناس کا مبتلا ہونا زیادہ موجب تعجب نہیں کیونکہ اس میں رادع کم ہوتا ہے موانع قریب قریب مفقود ہوتے ہیں بلکہ سب شرائط موجبہ امراض پائے جاتے ہیں' علم سے بھی بے بہرہ ہوتے ہیں' صحبت سے بھی محروم ہوتے ہیں' تعجب تو ان خواص سے ہے کہ وہ باوجود علم کے ان امراض میں کیوں کر مبتلا ہیں' خصوصاً ان لوگوں سے کے مقابلے کو لے لیجئے جب تکبر نہی حرمت کے لیے ہے جیسا کہ ترتب وعید سے معلوم ہوتا ہے تو اس کی ضد کا امر وجوب کے لیے ہوگا کیونکہ جیسے امر بالشئی مستلزم ہوتا ہے اس کی ضد سے نہی کو اسی طرح نہی الشئی مستلزم ہے اس کی ضد کے امر کو اور اصولی قاعدہ ہے کہ ایک ضد کے امر کا جو درجہ ہوگا دوسری کی نہی کا بھی وہی درجہ ہوگا اور جو درجہ ایک ضد کی نہی کا ہوگا وہی درجہ دوسری ضد کے امر کا ہوگا۔ پس تکبر کی ضد ہے تواضع اور تکبر کی نہی حرمت کے لیے ہے تو اس کی حرمت سے تواضع کا وجوب ثابت ہوگیا۔ اب رہا استغناء و تذلل تو اس کی تعیین درجہ ایک چھوٹے سے مقدمہ کے ملانے سے ہوجائے گی۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ تذلل کو کیوں اختیار کیا جاتا ہے اس سے مقصود کیا ہوتا ہے۔

حقیقت مال وجاہ

سو ظاہر ہے کہ تذلل سے تحصیل دنیا اور تحصیل مال مقصود ہوتا ہے چونکہ اس شخص کو مال کی جانب رغبت ہے اس لیے اس کے مقابلے میں عزت کو بھی ہیچ سمجھا جاتا ہے' آبرو کی بھی پروا نہیں کی جاتی' پس تذلل کا سبب حب دنیا اور حب مال ہے اور نصوص سے ثابت ہے کہ یہ سب سے بڑھ کر گناہ اور سب خطاؤں کی جڑ ہے۔ حضرت فخر بنی آدم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "حب الدنیا راس کل خطیئة"[1] کہ تمام مفاسد کا منشاء حب دنیا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی چیز حرام ہوگی بس جو شے اس سے پیدا ہو وہ بھی اس کے حکم میں ہوگی کیونکہ ناشی عن الشئی کوشی ہی کا حکم دیا جایا کرتا ہے' گناہ کا بچہ گناہ ہی ہوگا بس اس سے تذلل کی حرمت ثابت ہوگئی اور تذلل کی حرمت سے اس کی ضد یعنی استغناء کا وجوب ثابت ہوگیا۔ تکبر اور تذلل میں حب دنیا مشترک ہے یعنی تکبر میں تو جاہ مطلوب ہے متکبر کا ہی مقصود ہوتا ہے کہ جاہ بڑھ جائے وہ بھی دنیا ہے اور تذلل سے مال متاع مقصود ہوتا ہے اسی

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین ۳:۱۳۱ کنز العمال ۶۱۱۴' مشکوۃ المصابیح ۵۲۱۳

لیے لوگوں کی سخت سست سنتے جو ابھی مخدومیت کی شان کو بھی نہیں پہنچتے ابھی صاحب کمال کہلانے کے بھی مستحق نہیں تکبر کا کوئی داعی ابھی تک ان میں نہیں بلکہ موانع موجود ہے موانع کی قوت کے مقابلہ میں کسی داعی کو قوت نہیں ہے اگر کوئی مخدوم ہو تو کسی نہ کسی درجہ میں وہاں داعی تو موجود ہے گو مانع بھی قوی موجود ہے لیکن خیر سے یہاں مخدوم بھی نہیں پھر ان میں تکبر کیسا۔ خصوصاً طلبہ تو اس مرض میں زیادہ مبتلا پائے جاتے ہیں' میں خصوصیت سے ان ہی کی اصلاح کے متعلق بیان کرتا ہوں کیونکہ انہی کی فرمائش سے میں یہ وعظ کر رہا ہوں لہٰذا وہ احق بالعلاج ہیں' دوسرے بالتبع شامل ہیں جو شخص اپنے مکان پر کسی حکیم کو بلا کے لائے اس کا علاج ضروری ہے۔ ہمسایہ کا حق اس وقت کچھ نہیں اس کو حاجت ہو تو دوبارہ بلا دے لیکن اگر وہ کوئی نسخہ ہمسایہ کو بھی لکھ دے تو اس کی عنایت اور اس کی جانب سے تبرع ہے پس میں طلبہ کی عامتہ الورود غلطی پر متنبہ کرتا ہوں لیکن باوجود اس کے بہت ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کیونکہ یہ لوگ مجھ سے بڑے صاحب رتبہ ہیں واللہ میں ہر طالب علم کا اپنے کو خادم سمجھتا ہوں چونکہ انہوں نے خود ایک خدمت کے لیے مجھے بلایا ہے اس لیے میں اپنا کام کیے دیتا ہوں گو وہ بعد میں تاویلیں توجیہیں کرتے پھریں' تاویل اور توجیہ سے شے کی حقیقت نہیں بدلا کرتی اس کی ماہیت میں کچھ فرق نہیں ہوتا' محض من سمجھوتی ہی ہوتی ہے اگر کسی مضر شے کی تاویل کر لو تو اس سے اس کی مضرت نہیں جاتی رہے گی۔ اگر سنکھیا کی توجیہ کر لو کہ یہ تو نمک ہے یا مصری ہے تو اس کی سمیت نہیں باطل ہو جائے گی تاویل کر کے مخلوق کو دھوکہ دے سکتا ہے لیکن حق تعالیٰ کے علم کو تو معاذ اللہ نہیں بدل سکتا۔ مولانا رومی فرماتے ہیں:

که گهے آهے دروغے میزنی   از برائے مسکه دوغے میزنی
خلق را گیرم که بفریبی تمام   در غلط اندازی تاہر خاص وعام
کارہا باخلق آری جمله راست   باخدا تزویروحیله کے رواست
کارہا اوراست باید داشتن   رایت اخلاص و صدق افراشتن

(تو کبھی جھوٹی آہ کھینچتا ہے گویا مکھن حاصل کرنے کے لیے چھاچھ بلوتا ہے' میں نے فرض کیا کہ تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے' مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں' خداوند تعالیٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے' خدا تعالیٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنا چاہیے' اخلاص اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیے)

شرعی وضع کی ضرورت

بھائیوان تاویلات وتوجیہات کو چھوڑ نا چاہیے۔صدق وخلوص سے کام لینا چاہیے‘ اہل رسم کے اتباع کی حاجت نہیں ہے‘ اپنا نیک و بد خود سمجھنا چاہیے‘ آپ لوگ اہل علم ہیں‘ جاہل و عوام نہیں ہیں ”العاقل تکفیه الاشارة“ اگر ہم لوگ فکر صحیح سے کام لیں تو دیکھیں گے کہ ہم لوگوں کی ضمیر میں ضرور تفاخر ہے الا ماشاء اللہ کوئی فرد ایسا ہوگا جو اس وباء عام میں مبتلا نہ ہو‘ رفتار میں تفاخر گفتار میں تفاخر نشست و برخاست میں تفاخر معاشرت و معاملات میں تفاخر خوراک پوشاک میں تفاخر محض تفاخر وریاء کے لیے قیمتی گراں بہالباس پہنا جاتا ہے‘ روٹی تو کھاویں‘ مسجدوں کی خرچ کریں‘ زکوٰۃ وغیرہ کا مال مگر لباس قیمتی ہی ہوگا۔ گو قرض لے کر ہو مگر شان میں فرق نہ آئے‘ یہ تو اچھا خاصا لباس زور ہے‘ ہر کپڑے میں یکتائی سوجھتی ہے‘ رضائی کے لیے چھینٹ لیں گے‘ وہ جو محلّہ بھر میں بھی کسی کے پاس نہ ہو بلکہ شہر بھر میں بھی کسی کے پاس نہ ہو اور گو ہو چھینٹ لیکن مخمل نما ہو پھر مشورے ہوتے ہیں کہ اس کو گوٹ کیسی خوبصورت رہے گی‘ مغزی کیسی خوشنما معلوم ہوگی‘ استر کیسا ہونا چاہیے‘ کرتہ ہے وہ ایسا ہی ٹوپی ہے وہ ایسی ہی یہ تو وہ لوگ ہیں جو اپنی شان کی موافق شرعی لباس پہنتے ہیں‘ وضع علماء کی اختیار کرتے ہیں مگر اس میں تفاخر اور بعض حضرات طلبہ مزید برآن نئے فیشن پر مٹے ہوئے ہیں۔ٹوپی دیکھئے توڑ کی پاجامہ‘ پتلون‘ اچکن‘ شیروانی‘ جوتا ہمیشہ گرگابی‘ کالر نکٹائی لگی ہوئی ہے جو کہ فی الحقیقت ناک کٹائی ہے نام ہی بڑا خوبصورت ہے مگر لوگ ان پر مرے ہوئے ہیں بعض دفعہ لباس قیمتی نہیں ہوتا لیکن اس کو اس طرز سے تراشا جاتا ہے اور ایسے طور پر سلوایا جاتا ہے جس سے بہت قیمتی معلوم ہو۔ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ طالب علم نہیں کوئی نواب صاحب ہیں یا کوئی امیر زادے ہیں‘ میں یہ نہیں کہتا کہ میلے کچیلے رہو‘ اپنے لباس وبدن کو پاک وصاف نہ رکھو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اپنی حیثیت سے نہ بڑھو‘ جتنی چادر ہے اتنے ہی پیر پھیلاؤ‘ اپنی وسعت کا خیال رکھو‘ علمی وشرعی وضع کو نہ چھوڑو‘ کتنی شرم کی بات ہے کہ تم عالم ہو کر جاہلوں کا اتباع کرو‘ ان کی تقلید کرو‘ چاہیے تو یہ تھا کہ جاہل تمہاری تقلید کرتے نہ کہ وہ الٹا امام ومقتداء بن جائیں‘ یوں تاویلیں توجیہیں کر کے نہ مانو تو اس کا علاج تو کچھ نہیں‘ ذرا تم غور کرو خوض وتاویل سے کام تو لو کہ تم نے یہ طریقہ کہاں سے اخذ کیا ہے۔ظاہر ہے کہ تم نے اس کو اہل باطل سے سیکھا ہے اس لباس

میں کفار کو اپنا پیشوا بنایا ہے اس سے مقصد بجز تفاخر وریاء وغیرہ کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے علاوہ ازیں جس وضع کو تم نے دوسروں سے لیا ہے وہ تمہارے تحمل سے بھی باہر ہے اور عقلاً و شرعاً انسان کو وہ کام کرنا چاہیے جس کی برداشت وتحمل کر سکے، تجمل بقدر تحمل ہونا چاہیے، میں تم کو ایک معیار و قاعدہ بتاتا ہوں اس سے اس وضع کے جواز عدم جواز کا اندازہ کر لیا کرو کہ قیمتی و خوش وضع لباس پہننے کے بعد تمہارے قلب میں کچھ تغیر وتبدل ہوتا ہے کچھ عجب وفخر معلوم ہوتا ہے یا نہیں اگر تمہاری حالت ویسے ہی ہے جیسے پہلے تھی بے شک قیمتی وخوش وضع لباس میں کچھ حرج نہیں ہے بشرطیکہ اور کوئی مانع شرعی نہ ہو اور اگر کچھ خودداری وعجب کی بوآئے تو حرام باقی وضع ہر حال میں حرام رہے گی جو کفار سے اخذ کی گئی ہے کیونکہ اس میں منشا حرمت صرف تفاخر نہیں بلکہ شبہ بھی علت ہے پس صرف تفاخر کی نفی سے حرمت کا انتفاء نہ ہوگا جبکہ دوسری علت باقی رہے نیز ہر وقت لباس کی فکر ویسے بھی تو مضر ہے جو شخص ہر وقت اسی دھن میں رہتا ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ ایک حکیم فرماتے ہیں:

عاقبت ساز وترا از دین بری | ایں تن آرائی وایں تن پروری

(انجام کار تمہاری اس تن آرائی اور تن پروری کا یہ ہوگا کہ تم کو دین سے چھڑا دے گا)

حضرات آپ کا کمال آپ کا جمال تو صرف علم وعمل ہے اس کا خیال رکھئے اس میں مشغول ہوجائیے اس لباس سے زینت حاصل کیجئے۔ **"وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون"** (پس حرص کرنے والوں کو ایسی چیز میں حرص کرنا چاہیے) آپ کو علم وعمل کے ہوتے ہوئے کسی دوسری شے کی ایسی احتیاج نہیں ہے جس کے لیے تشویش اور ذلت میں مبتلا ہو اس کا حصول تمام اشیاء سے مستغنی و بے نیاز بنا دیتا ہے۔ کسی امر کی ضرورت نہیں رہتی۔

زعشق ناتمام ماجمال یار مستغنی است | باب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روی زیبارا

نباشد اہل باطن درپے آرایش ظاہر | بہ نقاش احتیاجی نیست دیوار گلستان را

(جمال محبوب ہمارے عشق ناتمام سے مستغنی ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ و روپ خدوخال کی احتیاج نہیں ہے، اہل باطن ظاہری آرائش کے پیچھے نہیں پڑتے، دیوار گلستان کو نقاش کی احتیاج نہیں ہے)

بس ان زنانے پن کی زینت کو چھوڑنا چاہیے سادگی سے بود باش کرنا چاہیے۔

غرض از جامہ دفع حر و برداست   ندارد میل زینت ہر کہ مرداست

(کپڑے سے غرض سردی گرمی کا رفع کرنا ہے جو مرد خدا ہے اس کا میلان زیب وزینت کی طرف نہیں)

علامت ایمان

حدیث میں ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **"البذاذة من الایمان"** یعنی سادگی سے رہنا ایمان کی علامت ہے آپ لوگ مقتداء ہیں، نائب رسول ہیں، آپ اگر اس فیشن کے لباس وضع کو اختیار کریں گے تو عوام کا کیا حال ہوگیا، وہ تو اچھے خاصے انگریز ہی ہو جائیں گے۔

بہ نیم بیضہ کہ سلطان ستم روادارد   زنند لشکر یانش ہزار مرغ بیخ

(اگر بادشاہ آدھا انڈہ ظلم سے روا رکھے تو اس کے لشکری ہزار مرغ بیخ پر ذبح کرتے ہیں)

عوام اس سے غفلت میں پڑ جائیں گے اور ان کو آپ پر حق احتجاج حاصل ہوگا اور اس سب کا وبال آپ لوگوں کی گردن پر ہوگا۔ دیکھ لیجئے احادیث میں قصہ آتا ہے کہ کوئی خلیفہ باریک کپڑے پہن کر خطبہ جمعہ کو آئے۔ ایک صحابی نے فوراً اعتراض کیا کہ **"انظروا الی امیرنا هذا یلبس لباس الفساق"** دیکھئے خلیفۃ المسلمین کو محض باریک کپڑے پہننے پر جو اس وقت شعار اوباش کا تھا مجمع عام میں کیسا لتاڑا گیا۔ حدیث شریف میں جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: **"من تشبه بقوم فهو منهم"**[1] اور ظاہر ہے کہ اگر آپ کا طریقہ زینت یا فیشن کا اہل کفر یا اہل غفلت سے ماخوذ ہوگا تو آپ بھی ان ہی میں شمار ہوں گے۔ طلبہ کے لیے یہ لباس ہرگز شایان نہیں۔ اس سے علم کی ناشکری بے قدری ہوتی ہے خصوصاً طالب علمی کی حالت میں تو بالکل فقراء ومساکین کی طرح سادہ لباس سادہ مزاج رہنا چاہیے، میں قیمتی لباس سے منع نہیں کرتا، خدا تعالیٰ نے جس کو دیا ہے وہ پہنے میں ترفع وتفاخر

---

[1] سنن ابی داؤد: ۴۰۳۱، مسند احمد ۲: ۵۰، المصنف لابن ابی شیبہ ۵: ۳۱۳، مجمع الزوائد ۱۰: ۲۷۱، کنز العمال: ۲۴۶۸۰، مشکوۃ المصابیح: ۴۳۴۷

سے روکتا ہوں، باقی جن لوگوں میں یہ تفاخر و بڑائی کا مادہ نہ ہو، وہ کیسا ہی بڑھیا لباس پہنیں جب بھی ان کی طالب علمی کی شان میں ضرر رساں نہیں ہوتا کیونکہ وہ بڑھیا لباس میں بھی ایسے الول جلول رہتے ہیں کہ صورت سے آثار طالب علمی صاف نظر آتے ہیں اور جو لوگ زینت و وضع کی فکر میں رہتے ہیں یا نئے فیشن کو اختیار کرتے ہیں ان کی صورت پر طالب علمی کی شان نہیں ہوتی بلکہ افسوس سے کہا جاتا ہے کہ آج کل اس طرز و وضع کو اس لیے اختیار کیا جاتا ہے کہ کہیں لوگ طالب علم نہ سمجھ لیں۔ گویا یہ چاہتے ہیں کہ عوام ہم کو زمرہ طلبہ سے علیحدہ سمجھیں یا ایک شاندار و ممتاز طالب علم تصور کریں اور تاویل یہ کرتے ہیں کہ جہلاء اور عوام کی نظروں میں ذلیل نہ ہوں۔ صاحبو! ذرا گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ یہ کیسی عزت ہے جس کی عزت ہونے پر اہل جہل کی نظر سے استدلال کیا جاتا ہے اس جہالت کا بھی کوئی ٹھکانا ہے عزت تو وہ جس کو اہل نظر عزت کہیں اہل علم کو چاہیے کہ اپنے سلف صالحین اہل علم کا اتباع کریں ان کی پیروی کو اختیار کرو، اسی میں فلاح دارین تصور کریں، یہ آپ کے بچپن کا زمانہ ہے اب جس طرح چاہو نفس کو سدھار سکتے ہو، پھر اصلاح مشکل ہوگی۔

والنفس كالطفل ان تمهله على نسب حب الرضاع وان تفطمه ينفظم

(نفس مثل بچہ کے ہے جس راہ پر ڈال دو اس پر پڑ جاتا ہے، اگر دودھ پلاتے رہو پیتا رہے گا لیکن اگر دودھ چھڑا دو تو چھوڑ دے گا)

اپنی وضع قدیم کو نہ چھوڑو غرباء و مساکین اہل اللہ کے طرز پر رہو اگر تم جہلاء کی نظروں میں اس سے ذلیل بھی ہو تو اس پر فخر کرو یہی ذلت عزت ہے اول تو ذلیل ہوتے نہیں عوام میں بھی اسی عالم کی وقعت ہوتی ہے جو سلف کی طرز پر ہو لیکن اگر کوئی ذلیل بھی سمجھے تو تم یہ جواب دو۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

اوست دیوانہ کے دیوانہ نشد مرعس رادید و درخانہ نشد

(ہم اگر قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا پروا ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی اور ان کی محبت کے متوالے ہیں، جو دیوان نہیں ہوا وہی دیوان ہے جس طرح کوتوال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے)

نامعلوم کس وجہ سے آپ لوگ اپنی وضع بدلتے ہیں۔ ہر طرز ہر طریقہ میں کیوں ردوبدل کرلیا ہے' خوب دھڑلے سے انگریزی لباس پہنتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی لندن سے آئے ہیں اور طرہ یہ ہے کہ انگریزی کا ایک حرف بھی نہ جانتے ہو مگر لباس سے صاحب بہادر بلکہ سانپ بہادر ہی معلوم ہوں گے۔ میرے خیال میں یہ تو عوام میں بھی ذلت سی ہے سلف صالحین کا لباس خواص میں تو بالاتفاق وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے لیکن عوام میں بھی اسی کو عزت کی نظروں میں دیکھا جاتا ہے اور صورت تسلیم اگر عوام اس ثقہ لباس میں آپ کو ذلیل سمجھتے ہیں تو اس نئے لباس میں عوام خواص دونوں آپ کو ذلیل سمجھتے ہیں دونوں طرف سے طعن و تشنیع ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ سانپ بنے پھرتے ہیں اور نام کو انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے اس سے بڑھ کر ستم یہ ہے کہ تکبر لباس میں تو تھا ہی دل میں بھی تکبر گھسا ہوا ہے چنانچہ کبھی اپنی خطا کے مقر نہیں ہوتے قصور کا اعتراف نہیں کرتے' تاویل کو تیار ہوجاتے ہیں' ہر بات میں تاویلی یعنی ٹھنسا ہوا ہے حالانکہ ہر کلامیکہ محتاج یعنی باشد لایعنی است' ہر امر میں لِانَّ موجود ہے اچکن میں بھی لان جوتا میں بھی لان کرتہ میں بھی لان ٹوپی میں بھی لان لباس کیا ہوا لان کا مجموعہ ہوگیا جو نہ اوڑھنے کا نہ بچھانے کا۔

طلب کی شان

اے صاحبو! ان تکلفات باردہ کو چھوڑو تم لوگ طالب علم ہو تو طلب کی شان کو نبھاؤ۔ طلب کے ساتھ توجہ دو چیزوں کی طرف نہیں ہوا کرتی۔ ''**لان النفس لاتتوجہ الی الشیئین فی آن واحد**'' ورنہ اسی لباس و باس میں پھنسے رہ جاؤ گے اور مقصود اصل سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اس نئی وضع قطع میں کیا دھرا ہے کون سی سلطنت مل جاتی ہے سلف صالحین کی وضع اختیار کرو' یہی کمال ہے یہی جمال ہے یہی عزت ہے یہی حرمت ہے گراں قیمت لباس پہننا شرعاً کمال ہے ہی نہیں دیکھئے تواریخ میں جہاں سلاطین کے حالات لکھے ہیں ان کی تعریف کرتے ہیں تو یہ کسی جگہ نہیں لکھتے کہ فلاں بادشاہ بہت خوش لباس تھا' بہت قیمتی کپڑا پہنا کرتا تھا بلکہ جو بادشاہ موٹے اور کم قیمت کپڑے استعمال کرتا تھا اس کا خصوصیت

سے ذکر کیا جاتا ہے اور خاص مداح میں سے شمار ہوتا ہے جہاں اس کے کارنامے وقعت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں سادگی کا بھی احترام کیا جاتا ہے اور یہ اس کے اول نمبر کے محاسن میں سے سمجھا جاتا ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں:

شنیدم کہ فرماندہی دادگر　　قبا داشتے ہر دو رو آستر

(ایک عادل بادشاہ کو میں نے سنا کہ اس کی قبا میں دونوں جانب استر تھا)

دیکھئے چونکہ اس کی قبا میں دونوں جانب استر تھا' اس لیے شیخ نے مدح کی اور اسی فرمانروا کی یہ مدح نہیں کی کہ دیباج پہنتا تھا یا اطلس پہنتا تھا علاوہ ازیں کہ راحت و آرام بھی اسی سلف کے لباس میں ہے جہاں چاہا بیٹھ گئے' زمین پر بیٹھ گئے' تب بھی کچھ حرج نہیں' فرش پر بیٹھ گئے تب کچھ دقت نہیں' غرض ہر طرح سے آرام ہوتا ہے اور تکلف کے لباس میں ہر حالت میں تکلیف ہوتی ہے بعض لباس تو ایسے ہیں کہ ان کو پہن کر آدمی کرسی اور تخت کے سوا کسی چیز پر بیٹھ ہی نہیں سکتا اور اگر فرش اور زمین پر بیٹھتا بھی ہے تو بہت مصیبت سے پھر جن لوگوں کو لباس کی زینت کا اہتمام ہے ان کو ہر وقت اسی کا دھیان رہتا ہے حتیٰ کہ نماز میں بھی یہی خیال دامن گیر ہوتا ہے دامن سمیٹ سمیٹ کر نماز پڑھتے ہیں' مبادا کہیں خاک نہ لگ جائے' کہیں دھول وغیرہ میں نہ آلود ہو جائے' جماعت سے نماز پڑھیں گے تو سجدہ سے سب کے بعد اٹھیں گے تاکہ اچکن شریف کسی کے نوائے کثیف کے نیچے نہ آ جائے۔ نماز میں بھی یہی مشغلہ ہے' جس سے ساری نماز لباس ہی ہوگئی حالانکہ چاہیے تھا اس کا عکس کہ لباس بھی نماز ہو جاتا اگر کوئی مقام صاف ستھرا ہو تو بیٹھ جائیں گے ورنہ کھڑے ہیں اللہ تعالیٰ نے یہ اس لباس کی سزا دی ہے۔ ایک صاحب کانپور میں میرے پاس آئے' کوٹ پتلون ڈاٹے ہوئے تھے جو شخص پتلون پہنے ہوئے ہو وہ کرسی وغیرہ پر تو با آسانی بیٹھ سکتا ہے زمین پر اس سے نہیں بیٹھا جاتا ہم غریب لوگ ملاں آدمی ہمارے پاس کرسی وغیرہ کہاں تھی ہم فرش پر بیٹھتے تھے وہ بیچارے بیٹھ بھی نہ سکتے تھے اور لحاظ و شرم کی وجہ سے کھڑے کھڑے گفتگو بھی نہ کر سکتے تھے' مجبور ہو کر بدن کو تول کر اور ہاتھ کی چھڑی پر سہارا دے کر بھد سے گر پڑے' مجھے دل میں بہت ہنسی آئی پھر اٹھنے میں ان کو اس سے بھی زیادہ مصیبت ہوئی' اگر اسی کا نام آزادی ہے تو ایسی آزادی ہماری قید پر ہزار مرتبہ قربان ہے۔ ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' ایک شخص نے کیا اچھی بات کہی کہ لباس تو خادم مملوک

ہے مخدوم و مالک نہیں ہے جب اسی کی ذہن میں رہے تو وہ خادم کہاں رہا، مخدوم بن گیا، قلب موضوع لازم آ گیا، یہ تو ظاہری خرابی ہے اور شرعی خرابی یہ ہے کہ اس لباس سے کبر پیدا ہوتا ہے اور جب کبھی لباس سے کسی قسم کی ظاہری یا باطنی شرعی مفسدہ لازم آئے وہ نہی میں داخل اور حرمت کے حکم سے موصوف ہو جائے گا۔

کبر و عجب کا علاج

اس صورت میں اگر کبر و عجب کا علاج کرنا چاہو جو کہ ضروری ہے اور اس کی علت تھی تکلف فی اللباس تو اسکا علاج بھی ہے کہ اس کو بالکلیہ ترک کر دو۔ چند روز اس سے پرہیز کرو، اس کا نام تک نہ لو کہنے پر عمل کرو اپنی رائے سے علاج نہیں ہوا کرتا ہے، کسی طبیب حاذق سے مشورہ کرو، اطباء بھی اپنا خود علاج نہیں کر سکتے تم تو کس شمار میں ہو، یاد رکھو اس صورت میں عجب کے علاج پر بغیر اس لباس کے ترک کی قدرت نہ ہو گی اگر اپنے کو صحیح سالم رکھنا پسند کرتے ہو تو اس آفت سے فوراً دستبردار ہو جاؤ اور اگر یہ چاہو کہ لباس بھی یہی رہے اور عجب بھی جاتا رہے تو یہ غیر ممکن ہے اور اس شعر کا مصداق ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(گہرے دریا میں تختہ سے جکڑ کر ڈال دیا اور پھر کہتے ہو کہ دامن تر نہ ہو محتاط رہو)

اگر کوئی معالج اپنی ناتجربہ کاری سے اس طریقہ کو تجویز کر چکا تو ہم یہی کہہ دیں گے

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(گہرے دریا میں تختہ سے جکڑ کر ڈال دیا اور پھر کہتے ہو کہ دامن تر نہ ہو محتاط رہو)

حضرت آپ کو تو یہ تعلیم دی گئی ہے "دع مایریبک الی مالا یریبک"[1] کہ امور مشکوکہ مشتبہ سے احتراز کر کے امور یقینیہ کو اختیار کرو جن میں کسی مفسدہ کا شبہ بھی نہ ہو۔ فرماتے ہیں: "لایکمل ورع المومن حتی یدع مالا باس بہ حذرا ممابہ باس ان کما قال"، یعنی انسان محرمات سے جب ہی اجتناب کر سکتا ہے مشتبہات سے بھی اجتناب کرے۔ یہی ہے کہ ورع کامل اور یہی ہے اول درجہ کا تقویٰ اس کو اختیار کیجئے اگر

---

[1] سنن الترمذی: ۲۵۱۸، سنن النسائی کتاب الاشربۃ باب: ۴۸، مسند احمد ۱: ۲۰۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۷۷۳

آپ لباس میں تاویلیں اور توجیہیں کر کے اس کو جائز بھی کر لیں تب بھی اس کے مشتبہ ہونے میں تو کلام نہیں پھر تم امر مشتبہ کو کیوں اختیار کرتے ہو۔ صاحبو! آپ اپنے سلف صالحین کے کارنامے دیکھئے۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے ایک دفعہ ایک کرتہ پہنا جو آپ کو اچھا معلوم ہوا نفس کو اس سے حظ آنے لگا' آپ نے مقراض لے کر اس کی تھوڑی تھوڑی آستینیں کاٹ ڈالیں تاکہ بدزیب ہو جائے اور نفس کو حظ نہ آئے اگر اور بھی کوئی خرابی نہ ہو تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ یہ نئی وضع قطع محض حظ نفس کے لیے اختیار کرتے ہیں اور آپ کے اسلاف حظ نفس سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں عیسائیوں نے آپ کو بیت المقدس کی طرف بلایا۔ آپ معمولی لباس میں اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لے گئے اور تشریف اس لیے لے گئے کہ نصاریٰ نے کہا تھا کہ ہماری کتابوں میں فاتح بیت المقدس کا حلیہ موجود ہے۔ اگر خلیفہ اسلام کا وہی حلیہ ہے تو ہم بدون جنگ کے شہر کھول دیں گے ورنہ اس کو کوئی فتح نہیں کر سکتا چونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تشریف لے جانے میں بدون قتل وقتال کے شہر فتح ہوتا تھا اس لیے تشریف لے گئے وہاں پہنچ کر لوگوں نے عرض کیا کہ آپ خلیفہ اور سلطان ہو کر پیش ہوں گے۔ گھوڑی پر سوار ہو جائیں اور عمدہ لباس پہن لیجئے تاکہ ان کی نظر میں عزت اور وقعت ہو۔ آپ نے فی البدیہہ فرمایا ''اعزنا اللّٰہ بالاسلام'' کہ ہم ایسی جماعت ہیں جن کو حق تعالیٰ نے اسلام سے عزت دی ہے جس سے دوسری عزتیں بار ہا ہیچ ہو گئی ہیں مگر آپ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسرار سے رائے کو قبول فرما لیا تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔ قبول فرمانے کے بعد لباس کی تلاش ہوئی کہ دوسرا جوڑا تبدیل کریں' اب وہ لباس کہاں سے آئے خلیفہ کے پاس کپڑوں کی گٹھڑی ہی نہ رہی۔ صاحبو! خیر یہ تو وہ جلیل القدر صحابی جن سے شیطان بھی بچ کر نکلتا تھا جن کی زبان پر حق تھا اگر ان کے پاس گٹھڑی نہ تھی تو کچھ عجب نہیں۔ ہمارے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے پاس بھی کپڑوں کی گٹھڑی نہ تھی نہ کوئی ٹرنک بکس تھا' ایک مرتبہ کسی شخص نے مولانا کی خدمت میں چند ٹوپیاں بھیجیں' آپ نے ان کو تقسیم کرنا شروع کر دیا' صاحبزادہ نے والدہ صاحبہ کی وساطت سے ایک ٹوپی مانگ لی خود نہیں کہا فرمایا: ہاں تو بھی ایسی ٹوپی پہنے گا' ایسا دماغ بگڑا ہے اب یہ تکلف سوجھے گا' دیکھ تو

میں کیسی ٹوپی پہنتا ہوں اور ان کے کپڑوں کی گٹھڑی دیکھی، تقدیر سے صاحبزادے کی گٹھڑی بھی بھڑکدار نکلی بس آگ بگولہ ہو گئے کہ او ہو اس بھڑکدار گٹھڑی میں آپ کا لباس رکھا ہوا تھا، یوں کپڑے تہہ کیے ہیں یہ اچکن بھی تہہ ہوا رکھا ہے۔ غرض سب کپڑوں کو کھول کھول کر صحن میں پھینک دیا، مقتداؤں کی یہ حالت ہے تو مقتداؤں کی حالت سے کیا تعجب۔ غرض حضرت خلیفہ کے پاس تو لباس ملا نہیں ایک خوش وضع جوڑا مستعار لیا گیا اور آپ اسے پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر چلے ایک دو قدم ہی چلے تھے کہ فوراً اتر پڑے کیونکہ اس لباس اور سواری میں نفس کو کچھ حظ آنے لگا تھا اور نظر اپنے اوپر پڑنے لگی تھی۔ سچ ہے۔

بردل سالک ہزاران غم بود　　گرز باغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم طاری ہوتے ہیں اگر اس کی باطنی حالت میں کچھ کمی ہوتی ہے)

اور کہتے ہیں:

بہرچہ ازدوست دامانی چہ کفرآں صرف وچہ ایماں
بہرچہ ازیار دورافتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ ہی ہو)

اور فرمایا تم نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہلاک ہی کر دیا ہوتا، لاؤ میرا پرانا لباس اور اس جنجال کو مجھ سے دور کرو، میں اسی عاریتی لباس کو نہیں پہنتا۔

کہن خرقہ خویش پیراستن　　بہ ازجامہ عاریت خواستن

(اپنا پرانا کپڑا پہننا بہتر ہے عاریت کا کپڑا پہننے سے)

بس وہی لباس پہن کر اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لے چلے، اس میں دینی نفع تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے مقبول ہوئے اور دنیاوی فائدہ یہ ہوا کہ وہاں نصاریٰ کو اپنی کتابوں کی پیشین گوئی سے اس کی بھی اطلاع تھی۔ خلیفہ کس شان سے آئیں گے چنانچہ وہ دور سے دیکھتے ہی پہچان گئے ورنہ وہ اس وضع کو دیکھ کر سمجھتے بھی نا کہ خلیفہ کون ہیں۔ میں آپ لوگوں کو ایک ضابطہ کلیہ بتائے دیتا ہوں اس کو یاد رکھو اور اپنے ہر طرز کو اس معیار پر جانچ لیا کرو۔ یاد رکھو جس وقت تم اپنی نگاہ میں بھلے معلوم ہو اس وقت سمجھ لو تم حق تعالیٰ کی نظر میں برے ہو، کسی کمال سے کسی جمال سے کسی علمی تقریر تحریر سے جب تم کو اپنے اندر حسن ظاہر ہو اس

وقت حق تعالیٰ کے نزدیک تمہارے اندر قبح یہی پندار اور خود بینی ہے اسی خود بینی کے باب میں ایک صاحب حال اور صاحب فن فرماتے ہیں:

فکر خودورائے خوددر عالم رندی نیست کفراست دریں مذہب خود بینی وخودرائی

(اپنی رائے اور فکر کوراہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس طریق میں خود بینی اور خودرائی کفر ہے)

احادیث میں اعجاب کل ذی رایٍ برایہ خودرائی کی سخت مذمت وارد ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عجب کو مذموم فرمایا ہے اس کا راز یہی ہے کہ عجب وخود بینی مقدمہ ہے کبر کا کیونکہ انسان عجب سے اول تو اپنے نفس کو جمیل وحسین دیکھتا ہے بعد میں اوروں کو ذلیل سمجھنے لگتا ہے یہی کبر ہے اور مقدمات شے کے لیے بھی شے ہی کا حکم ہوا کرتا ہے لہٰذا عجب علاوہ مستقل نصوص کے خود اس دلیل سے بھی حرام ہے اب اس لباس کو پہننے والے سوچ لیں کہ یہ لباس پہن کر ان کو عجب ہوتا ہے یا نہیں۔ اب اختیار ہے تاویلیں کرتے رہیں ہمارا کام بتانا تھا' بتادیا' بررسولاں بلاغ باشد وبس وہ خود جانتے ہیں اہل علم ہیں: ''بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ'' (بلکہ انسان اپنے واسطے آپ دلیل ہے اگر چہ اپنے آپ کو بہانوں پر لا ڈالے) یہ تو لباس میں فخر تھا۔

مغرب کی تقلید

اب بول چال کو لے لیجئے یہاں بھی وہی مصیبت ہے تقریر میں بھی فخر تحریر میں بھی فخر اور مجھ کو بعض نا آموز اور مبتدیوں کی یہ زیادہ شکایت ہے کہ فخر بھی ایک مذموم چیز پر یعنی یہ لوگ اپنی تحریر وتقریر میں نئی زبان کا اتباع کرنا چاہتے ہیں انگریزی زبان کے والا اور شیدا ہیں وہی محاورات برتتے ہیں اور یہ بلاعوام میں بھی گھس گئی۔ چنانچہ بعضے مفردات کو بگاڑ کر بولیں گے لب ولہجہ کو بدل دیں گے صحیح اردو بولنے سے عار آتی ہے۔ اگر چہ یہ ہیں ہندوستانی مگر زبان غلط ہی بولیں گے ورنہ کسر شان ہوگی۔ کانپور کے اسٹیشن پر میں نے ایک ہندوستانی خانساماں کو دیکھا حالانکہ ہندوستانی تھا مگر انگریزی کے نشہ میں ڈوبا ہوا تھا' کسی سے کہہ رہا تھا کہ ہم یہ بات سننا نہیں مانگتا۔ نالائق سننا بھی کوئی مانگنے کی چیز ہے اس حماقت کی بھی کوئی حد ہے۔ واللہ عقول مسخ ہوگئیں' انگریز تو اس امر کی کوشش کریں کہ صحیح اردو بولیں خطاء سے احتراز کریں اور یہ احمق اس

کوشش میں ہیں کہ غلط اردو بولیں۔ ان کو اگر صحیح اردو بولنا آ جائے تو فخر کرتے ہیں اور یہ بے ہودہ غلط بول کر فخر کرتے ہیں اپنے کو انگریز بنانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ **"من تشبه بقوم فهو منهم"**[1] کے پورے مصداق ہو جائیں۔ ایک مرتبہ میرے بھائی کے پاس ایک ہندو تحصیلدار صاحب اور ایک مسلمان سب انسپکٹر صاحب آئے مگر تھانیدار صاحب ڈاڑھی منڈائے ہوئے تھے اور تحصیلدار صاحب ڈاڑھی رکھے ہوئے تھے نوکر پان لے کر آیا اور تھالی تحصیلدار کے سامنے رکھ دی، یہ دیکھ کر تھانیدار صاحب ہنسے کہ اس نے مجھے ہندو سمجھا، نوکر ان کے ہنسنے سے سمجھ گیا اور تھالی اٹھا کر ان کے سامنے رکھدی۔ اس پر بھائی نے ان کو خوب ہی لتاڑا اور بہت شرمندہ کیا کہ افسوس ہے کہ تم ایسی حالت اختیار کیے ہوئے ہو جس سے نوکر نے تم کو ہندو سمجھا اور اہلکار اپنی ڈاڑھی رکھنے کا ایک عجیب قصہ بتاتے ہیں کہ میں ڈاڑھی منڈایا کرتا تھا، میری کسی دوسری جگہ تبدیلی ہوئی، وہاں پہنچا تو ایک ہندو رئیس ملنے آیا اور کہا کہ اچھا ہوا آپ تشریف لے آئے یہاں ہمیشہ سے مسلمان آتے رہے اور ہندوؤں کو بہت تنگ کرتے ہیں اب آپ سے ان کی قوت ہوگی اور یہ بھی کہا کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کی خوب خبر لی جائے۔ انہوں نے کہا سبحان اللہ اور میں کیا آپ کے نزدیک ہندو ہوں، میں بھی مسلمان ہوں۔ وہ تو اپنی اس حماقت سے شرمندہ ہوا ہی مگر میں نے بھی اسی روز سے ڈاڑھی منڈانی چھوڑ دی کہ افسوس اس نالائق نے مجھ کو محض ڈاڑھی نہ ہونے کی وجہ سے ہندو سمجھا پھر کبھی نہ منڈائی میں نے الہ آباد میں بیان کیا تھا کہ اے نئی روشنی کے شیدائیوں اور اے جنٹلمینیوں تم جلدی ڈاڑھی رکھ لو کیونکہ میں نے اخبار میں دیکھا ہے کہ یورپ میں اس امر کا مشورہ ہو رہا ہے کہ ڈاڑھی رکھنا چاہیے منڈانا نہیں چاہیے تو اگر وہاں یہ پاس ہو گیا تو لازمی بات ہے کہ پھر تم بھی تقلیداً ضروری ڈاڑھی رکھو گے سو قبل اس کے کہ یہ وہاں پاس ہو تم اس جرم سے تائب ہو جاؤ اور شریعت کی رسی پکڑ لو ورنہ ناحق بدنام ہو گے کہ انہوں نے یورپ کی اتباع سے ڈاڑھی رکھی ہے شریعت کے حکم سے نہیں رکھی اور یہ ممکن نہیں کہ جب ڈاڑھی رکھنا فیشن ہو جائے تو تم اس فیشن کو چھوڑ دو۔ لامحالہ ضرور رکھو گے اس لیے پہلے ہی سے رکھنا مناسب ہے مجھے اس بات پر کہ بعضے ہندو ڈاڑھی رکھتے ہیں اور بعضے مسلمان نہیں رکھتے ایک شعر یاد آیا۔

---

[1] سنن ابی داؤد : ۴۰۳۱، مسند احمد ۲ : ۵۰، المصنف لابن ابی شیبة ۵ : ۳۱۳

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

مسلمانوں نے کفار کی دیکھا دیکھی ڈاڑھی منڈانا شروع کی اور کفار نے مصالح خاصہ کے سبب رکھنی شروع کردی یہ تو ان کے طرز پر مٹے ہوئے ہیں اور وہ انکی پروا بھی نہیں کرتے' آج کل مسلمان ہر امر میں الٹی چال چلتے ہیں جو اختیار کرنے کا کام ہے اس کو ترک کرتے ہیں جو ترک کرنے کا ہے اس کو اختیار کرتے ہیں جیسے ایک شخص کی عورت ہمیشہ الٹا کام کرتی تھی ہر بات کا الٹا جواب دیا کرتی تھی جس کام کو کہتا اس کے خلاف ہی کرتی وہ تنگ آ گیا تھا۔ اس نے کہا قصہ پاک کرنا چاہیے بس ایک روز ندی میں طغیانی ہوئی اس نے عورت سے کہا آج جنگل میں میرے پاس روٹی لے کر نہ آنا' کہا میں تو آؤں گی' اس نے کہا کہ اچھا ندی چڑھ رہی ہے ندی میں سے مت آنا' کہا میں تو ندی ہی میں سے آؤں گی' غرض ندی میں سے روٹی لے کر جانے لگی' پانی زیادہ تھا ڈوب کر مرگئی' شام کو جب وہ شخص اس کو ڈھونڈنے چلا تو جس طرف کو ندی بہہ رہی تھی اس کے خلاف چلا' لوگوں نے کہا ادھر کیوں جاتا ہے کہا وہ ندی میں ڈوب کر مرگئی ہے اور چونکہ ہر کام الٹا کرتی تھی تو شاید الٹ ہی بہی بھی ہو اس لیے الٹا ہی تلاش کرتا ہوں خیر یہ تو ضد کے لفظ پر یاد آ گیا۔ بھائیو تم مسلمان ہو تم کو اسلامی طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہنے کو کہتے ہو کہ ہم مسلمان ہیں اور پھر مخالفت کرتے ہو۔ یہ کیسا اسلام ہے کہ اس کی مخالفت ہے۔ حتیٰ کہ احکام سے گزر کر زبان تک میں غیر قوموں کی تقلید کرتے ہیں اور وہ لوگ صحیح اُردو بولنا باعث عزت سمجھتے ہیں گو بولی نہیں جاتی۔ چنانچہ مظفر نگر میں ایک یورپین سپرنٹنڈنٹ پولیس اردو بولتا تھا اور اس پر فخر کرتا تھا کہ میں صحیح اردو بولتا ہوں اور ایک یہ احمق ہندوستانی ہیں کہ اس طرح بولتے ہیں دل ہم سننا نہیں مانگتا۔ نہ معلوم یہ کون سی اردو ہے ایسے ہی بعض مقامات پر ترکیب کو بدل رہے ہیں۔ مثلاً بجائے اس کے کہ آپ کو شام کو آنے کا اختیار ہے۔ یہ بولتے ہیں آپ شام کو آ سکتے ہیں' آپ جا سکتے ہیں' نہ معلوم یہ سکنا کیسا ارزاں ہو گیا ہے بس فضول لفظ استعمال کرتے ہیں حالانکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ شام کو آنے کا اختیار ہے ایک مرتبہ ایک صاحب کے یہاں میری دعوت ہوئی اور ساتھ میں ایک جنٹلمین صاحب کی بھی تھی چونکہ انہیں زکام تھا اس لیے ان کے واسطے مسی روٹی پکوائی گئی تھی اور میرے لیے گیہوں کی روٹی پکی' مسی روٹی اوپر رکھی تھی میں نے دل میں کہا کہ اگر نیچے سے گیہوں کی

روٹی نکالوں تو یہ شخص کہے گا کہ مولوی بھی کیسے بد دماغ ہوتے ہیں کہ ان سے مسی روٹی نہیں کھائی جاتی اس لیے میں نے مسی روٹی توڑی' صاحب خانہ نے کہا کہ آپ گیہوں کی روٹی کھایئے' مسی روٹی ان کے لیے ہے کیونکہ ان کو زکام ہے تو جنٹلمین صاحب فرماتے ہیں نہیں نہیں آپ کھاسکتے ہیں یعنی آپ کھانے پر قادر ہیں۔ مجھ کو بہت ہنسی آئی بس سکنا تو ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگیا ہے۔ مجھ کو ان سے شکایت نہیں۔ شکایت تو عربی خوانوں کی ہے کہ وہ کس وجہ سے اس طرز کو اختیار کرتے ہیں وہ لوگ تو انگریزی پڑھتے ہیں اس لیے یہ طرز اختیار کرتے ہیں تم کو کیا ہوا تم تو عربی پڑھتے ہو۔ تو عربی طریقہ اختیار کرو۔ افسوس تمہاری تحریر وتقریر سب نئی زبان کے قالب میں آ گئی ہے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون کیوں اپنے علم کو برباد کرتے ہو۔ تمہارے سلف کا طریقہ کیا برا ہے اس میں کون سی قباحت ہے میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس طرح بولو کہ اس کے تئیں بیچ سہارن پور کے۔ اوپر اس کے گو ابتدائی تعلیم میں ترجمہ کا یہی طریقہ مناسب ہے کیونکہ عربی فارسی الفاظ کا ترجمہ اس طرز میں اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کے بھائی حکیم علی اکبر صاحب کیرانوی بہت سادہ مزاج و باکمال شخص تھے۔ کسی بات میں تکلف نہ تھا' فرمایا کرتے تھے کہ آج کل ترجمہ کا نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے مکتوب دویم کا ترجمہ کرایا جاتا ہے دوسرا خط جس سے وہ پڑھنے والا اوتنی کا یوں سمجھے کہ مکتوب کے معنی تو دوسرا اور دویم کے معنی خط یوں ترجمہ کرانا چاہیے' خط دوسرا اور ہے بھی واقعی یہی بات البتہ جب اتنی سمجھ آ جائے کہ ترجمہ الفاظ خود سمجھنے لگے تو محاورہ کے اتباع میں بھی کچھ مضائقہ نہیں ایک مرتبہ ان کے سامنے کوئی شخص نعتیہ غزل پڑھ رہا تھا اس نے کسی شعر میں پڑھا بلا لو یا رسول اللہ فرمایا' ارتنی کا یا بھوتنی کا ہے بلا لو ہاں اس کے لیے پالکی آئے گی' نا ارے جاتا ہے تو چلا جا۔ ان کی باتیں بھلی معلوم ہوا کرتی تھیں۔ بھائیو تمہارے سلف تو بڑے فصیح و بلیغ تھے' ان کی پیروی کرو' ان کے طرز پر مطلب خیز عبارت لکھو اور اپنے مشائخ کا اتباع کرو' تواضع و استغناء کو پیشوا بناؤ' اب چونکہ وقت ختم ہوگیا ہے اور ضروری مضمون بھی ختم ہوگیا ہے لہٰذا میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔

اور حافظ شیرازیؒ امام فن کے دو شعر نقل کر کے یہ بتاتا ہوں کہ یہ مضمون فقط میرا ہی ایجاد و اختراع نہیں ہے بلکہ اکابر نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ پس فرماتے ہیں:

اے دل کے بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی　　بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل یہی بہتر ہے کہ محبوب حقیقی کی محبت و عشق میں مشغول رہ کر بے زر و مال حشمت و دبدبہ میں قارون یعنی دنیا داروں سے بصد درجہ بڑھے رہو)

اس میں استغناء عن المال (مال سے بے پروائی) کی تعلیم فرمائی ہے کہ گو تمہارے پاس زر نہ ہو لیکن استغناء مالک خزائن ہی جیسا ہونا چاہیے۔ آگے استغناء عن الجاہ (یعنی جاہ سے بے پروائی) یعنی تواضع کی نسبت فرماتے ہیں:

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں　　شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(لیلیٰ (یعنی محبوب) کے کوچہ کی راہ میں جان کو بہت سے خطرات ہیں اس راہ میں قدم رکھنے کی اول شرط یہ ہے کہ مجنوں ہو)

مجنوں میں جاہ کہاں تمام بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ استغناء و تواضع کو جمع کرو اور تذلل و تکبر سے بچو، حب مال و حب جاہ کو چھوڑ دو اور لباس و وضع کے فضول تکلفات کو جو کہ حب جاہ سے ناشی ہوتا ہے قطع کرو پس اب حق تعالیٰ سے دعا کرو کہ حق تعالیٰ فہم عطا فرماویں اور توفیق عمل عطا کریں۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولانا محمّد وعلی اله واصحابه اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین واخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین.

اشرف علی (رمضان المبارک ۱۳۵۴)

زائد تعلقات کو کم اور لایعنی باتوں کو ترک کرنا چاہیے۔ فضول وہ ہے جس کے ترک کرنے میں نہ دین کا نقصان ہو نہ دنیا کا اور کرنے میں نہ دنیا کا نفع ہو نہ آخرت کا۔

ترك مالا يعنى

لایعنی امور کو ترک اور تعلقات زائد کو کم کرنے کے متعلق یہ وعظ ۱۹ جمادی الاخری یوم جمعہ کو برمکان شیخ رشید احمد صاحب میرٹھ تقریباً دو گھنٹے ہوا۔

اس وعظ میں جن صاحبان نے شرکت کی ان کی تعداد تقریباً ۴۰ کے قریب تھی۔ اس وعظ کو مولانا ظفر احمد عفا اللہ نے قلم بند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّم اَمَّا بَعْدُ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ. مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ.[1]

ترجمہ: (ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: اسلام کی خوبی یہ ہے کہ جو چیز مفید نہ ہو آدمی اس کو ترک کر دے)

دستور العمل

یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے ایک نہایت نافع دستور العمل بیان فرمایا ہے جو ایک جامع کلام ہے جس میں دنیا و آخرت دونوں کا انتظام مضمر ہے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور کمال ہے کہ چند لفظوں میں نہایت جامع مضمون آپ ارشاد فرما دیتے ہیں گویا وہ ایک کلی ہے جس کے تحت میں صدہا ہزارہا جزئیات موجود ہیں اور بس جزئیات کا حکم ایک کلیہ سے معلوم ہوسکتا ہے یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر بھی دستور العمل ارشاد فرمائے ہیں وہ سبھی نافع ہیں حتیٰ کہ اس لیے بعض دفعہ بیان کے وقت سخت حیرانی ہوا کرتی ہے کہ کس بات کو بیان کیا جائے آپ کی ساری ہی باتیں بیان کے قابل ہیں مگر اس کے لیے تو ایک عمر بھی ناکافی ہے اس لیے ایک جلسہ میں ایک ہی مضمون کو اختیار کیا جاتا ہے مگر اس اختیار کا معیار ایک امر اجتہادی ہے جس کی بناء پر متعدد مضامین سے ایک کو ترجیح دے لی جاتی ہے

---

[1] مجمع الزوائد للهيثمی ۸: ۱۸ ' مسند احمد ۱: ۲۰۱ ' كنز العمال ۳: ۸۲۹۱

اور معیار ضرورت ہے لیکن ضرورت بھی سب ہی ارشادات کی ہے آپ کا کوئی بھی ارشاد غیر ضروری نہیں مگر زیادہ ضرورت پر نظر کر کے ایک بات کو اختیار کرلیا جاتا ہے اور زیادہ ضرورت کا معیار مخاطبین کی کوئی خاص حالت ہوا کرتی ہے جیسے فن طب میں ایک مرض کے لیے بہت نسخے ہوتے ہیں کہ وہ سب اس مرض کے لیے مفید ہوتے ہیں لیکن طبیب ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دے کر اسی کو تجویز کر دیتا ہے اور اس ترجیح کی وجہ فصول وامزجہ کا اختلاف ہے کہ ایک نسخہ ایک فصل کے لیے مناسب ہے دوسرا دوسرے موسم کے لیے اور ایک نسخہ کسی مزاج کے موافق ہے دوسرا کسی اور مزاج کے ان امور خاصہ پر نظر کر کے طبیب کسی ایک نسخہ کو ترجیح دیا کرتا ہے اور اس کا مدار محض معالج کی تشخیص پر ہے اس کے اجتہاد میں جو نسخہ مریض کے مزاج سے زیادہ موافق اس وقت ہوتا ہے وہ اسی کو اختیار کر لیتا ہے یہ ممکن ہے کہ دوسرے طبیب کے نزدیک اس وقت کسی دوسرے نسخہ کو ترجیح ہو کیونکہ اس تشخیص میں مرض کی کیفیت کچھ اور ظاہر ہوئی ہو مگر بہر حال ایک طبیب کو دوسرے پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، ہر ایک نے اپنے اجتہاد ہی سے ایک ترجیح دی ہے یہی حالت معالجہ باطنیہ کی ہے کہ اس میں بھی خصوص مواقع کی وجہ سے ایک خاص تدبیر کو اختیار کیا جاتا ہے چنانچہ اس وقت ایک ایسی ہی خاص وجہ سے میں نے اس مضمون کو اختیار کیا ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ یہ مضمون باوجود یہ کہ نہایت ضروری ہے مگر اس کی طرف سے غفلت بہت ہو رہی ہے کسی مضمون کے ضروری ہونے کے مختلف اسباب ہوا کرتے ہیں کبھی ایک مضمون کا بیان کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس پر عمل کرنا شرعاً واجب یا فرض ہے یہ وجہ تو بہت سے احکام میں مشترک ہے کبھی اس لیے ضرورت بیان کی ہوتی ہے کہ کسی فرض و واجب پر عمل کرنے میں کوتاہی کی جاتی ہے اور ایک بڑا سبب ضروری ہونے کا یہ ہے کہ ایک چیز شرعاً ضروری ہے مگر اس کی طرف سے بے التفاتی اس درجہ ہے کہ اس کو ضروری نہیں سمجھا جاتا اس لیے اس کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی چنانچہ یہ مضمون جو میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں اس کی یہی حالت ہے کہ فی نفسہ وہ بہت ضروری ہے مگر عام طور پر لوگوں کو اس کی ضرورت کا احساس نہیں ہے۔ ترجمہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ واقعی عموماً اس کو ضروری کوئی نہیں سمجھتا۔ الا ماشاء اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ جو چیز مفید نہ ہو آدمی اس کو ترک کر دے۔ ترجمہ سن کر اکثر لوگوں کو خیال ہوا ہوگا کہ اس میں کون سی

ضرورت کی بات ہے نہ اس میں کسی ثواب کا ذکر ہے نہ عذاب کا نہ وعدہ ہے نہ وعید ہے نہ کسی کام کرنے کا حکم ہے حالانکہ آئندہ آپ کو اس کا ضروری ہونا معلوم ہو جائے گا اور اس وقت آپ کو اندازہ ہوگا کہ اتنی ضروری بات سے ہم لوگ کس قدر غافل ہیں۔

علمی غفلت

صاحبو! عملی غفلت سے علمی غفلت زیادہ اشد ہے کیونکہ جس کام کو انسان ضروری سمجھتا ہے اور عمل کرنے میں سستی کرتا ہو وہاں تو یہ امید ہو سکتی ہے کہ اگر کسی وقت اس کے ضروری ہونے پر توجہ ہوگئی تو فوراً عمل شروع کر دے گا اور علمی غفلت میں یہ امید بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ جب اس کو ضروری ہی نہیں سمجھا جاتا تو ضرورت پر توجہ کیوں کر ہوگی بلکہ عجب نہیں کہ اگر کوئی شخص کبھی اس کام کی ضرورت بیان کرے تو سننے والوں کی اس سے وحشت ہو اور یوں کہیں کہ یہ تو بالکل نئی بات ہے' آج تک کسی نے بھی اس کو ضروری نہ کہا تھا' یہ بات تو ہم نے کبھی نہیں سنی' پس علمی غفلت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ متنبہ کرنے سے بھی بعض دفعہ متنبہ نہیں ہوتا ہے اس لیے علمی غفلت کا دور کرنا عملی غفلت کی اصلاح سے مقدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات نماز کا بیان نہیں کیا جاتا ہے حالانکہ وہ سب سے زیادہ ضروری فرض ہے اور اس سے غفلت بھی بہت کی جا رہی ہے اور دوسرا مضمون بیان کے لیے اختیار کیا جاتا ہے کہ نماز سے تو محض عملی غفلت ہے علمی غفلت نہیں ہر مسلمان نماز کی ضرورت کو جانتا اور تسلیم کرتا ہے لیکن اس دوسری بات کو لوگ ضروری نہیں سمجھتے عمل تو کیا ہی کرتے اس لیے طبیب روحانی اس دوسری بات کو بیان کرتا ہے تاکہ لوگوں کے عقائد کی تو اصلاح ہو جائے اور وہ گو اس پر عمل نہ کریں تو اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ عملی غفلت سے صرف عمل میں نقصان آتا ہے اور علمی غفلت سے عقائد و خیالات میں اور ظاہر ہے کہ عقائد و خیالات کی اصلاح عملی اصلاح سے مقدم ہے۔ علمی غفلت کا تدارک بہت دیر سے ہوتا ہے اور اگر چندے اس کی ضرورت کو بیان نہ کیا جائے تو پھر ذہن میں ڈالنے سے بھی اس پر توجہ نہیں ہوتی بلکہ اس کے سننے ہی سے وحشت اور تعجب ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ اکثر سامعین نے اس حدیث کا ترجمہ سن کر یہ خیال کیا ہوگا کہ اس میں تو کوئی ضروری بات نہیں بلکہ محض ایک معمولی بات ہے کہ جو چیز مفید نہ ہو اس کو ترک کر دینا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرات انبیاء

علیہم السلام کی تعلیم میں ان میں سے بالخصوص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں یہی تو بڑی خوبی ہے کہ وہ بڑے بڑے مہلک امراض کا علاج نہایت سہل اور معمولی باتوں میں کر دیتے ہیں جنہیں دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ تو کچھ علاج نہیں محض ایک معمولی بات ہے لیکن اس پر عمل کرنے سے اس کا فائدہ عظیمہ جب معلوم ہوتا ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی قدر ہوتی ہے اور بے ساختہ کہتا ہے:

جزاک اللہ چشمم باز کردی   مرابا جانجاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھ کو محبوب حقیقی کا ہمراز کر دیا)

تعلیم انبیاء

انبیاء کی تعلیم ایسی ہوتی ہے جیسے بعض اطباء جڑی بوٹیوں سے علاج کیا کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ طبیب بڑا ماہر ہے جو ایک معمولی گھاس سے بڑے سے بڑے مرض کا علاج کر دے مگر اس کی قدر وہی کر سکتا ہے جو اس کے علاج پر ایک دفعہ عمل کر کے اس کے فائدہ کا مشاہدہ کر چکا ہو ورنہ ظاہر ہے لوگ تو یہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ بھی کوئی علاج ہے جس میں جنگل کی گھاس ہی بتلا دی جو ایک پیسہ کو بھی نہیں پوچھی جاتی مگر حقیقت میں فن دانی اسی کا نام ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اور کام جلدی ہو جائے۔ ہمارے استاد علیہ الرحمۃ (مولانا محمد یعقوب صاحبؒ) اکثر جڑی بوٹیوں سے علاج بتلا دیا کرتے تھے۔ مولانا علم طب میں بھی بڑے ماہر تھے اور آپ کے نسخہ میں زیادہ تر اجزاء نہ ہوتے تھے۔ اکثر تو مفردات بتلا دیا کرتے تھے ورنہ دو یا تین سے زیادہ اجزاء نہ ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک رئیس کو یہ دوا بتلائی کہ جامن کی کونپلوں کو سیاہ مرچوں میں پیس کر استعمال کریں یہ واقعہ تو میں نے ناتمام سنا ہے یہ معلوم نہیں کہ ان حضرات نے اس کو استعمال کیا یا نہیں۔ دوسرا واقعہ مکمل سنا ہے وہ یہ کہ ایک مرتبہ مولانا انبہٹہ تشریف لے گئے' مولانا کی دوسری شادی انبہٹہ ہی میں ہوئی تھی اس لیے وہاں جانا آنا رہتا تھا' ایک رئیس کو وہاں معدہ کا کچھ مرض تھا جس کے علاج انہوں نے بہت کیے تھے مگر کسی علاج سے نفع نہ ہوا۔ جب مولانا وہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت سے بھی رجوع کیا' مولانا نے ان کو یہ دوا بتلائی کہ اکاس بیل کو دودھ میں پکا کر استعمال کریں

چونکہ ایک معمولی دوا تھی جس میں ایک پیسہ بھی خرچ نہ تھا کیونکہ اکاس بیل خودرو بہت ملتی ہے اس لیے اس رئیس کو اس کی قدر نہ ہوئی۔

وہ یہ سمجھے کہ میرے مرض کے لیے تو ایسے نسخے کی ضرورت ہے جس میں بہت سے روپے خرچ ہوں اس معمولی دوائی سے مجھے کیا آرام ہوگا۔ مولانا کو بھی آثار سے معلوم ہو گیا کہ اس شخص نے میرے نسخے کی قدر نہیں کی' فرمایا اس کو معمولی نہ سمجھو تمہارے مرض کی یہی ایک دوا ہے کہ اس کو استعمال کر کے دیکھو مگر اس نے پھر بھی توجہ نہ کی جب مریض کو طبیب پر اعتماد نہ ہو تو اس کی جوتی کو غرض پڑی ہے کہ اس کی خوشامد کرے پھر مولانا کو کون سی فیس ملتی ہے جو وہ خوشامد کرتے۔ مولانا بھی خاموش ہو رہے۔ اتفاق سے اس محلہ کی مسجد میں ایک نابینا ملا جی مؤذن تھے جن کی بزرگی کے لوگ معتقد تھے انہوں نے صبح کو اس رئیس کے روبرو خواب بیان کیا کہ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا اور دریافت کیا کہ حضرت اس مرض کے لیے کوئی دوا بتلا دیجئے تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی صرف ایک دوا ہے اور وہی دوا بتلائی جو حضرت مولانا نے بتلائی تھی۔ یہ خواب مولانا سے بیان کیا گیا مولانا نے پوچھا کہ حافظ جی دیکھو میں ہی تو نہ تھا تو حافظ جی کیا کہتے ہیں ہاں حضرت آواز تو ایسی ہی تھی۔ مولانا نے فرمایا بھائی جب تم نے جاگتے میں میرا کہنا نہ مانا' آخر میں نے سوتے میں بتلا دیا تو دیکھئے مولانا کے ارشاد کی قدر اسی لیے نہ ہوئی کہ بظاہر وہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی تھی پس آج کل کچھ مذاق ایسا بدل گیا کہ معمولی اور آسان باتوں کی قدر نہیں ہوتی۔ نہ ایسی باتوں کو ضروری سمجھتے ہیں بس اسی بات کی قدر ہوتی ہے جس میں مصیبت جھیلنا پڑے۔ چنانچہ مشائخ میں سے بھی لوگ اسی شیخ کی قدر کرتے ہیں جو مجاہدات زیادہ بتلائے کہ تہجد کبھی قضا نہ ہو چھ مہینے تک چلہ میں رہو' کسی نہ ملو چاہے اس کم بخت کی تمام ضروریات کا پڑا ہو جائے مگر شیخ کو اس کی پروا نہ ہو۔ تب تو وہ شیخ ہے اور اگر کوئی یہ بتلا دے کہ بھائی رات کو آنکھ نہ کھلے تو عشاء کے بعد تہجد پڑھ لیا کرو اور اگر تنہائی کا موقع نہ ملے تو چلتے پھرتے ہی وظیفہ پورا کر لیا کرو۔ اس کی بہت کم قدر ہوتی ہے یوں سمجھتے ہیں کہ اس شیخ کے یہاں تو کوئی نئی بات نہیں سب معمولی باتیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہنستے کھیلتے گھر بس جائے تو یہ کمال کی بات ہے یا نقصان کی اگر دو پیسے کی جڑی بوٹی میں سالہا سال کا روگ جاتا رہے جو دوسرے اطباء کے صد ہا روپے کی نسخوں میں بھی نہ گیا تھا تو یہ طبیب کا کمال ہے یا عیب مگر جب لوگوں کا مذاق ہی بگڑ جائے تو اس کا کیا علاج وہی مثل ہے کہ اندھے کے آگے روئے

اپنی آنکھیں کھوئے۔ غرض انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا یہی حال ہے کہ وہ جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں ان کی باتیں ظاہر میں معمولی ہی معلوم ہوتی ہیں مگر ان کا فائدہ بہت بڑا ہوتا ہے اور اس سہل تعلیم کی بناوفور شفقت ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو اپنی امت سے محبت اور ان کے حال پر شفقت بہت ہوتی ہے اس لیے ان کی تعلیم نہایت آسان ہوتی ہے جیسے باپ اپنے بیٹے کو تعلیم دیا کرتا ہے دیکھئے ایک تعلق تو حاکم کو اپنی رعایا سے ہوتا ہے اور ایک تعلق باپ کو اولاد سے ہوتا ہے کیا دونوں تعلق یکساں ہیں ہرگز نہیں حاکم بوجہ حکومت کے لیے۔ بے تکلف فرمائش کر دیتا ہے کہ فلاں کام کرو فلاں کام مت کرو اس کو حاکم ہونے کی حیثیت سے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ رعایا کو اس کام کرنے میں مشقت ہوگی یا سہولت نہ وہ اس کی فکر کرتا ہے کہ اس کام کے آسان ہونے کا طریقہ رعایا کو بتلادے کیونکہ حاکم ہونے کا مقتضی ہی نہیں اس کو تو حکم دے دینا آتا ہے اگر کسی نے اس کی تعمیل کی فبھا ورنہ خلاف ورزی قانون کی تو دفعہ قائم کر کے اس پر جرمانہ یا سزا کر دے گا تو بات کیا ہے بات صرف یہ ہے کہ حاکم کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ جو کچھ میں حکم دے رہا ہوں رعایا اس پر عمل کر ہی لے بلکہ بعض دفعہ کسی شخص کو زیادہ ملزم بنانے کے لئے اور اس پر حجت قائم کرنے کے لیے اس کا قصد کیا کرتا ہے کہ یہ شخص اس حکم پر عمل نہ کرے تو اچھا ہے تاکہ میں اس کو سزا دے سکوں اس صورت میں وہ قصداً ایسا سخت حکم دیتا ہے جو اس سے ہو ہی نہ سکے لیکن باپ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ بے تکلف بیٹے کو جو چاہے حکم دے دے خواہ وہ اس سے ہو سکے یا نہ ہو سکے ہرگز نہیں بلکہ باپ جو حکم دینا چاہے گا اول اس کے کہنے کے لیے وقت ایسا تجویز کرے گا جب بیٹے کو فرصت ہو باپ کا کام بتلانا اسے ناگوار نہ ہو پھر وہ جو کچھ کہے گا بیٹے کی ہمت کے موافق کہے گا اور اس کے بعد بھی اس سے یہ کہہ دے گا کہ اس کام کو اس طریقہ سے کرنا ہے اس میں سہولت ہوگی اور پھر خود بھی اس میں اعانت کرے گا' بیٹے کا ہاتھ بٹادے گا' اس کی وجہ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ چاہتا یہ ہے کہ بیٹا اس کام کو کرے اس میں اس کا نفع ہے۔ باپ ایک کام بتلا کر یہ نہیں چاہتا کہ بیٹا اس کام کو نہ کرے تو اچھا ہے تاکہ میں اس کو خوب مار سکوں۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ حاکم اور باپ میں کتنا فرق ہے تو انبیاء علیہم السلام کو اُمت سے حاکمانہ تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان کو ایسا تعلق ہوتا ہے جیسا باپ کو اولاد سے ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ باپ کو اولاد سے محبت و شفقت محض اس لیے ہے کہ اولاد کا جسم باپ کے ذریعے سے پرورش پاتا ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام اُمت کی ارواح کو پرورش کرتے ہیں

اور ظاہر ہے کہ جسمانی تربیت سے روحانی تربیت بڑھی ہوئی ہے اور جو لوگ روحانی تربیت کرنے والے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ بعض دفعہ شیخ کو کسی مرید سے ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اپنی اولاد سے بھی ویسا تعلق نہیں ہوتا اور اسی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بعض مریدین کو شیخ سے ایسا تعلق ہو جاتا ہے کہ باپ سے اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے گو آج کل اس تعلق میں بہت کمی ہوگئی ہے کیونکہ آج کل آزادی کا زمانہ ہے ہر شخص آزاد ہوگیا ہے اس آزادی کا اثر اس طبقہ میں بھی کسی قدر ہو چلا ہے مگر تاہم اس میں شک نہیں کہ روحانی تربیت میں بھی مربی کو وہی شفقت ہوتی ہے جو جسمانی تربیت کی وجہ سے باپ کو ہوتی ہے بلکہ روحانی مربی کو اس سے بھی زیادہ شفقت ہوتی ہے باپ جو کام کرتا ہے وہ تو حیوانات بھی کرتے ہیں وہ بھی اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں ان کو بھی اپنے بچوں سے محبت ہوتی ہے لیکن روحانی مربی وہ کام کرتا ہے جو کسی باپ سے نہیں ہوسکتا کہ وہ انسان کی روح کو خدا تعالیٰ سے ملا دیتا ہے اس کو عارف و واصل بنا دیتا ہے پھر اس پاکیزہ تربیت میں طرفین سے جس قدر بھی تعلق ہو تھوڑا ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام عموماً اپنی اُمت پر بہت زیادہ شفیق ہوتے ہیں پھر ان میں سے بھی بالخصوص ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپ کو تو اپنی اُمت سے بہت ہی تعلق تھا' بخدا آپ سے زیادہ کوئی بھی شفیق نہیں۔ البتہ حق تعالیٰ کو اپنے بندوں پر آپ سے بھی زیادہ شفقت ہے بلکہ خود حضرات انبیاء علیہم السلام کی شفقت اسی شفقت الٰہیہ کا ظل ہے یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تعلیم نہایت سہل ہے اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم بھی اسی واسطے سہل ہے کہ ان میں شفقت خداوندی کی جھلک موجود ہے۔

خدا کی شفقت

دیکھئے ایک جگہ حق تعالیٰ کو اعمال صالحہ کا امر فرمانا منظور تھا مگر اس کو کس شفقت کے عنوان سے شروع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ.

(اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو کچھ پاکیزہ چیزیں دی ہیں ان کو کھاؤ اور کھا پی کر اللہ تعالیٰ کا شکر بھی کیا کرو' اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو)

مقصود تو اشکرو اللہ تھا اور شکر سے مراد عبادت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ اس کی عبادت کی جائے مگر اس حکم سے پہلے فرماتے ہیں: کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَارَزَقْنٰکُمْ یعنی اے مسلمانو! ہم نے تم کو جو کچھ پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں ان کو کھاؤ پیو۔ اس کے بعد فرماتے ہیں واشکرو اللہ یعنی اور ان نعمتوں کو کھا پی کر خدا کا شکر بھی کیا کرو۔ تو دیکھئے بلا تشبیہ یہ ایسی ہی صورت ہے جیسے باپ کو یہ منظور ہو کہ بیٹے کا سبق سنے تو وہ اس کو بلا کر کہتا ہے کہ آؤ بیٹا یہ لڈو مٹھائی کھالو۔ ہم تمہارے واسطے لائے ہیں پھر مٹائی دے کر کہتا ہے کہ اچھا سبق تو سنادو ہم تمہیں پھر بھی مٹھائی دیں گے۔ وہی صورت یہاں ہے کہ پہلے تو پاکیزہ نعمتوں کے کھانے کا حکم فرمایا پھر عبادت کا حکم فرمایا اور عبادت پر پھر بھی مٹھائی دینے کا وعدہ ہے وہ کیا جنت سبحان اللہ اس شفقت کی بھی کچھ انتہا ہے باپ کو تو بیٹے کے سبق سنانے سے کچھ اپنی غرض بھی مدنظر ہوتی ہے وہ یہ امید کرتا ہے کہ لڑکا لائق فائق ہو جائے گا تو کچھ کمانے لگے گا اور بڑھاپے میں میرے کام آئے گا' میری خدمت کرے گا مگر حق تعالیٰ کو ہماری عبادت سے کچھ بھی غرض نہیں' عبادت کا جو نفع ہے ہم کو ہی ہے اور اگر عبادت نہ کریں تو نقصان بھی ہمارا ہے۔ تمام مخلوق اگر عابد زاہد ہو جائے تو خدا کی سلطنت وعظمت میں اس سے کچھ زیادتی نہ ہوتی اور اگر سارے سرکش ہو جائیں اس کی عظمت میں کچھ کمی نہیں آتی۔ پس حق تعالیٰ کو انسان کے ساتھ جس قدر شفقت ہے وہ محض بے غرض ہے پھر حق تعالیٰ حاکم بھی ہیں حاکم ہونے کی حیثیت سے ان کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ اس طرح چمکار کر پھسلا کر حکم دیں۔ اگر وہ حاکمانہ طریقہ پر حکم دیتے کہ ہماری عبادت کرو ورنہ تم کو جیل خانے بھیج دیا جائے گا تو اس سے ان کو کون چیز مانع تھی' پھر حاکم بھی ایسے نہیں جیسے دنیا کے حکام ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ سلاطین دنیا کو رعایا سے دبنا پڑتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالم میں ہر شخص محتاج ہے۔ سلاطین اپنی سلطنت کی بقاء میں رعایت کے محتاج ہیں کہ اگر رعایا آمادہ بغاوت ہو جائے تو ان کی سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا ہے کہ ایک ذرہ ان کی مشیت کے بغیر نہیں مل سکتا اور اگر تمام عالم آمادہ بغاوت ہو جائے تو وہ ایک دم میں سب کو ہلاک کر کے دوسری مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے اور اس کو اس کی بھی ضرورت نہیں وہ اگر چاہے تو کسی کی مجال نہیں کہ سرکشی کر سکے چنانچہ ملائکہ کی یہی شان ہے کہ وہ کسی وقت سرکشی نہیں کر سکتے اس نے بعض حکمتوں کی وجہ سے انسانوں کو نافرمانی اور اطاعت دونوں کا

اختیار اور قدرت دے دی ہے اگر وہ چاہے تو اس قدرت کو سلب کر سکتا ہے اور سارے ہی سرکش ہو جائیں تو ملائکہ انسان سے بہت زیادہ ہیں' وہ اس کی اطاعت بجالاتے ہیں اور اگر کوئی بھی مطیع نہ ہو تب بھی اس کا کچھ ضرر نہیں اس کے تمام کمالات ذاتی ہیں کسی کی اطاعت و نافرمانی کا اس پر کچھ بھی اثر نہیں۔ پس حق تعالیٰ ایسے غنی ہیں کہ ان سے زیادہ غنی نہیں مگر باوجود اس غناء کے اس درجہ شفقت ہے کہ باپ ماں کو بھی اولاد سے وہ شفقت نہیں جو حق تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے ہے کیونکہ باپ کو اولاد سے اضطراری شفقت ومحبت ہے اور حق تعالیٰ اضطرار سے پاک ہے اس کو جو شفقت ورحمت ہے محض اختیاری ہے وہ خود چاہتے ہیں کہ مخلوق پر شفقت کریں اور باپ ماں کے چاہنے میں ان کے اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں' وہ مجبور ہو کر شفقت کرتے ہیں پس ایسے غناء کامل کے ساتھ ایسی کامل شفقت عجائب میں سے ہے۔

شکر کی اہمیت

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: "مَایَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا" یعنی حق تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے اگر تم خدا کا شکر کرو یعنی ایمان (کامل اختیار کرو) سبحان اللہ اس آیت میں یہ لفظ "مَایَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ" (حق تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے) اس قابل ہے کہ اس پر جان قربان کر دی جائے۔ فرماتے ہیں کہ ہم کو تمہارے عذاب کرنے میں کیا نفع ہے ہم تو تم پر رحمت ہی کرنا چاہتے ہیں مگر تم نافرمانی کر کے خود ہی عذاب کو مول لیتے ہو تو اس عنوان سے کس درجہ شفقت ٹپکتی ہے یہاں ایک ضروری تنبیہ بطور جملہ معترضہ کے ہے۔ بعض لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ حق تعالیٰ کو مخلوق سے بے پروا بے معنی بے توجہ سمجھتے ہیں اور اس غلطی کا منشاء یہ ہے کہ ان لوگوں نے غناء کا مطلب غلط سمجھا۔ اس میں تو شک نہیں کہ غناء حق تعالیٰ کی صفت یقیناً ہے چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں: "اِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ. وَتَوَلَّوْا وَاسْتَغْنَی اللّٰهُ" (یقیناً اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے بے پرواہ ہے اور انہوں نے نہ منہ موڑا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی بے پروائی کی) لیکن لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ان آیات میں مستغنی کے معنی وہ مراد لیتے ہیں جو ہمارے محاورہ میں مستعمل ہیں کہ ہمارے محاورہ میں مستغنی اس کو بھی کہتے ہیں جو دوسروں سے بالکل بے پرواہ ہو کسی کے نفع نقصان کی اسے رعایت نہ ہو حالانکہ مستغنی کے معنی آیات میں صرف یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کو کسی کی احتیاج نہیں وہ کسی کا محتاج نہیں۔ پس محتاج نہ ہونا اور بات ہے اور بے پرواہ ہونا اور

رعایت مصالح نہ کرنا دوسری بات ہے۔ غناء جو حق تعالیٰ کی صفت ہے اس کے معنی عدم احتیاج کے ہیں اور یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل جو لوگ محض ترجمے دیکھ کر محقق بن جاتے ہیں وہ کیسا ستم ڈھاتے ہیں پھر غضب یہ کہ یہ لوگ ترجمے دیکھ کر محققین سے مزاحمت کرتے ہیں اور معارضہ میں کہتے ہیں کہ صاحب مشارق الانوار میں تو یہ لکھا ہے۔ مظاہر حق میں یہ لکھا ہے میں کہتا ہوں کہ اس میں وہی لکھا ہے جو محقق بیان کرتا ہے مگر تم ترجمہ دیکھ کر اس کی حقیقت کو نہیں سمجھے بس اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کتابیں دیکھ دیکھ کر طبیب حاذق کے نسخوں میں مزاحمت کرنے لگے اس کو یہی جواب دیا گیا کہ تم نے صرف کتابیں دیکھی ہیں مگر فن کی حقیقت تم کو معلوم نہیں اس لیے طبیب کی رائے میں تم کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں اس طرح جو لوگ محض ترجمے پڑھ کر محققین سے مزاحمت کرتے ہیں وہ بھی اسی جواب کے مستحق ہیں چنانچہ ان لوگوں نے **غنی عن العالمین** اور **واستغنی اللّٰہ** کا ترجمہ دیکھ کر اتنی بات سمجھی کہ حق تعالیٰ مستغنی ہیں مگر اس کی حقیقت ان کو معلوم نہیں ہوئی وہ یہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے محاورہ میں کہہ دیا کرتے ہیں فلاں شخص بہت ہی آزاد اور مستغنی المزاج ہے یعنی کسی کے نفع نقصان کی پرواہ نہیں کرتا۔ یہی معنی خدا کے مستغنی ہونے کے بھی ہیں حالانکہ یہ معنی دوسری نصوص کے اور نیز دلائل عقلیہ کے بالکل خلاف ہیں۔ اگر مستغنی ہونے کے یہ معنی ہیں تو ان نصوص کا کیا مطلب ہے جن میں حق تعالیٰ کی شفقت و رحمت کا ذکر ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنے بندوں پر ایسی شفقت ہے کہ ماں باپ کو بھی اولاد پر ایسی شفقت نہیں ہو سکتی۔ تو یہ خرابی کاہے کی ہے یہ خرابی اس کی ہے کہ ان لوگوں نے لفظ تو عربی لیا اور معنی اردو محاورہ کے موافق لیے حالانکہ ہر لفظ کے معنی اسی زبان کے موافق کرنے چاہئیں جس زبان کا وہ لفظ ہے۔

عربی اور اردو کے معنی کا فرق

مگر آج کل بکثرت لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ "وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ" (اور انہوں نے مخفی تدبیر کی اور حق تعالیٰ نے بھی مخفی تدبیر کی اللہ تعالیٰ سب تدبیر کرنے والوں میں سے بہتر ہے) سے بعض لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے بھی مکر کیا اور خدا نے بھی مکر کیا اور خدا سب سے بہتر مکر کرنے والا ہے اشکال کا حاصل یہ ہے کہ دیکھو اس سے خدا کا (نعوذ باللہ) مکار ہونا لازم آتا ہے۔ تو منشاء اس اشکال کا صرف یہی ہے کہ انہوں نے عربی لفظ کا ترجمہ اردو محاورہ کے موافق کیا اردو میں مکر کرنا

فریب دینے کو کہتے ہیں جو کہ عیب کی صفت ہے اگر یہ لوگ اس عربی کے لفظ کا ترجمہ محاورہ عربیہ کے موافق کرتے تو اشکال کچھ بھی نہ تھا عربی میں مکر کے معنی تدبیر خفی کے بھی آتے ہیں اور تدبیر خفی کرنا یہ عیب نہیں بلکہ صفت کمال ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہوا کہ کافروں نے عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے واسطے مخفی تدبیر کی اور حق تعالیٰ نے ان کو بچانے کے واسطے مخفی تدبیر کی اور حق تعالیٰ سب تدبیر کرنے والوں میں بہتر ہے کہ کسی کی تدبیر اس کی تدبیر پر غالب نہیں آسکتی اس ترجمہ کے بعد کچھ بھی اشکال نہیں اس طرح ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے مجھ کو کچھ پوچھنا ہے مگر اول اس آیت کا ترجمہ کردو "وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی" میں نے کہا کہ اس کا ترجمہ یہ ہے اور پایا خدا نے آپ کو ناواقف' پس واقف بنادیا سن کر میرا منہ دیکھنے لگے' میں نے کہا جو پوچھنا ہو پوچھئے کہنے لگے اب تو کچھ بھی نہیں رہا' میں نے کہا کہ کیا آپ مجھ سے یہ امید کرتے ہیں کہ میں اس جگہ ضالہ کا ترجمہ گمراہ سے کرونگا' بعض تراجم میں گمراہ سے ترجمہ کیا ہے جس سے لوگوں کو اشکال پڑ جاتا ہے لیکن ان حضرات پر کوئی الزام نہیں ہے ممکن ہے اس وقت گمراہ کے معنی ناواقف بھی مستعمل ہوتے ہیں جیسا کہ عربی میں ضلالت کے معنی غیبت اور فقدان کے بھی آتے ہیں چنانچہ کھوئی ہوئی چیز کو ضالہ کہتے ہیں جس کے معنی مقصود الخبر کے ہیں اسی طرح ضال کا اطلاق فاقد الخبر پر بھی آتا ہے جس کا ترجمہ ناواقف ہے لیکن اب فارسی و اردو کا محاورہ بدل گیا اب گمراہ اسے کہتے ہیں جو باوجود راستہ جاننے کے ٹیڑھے راستہ پر چلے۔ آج کل بے خبر اور ناواقف کو گمراہ نہیں کہتے اس لیے اب گمراہ سے ترجمہ کرنا صحیح نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نبوت سے پہلے بعض علوم سے ناواقف ہونا کچھ عیب نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ جو علوم نبوت کے بعد آپ کو عطا ہوئے نبوت سے پہلے آپ ان سے ناواقف تھے اگرچہ اس وقت بھی دنیا بھر کے عقلاء سے زیادہ آپ واقف کار تھے لیکن علوم قرآن و احکام سے تو خبردار نہ تھے یہ تو علم نبوت کے بعد ہی آپ کو حاصل ہوا۔ اسی کو حق تعالیٰ دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

"وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْمِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْيُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَايَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِنْ اَمْرِنَا مَاكُنْتَ تَدْرِيْ مَاالْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ"

ترجمہ: اور کسی بشر کی (بحالت موجودہ) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمادے مگر تین طریق سے یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتہ کو بھیج دے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے۔ بیشک وہ بڑا عالی شان بڑی حکمت والا ہے۔ اسی طرح (یعنی اسی قاعدہ کے موافق ہم نے آپ کے پاس (بھی) وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے (اور اس کے قبل آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان و معرفت کا اعلیٰ درجہ جو کہ اب آپ کو حاصل ہے وہ) کیا چیز ہے (گو نفس ایمان ہر نبی کو ہر وقت نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے) ولیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ آپ (اس قرآن اور وحی کے ذریعے سے عام لوگوں کو) ایک سیدھے راستہ کی ہدایت کرتے ہیں۔ (سورۃ الشوریٰ) پارہ ۲۵ پس وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی میں ضال کے معنی وہی ہیں جو اس آیت ''مَاکُنْتَ تَدْرِیْ الخ'' سے معلوم ہوتا ہے یعنی خدا کی تعلیم و ہدایت سے پہلے آپ ان علوم سے بے خبر تھے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی نقص نہیں بلکہ عین کمال ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے انبیاء کو کچھ معلوم نہیں ہوسکتا نہ ان کے پاس کمالات بدون اعطاء الٰہی کے ہوتے ہیں گو ہم کو ایسا کہنا زیبا نہیں دیتا کہ انبیاء کے پاس کچھ کمالات نہ تھے کیونکہ اس سے ایہام بے ادبی کا ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ کے ذمہ تو حضور کا ادب لازم نہیں آپ تمام عالم کے سردار اور سب سے افضل ہیں مگر حق تعالیٰ کے تو بندے ہی ہیں اس لیے حق تعالیٰ آپ کو ناواقف اور بے خبر جو چاہیں کہہ سکتے ہیں تو دیکھئے اس مسائل کی حقیقت نہ معلوم ہونے کی وجہ سے ''وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی'' میں اشکال پڑا کیوں کہ اس نے ترجمہ میں گمراہ کا لفظ دیکھا اور اس سے وہ معنی سمجھا جو آج کل کے محاورہ میں گمراہ کے معنی ہیں اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ ترجمہ عوام کو خود نہ دیکھنا چاہیے بلکہ علماء سے پڑھنا چاہیے ورنہ ایسے ایسے اشکالات ترجمہ دیکھنے سے پیدا ہوں گے جن کا جواب عوام کے ذہن میں نہ آئے گا چنانچہ قرآن میں حق تعالیٰ کی صفت استغناء کو دیکھ کر بعض لوگ یہی سمجھے کہ حق تعالیٰ ایسے مستغنی ہیں جیسے ہمارے محاورہ میں کسی کو مستغنی کہا کرتے ہیں حالانکہ استغناء کے معنی عربی میں یہ ہیں کہ اس کو کسی کی حاجت نہیں وہ کسی کا

محتاج نہیں اور ہمارے محاورہ میں مستغنی اسے بھی کہتے ہیں جسے کسی کے نفع وضرر کی پروا نہ ہو اب لوگ غضب کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو بایں معنی بھی غنی سمجھتے ہیں چنانچہ ایسے مقام پر اس صفت کو استعمال کرتے ہیں جہاں سوا اس کے اور کچھ معنی ہو ہی نہیں سکتے۔

خدا کی مصلحت وحکمت

مثلاً کوئی ایک شخص جوانی کی حالت میں مر جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاتا ہے اب لوگ اس کی تعزیت میں جاتے ہیں ایک کہتا ہے کہ ہائے جوان موت مر گیا ابھی اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔ دوسرے صاحب بولے کہ واقعی بہت ہی بے وقت موت آئی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کی تعلیم وتربیت کا کون انتظام کرے گا' زمینداری یا ریاست کو کون دیکھے بھالے گا' اس کے بعد تیسرا کہتا ہے کہ ارے بھائی خدا کی ذات بڑی بے پرواہ ہے وہ بڑا مستغنی ہے اب ایسے موقع پر اس کلام کے معنی سوا اس کے اور کیا ہیں کہ (نعوذ باللہ) خدا کو کسی نفع وضرر کی پرواہ نہیں کسی کی مصلحت وحکمت پر نظر نہیں بس شاہ اودھ کی طرح بے وجہ حکم دیدیا کہ فلاں شخص کو مار ڈالو توپ خانہ لگاؤ مارشل لاء جاری کردو نہ اس کی بیوی کا خیال ہے نہ بچوں پر رحم ہے (نعوذ باللہ منہ واللہ) میرا تو اس سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے یہ سخت بے ادبی کا کلمہ ہے مگر لوگوں کو ذرا اس پر توجہ نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ صاحبو! خوب سمجھ لو کہ حق تعالیٰ سے زیادہ کوئی رحیم وکریم نہیں ان کی برابر کسی کو شفقت نہیں ہو سکتی۔ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کئے ایک حصہ تو اس نے دنیا میں ظاہر کیا جس کا یہ اثر ہے کہ باپ ماں کو اولاد سے دوست کو دوست سے جانوروں کو اپنے بچوں سے محبت وشفقت ہوتی ہے اور ننانوے حصے خدا تعالیٰ کے پاس ہیں کہ ان میں مخلوق کو حصہ نہیں دیا گیا اب آپ غور کریں کہ جس رحمت کے ایک حصہ کا یہ اثر ہے جو دنیا میں ہم سب کو نظر آ رہا ہے کہ باپ ماں اس کی وجہ سے بچے کی تکلیف کو نہیں دیکھ سکتے تو خدا تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا کیا ٹھکانا ہے جس کی رحمت سے اس کو وہ نسبت ہے جو سو سے ایک کو حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ ننانوے حصوں کے ساتھ اس ایک حصہ کو شامل کر کے سو حصہ میں رحمت سے مسلمانوں کے ساتھ پیش آئیں گے بخدا اس وقت ہم اس رحمت کا

اندازہ ہرگز نہیں کر سکتے یہ تو آخرت کی رحمت کا حال ہے رہی دنیا میں حق تعالیٰ کی رحمت سو اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ دنیا میں جس کسی کے اندر رحمت کا کچھ اثر ہے یہ خدا کی رحمت کے اس ایک حصہ کا ظل ہے جو اس نے دنیا میں ظاہر کی ہے تو خود اصل کی کیا حالت ہوگی پس دنیا میں بھی حق تعالیٰ کی رحمت اس درجہ بڑی ہے کہ مخلوق کی رحمت کو اس سے کچھ نسبت بھی نہیں کہ یہ رحمت ہی نہیں کہ ہم لوگ رات دن گناہ اور نافرمانی میں مبتلا ہیں اور حق تعالیٰ ہم کو عذاب سے ہلاک نہیں فرماتے بلکہ برابر اسباب حیات و سامان راحت عطا فرماتے رہتے ہیں۔ چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں: "وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَاتَرَکَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى "اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے ان کے افعال پر مواخذہ کرنے لگے تو زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑے لیکن وہ ان کو ایک میعاد معین تک ڈھیل دے رہا ہے اس پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ گناہ تو انسان و جن کرتے ہیں پھر اس کی کیا وجہ کہ مواخذہ کے وقت زمین پر کوئی چلنے والا نہ چھوڑا جاتا آخر حیوانات کی کیا خطا ہوئی، وہ تو مکلف نہیں ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ مواخذہ کے وقت انسان و جن تو گناہوں کی وجہ سے ہلاک کیے جاتے ہیں اور حیوانات اس لیے ہلاک کیے جاتے کہ وہ محض مکلفین کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں جب مکلفین باقی نہ رہتے تو حیوانات کی بقاء کی ضرورت نہ رہتی اس لیے سب ہی ہلاک کر دیئے جاتے، رہا یہ کہ بعض لوگ تو نیک کام کرتے ہیں وہ کیوں ہلاک ہوتے سو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ نیک کام کرتے ہیں وہ بھی گناہوں سے بچے ہوئے نہیں ماسوائے انبیاء علیہم السلام پس یا تو وہ اس سے مخصوص ہیں یا یہ کہا جائے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں تشریف رکھنا صرف ہدایت مکلفین کے لیے ہے جب یہ نہ رہتے تو یہ حضرات آخرت میں رہتے مگر حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ان گناہوں پر مواخذہ نہیں فرماتے، تنبیہ کا مضمون ختم ہوا۔

سہل تعلیم اور احکام

(اصل مضمون یہ تھا کہ) حق تعالیٰ تعلیم میں بندوں پر بے حد شفقت کی رعایت فرماتے ہیں چنانچہ اس کی فرع یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مخلوق کو ایسے کاموں کا مکلف نہیں بنایا جو ان پر دشوار

ہوں بلکہ بہت سہل سہل احکام مقرر فرمائے ہیں۔صاحبو! ہم چار روپے کے نوکر سے وہ کام لیتے ہیں جو حق تعالیٰ نے باوجود اس تواتر نعم کے ہم سے نہیں لئے' چار پانچ روپے ماہوار پر اگر آپ کسی کو نوکر رکھیں تو وہ تمام دن کے لیے آپ کا پابند ہوجاتا ہے اور وہ پھر جو چاہیں آپ اس سے کام لیتے ہیں کسی کام کا اس کو حق نہیں ہوتا اور حق تعالیٰ نے آپ کو دن رات میں پانچ نمازوں کا مکلّف کیا ہے جن میں مجموعی طور پر ایک گھنٹہ سے زیادہ صرف نہیں ہوتا پھر یہ بھی حقیقت میں تمہارا ہی کام ہے خدا کا کام نہیں وہ ہماری نمازوں سے مستغنی ہے۔مولانا فرماتے ہیں:

مابری از پاک و ناپاکی ہمہ　　　　وز گراں جانی و چالاکی ہمہ

یعنی حق تعالیٰ ناپاکی سے تو پاک ہیں ہی وہ ہماری بیان کی ہوئی پاکی سے بھی پاک ہیں یعنی سبحان اللہ والحمدللہ میں جو تم کہتے ہو کہ خدا تعالیٰ پاک ہیں تو وہ تمہاری اس پاکی بیان کرنے سے بھی پاک ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کی پاکی ہمارے ذہن میں بھی نہیں آسکتی بس اس صورت میں ہماری تنزیہ کی یہ کیفیت ہوگی کہ

شاہ را گوید کسے جولاہ نیست　　　　این نہ مدح ست اوٗمگر آگاہ نیست

یعنی ہم جو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ کی تعریف میں یہ کہے کہ وہ جولاہ نہیں ہے کہ اس تعریف کو بادشاہ کی تعظیم سے کچھ بھی نسبت نہیں بعینہ یہی مثال ہماری تسبیح وتحمید کی ہے حق تعالیٰ کی حقیقی پاکی ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی مگر بایں ہمہ حق تعالیٰ کی رحمت وشفقت ہے کہ ہماری طاعت وذکر کو قبول فرمالیتے ہیں اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کی تعریف اس طرح کرنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت بڑی شان ہے آپ نہ جلاہیں نہ دھنے ہیں تو پھر دیکھو اس کی کیا گت بنتی ہے مگر حق تعالیٰ ہماری تسبیح وتحمید کو قبول فرمالیتے ہیں حالانکہ وہ بھی ایسی تعریف ہے بس ہمارے ذکر وطاعت کی قبولیت کی یہ مثال ہے سب کو مولانا فرماتے ہیں:

ایں قبول ذکر تواز رحمت است　　　　چوں نماز مستحاضہ رخصت است

یعنی مستحاضہ عورت جس کو ہر وقت خون آتا رہتا ہے شریعت نے اس کو معذور سمجھ کر حکم دیا ہے کہ اسی حالت میں نماز پڑھتی رہے' خون ٹپک رہا ہے کپڑے اور بدن ناپاک ہے مگر اس حالت

میں بھی اس کو دربار میں آنے کی اجازت ہے، کچھ ٹھکانا ہے شفقت کا۔ بس یہی مثال ہمارے ذکرو طاعت کی ہے، ہم باطنی ناپاکیوں میں ملوث ہیں مگر رحمت کی وجہ سے قبول فرمالیتے ہیں، خدا کی رحمت ایسی شفقت ہے کہ کوئی کیسا ہی گناہ گار ہو مگر ہر وقت اس کو دربار میں آنے کی اجازت ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ نومیدی نیست　　　صدبار اگر توبہ شکستی باز آ

(واپس آ، واپس آ، جو کچھ بھی تو ہے واپس آ جا، اگرچہ کافر و آتش پرست اور بت پرست ہے واپس آ جا، ہمارا دربار نا امیدی کا دربار نہیں، اگر سو بار بھی تو نے توبہ توڑی واپس آ جا)

بے مثالی شفقت

اگر دن میں سو مرتبہ گناہ کرے اور پھر توبہ کرنا چاہے تب بھی اس کو اجازت ہے کہ دربار میں آ جائے اور توبہ کر کے پاک و صاف ہو جائے۔ دنیا میں کسی حاکم کو بلکہ اپنے باپ کی بھی ایک بار سرکشی کر کے پھر منہ دکھانے کے قابل نہیں مگر وہاں سو بار، ہزار بار سرکشی کرنے کے بعد بھی فرماتے ہیں کہ آ جاؤ ہم سب معاف کر دیں گے اس قدر استغناء کے ساتھ یہ شفقت نہایت عجیب ہے (چنانچہ آیت بالا میں اشکروا للہ سے پہلے) "كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَارَزَقْنَاكُمْ" فرمانا یہ بھی اسی شفقت سے ناشی ہے پھر اس میں دوسری شفقت یہ ہے کہ عبادت کو شکر سے تعبیر کیا اعبدوا اللہ نہیں فرمایا بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آخر تم پر بہت انعامات کیے ہیں، تمہارے لیے پاکیزہ نعمتیں کھانے پینے کو پیدا کی ہیں تم ہماری نعمتوں میں سرتاپا غرق ہو گیا۔ اس کی قدر ضروری نہیں کیا نعمت کا شکر لازمی نہیں یہ ایسا عنوان ہے جس کو ہر شخص فوراً تسلیم کر لیتا ہے کیونکہ نعمت کا شکر ادا کرنا عقلاً ہر شخص کے نزدیک ضروری ہے۔ حق تعالیٰ کو یہ حق تھا کہ ہم کو صاف صاف فرما دیتے کہ تم کو ہماری عبادت کرنا چاہیے مگر غایت شفقت کی وجہ سے یہ عنوان اختیار فرمایا کہ تمہارے اوپر ہمارے بہت سے انعامات ہیں انکے شکریہ میں کچھ ہمارا بھی کام کر لو۔ پھر شفقت یہ ہے کہ حقیقت میں عبادت کرنا ہمارے واسطے نافع ہے خدا کو اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ پس واقع میں وہ ہمارا ہی کام ہے مگر شفقت کی وجہ سے اس کو اپنا کام کہہ

دیا جیسے باپ بیٹے سے کہا کرتا ہے کہ ہم تم کو مٹھائی دیں گے تم ہمارا ایک کام کر دو وہ یہ کہ سبق سنا دو حالانکہ سبق سنانا اسی کا کام ہے۔ اسی کے نفع کی چیز ہے غرض حق تعالیٰ کی تعلیم کے سہل ہونے کی لم یہ ہے کہ ان کو اپنے بندوں کے حال پر شفقت بہت زیادہ ہے اور حضرات انبیاء علیہم السلام میں یہی شفقت اسی طرح جھلک رہی ہے جیسے آئینہ میں نور آفتاب جھلکتا ہے۔ اس لیے حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم بھی بہت سہل ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بالکل ایسی مثال ہے:

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت می گویم

(آئینہ کے پیچھے طوطی کی طرح مجھے رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)

ظاہری و باطنی اصلاح

انبیاء میں جو سب سے اکمل ہے ان میں ظہور صفات بھی اکمل ہوتا ہے اسی لیے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں شفقت و سہولت سب سے کامل ہیں اور منافع بھی آپ کی تعلیم میں بہ نسبت دوسروں کی تعلیم کے زیادہ ہیں۔ چنانچہ اس وقت جو ارشاد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میں نے بیان کے لیے اختیار کیا ہے وہ بظاہر ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے بجالانے میں جو منافع ہے اور ترک میں جو مضار ہے ان کو معلوم کر کے اس کی ضرورت و اہمیت ظاہر ہوگی۔ پھر جب اس پر نظر کی جائے گی کہ ہم لوگ اس کی طرف سے کس قدر بے التفاتی برت رہے ہیں تو اس سے اس کی ضرورت اور زیادہ موکد ہو جائے گی اب سمجھنا چاہیے کہ ہم لوگ جن گناہوں کو چھوڑے ہوئے ہیں ان میں بعض تو اس لیے متروک ہیں کہ وہ وضع کے خلاف ہیں۔ مثلاً چوری کرنا' زنا کاری' غصب کرنا' یہ ایسے کام ہیں جو محض اپنی شریفانہ وضع کی رعایت سے اکثر لوگ نہیں کرتے اور جو کام ہماری وضع کے خلاف نہیں گو شرعاً ان کا ارتکاب کتنا ہی گناہ عظیم ہو۔ ان میں اکثر لوگ مبتلا ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے اندر بعض گناہوں کے نہ ہونے کا سبب خوف خدا نہیں ہے اور جو لوگ خوف خدا کی وجہ سے بھی گناہ چھوڑتے ہیں وہ بھی اکثر سب گناہوں کو نہیں چھوڑتے' بس وہ نماز پڑھ لیں گے' زکوٰۃ دے دیں گے تو اپنے نزدیک جنید ہو گئے اور حج کر لیا تو جنید کے بھی

پیر ہو گئے۔ بس انہوں نے انہی اعمال کو ضروری سمجھ لیا۔ باقی اعمال کی ان کو پرواہ نہیں، دل میں کبر وریاء بھری ہوئی ہے، رضا بالقضا نہیں ہے، خدا کے ساتھ محبت نہیں، معرفت نہیں، جاہ طلبی وحسد دل میں موجود ہے مگر وہ بے فکر ہیں۔ حالانکہ حکم یہ ہے: "**وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ**" کہ ظاہری اور باطنی سب گناہوں کو چھوڑ دو۔ یہ لوگ محض ظاہر کو سنوارتے ہیں باطن کی اصلاح کا اہتمام نہیں کرتے بس وہ حال ہے۔

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　　وز درونت ننگ میدارد یزید
از بروں چوں گور کافر پر خلل　　　واندروں قہر خدائے عزوجل

(ظاہری حالت سے تو بایزید بسطامیؒ جیسے بزرگ پر تو طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری باطنی حالت سے یزید بھی شرماتا ہے، تیری ظاہری حالت تو گور کافر کی طرح آراستہ وپیراستہ ہے اور اس کے اندر خدائے بزرگ وبرتر کا قہر وغضب نازل ہے)

بس ہماری وہی حالت ہے کہ اوپر سے اپنے آپکو سنوار رکھا ہے اور کپڑا اٹھا کر دیکھو تو گودر گوہور ہے ہیں ایک بزرگ نے ایک جوان کو دیکھا کہ اکڑ کر چل رہا ہے آپ نے اس کو ٹوکا کہ ذرا سنبھل کر چلو۔ وہ کہنے لگا تم جانتے نہیں ہم کون ہیں، فرمایا ہاں میں خوب جانتا ہوں، کہنے لگا بتلاؤ تم کیا جانتے ہو۔ آپ نے فرمایا: "**اولک نطفة مذرہ واخرک جیفة قذرہ وانت بین ذالک تحمل العذرة**" کہ تمہاری ابتدا تو ایک ناپاک نطفہ ہے اور تمہاری انتہا سڑی ہوئی لاش ہے کہ مرنے کے بعد تمہارے اندر ہزاروں کیڑے پڑ جائیں گے اور مردہ لاش میں ایسی بدبو آئے گی کہ کوئی پاس بھی نہ پھٹک سکے گا۔ اس لیے شریعت نے حکم دیا ہے کہ مرجانے کے بعد دفن میں جلدی کرو۔ شریعت کا یہ مقصود ہے کہ مسلمان مردہ کو ایسی حالت میں اپنے سے جدا کیا جائے کہ کوئی بات موجب نفرت کے اس کے اندر نہ پیدا ہو، دیر کرنے میں اندیشہ ہے کہ لاش پھول جائے اس میں سے بدبو آنے لگے اور اس حالت کو دیکھکر لوگ اس کو حقارت سے دیکھیں اور نفرت ظاہر کرنے لگیں، یہ تو اکرام میت کے منافی ہے۔ غرض یہ ہماری انتہائی حالت ہے جس میں بڑے سے بڑا عاشق بھی ہماری لاش کو جلدی دفن کردینا ہی چاہے گا اور درمیانی حالت یہ ہے کہ تم ہر وقت گوہ کا ٹوکرا ساتھ ساتھ لئے

پھرتے ہو کیونکہ تمہارے پیٹ کے اندر نہ معلوم کتنے سیر پاخانہ بھرا ہوا ہے یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے پیٹ کو ڈھکا ڈھول بنادیا ہے کہ اس میں پاخانہ بھرا ہوا ہے مگر پاس بیٹھنے والوں کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔ واقعی اگر امعاء میں قوت ماسکہ نہ ہوتی جس کی وجہ سے وہ پاخانے کو روکے رہتی ہے اور ایک معین وقت میں سارے کو باہر نکال دیتی ہے تو ہماری کیسی بری گت بنتی ہے بس ہر وقت موری سے پاخانہ بہا کرتا۔ چنانچہ جب کسی مرض یا بڑھاپے کی وجہ سے یہ قوت ماسکہ کمزور ہوجاتی ہے تو اس شخص کی تیماردار بھی گھبراتے ہیں' سارا گھر بدبو سے سڑ جاتا ہے' سارے گھر میں ایک موری کی وجہ سے سڑاہند پھیل جاتا ہے تو یہ خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس نے امعاء میں قوت ماسکہ رکھ دی ہے ورنہ ہر وقت نجاست بہا کرتی۔ پھر دیکھو انسان کے بدن میں ہزاروں مسامات ہیں جیسے پسینہ نکلتا ہے۔ یہ خدا کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ ان مسامات سے پاخانہ کا عرق کبھی باہر نہیں آتا۔ اگر مسامات سے پاخانہ نکلا کرتا تو زندگی موت ہوجاتی تو محض خدا کی رحمت کی وجہ سے آپ بنے ٹھنے پھرتے ہیں ورنہ انسان کے اندر اتنا پاخانہ بھرا ہوا ہے کہ اگر وہ ہر وقت نکلنے لگے اس وقت اس زینت و آرائش کی ساری مٹی پلید ہوجائے۔ غرض ان بزرگ نے خوب جواب دیا کہ ہاں میں جانتا ہوں کہ تو کون ہے۔ بس تیری حقیقت تو یہ ہے آگے خدا کی ستاری ہے کہ اس نے تیرے پیٹ کو ڈھکا ڈھول بنادیا ہے تو کیا اس نعمت کا یہی شکر یہ ہے کہ تو فرعون کی طرح اکڑ کر چلے۔

صاحبو! جس طرح ہمارا ظاہر ناپاک معلوم ہو رہا ہے اسی طرح ہمارا باطن بھی ناپاک ہے مگر خدا کی رحمت سے وہ پاک معلوم ہو رہا ہے اسی طرح ہمارا باطن بھی ناپاک ہے جس کی اطلاع خدا ہی کو ہے یا ہم کو ہے دوسروں کو کچھ خبر نہیں کہ ہمارے دل میں کیا کیا گندگی بھری ہوئی ہے بخدا اگر دلوں کی گندگی کی بدبو محسوس ہوتی وہ ایسا ہی سمجھتے مگر یہ بھی رحمت الٰہی ہے کہ اس گندگی کی بدبو ہر اک کو محسوس نہیں ہوتی جس سے لوگ اپنے آپ کو پاک وصاف اور ستھرے سمجھنے لگے۔ صاحبو! تم کو زکام ہو رہا ہے اس لیے یہ بدبو محسوس نہیں ہوتی' کسی صحیح الدماغ ہے کو اپنا حال دکھلاؤ' وہ بتلائے گا کہ تمہارے دل میں کس قدر گندگی ہے جس کی بدبو سے اس کا دماغ پریشان ہوگیا' کوئی مولانا یا کوئی شیخ اس

پر مغرور نہیں ہو کہ لوگ ہم کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ہماری تعظیم و تکریم کرتے ہیں تو ہم واقع میں بھی ایسے ہی ہیں' یقیناً دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ مخلوق کو دھوکہ دے رہے ہیں کہ لوگ ان کے ظاہری طرز اور عبادت و مجاہدات کی وجہ سے ان کو بزرگ سمجھنے لگے' دل کی کسی کو خبر نہیں کہ یہ سارا ڈھونگ ہی ڈھونگ ہے یا کچھ اخلاص بھی ہے مگر یاد رکھو' خدا کے سامنے یہ دھوکہ نہ چل سکے گا۔ مولانا فرماتے ہیں:

اللہ اللہ می زنی از بہر نان　　بے طمع پیش آؤ اللہ را نجواں
خلق راگیرم کہ بفریبی تمام　　درغلط اندازی تاہر خاص و عام
کارہا باخلق آری جملہ راست　　باخدا تزویر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن　　رایت اخلاص و صدقہ افراشتن

(تم اللہ اللہ روٹی کے لالچ سے کرتے ہو' بے طمع ہو کر اخلاص سے اللہ اللہ کرو تو اثر ہو' میں نے فرض کر لیا کہ تم نے ساری مخلوق کو دھوکہ ہی دے دیا مگر خدا تعالیٰ کو کہاں دھوکہ دے سکتے ہو' مخلوق کے ساتھ تمہارے سب کام درست ہیں' خدا تعالیٰ کے ساتھ مکر و حیلہ کب جائز ہے' اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو سب کام درست رکھنے چاہئیں اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیے)

از بہر نان پر مجھے یاد آیا کہ ایک مولوی کان پور میں آئے' ان کا کرتہ پھٹا ہوا نئے کرتہ کی ضرورت تھی آپ نے کیا حکمت کی تھی کہ ایک رئیس کے یہاں مولود پڑھنے گئے وہاں کسی شعر پر آپ نے وجد ظاہر کیا اور کرتہ جھر جھر پھاڑ ڈالا' اب اس بے چارہ رئیس کو غیرت آئی کہ مولانا صاحب میرے گھر پر کرتہ پہن کر آئیں اور یہاں سے ننگے تشریف لے جاویں اس نے فوراً نوکر کو بزاز کے یہاں بھیجا اور ان کے واسطے ایک تھان منگایا' فوراً کرتے قطع ہوئے اور ایک کرتہ ان کو پہنایا' باقی کرتے بھی شاید انہی کے حوالے کر دیئے تھے۔ اس کو مولانا فرماتے ہیں اللہ اللہ می زنی از بہر نان یہی وجہ ہے کہ وعظ و پند میں اثر نہیں عوام بھی سمجھ گئے کہ یہ سارا وجد نیا کرتہ لینے کے واسطے کیا تھا' پھر ایسی حالت میں ان پر کیا خاک اثر ہو' غرض مخلوق کو بہت دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ ظاہر میں وجد و حال کی صورت بنائی جاتی ہزار دانوں کی تسبیح ہاتھ میں رکھی جاتی ہے اور باطن میں ریاء اور حب جاہ بھری ہوئی ہے مگر حق

تعالیٰ کے یہاں یہ دھوکہ نہ چل سکے گا لیکن اس سے وہ لوگ خوش نہ ہوں جو کچھ بھی نہیں کرتے کہ ہم ریاء سے محفوظ ہیں کیونکہ ہم ذکر ہی نہیں کرتے جو ریاء پیدا ہو سو خوب سمجھ لو کہ تم ان سے اچھے نہیں کیوں کہ وہ ذکر تو کرتا ہے گو ریاء ہی سے سہی اور تم تو اتنا بھی نہیں کرتے' ذکر اگر ریاء سے بھی ہو تو چونکہ وہ ایک روز مبدل بہ اخلاص ہو جاتا ہے ایک دن اپنا کام کر جاتا ہے چنانچہ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص ریاء سے ذکر کرتا ہو اسے حقیر نہ سمجھو کیونکہ ریاء ہمیشہ ریاء نہیں رہتی وہ اولاً ریاء ہوتی ہے پھر کرتے کرتے عادت ہو جاتی ہے اور عادت کے بعد پھر اس کو نہ دکھلاوے کا خیال رہتا ہے نہ لوگوں کو وہ عمل نیا معلوم ہوتا ہے اس لیے عادت سے عبادت ہو جاتی ہے پھر اس میں خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ سبحان اللہ واقعی یہ حضرات حکماء ہیں کسی نے افلاطون کو خواب میں دیکھا تھا اس سے ارسطو اور جالینوس وغیرہ کے متعلق پوچھا کہ یہ لوگ فلسفی تھے کہا کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں پھر جنید اور بایزید بسطامی وغیرہ کے متعلق پوچھا کہا ''اولئک ھم الفلاسفة حقا'' یعنی سچے فلسفی یہی لوگ ہیں واقعی حکمت اسلامی کے مقابلہ میں حکمت یونان کی حکمت ہی کیا ہے کچھ بھی نہیں' سچے فلسفی اور حکیم یہی لوگ ہیں یعنی صوفیاء کرام چنانچہ دیکھ لیجئے حضرت حاجی صاحب نے ریاء کے متعلق کیسا عجیب مضمون بیان فرمایا جس سے ریاء کا علاج بہت ہی سہل ہو گیا ہے کہ جس کام میں ریاء کا خیال آتا ہے اس کو بکثرت کرنا چاہیے اور ریاء کی پروانہ کرنا چاہیے البتہ عقلاً عقیدۃً اس کو برا سمجھتے رہنا چاہیے پھر کرتے کرتے وہ خود ہی عادت اور عادت سے عبادت ہو جائے گی۔ یہ ایسی حکمت ہے کہ حکماء یونان کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی اس کے مناسب مضمون ہے کہ بعض لوگوں کو ذکر میں یہ شکایت پیش آتی ہے کہ ہم کو حضور قلب نصیب نہیں ہوتا' وساوس و خطرات ہجوم کرتے ہیں اس کا بھی یہی علاج ہے کہ ذکر کرتے رہنا چاہیے اول اول محض ذکر لسانی ہوتا ہے پھر کرتے کرتے حضور حاصل ہو جاتا ہے اسم سے مسمی کی طرف انتقال خود بخود ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

مست ولا یعقل نہ از جام ھو اے زھو قانع شدہ بر نام ھو

(جام ھو سے تو مست ولا یعقل نہیں ہے اے شخص تو ذات ھو سے ھو کے نام پر قانع ہو گیا)

یہ تو شکایت ہے پھر اس سے اضراب کے طور پر فرماتے ہیں:

از صفت و زنام چہ زاید خیال　　　　وآں خیالت ہست دلاں وصال

(اللہ تعالیٰ کا نام لیتے لیتے ایک خیال قائم ہو جاتا ہے پھر وہی خیال وصال کا وسیلہ ہو جاتا ہے)

یعنی خدا کا نام لیتے لیتے اول ایک خیال قائم ہو جاتا ہے پھر وہی خیال وصال کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ صاحبو! خدا کے نام سے اثر ضرور ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ مٹھائی اور کھٹائی کا نام لینے سے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ تو خدا کا نام کیا اس سے بھی کم ہو گیا ہرگز نہیں اس سے بھی ضرور ایک دن دل پر اثر ہوگا' کام میں لگا رہنا چاہیے' گھبرانا نہ چاہیے' کھٹائی کے نام سے منہ میں پانی بھر آنے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک بادشاہ نے شہزادہ کو روزہ رکھوایا تھا اور روزہ کشائی کی رسم کے لیے بڑے پیمانے پر دعوت کا انتظام کیا تھا' لڑکے نے ظہر تک تو صبر کیا لیکن عصر کے بعد اس سے نہ رہا گیا' مارے پیاس کے بے تاب ہو گیا اور مچلنا شروع کیا' بادشاہ نے اطباء کو بلایا کہ کوئی ایسی تدبیر کرو کہ اس کی پیاس کو تسکین ہو جائے اور روزہ بھی نہ جائے ورنہ سارا کیا کرایا سامان برباد ہو جائے گا۔ سب اطباء اس کے علاج سے عاجز ہو گئے' ایک غیر مشہور طبیب کی سمجھ میں ایک نسخہ آیا اس نے عرض کیا کہ حضور میں اس کا علاج کروں گا۔ آپ چند لڑکوں کو بلائیے اور تھوڑے سے لیموں منگا دیجئے۔ چنانچہ فوراً انتظام کیا گیا' اس نے لڑکوں سے کہا کہ شہزادے کے سامنے لیموں کا ٹکڑا کھانا شروع کرو' بس لیموں کو کھاتے ہوئے دیکھ کر شہزادے کے منہ سے رطوبت کے دریا پیدا ہو گئے۔ طبیب نے کہا کہ اس رطوبت کو نگلنا شروع کرو۔ بس لعاب دہن کے نگلنے سے روزہ بھی نہیں ٹوٹتا' اس نے لعاب نگلنا شروع کیا۔ بس پیاس کو فوراً تسکین ہو گئی' بادشاہ اس تدبیر سے بہت خوش ہوا اور طبیب کو بہت کچھ انعام دیا' بس جب لیموں کے نام میں یہ خاصیت ہے تو خدا کے نام میں کیوں یہ خاصیت نہ ہو گی کہ اس سے دل بھر آئے۔ الغرض ریاء کا قصد نہ کرنا چاہیے لیکن اگر ایک دن میں ریاء زائل نہ ہو تو ذکر کو چھوڑنا بھی نہ چاہیے' کرتے رہنا چاہیے رفتہ رفتہ ریاء خود زائل ہو جائے گی۔ وہ خدا کا نام تم کو انشاء اللہ خدا ہی تک پہنچا دے گا نہ ہونے سے ذکر کا ہونا بہرحال اچھا ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ کوئی شیخ صاحب یا مولانا صاحب مخلوق کی تعظیم و تکریم پر مغرور نہ ہوں۔ وہ یا تو مخلوق کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اگر کسی کا قصد دھوکہ دینے کا

بھی نہ ہوتو خدا کی ستاری ہے کہ اس نے ہمارے عیوب مخلوق سے چھپا دیئے ہیں اور محاسن ظاہر کردیئے ہمارے اندر کبر ہے ریاء ہے حسد ہے حب جاہ ہے لیکن مخلوق کو خبر نہیں وہ ہم کو اس عیوب سے پاک سمجھتے ہیں۔ اس لیے تعظیم وتکریم سے پیش آتے ہیں اگر لوگوں کو ہمارے عیوب باطنیہ کی خبر ہوجائے تو سب سے پہلے وہ ہماری گت بنائیں۔ پس اگر خدا کی ستاری سے ہمارے عیوب ظاہر نہ ہوں تو ہم کو اپنا معتقد نہ ہونا چاہیے۔ غضب تو یہ ہے کہ لوگوں کی تعظیم وتکریم عقیدت سے ہم خود بھی اپنے معتقد ہوجاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم واقع میں کچھ ضرور ہیں' جب ہی تو اتنے آدمی بڑا سمجھتے ہیں۔ سو خوب سمجھ لو "بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ" (بلکہ انسان خود اپنی حالت پر مطلع ہے) ہر شخص اپنی حالت کو دوسرے سے زیادہ جانتا ہے اور دوسرے اس کی اندرونی حالت سے محض اس لیے بے خبر ہوتے ہیں۔ بس تعجب ہے کہ چند ناواقفوں کی تعظیم وتکریم سے تم واقف ہوکر اپنے معتقد بن گئے آج کل بکثرت یہی حالت ہے کہ باوجود یہ کہ باطن سراپا گندہ ہے لیکن ظاہری تقویٰ کو کافی سمجھا جاتا ہے اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے باطن میں کیا کیا گندگی بھری ہوئی ہے اس پر میں نے یہ شعر پڑھا تھا:

از بروں چوں گور کافر پر حلل   واندروں قہر خدائے عزوجل

(ظاہر سے تو گور کافر کی طرح آراستہ ہے اور اس کے اندر خدا کا قہر نازل ہے)

لایعنی امور سے احتیاط

حاصل یہ کہ بعض منکر رذائل کے ازالہ کی طرف التفات بھی نہیں کرتے من جملہ ان ہی رذائل کے اشتغال بما لایعنی ہی ہے جس کے نسبت یہ ارشاد ہے۔ یعنی "من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه"[1] کہ غیر ضروری اور لایعنی امور کو ترک کردیں اس پر نہ مشائخ کو التفات ہے نہ غیر مشائخ کو سب غور کرکے دیکھ لیں کہ دن بھر میں کتنی بار فضول باتیں کرتے ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ آدمی لایعنی امور کو ترک کردے اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا حسن اس کے بغیر حاصل نہیں ہوتا تو کیا اسلام کے حسن کی آپ کو ضرورت نہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ

---

[1] مجمع الزوائد للهيثمى ۸:۱۸' مسند احمد ۱:۲۰' کنز العمال ۳:۸۲۹۱

علیہ کے والد ہمیشہ نظر نیچی رکھتے تھے۔ اگر کوئی ان سے بات بھی کرتا تو نظر اٹھا کر اس کو نہ دیکھتے تھے سر نیچے کئے بات کا جواب دیتے' لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ بات کا سننا کان کے متعلق ہے اور جواب دینا زبان کے متعلق ہے نگاہ کا اس میں کچھ کام نہیں تو میں بے فائدہ اپنی نظر کو کیوں صرف کروں۔ صاحبو! جن لوگوں کو اپنے اسلام کے کامل کرنے کا خیال ہوتا ہے وہ تو لایعنی امور سے اتنی احتیاط کرتے ہیں کہ نظر کو بھی بے فائدہ نہیں صرف کرتے اور اس میں جو نفع ہے اس کو ابھی آپ نہیں سمجھ سکتے' اس پر عمل کر کے دیکھئے کس قدر دل میں نور پیدا ہوتا ہے پھر آپ کو محسوس ہوگا کہ بے فائدہ نظر کرنے سے کتنا ضرر ہوتا ہے غرض یہ کہ معلوم ہو گیا کہ اس سے غفلت سب کو ہے اور ایسی غفلت ہے کہ لایعنی امور کا ارتکاب کر کے ندامت بھی کسی کو نہیں ہوتی' گناہ بھی لوگ کرتے ہیں مگر اس سے ندامت تو ہوتی ہے چنانچہ غیبت کر کے سب پچھتاتے ہیں مگر ہنسی دل لگی کر کے کوئی نہیں بچتا کہ اے اللہ میں نے فضول وقت ضائع کیا' میری توبہ ہے اگر لایعنی امور سے ایسی احتیاط نہ ہو سکے جیسی مولانا رفیع الدین صاحب کے والد کرتے تھے کہ وہ نظر کو بھی بے فائدہ صرف نہ کرتے تھے تو ایسا بھی تو نہ ہونا چاہیے کہ بالکل وہ دردہ ہی ہو جاؤ کہ کسی وقت اس سے بچنے کا خیال ہی نہ ہو۔ اب سمجھو کہ لایعنی کسے کہتے ہیں۔ افعال کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو نافع ہیں خواہ دنیا میں یا دین میں دوسرے وہ جو مضر ہیں دنیا میں آخرت میں تو جو امور نافع ہیں خواہ دنیا میں دین میں وہ تو ضروری ہیں ان کے چھوڑنے کو میں نہیں کہتا۔ البتہ اتنی قید ضروری ہے کہ جو امور دنیا میں نافع ہوں شریعت سے ان کی اجازت ہونی چاہیے اگر اجازت نہ ہوگی تو وہ دوسری قسم میں داخل ہو جائیں گے جو کہ آخرت میں مضر ہیں کیونکہ ناجائز کام میں یہ ممکن ہے کہ دنیا کا نفع بظاہر معلوم ہوتا ہو مگر آخرت میں اس سے ضرر ہوگا' عتاب و عذاب ہوگا لیکن جب ایک کام دنیا میں بھی نافع ہے شریعت سے بھی اس کی اجازت ہے تو اس کو ضرور کر لینا چاہیئے۔ مثلاً ہم ایک شخص سے سودا کر رہے ہیں اور اس کو مال دکھلا رہے ہیں اور وہ ہم سے جھک جھک کرتا ہے اور اگر اس میں ایک گھنٹہ بھی لگ جائے تو کچھ حرج نہیں یہ سب گفتگو ثواب میں داخل ہے بشرطیکہ جھوٹ اور فریب سے احتراز کیا جائے کیونکہ اگر ہم خریدار سے بات چیت نہ کریں اور اس کو بار بار قسم قسم کا مال نہ دکھلائیں اور ایک چیز دکھلا کر

ایک دفعہ قیمت بتلا کر خاموش ہو جائیں تو اس طرح تجارت نہیں چل سکتی اس لیے خریدار سے بات چیت کرنا ضروری ہے کیونکہ دنیا کے لیے نافع ہے اور اگر تجارت کے سوا ہماری اور کوئی آمدنی نہ ہو تو دین کے واسطے بھی نافع ہے کہ کسب حلال کے لیے سعی ہے ضروری کی تفسیر میں لوگ غلطی کرتے ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بس نماز روزہ ہی ضروری ہے اور کوئی چیز ضروری نہیں یہ خیال غلط ہے ضروری وہ ہے جس کے ترک میں ضرر ہو دنیا کا یا آخرت کا اس تفسیر کے مطابق خریدار سے بات چیت کرنا بھی ضروری ہے اگر تم اس سے نہ بولو گے تو تجارت کو ضرر ہوگا اس وقت شریعت مقدسہ سکوت کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر اس مکالمت میں گھنٹہ دو گھنٹہ لگ جائیں تو یہ مت سمجھا جائے کہ وقت ضائع ہوا اور دین کا نقصان ہوا ہرگز نہیں یہ سارا وقت ضروری کام میں صرف ہوا ہے اگر نیت اچھی ہے مثلاً یہ نیت ہے کہ ہم اس خریدار سے اس لیے گفتگو کرتے ہیں تاکہ یہ کوئی چیز خریدے تو ہم کو مال حاصل ہوگا جس سے اہل وعیال کا نفقہ ملے گا یا صدقہ وخیرات کریں گے تو اس تمام وقت میں ثواب بھی ملا' یہ کتنی بڑی رحمت ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ شریعت کو ہماری دنیا کی کس قدر رعایت ہے پھر بھی لوگ شریعت کی قدر نہیں کرتے بس اگر تم کو تجارت کی ضرورت وحاجت ہو تو جب تک یہ امید رہے کہ خریدار کچھ نہ کچھ خریدے گا اس وقت تک سودا کرنے میں کچھ بھی حرج نہیں' چاہے کتنا ہی وقت صرف ہو جائے یہ سب ضرورت میں داخل ہے لایعنی نہیں ہے اسی طرح ایک شخص غریب ہے سر پر امرودوں کا ٹوکرا رکھے ہوئے بیچتا پھرتا ہے وہ اگر تمام دن لے لو امرود کی صدا لگاتا پھرے تو اس میں بھی کچھ حرج نہیں اس کا سارا وقت ضروری کام میں صرف ہوا اور اس کے دن بھر لے لو امرود کہنے میں وہی ثواب ہے جو دن بھر اللہ اللہ کرنے میں ثواب ہے بلکہ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ لے لو امرود کہنے میں خدا کا ذکر نہیں ہوتا لاؤ اس کے بجائے سبحان خالق الکمثری کہا کروں تو فقہاء نے اس کو ناجائز لکھا ہے کیونکہ اس میں خدا کے نام کو دنیا کے واسطے استعمال کرنا ہے جس سے خدا کے نام کی بے ادبی ہوتی ہے اس شخص کو لے لو امرود کہنے ہی میں ثواب ہے اور سبحان خالق الکمثری کہنے میں کراہت ہے اسی طرح اگر کوئی شخص پہرہ دینے کا ملازم ہے وہ رات بھر جاگو جاگو کہتا رہے تو اس کے جاگو جاگو کہنے میں کوئی ضرر نہیں یہ بھی ضروری کام میں داخل

ہے اس سے دل کا نور کچھ بھی کم نہ ہوگا اور اگر وہ بجائے جاگو کے لا الہ الا اللہ زور سے کہتا پھرے اور یہ سمجھے کہ جاگو کہنے میں خدا کا ذکر نہیں ہوتا لاؤ ایسا لفظ پکاریں جس میں خدا کا ذکر بھی ہوجائے اور پہرہ بھی ہوجائے تو فقہاء نے اس کو مکروہ لکھا ہے اور وجہ وہی ہے کہ اس نے خدا کے نام کو دنیا کے واسطے استعمال کیا۔ واقعی فقہائے دین کو خوب سمجھتے ہیں بظاہر تو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ لا الہ الا اللہ پکار کر پہرہ دیا جائے مگر فقہاء نے اس کی علت کو سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جاگو جاگو کہنے میں اس کو ثواب ملے گا اور ذکر کے ساتھ پہرہ دینے میں گناہ ہوگا۔ اسی طرح راستوں میں بیٹھ کر قرآن پڑھنا اس نیت سے کہ کوئی ہم کو حاجت مند سمجھ کر کچھ دے گا بالکل حرام ہے اگر کوئی حاجت مند زیادہ ہو اور اس کو مانگنا جائز ہو صاف صاف سوال کرنا چاہیے۔ قرآن کو صورت سوال بنانا حرام ہے فقہاء نے ضرورت کی وجہ سے تعلیم پر اجرت لینے کو جائز کہا ہے لیکن ذکر خالص کو دنیا کا ذریعہ بنانا جس سے تعلیم مقصود نہ ہو حرام ہے غرض پہرہ والے کا جاگو پکارنا فضول نہیں ہے بلکہ وہ اگر پہرہ چھوڑ کر چپکے چپکے نفلیں پڑھنے لگے تو وہ خائن ہے اس نے اپنی ملازمت میں خیانت کی اس حالت میں تنخواہ لینا اسے بالکل حرام ہے اسی طرح اگر کوئی شخص ذکر و شغل میں مشغول ہو اور اس وقت کوئی اس کے پاس نماز سیکھنے آئے تو اس وقت ذکر و شغل ترک کر دینا اور اس شخص سے بات چیت کرنا واجب ہے۔ یہ بات چیت بھی ضرورت میں داخل ہے یا ہم تسبیح وغیرہ میں مشغول ہیں اور ایک آدمی نماز خراب پڑھ رہا ہو اس وقت واجب ہے کہ اپنا ذکر چھوڑ کر اسے ٹوک دیں کہ نماز اطمینان سے پڑھو بشرطیکہ فتنہ اور لڑائی کا خوف نہ ہو اگر ایسا خوف ہو اور نہ ٹوکا تو کچھ گناہ نہیں لیکن اگر محض اپنے ذکر اور تسبیحوں کا خیال ہو تو کہ کون اس کو بتلائے کیوں اپنا کام چھوڑیں یہ نماز خراب پڑھے گا تو خود ہی جہنم میں جائے گا تو اس میں ان تسبیح پڑھنے والے صاحب کو بھی گناہ ہوگا باوجود قدرت کے اس نے نہی عن المنکر میں کوتاہی کی مگر آج کل کے لوگوں کو اپنے وظائف کا ایسا اہتمام ہوتا ہے کہ ان میں بولنا گناہ سمجھتے ہیں بس ایسی چپ سادھ کر بیٹھتے ہیں کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے بولنا جانتے ہی نہیں۔ یاد رکھو یہ سخت غلطی ہے ضرورت کے وقت بات چیت کرنا ذکر وغیرہ سے افضل ہے مگر لوگوں کی حالت یہ ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے بولنے بات کرنے کو برا نہیں سمجھتے اور وظیفہ میں بولنے کو گناہ سمجھتے ہیں

چاہے ان کے نہ بولنے سے کسی کی جان ہی جاتی رہے جیسے ایک دیہاتی زاہد رات کو مسجد میں بیٹھا ہوا مراقبہ کر رہا تھا وہاں ایک غریب مسافر بھی پڑا سو رہا تھا جو سوتے ہوئے خراٹے لیا کرتا تھا' اس کے خراٹوں سے دیہاتی کے مراقبہ میں خلل پڑنے لگا تو آپ نے اسے جگا کر بٹھا دیا کہ اٹھ کر بیٹھو یہ تم کیا کر رہے ہو؟ وہ غریب اٹھ کر بیٹھا مگر نیند کہاں جاتی ہے بے چارہ تھکا ماندہ تھا تھوڑی دیر بعد پھر سو رہا اور ویسے ہی خراٹے لینے لگا' دیہاتی نے پھر اسے اٹھا دیا وہ پھر کچھ دیر میں سو رہا اور ویسے ہی خراٹے لینے لگا اب تو دیہاتی سے نہ رہا گیا اس نے نکال خنجر اس غریب کا کام تمام کر دیا کہ اب تو خراٹے نہ لے گا' صبح ہوئی لوگ نماز کو آئے تو مسجد میں خون ہی خون دیکھا' پوچھا خان اس مسافر کو کس نے مارا تو آپ بے تکلف فرماتے ہیں کہ ہم نے مارا یہ ہمارے مراقبہ میں خلل ڈالتا تھا۔ سبحان اللہ آپ کا مراقبہ نہ جائے چاہے کسی کی جان جاتی رہے۔

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

یہ تو وہی مثل ہوئی کہ گڑ کھاویں اور گلگلوں پر ہیز نہ قتل تو کر دیں مگر مراقبہ نہ چھوٹنے پائے۔ **استغفر اللہ العظیم۔**

یہ سب باتیں جہالت سے پیدا ہوتی ہے لوگ بوجہ جہالت کے بھی نہیں سمجھتے کہ شرعاً کون سا کام ضروری ہے اور کون سا غیر ضروری ہے اسی لیے علم کی ضرورت ہے یا کم از کم علماء کی صحبت ہی ہو تو ایسی غلطیاں پھر نہیں پیش آتیں' الغرض تین قسم کے افعال ہیں ایک وہ جن میں دنیا کا یا دین کا نفع ہو یہ تو ضروری ہیں دوسرے وہ جن میں دنیا کا یا دین میں ضرر ہو ان کا ترک ضروری ہے۔ تیسرے وہ جن میں نہ دنیا کا دین کا نفع ہے نہ ترک میں ان دونوں کا ضرر ہے یہ قسم لایعنی ہے۔ حدیث "من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه" میں اسی قسم کے افعال کو چھوڑنے کی ترغیب دی گئی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے افعال سے منع فرماتے ہیں مگر اس کی طرف کسی کو بھی التفات نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اتقیاء کی شکایت کرتا ہوں کیونکہ ہم جیسوں کے تو بہت سے گناہ ہیں ہم لوگ جب گناہوں میں مبتلا ہیں تو لایعنی امور میں ہمارا ابتلاء چنداں عجیب نہیں ہم تو کہیں غیبت کرتے رہتے ہیں کہیں بدنگاہی میں مبتلا ہیں۔ غرض سر سے پیر تک گناہوں میں غرق ہیں پھر ہم لایعنی امور میں بھی اگر مبتلا ہوں تو کچھ تعجب نہیں مگر افسوس اتقیاء پر ہے جو تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں مگر لایعنی امور سے بچنے کا ذرا فکر نہیں

کرتے۔ بس حضرت شیخ ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھے ہیں تا کہ دیکھنے والے یہ سمجھتے رہیں کہ ان کا دل مشغول بحق ہے مگر ساتھ ہی ہنسی دل لگی بھی ہو رہی ہے۔ صاحبو! فضول باتوں سے قلب میں وہ ظلمت پیدا ہوتی ہے جس سے ذکر واذکار کا سارا اثر ڈھل جاتا ہے مگر اس کا ادراک ہر شخص کو نہیں ہوسکتا جس کا دل نورانی ہوا سے اس ضرر کا ادراک ہوتا ہے۔ کالے توے پر اگر تھوڑی سی سیاسی اور لگ جائے تو اس پر کیا اثر محسوس ہوسکتا ہے ہاں شفاف آئینہ کو دیکھو کہ اس پر ذرا سی بھاپ سے بھی میلا پن آجاتا ہے اور فوراً فرق محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کے قلوب شفاف ہیں ان کے ایسے واقعات منقول ہیں ایک ذرا سی بھی فضول بات سے کس قدر متاثر ہوئے ہیں۔ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ اپنے ایک دوست کے مکان پر گئے جا کر آواز دی اندر سے جواب ملا کہ گھر میں نہیں ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ کہاں گئے ہیں جواب ملا معلوم نہیں کہاں گئے ہیں۔ بس اس کے بعد ان کو فوراً تنبہ ہوا کہ میں نے سوال فضول کیا کہ کہاں گئے ہیں (ممکن ہے کہ وہ کسی مخفی کام کے لیے گئے ہوں جس کا بتلانا مصلحت کے خلاف ہو تو میں نے خواہ مخواہ اپنے ایک مسلمان بھائی کا راز دریافت کیا) بس اتنی بات پر وہ تیس برس تک روتے رہے کہ میں نے یہ سوال کیوں کیا کہ وہ کہاں ہیں اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ فضول بات کا اہل قلوب پر کتنا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ایک ڈاکٹر صاحب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں رہ کر ہندوستان واپس آئے تھے کہ ایک مرتبہ ایک رئیس کی فٹن گاڑی میرے بلانے کے لیے آئی' میں نے سوار ہونے سے عذر کیا کہ قریب جگہ ہے ویسے ہی چلا جاؤں' انہوں نے اصرار کر کے بٹھلایا' بس گاڑی میں پیر رکھنا تھا وہ نور معاً سلب ہوگیا تو یہ امور جن کو ہم ہلکا سمجھتے ہیں صاف شفاف قلوب سے پوچھو کہ ان سے کس قدر ظلمت پیدا ہوتی ہے۔ صاحبو! میں حرمت کا فتویٰ نہیں دیتا' میں یہ نہیں کہتا کہ ایسے امور کے ارتکاب سے گناہ ہوتا ہے' نہیں فتویٰ تو وہی ہے کہ گناہوں سے بچنا واجب ہے اور اتنی کاوش کی ضرورت نہیں مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں ہوسکتا کہ یہ حدیث ہی پڑھنا فضول ہے۔ آخر یہ بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے کہ لایعنی امور کا ترک کر دینا اسلام کی خوبی ہے۔ اگر ہم سے بالکل ترک لایعنی نہ ہوسکے تو اس کی کثرت تو ترک کرنی چاہیے رہا یہ کہ اس کا ضرر کیا ہے تو جس طرح ترک لایعنی نہ ہوسکے تو اس کی کثرت تو ترک کرنی چاہیے۔ رہا یہ کہ اس کا ضرر کیا ہے تو جس طرح ترک لایعنی کے فائدہ کا احساس بھی نور قلب پر موقوف ہے اور اگر کسی کے دل میں نور

نہ ہوتو اس کوکسی محقق کا قول مان لینا چاہیے یا محقق کے مقلد کی تقلید کر لینی چاہیے۔قاعدہ ہے کہ یا تو آدمی خود بینا ہو جب راستہ دیکھ سکتا ہے اور اگر خود اندھا ہے تو اس کو کسی سوانکھے کی تقلید کرنی ضروری ہے اگر اندھے آدمی سے ایک سوانکھا یہ کہے کہ اس راستہ میں گڑھا ہے اس سے بچ کر چلو عقلاء یہی کہیں گے کہ اندھے پر اس کی تقلید واجب ہے پھر حیرت ہے کہ دین کے باب میں محققین کا قول نہ مانا جائے۔

فضول باتوں سے پرہیز

سید المحققین سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”**كثرة الكلام تقسوا القلب**[1]“ زیادہ باتیں بنانا دل کو سخت کر دیتا ہے۔حدیث میں ہے: ” **كثرة الضحك تميت القلب**[2]“ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔کیا اب بھی کسی کو اس میں شک ہے کہ فضول (اور لایعنی) باتوں سے دل کی صفائی اور نور زائل ہو جاتا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ ہم تو رات دن ہنستے رہتے ہیں ہمارا دل تو مردہ نہیں ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ تجھ کو حیات قلب نصیب ہی نہیں ہوئی جس سے کہ موت قلب کا احساس ہو "**الاشياء تعرف باضد ادها**"(اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) غضب یہ ہے کہ جس طرح دنیا والے شطرنج وگنجفہ سے دل بہلاتے ہیں اسی طرح آج کل اتقیاء کے یہاں لغو اور فضول باتیں دل بہلانے کا مشغلہ ہوگئی ہیں۔بس تسبیح ہاتھ میں لے لی اور دنیا بھر کی باتیں بنا رہے ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ذکر سے جو نور قلب حاصل ہوا تھا وہ زائل ہو جاتا ہے اور نور قلب کے زائل ہونے سے طاعت کا شوق کم اور ہمت میں پستی آ جاتی ہے اور جہاں شوق و ہمت میں کمی آئی پھر گناہوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ گناہ سے بچنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک شوق ومحبت دوسرے ہمت اور یہ دونوں باتیں نور ذکر سے پیدا ہوتی ہیں جب ان لغویات سے وہ نور ہی زائل ہو گیا تو شوق و ہمت میں کمی آنا لازمی ہے پھر اس شخص کا گناہوں میں مبتلا ہو جانا کچھ بھی عجیب نہیں کیونکہ اب وہ روک ہی نہیں رہی جس کے ذریعے گناہوں کی نفرت دل میں جم جاتی ہے بس لایعنی امور کا

---

[1] فتح الباری لابن حجر ۱۰:۴۴۶

[2] اتحاف السادة المتقين ۵:۱۴۷، ۷:۳۹۴

ارتکاب گوخود معصیت نہ ہومگر معصیت کا ذریعہ ضرور ہے اب تو آپ کواس کے ترک کا ضروری ہونا معلوم ہو گیا ہوگا۔ شیخ فرید عطار پند نامہ میں فرماتے ہیں:

دل ز پر گفتن بمیرد در بدن　　گرچہ گفتارش بود در عدن

(دل زیادہ بک بک کرنے سے بدن میں مرجاتا ہے' مگر اس کی گفتگو نہایت پاکیزہ اور بھڑک دار ہے)

پند نامہ عجیب کتاب ہے اس کو دستور العمل بنانا چاہیے اس سے اصلاح کا زیادہ حصہ طے ہو جاتا ہے بس دریا کو کوزہ میں بھر دیا ہے۔ شیخ عطار نے یہ کتاب تالیف کر کے مولانا رومی کے والد صاحب کو دیدی تھی کہ اپنے صاحبزادے کو کتاب پڑھائے گا اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کیسی کتاب ہے۔ مولانا رومی نے بھی شیخ عطار کی کتاب کی بہت مدح فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ہفت شہر عشق راعطار گشت　　ماہنوز اندرخم یک کوچہ ایم

(حضرت فرید الدین عطارؒ عشق و معرفت کے ساتوں شہروں میں گھومے ہیں ہم ابھی تک عشق کی ایک گلی کے کنارے پر ہیں)

یعنی بہت ہی بڑے عارف ہیں جنہوں نے عشق کے تمام طبقے طے کر لئے ہیں۔ سو اتنا بڑا محقق کہتا ہے:

دل ز پر گفتن بمیرد در بدن　　گرچہ گفتارش بود درعدن

(دل زیادہ بک بک کرنے سے بدن میں مرجاتا ہے مگر اسکی گفتگو نہایت پاکیزہ اور بھڑک دار ہے)

پر گفتن کے معنی بہت بک بک کرنا اور درعدن سے مراد بھڑک دار کلام ہے یعنی چاہے ظاہر میں کلام کیسا ہی خوش نما بھڑک دار ہو مگر زیادہ کلام سے دل ضرور مرجاتا ہے۔ صاحبو! آخر اس کی کچھ تو وجہ ہے کہ ہم نماز بھی پڑھتے ہیں وضو بھی کرتے ہیں مگر پھر دل میں ہمارے نور نہیں پیدا ہوتا۔ حالانکہ نماز کے انوار اس قدر ہیں کہ شاید ہی کسی عبادت کے انوار اس قدر ہوں۔ اسی طرح وضو کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وضو کے ہر قطرہ پانی کے ساتھ گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ نیز آپ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا کہ اگر کسی شخص کے گھر کے پاس نہر

جارہی ہو جس میں وہ پانچوں وقت غسل کرتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ بھی میل رہ جائے گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ کچھ بھی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی طرح مسلمان جب پانچوں وقت وضو کر کے نماز پڑھتا ہے تو وہ گناہوں سے ایسا ہی پاک ہو جاتا ہے پھر حیرت ہے کہ ہمارے دل میں نہ نماز سے نور پیدا ہوتا ہے نہ وضو سے' آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ تو خوب سمجھ لو کہ نور تو پیدا ہوتا ہے مگر وہ نور ذرا سا ہوتا ہے کیونکہ ہمارے قلوب پہلے ہی سے شفاف نہیں' پھر نماز اور وضو بھی ہم ایسے ہی معمولی طور پر ادا کرتے ہیں لیکن پھر بھی جس قدر نور پیدا ہوتا ہے وہ ہماری ان فضول اور لغو باتوں سے زائل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ دوسری نماز کے وقت کچھ بھی نور باقی نہیں رہتا۔ پھر دوسری نماز سے کچھ نور پیدا ہوا۔ وہ اس کے بعد لغویات کا شکار ہو گیا۔ یہی قصہ روزانہ چلتا رہتا ہے جیسا کہ مولانا نے مثنوی میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک چور چوری کرنے گیا تھا' جب کچھ آہٹ ہوئی تو مالک کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے زمانہ میں دیا سلائی تو نہ تھی جس سے فوراً چراغ روشن ہو جائے' چقماق سے کام لیا کرتے تھے۔ اس نے ایک سوکھی لکڑی پر چقماق سے چنگاری جھاڑی وہ چور بھی قریب آ بیٹھا۔ جب وہ چنگاری ستارے کی طرح چمکی اور لکڑی پر پڑی اس نے فوراً اپنا انگوٹھا اس جگہ رکھ دیا' وہ گل ہو گئی' غرض جب وہ ستارہ جھڑتا چور اس جگہ انگوٹھا رکھ دیتا جس سے آگ بڑھنے نہ پاتی۔ مولانا فرماتے ہیں:

بس ستارہ آتشم آہن چکید

(بس ستارہ آتش لوہے سے جڑا)

بغل کا چور

مولانا فرماتے ہیں کہ نماز و وضو وغیرہ سے نور تو ضرور پیدا ہوتا ہے کیونکہ خدا اور رسول کا فرمان سچا ہے مگر ہماری بغل میں چور بیٹھا ہوا ہے جہاں ذرا نور پیدا ہو وہ فوراً انگوٹھا رکھ دیتا ہے جس سے نور بڑھنے نہیں پاتا بلکہ جس قدر پیدا ہوتا ہے ساتھ ساتھ گل ہو جاتا ہے۔ صاحبو! وہ چور کا انگوٹھا یہی ہماری فضول اور لغو باتیں ہیں جس سے طاعات کا نور سلب ہو جاتا ہے اول تو ہماری طاعات میں نور ہی کہاں۔ اس کی مثال تو پہلے ہی سے ایسی ہو رہی ہے جیسے کوئی منہیار چوڑیاں لیے جا رہا تھا' ایک گاؤدی نے اس میں لاٹھی کا کھودا مار کر پوچھا کہ میاں اس میں کیا

چیز ہے ان گنواروں کی عادت ہوتی کہ لاٹھی کا کھودا مار کر پوچھا کرتے ہیں، منہیار نے کہا کہ ایک کھودا اور مار دو تو کچھ بھی نہیں۔ یعنی اس میں ایسی نازک چیز ہے دوسری مار میں ختم ہو جائے گی۔ یہی حال ہمارے نور کا ہے کہ بس شیطان کی ایک ضرب لگ جائے تو کچھ بھی نہیں نہ کہ اس پر اتنی ضربیں پڑتی ہوں کہ ہم رات دن فضول باتیں کر کے پھونکیں مار مار کر خود ہی اس کو گل کرتے ہیں۔ صاحبو! نور بڑھتا ہے دھونکنے سے شیطان ہماری دھونکنی چرا کر لے گیا ہے اس لیے وہ بڑھنے نہیں پاتا پھر جس قدر پیدا ہوتا ہے وہ ساتھ ساتھ بجھتا جاتا ہے جمع نہیں ہونے پاتا' اس لیے ہم کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔ بعض ذاکرین شکایت کیا کرتے ہیں کہ ہم کو ذکر سے نفع نہیں ہوتا' دل میں نور نہیں آتا' اس کا جواب یہی ہے کہ نور کہاں سے پیدا ہو۔ جب تم ایک گھنٹہ ذکر کر کے چار گھنٹے فضول بک بک میں لگاتے ہو وہ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے تم اس سے زیادہ ظلمت پیدا کر دیتے ہو دیکھو حوض میں اس وقت پانی ہو سکتا ہے جب کہ نیچے کی ڈاٹ بند ہو اور اگر ڈاٹ کھلی ہوئی ہو گی تو تم اوپر سے بھرو گے اور نیچے سے وہ نکلتا رہے گا۔ حوض خالی کا خالی رہے گا اور اگر اوپر سے پانی کے ساتھ خس و خاشاک بھی بھرتے رہو گے تو وہ اٹ جائے گا اور کیچڑ جمع ہو کر سڑاہند پیدا کر دے گا۔ پھر چند دنوں میں پانی خشک ہو جائے اور کوڑا ہی کوڑا رہ جائے گا بعض ذاکرین ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ زیادہ بک بک نہیں کرتے مگر ان کو ذکر سے اس لیے نفع نہیں ہوتا کہ ان میں کبر وحب جاہ ہوتی ہے۔ حضرت شبلیؒ کے ایک مرید نے ان سے شکایت کی کہ ذکر سے نفع نہیں ہوتا۔ شیخ نے اس کو کچھ اور بتلا دیا جب بار بار شکایت کی تو شیخ نے توجہ سے مرض دریافت کیا' معلوم ہوا کہ اس میں کبر ہے۔ آپ نے اس کے علاج کی تدبیر کی' فرمایا کہ یہ اخروٹوں کا ٹوکرا فلاں محلّہ میں اپنے سر پر رکھ کر لے جاؤ (اس محلّہ میں اس کے معتقدین زیادہ تھے) اور لوگوں سے کہنا کہ تمہارے سر پر دھولیں ماریں اور فی دھول ایک اخروٹ لے لیں اس نے کہا اللہ اکبر میں ایسا کروں۔ شیخ نے فرمایا اے شخص یہ وہ کلمہ ہے کہ اگر کافر صد سالہ اسے کہتا تو مومن ہو جاتا مگر اس وقت تو اس کے کہنے سے کافر ہو گیا کیونکہ اس نے اللہ اکبر اس لیے نہ کہا تھا کہ خدا کی بڑائی بیان کرے بلکہ اس نے اپنی بڑائی بیان کرنے کے لیے اللہ اکبر کہا تھا۔ عارفین نے لکھا

ہے کہ سالک کے سر پر سے تکبر تمام امراض کے بعد نکلتا ہے اور جہاں یہ خبیث مادہ نکلا پھر وہ بہت جلد واصل ہو جاتا ہے تو گویا خدا اور بندے کے درمیان صرف خودی حائل ہے۔ یہ خودی جاتی رہے تو پھر کوئی حجاب نہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں:

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجاب خودی حافظ ازمیان برخیز

(محبوب اور محبّ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں' اے حافظ تو اس حجاب خودی کو درمیان سے اتار کر پھینک دے)

قرب الی اللہ

حضرت بایزیدؒ نے ایک مرتبہ حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا' موقع اچھا تھا انہوں نے موقع کا سوال بھی کیا' عرض کیا "یا رب دلنی علی اقرب الطریق الیک" یعنی مجھ کو ایسا راستہ بتلا دیجئے جو آپ کی طرف پہنچنے کے لیے سب سے زیادہ نزدیک ہو' وہاں سے ارشاد ہوا "یا بایزید دع نفسک و تعال" اے بایزید بس اپنے نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ' مطلب وہی ہے کہ خودی اور کبر کو زائل کر دو پھر کوئی حجاب نہیں۔ واقعی بہت ہی مختصر اور قریب راستہ بیان فرمایا اور حق تعالیٰ سے زیادہ اس بات کو کون بتلا سکتا ہے تو یہ کبر وہ بلا ہے جس کی وجہ سے سارا ذکر و شغل بےکار ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک بزرگ کے مرید کو ذکر و شغل سے نفع نہ ہوتا تھا' شیخ نے بہت سی تدابیر کیں مگر سب بیکار ثابت ہوئیں۔ آخر ایک دن انہوں نے اس کو بلا کر پوچھا کہ بھائی تم جو ذکر و شغل کرتے ہو اس میں تمہاری نیت کیا ہے۔ کہنے لگا میری نیت یہ ہے کہ حق تعالیٰ میری اصلاح کر دیں تو میں دوسروں کی اصلاح کروں' مخلوق کو نفع پہنچاؤں' فرمایا کہ اب چور معلوم ہوا' تم پہلے ہی بڑے بننے کی فکر میں ہو اس لیے نفع نہیں ہوتا' اس خیال کو دل سے نکالو اور مخلوق کے نفع کو چولہے میں ڈالو۔ محض رضاء حق کی نیت رکھو اور تمام خیالات دل سے دور کرو۔ چنانچہ وہ شخص طالب تھا' نیت درست کر لی۔ اگلے ہی دن سے نفع شروع ہو گیا' خوب سمجھ لو۔ یہ حب ریاست بھی بڑا سد راہ ہے' لوگ ذکر شروع کر کے اگلے ہی دن سے پیر بننے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں ایسی مثال ہے جیسے لڑکا بلوغ سے پہلے ہی باپ بننا چاہے تو بجز اس کے کہ اپنی صحت کو خراب کرے گا اور کچھ نفع نہ ہوگا۔

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی　　تاراہ بین نباشی کے راہبر شوی
درمکتب حقائق پیش ادیب عشق　　ہاں اے پسر بکوش کہ رزوی پدر شوی

(اے بے خبر کوشش کر کہ تو خبردار ہو جائے جب تک تو راہ میں (راستہ دیکھنے والا) نہیں ہوگا تو اس وقت تک راہبر بھی نہیں بن سکتا' حقائق کے مدرسہ میں ادیب عشق کے سامنے اے لڑکے کوشش کر کہ کسی دن باپ یعنی مصلح بن جائے گا)

اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کبر کیسی مضر چیز ہے سالکین اپنے ان امراض کی اطلاع تو شیخ کو کرتے نہیں' ان کو تو بلی کی گوہ کی طرح چھپاتے ہیں کیونکہ ڈرتے ہیں کہ ان کا علاج کیا جائے گا اور وہ علاج ہم کو ناگوار ہوگا۔ جیسے حضرت شبلی نے اس مرید کا علاج کیا تھا کہ فی دھول ایک اخروٹ بانٹتے جاؤ اور دھولیں کھاتے جاؤ' پھر شیخ کی شکایت بیجا کرتے ہیں کہ ہم کو اتنے دن سر رگڑتے ہو گئے ہیں' نفع ہی نہیں ہوتا۔ کچھ توجہ ہی نہیں فرماتے۔ وہ توجہ کیا خاک کریں جب تک یہ متعفن مادہ مسہل کے ذریعے سے نہ نکالا جائے اس وقت تک توجہ بھی نفع نہیں دے سکتی۔ اطباء لکھتے ہیں کہ جب مزاج پر کسی خلط کا غلبہ ہوتا ہے تو دودھ مضر ہوتا ہے کیونکہ یہ لطیف غذا ہے جلد خلط غالب کی طرف مستحیل ہو جاتا ہے' دودھ کا نفع جب ہی ہوتا ہے جب کہ مزاج کا تنقیہ کر کے اعتدال پیدا کر لیا جائے۔ اسی طرح توجہ کا نفع رذائل کے تنقیہ کے بعد ہوتا ہے اور جن بزرگوں کے واقعات آپ نے سن رکھے ہیں کہ وہ اپنے پیر کی ایک توجہ سے کامیاب ہو گئے وہ ان رذائل سے پہلے ہی پاک ہو چکے ہیں' استعداد کامل موجود تھی' صرف دیا سلائی لگانے کی دیر تھی' توجہ دیا سلائی ہے۔ اس کا لگانا تھا کہ آگ بھڑک اٹھی' کام بن گیا' گیلی لکڑی میں ہزار دیا سلائیاں لگاؤ کبھی آگ جل کر نہ دے گی لیکن دھواں بہت اٹھے گا جس سے سارا گھر سیاہ اور پاس والے پریشان ہو جائیں گے' دھوئیں سے مراد جھوٹے دعوے ہیں۔ یعنی جس کا رذائل سے تنقیہ نہ ہوا ہو اس کو اگرچہ توجہ دی جائے اور اس سے کچھ کیفیات طاری ہونے لگیں تو وہ رات دن ڈینگیں ہانکتا پھرے گا کہ میں ایسا ہوں کہ میں ویسا ہوں بس اس کے سوا اور کچھ نفع نہ ہوگا اور اگر کسی میں یہ معاصی کبر و حب جاہ وغیرہ نہ بھی ہوں تو یہ لغو اور فضول باتیں بنانے کا مرض سب ہی میں ہے اس سے سارا کیا کرایا کام برباد ہو جاتا ہے تو یہ باتیں اگر معاصی میں داخل نہ ہوں مباحات ہی میں داخل ہوں مگر انکی تاثیر یہ ہے کہ نور قلب کو

بجھا دیتی ہیں، گو گناہ نہ ہوتا ہو، جیسے پانی اگرچہ فی نفسہ طاہر و مطہر ہے کپڑے کو صاف کر کے سفید بنا دیتا ہے لیکن آگ کو بجھا ہی دیتا ہے اس کی وجہ کیا ہے، وجہ صرف یہ ہے کہ آگ اور پانی کے مزاج میں اختلاف ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ مباحات گو فی نفسہ پاک ہوں، ان سے گناہ نہ ہوتا ہو مگر یہ نور جو قلب میں طاعات و ذکر سے پیدا ہوتا ہے یہ طاعات سے تو بڑھتا ہے لیکن فضول مباحات سے بجھ جاتا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ نور قلب کے مزاج کے لیے مباحات موافق نہیں آتے اس لیے سالک کو جس طرح معاصی سے اجتناب لازم ہے اسی طرح بعضے مباحات سے بچنا بھی ضروری ہے۔ (یعنی امور سے) باقی اس کی دلیل مشاہدہ اور تجربہ کے سوا کچھ نہیں۔ آزما کر دیکھ لیجئے کہ ایک دن آپ دس گھنٹے ذکر کریں اور دو گھنٹے فضول بک بک کریں اس روز دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور ایک دن صرف دو گھنٹے ذکر کریں اور لایعنی امور سے پرہیز کریں اس دن قلب کی کیا حالت ہوتی ہے دونوں دنوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ کسی نے سچ کہا ہے:

چشم بندولب بہ بندد گوش بند — گر نہ بینی نورحق برما بخند

(ظاہر میں چشم ولب اور کان کو بند کرو اس پر بھی اگر خدا کا نور نہ دیکھو تو مجھ پر ہنسنا)

لایعنی امور

اور لایعنی امور صرف باتوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جس طرح بعضے اقوال لایعنی ہوتے ہیں اسی طرح بعضے افعال لایعنی ہوتے ہیں بعضے اموال لایعنی ہوتے ہیں، سب کو ترک کرنا چاہیے، پس لایعنی کی تین قسمیں ہوئیں، اقوال، افعال، اموال فضول باتیں تو یہ ہیں کہ مجلس جما کر بیٹھ گئے اور ادھر ادھر کے قصے کہنے شروع کر دیئے۔ ایک کہتا ہے کہ متھرا میں پیڑے اچھے ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا کہ نہیں اناؤ میں اچھے پیڑے ہوتے ہیں، بھلا ان فضول باتوں میں کوئی نفع بھی نہیں ہے۔ سوائے وقت ضائع کرنے کے اناؤ کے پیڑوں پر مجھے ایک قصہ ہنسی کا یاد آیا کہ دو شخص لکھنؤ سے کان پور جانے کو ریل میں سوار ہوئے، راستہ میں اناؤ کا اسٹیشن آیا، وہ کہنے لگے یہاں کے پیڑے بہت مشہور ہیں، ایک تیسرا شخص بھی وہاں بیٹھا تھا، وہ بولا جی ہاں مشہور تو بہت ہیں مگر اب پہلے جیسے نہیں رہے، میں نے پیڑے خریدے ہیں ان کو چکھ لیجئے پھر خریدنے کا قصد کیجئے گا پھر دو پیڑے جو خریدے تھے پیش کر دیئے اس پر … دونوں میں

سے ایک صاحب نے چکھنے کے لیے ایک پیڑا اٹھالیا' اس شخص کو بہت ناگوار ہوا' اس نے دوسرا پیڑا دوسرے رفیق کے سامنے پیش کر دیا کہ اس کو آپ چکھ لیجئے۔ وہ کہتے تھے کہ اس بات سے مجھے ندامت ہوئی کہ سر اوپر کو نہ اٹھتا تھا' پھر وہ پیڑے والا کانپور اترا ہم نے اس شخص کو سواری کرایہ نہ کرنے دی اور اس کو بھی اپنے ساتھ سوار کرلیا کہ اسی طرح اس ندامت کا معاوضہ ہوجائے مگر پھر بھی اس سے طبیعت ایسی شرماتی رہی کہ اپنی یہ ساری خاطر تواضع خاک میں ملی جاتی تھی بعض دفعہ مجلسوں میں چاولوں کی قسمیں بیان ہوتی ہیں ایک کہتا ہے کہ دہرہ کے چاول اچھے ہوتے ہیں ایک کہتا ہے کہ پیلی بھیت کے عمدہ ہوتے ہیں غرض انہی فضولیات میں مجلسیں گرم رہتی ہیں' بعض لوگوں کو فضول سوالات کرنے کا مرض ہوتا ہے کہ ایسے سوالات کرتے ہیں جن کی عمر بھر بھی ضرورت پیش نہ آئے۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب ریل میں سوار ہوئے تھے' اسٹیشن پر کسی کام کو اتر کر چلے گئے' پیچھے کچھ جنٹلمین اسی گاڑی میں آ گھسے' یہ لوگ آزاد بے باک ہوتے ہی ہیں' انہوں نے مولوی صاحب کا اسباب تختہ سے پھینک دیا اور اپنا سامان رکھ دیا۔ جب وہ لوٹ کر آئے تو اسباب منتشر پایا' پوچھا کہ میرا اسباب کس نے پھینکا ہے' کوئی بڑا ہی نالائق ہے' لڑکوں نے اقرار کیا کہ حضرت یہ نالائق حرکت ہم سے ہوئی ہے انہوں نے ان کی خوب کوری کوری سنائی کہ تم لوگ بڑا تہذیب کا دعویٰ کرتے ہو مگر تم میں خاک تہذیب نہیں ہے' تم بڑے بے تہذیب ہو' لڑکے سب کچھ سنتے رہے اور بہت شرمندہ ہوئے' جب گاڑی چل پڑی اور مولوی صاحب بھی اطمینان سے بیٹھ گئے۔

شریعت کی توہین

تو اب ان لڑکوں کو شرارت سوجھی' انہوں نے مولوی صاحب سے بدلہ لینا چاہا کہ ان سے کوئی ایسا سوال کرنا چاہیے جس کا جواب ان سے نہ بن پڑے تاکہ یہ شرمندہ ہوں۔ چنانچہ ایک آگے بڑھا اور مولوی صاحب سے پوچھنے لگا کہ مولانا نماز کے وقت فرض ہے انہوں نے کہا کیا آپ کو اب تک اتنی خبر بھی نہیں' کہنے لگا جی ہاں ہم تو ایسے ہی جاہل ہیں' آپ بتلا دیجئے' انہوں نے بتلا دیا کہ پانچ وقت فرض ہے' کہنے لگا ہر زمانہ میں اور ہر شہر میں' انہوں نے کہا ہاں ہر حالت میں دن رات کی پانچ ہی نمازیں ہیں' کہنے لگا پھر جن مقامات میں چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینہ کی رات ہوتی ہے' کیا وہاں بھی پانچ ہی نمازیں فرض ہوں گی تو وہاں سال بھر میں پانچ نمازیں

ہوئیں۔ مولوی صاحب نے اس سوال کا بہت معقول جواب دیا' فرمایا کہ تم کو وہاں جانا ہے کہا نہیں' فرمایا کیا تم وہاں سے آئے ہو' کہا نہیں' فرمایا جب تم کو نہ وہاں جانا ہے نہ وہاں سے آئے ہو' پھر تم کو ایسی جگہ کے بارے میں سوال کرنا فضول ہے' کام کی باتیں پوچھو فضول وقت ضائع نہ کرو' جواب نہایت معقول تھا مگر ان کے مذاق کے موافق نہ تھا اس لیے ان کو قدر نہ ہوئی اور یہ سمجھ کر سب لڑکے ہنسنے لگے کہ ہم نے مولوی صاحب کو چپ کرادیا' وہ لڑکے تو ہنسے ہی تھے وہاں ایک صاحب پختہ عمر کے بھی بیٹھے تھے جو باوجود جنٹلمین ہونے کے پابند صوم وصلوٰۃ بھی تھے۔ وہ بھی ہنسنے لگے۔ مولانا احمد حسن صاحب امروہیؒ بھی اس گاڑی میں سوار تھے' وہ فرماتے تھے کہ مجھے اس شخص کے ہنسنے پر بڑا غصہ آیا کہ اس بیوقوف کو کیا ہوگیا کہ نماز کا پابند ہوکر ایک شرعی بات پر ہنستا ہے' میں نے اپنے جی میں کہا تجھے تو میں ٹھیک بناؤں گا' میں اس کے پاس گیا اور سلام کرکے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا کہ آپ کا نام کیا ہے مکان کہاں ہے' شغل معاش کیا ہے' معلوم ہوا کہ سرکاری ملازم ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے ذمہ سرکاری کام کتنے گھنٹہ روزانہ ہے' بولے چھ گھنٹے' میں نے کہا ہر موسم میں خواہ دن چھوٹا ہو یا بڑا کہنے لگے ہاں ہر موسم میں' میں نے کہا بھلا اگر گورنمنٹ کی حکومت اس علاقہ میں ہوجائے جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے اور گورنمنٹ آپ کو وہاں متعین کردے' کسی کام پر کیا وہاں بھی آپ دن بھر میں چھ گھنٹے کام کریں گے' اگر وہاں بھی یہی رہا تو یوں کہو کہ سال بھر میں صرف چھ گھنٹے ہی کام ہوگا۔ کہنے لگے کہ وہاں گھڑی گھنٹے سے حساب لگالیں گے۔ مولانا نے کہا کہ افسوس ہے کہ تمہارے ایمان اسلام پر' کہ یہی سوال ایک دین کے کام کے لیے کیا گیا تو یہ جواب وہاں آپ کو نہ سوجھا اور گورنمنٹ کے کام کے لیے فوراً عقل آ گئی کہ گھڑی گھنٹہ سے حساب لگالیں گے۔ صاحب تم اپنے ایمان کی خیر مناؤ کہ تم ایک عالم کے شرعی جواب پر ان بے باک لڑکوں کے ساتھ ہوکر ہنسے تم نے شریعت کی توہین کی تمہارا ایمان نہ کہیں سلب ہوگیا ہو' بے چارے پر نماز روزہ کا اتنا اثر تھا کہ اس کو ایمان سے محبت تھی' سلب ایمان کا لفظ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے' اور روتا ہوا مولانا کے قدموں میں گر پڑا کہ مولانا میں اس گناہ سے توبہ کرتا ہوں' واقعی مجھ سے خطا ہوئی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے بھی اس کا سر قدموں سے نہ اٹھایا کہ اچھا ہے اس متکبر کا دماغ تو درست ہو' دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا تو میں نے ان کو نصیحت کی کہ دین کی بات پر اس طرح نہ ہنسنا چاہیے جس سے مسئلہ

دین کی توہین لازم آجائے' مولانا کا جواب تو تقدیر تسلیم تھا کہ اگر بالفرض وہاں کوئی پہنچ جائے تو کیا کرے' ظاہر ہے کہ حساب لگا کر سال بھر کی نمازیں پڑھی جائیں گی لیکن تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے مقامات پر سردی اس قدر ہے کہ سمندر تک برف سے جمے ہوئے ہیں وہاں انسان کا زندہ رہنا ممکن نہیں اس لیے یہ سوال ہی سرے سے لغو ہے۔

لوگوں کی عادت

اسی طرح ایک شخص نے ایک بزرگ سے سوال کیا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں آپ کے نزدیک کون حق پر تھا' فرمایا تم کو اس سے کیا مطلب میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ قیامت میں تم سے اس کے متعلق کوئی سوال نہ ہوگا نہ ان کا مقدمہ فیصلہ کے لیے تمہارے پاس آئے گا اور اگر تم سے سوال ہوا تو تم اللہ تعالیٰ کے سامنے میرا نام لے دینا کہ میں نے اس سے سوال کیا تھا اس نے مجھ کو جواب نہیں دیا۔ واقعی خوب جواب دیا۔ اسی طرح آج کل یہ عادت ہے کہ جہاں کوئی مولوی باہر کا کسی شہر میں پہنچا اور لوگوں نے اس سے سوالات کرنا شروع کیے یہ بھی بہت برا مرض ہے کیونکہ پردیسی آدمی کو شہر کے واقعات پوری طرح معلوم نہیں ہوتے اور پوچھنے والے بوجہ جہل کے پوری بات بیان نہیں کرتے' وہ جتنی بات سنتا ہے اس کے موافق جواب دیتا ہے اس کو یہ لوگ فتویٰ قرار دے کر وہاں کے علماء سے الجھتے ہیں کہ تم نے تو یہ کہا تھا اور فلاں عالم یہ فرما گئے ہیں حالانکہ ممکن ہے کہ وہاں کے علماء کو واقعہ کی پوری تحقیق ہو جس کی بناء پر انہوں نے دوسرا جواب دیا ہو اسی لئے میری عادت ہے کہ سفر میں ایسے سوالات کے جواب نہیں دیا کرتا' کہہ دیتا ہوں کہ سوال کی پوری صورت حال لکھ کر ڈاک میں میرے پاس بھیج دینا' اطمینان سے جواب دوں گا اس کے بعد اگر وہ کسی سے الجھے گا تو جواب کے ساتھ لوگ اس کے سوال کو دیکھ لیں گے کہ اس نے سوال کس طرح کیا تھا اور زبانی سوال کے جواب میں لوگ صرف جواب کو نقل کر دیتے ہیں اپنے سوال کو پورا نقل نہیں کرتے کہ ہم نے سوال کس طرح کیا تھا ایک مرتبہ رام پور گیا تو وہاں ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ گیارہویں کرنا کیسا ہے میں سمجھ گیا کہ اس کا مقصود میرے مسلک پر عمل کرنا نہیں ہے بلکہ محض مجھے بدنام کرنا ہے کہ یہ وہابی ہے اس لیے میں نے

اس سے یہ سوال کیا تم عمل کے واسطے پوچھتے ہو یا امتحان کے واسطے اگر عمل کے واسطے پوچھتے ہو تو تم کو شہر کے علماء سے پوچھنا چاہیے جن کی دین داری اور تقویٰ کا تم کو تجربہ ہے مجھ سے تم واقف نہیں ہو۔ صرف آج ہی آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے ایک دن میں تم کو میری دیانت اور تقویٰ کا تجربہ نہیں ہوسکتا' میرے ساتھ کچھ دن رہو گے جب میری حالت سے واقف ہوگے اور اگر امتحان کے واسطے پوچھتے ہو تو تم کو میرا امتحان لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

مناظرہ کا شوق

جن لوگوں نے مجھ کو پڑھایا ہے وہ سہ ماہی اور ششماہی اور سالانہ امتحانات میرے لے چکے ہیں آپ سے میں نے کچھ پڑھا نہیں نہ پڑھنا چاہتا ہوں اس لیے آپ کو میرے امتحان کا کیا حق ہے بس اس جواب پر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں ان کے سامنے اپنا مسلک بیان کر دوں' پھر مجھ میں اور وہاں کے علماء میں مناظرہ ہو۔ سو میں ایسا روگ نہیں پالتا۔ بعض علماء کو مناظرہ کا شوق ہوتا ہے وہ جہاں جاتے ہیں مناظرہ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مناظرہ کے بعد بھی لوگ تو اسی حال پر رہتے ہیں جس پر پہلے سے تھے ہاں ان کا وقت اچھی طرح برباد ہوتا ہے آج کل مناظروں میں اظہار حق کا مطلوب ہوتا نہیں محض ہار اور جیت مدنظر ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر فریق اسی کوشش میں ہوتا ہے کہ جس طرح ہو سکے دوسرے کی ہر بات کو توڑا جائے۔ چاہے اس کے منہ سے ایک دو بات سچی نکل جائے مگر یہ اس کو بھی رد کرنا چاہتے ہیں ایک مرتبہ رام پور میں نواب صاحب نے قادیانیوں سے اہل حق کا مناظرہ کرایا تھا جب میں وہاں سے لوٹا تو لوگوں نے مجھ سے مناظرہ کا حال پوچھا' میں نے کہا کہ امیروں کو بازیوں کا شوق ہوتا ہے آج مرغ بازی ہو رہی ہے کل تیتر بازی' پرسوں بٹیر بازی' نواب صاحب کو مولوی بازی کا شوق ہوا تھا انہوں نے مناظرہ کرادیا کہ دو مولوی آپس میں کھڑے لڑ رہے تھے' نواب صاحب کو لطف آ رہا تھا۔ بس یہ حاصل تھا مناظرہ کا سو واقعی آج کل کے مناظروں کا یہی حال ہے۔ بچپن میں مجھے بھی اس کا شوق تھا مگر جتنا پہلے شوق تھا اب اتنی ہی نفرت ہے۔ آج کل مناظرہ میں تو تو میں میں اور پھبتیاں بہت ہوتی ہیں جس سے سوائے اپنے مقابل کو رنج دینے کے کچھ مقصود نہیں ہوتا' بات بات میں رسالے بازی ہوتی ہے جس میں طرز تحریر ایسا اختیار کیا جاتا ہے جس سے

مدمقابل کی خوب تحقیر وتوہین ہو۔ اسی لیے آج کل مناظرہ سے ضد اور عداوت بہت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے ایک رسالہ کسی کے جواب میں لکھا ہے مصنف رسالہ کے پیر کا نام مسکین شاہ تو مجیب نے اس کے پیر کے اوپر پھبتی کے طور سے یہ شعر لکھا ہے:

گربہ مسکین اگر پر داشتے تخم کنجشک از جہاں برداشتے

(بلی مسکین اگر پر رکھتی ہوتی تو چڑیوں کا بیج دنیا سے کھودیتی)

بھلا اظہار حق میں اس پھبتی کو کیا دخل تھا کچھ بھی نہیں محض فضول وقت ضائع کرتے ہیں جس سے نفع کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے اسی لیے آج کل کے مناظرے بھی میرے نزدیک لایعنی میں داخل ہیں (البتہ اگر کسی مسلمانوں کا دین برباد ہونے کا اندیشہ ہو اور ان کی ایمان کی حفاظت کیلئے مناظرہ کی ضرورت ہو وہ موقع اس سے مستثنیٰ ہے مگر ایسے مناظرے سو میں ایک دو ہوتے ہیں' اکثر تو محض شوقیہ ہوتے ہی ہیں ۱۲ جامع) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صاحبزادے حماد کو وصیت فرمائی تھی کہ علم کلام (مناظرہ) میں مشغول مت ہونا۔ انہوں نے کہا کہ آپ مجھ کو اس سے منع فرماتے ہیں مگر میں نے آپ کو خود مناظرہ کرتے دیکھا ہے' فرمایا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے جب ہم مناظرہ کرتے تھے تو ہم یہ چاہتے تھے کہ دوسروں کی زبان سے حق کی بات نکلے اور ہم اس کو تسلیم کرلیں تاکہ میرے بھائی کی بات اونچی رہے اور وہ حق راستہ پر چلے اور اب ہر فریق یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کی زبان سے غلط بات ہی نکلے تاکہ میں اس کو رد کرسکوں تو اس زمانہ میں ہر شخص اپنے بھائی مسلمان کے لیے گمراہی کی تمنا کرتا ہے اس لیے اب مناظرہ میں پڑنا ۔۔ رہے۔ سبحان اللہ کیسی عجیب بات فرمائی اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سلف صالحین کے مناظرہ میں اور آج کل کے مناظرہ میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے ان کو درحقیقت اظہار حق ہی مطلوب تھا وہ فضول وقت ضائع نہ کرتے تھے نہ ان کو اس سے عار تھی کہ کوئی ہم کو ناواقف کہہ دے گا۔ مولانا عبدالقیوم صاحب بھوپالی سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو آپ مسئلہ بتلادیتے اگر کوئی یہ پوچھتا کہ یہ مسئلہ کس حدیث سے ثابت ہے تو آپ فرمادیتے کہ بھائی میں نومسلم نہیں ہوں میرے آباؤ اجداد سب مسلمان تھے جس طرح میں نے اپنے باپ کو عمل کرتے دیکھا ہے اسی طرح میں نے کیا اور وہ اپنے باپ کو دیکھ کر عمل کرتے تھے اور وہ اپنے باپ سے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دوسرے کو دیکھ کر عمل کرتے آرہے ہیں اس لیے ہم

کوحدیث معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں جونومسلم ہوا سے حدیثیں معلوم کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے آباؤاجداد نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ عمل کر کے نہیں دکھلایا تو مولانا کے اس جواب کا منشاء صرف یہ تھا کہ تو تو میں میں کے اندر وقت ضائع نہ ہو کیونکہ جاہلوں کو اگر حدیث بتلا بھی دی جائے تو وہ یہ کیونکر سمجھ سکتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ کس طرح مستنبط ہوا اس لیے ایک عامی شخص کا یہ سوال کرنا فضول ہے اور فضول سوال کا جواب دینا بھی فضول ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جواب نہ دینے سے بعض لوگ اس کو ناواقف کہیں گے مگر سلف کو اس کی پرواہی نہ تھی کہ کوئی ہم کو کیا کہے گا وہ فضول باتوں پر پڑنے کو گوارا نہ کرتے تھے۔

علماء کی عادت

آج کل علماء کی عادت ہے کہ وہ سائل کے مذاق کا اتباع کرتے ہیں اور جہاں سے وہ دلیل طلب کرے اسی جگہ سے دلیل بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس سے بجائے نفع کے نقصان ہوتا ہے کیونکہ بعض سائل ایسے ہوتے ہیں جن کے دلائل عوام کی فہم سے باہر ہوتے ہیں اب اگر ان کو دلیل کا عادی کر دیا جائے گا وہ ان مسائل کو بھی بلا دلیل نہ مانیں گے اور دلیل سمجھ نہ سکیں گے اس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ عمل بھی نہ کریں گے تو یہ کتنا بڑا نقصان ہے بس اسلم طریقہ یہ ہے کہ لایعنی سوالات کا جواب نہ دیا جائے۔ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ ایک عورت کا شوہر اور بھائی چوروں کے ہاتھوں سے مارے گئے وہاں سے ایک فقیر کا گزر ہوا عورت کو روتا دیکھ کر رحم آیا اور عورت سے کہا کہ تم ان کے سر کو دھڑ سے جوڑ دو اور دعا میں کرتا ہوں' عورتوں نے سروں کو دھڑ سے جوڑ دیا مگر جلدی میں یہ غلطی کی کہ شوہر کا سر بھائی کے دھڑ پر لگا دیا اور بھائی کا سر شوہر کے دھڑ سے' فقیر نے دعا کی وہ دونوں زندہ ہو گئے' اب وہ عورت کس کے پاس رہے' میں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے۔ بھلا یہ بھی کوئی سوال ہے۔ جس کے سر نہ پاؤں اس کا طرز بتلا رہا ہے کہ کسی نے فرصت میں بیٹھ کر گھڑا ہے' علماء کو چاہیے کہ ایسی فرضی صورتوں کا جواب نہ دیا کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو آپ اول یہ سوال کرتے تھے کہ یہ واقعہ پیش آیا ہے یا ویسے ہی سوال کرتے ہو اگر وہ یہ کہتا کہ واقعہ پیش آیا ہے تب جواب دیتے ورنہ دھمکا دیا کرتے تھے۔ آج کل بہت لوگوں کو یہ مرض ہے کہ فضول سوالات کیا کرتے ہیں حتیٰ کہ خطوط میں بھی دنیوی امور کے متعلق ایسے سوالات ہوتے ہیں۔ تھانہ بھون میں ایک شخص ہیں ان کے ایک دوست کی عادت تھی کہ وہ ہر خط میں بہت سے بے ہودہ سوالات کیا کرتے تھے' مثلاً یہ کہ غلہ

کا بھاؤ کیا ہے دال کا نرخ کیا ہے بارش کیسی ہوئی کھیتیاں کیسی ہیں اور اس کے بہت سے سوالات ہر خط میں ہوتے تھے وہ بیچارے بعضی باتوں کا جواب دے دیتے اور بعضی باتوں کا جواب نہ دیتے تھے اگلے خط میں وہ اس پر مواخذہ کرتے کہ تم نے میری بہت سی باتوں کا جواب نہیں دیا اس کی کیا وجہ ہے جب وہ بے چارہ تنگ آ گیا تو اس نے بھی ایک خط میں سوا سو سوالات اسی قسم کے لکھے اس پر ان کا خط آیا کہ تم بڑے بیہودہ آدمی ہو فضول سوالات کرتے ہو اس نے لکھا حضور ایسے ہی سوالات آپ کے ہوتے ہیں جن سے میں تنگ ہوا کرتا تھا میں نے آپ کو دکھلایا ہے کہ فضول باتوں سے کیسی تکلیف ہوتی ہے جب ان کی وہ عادت بدلی۔ سو واقعی ایسے لوگوں کا ایسا ہی علاج ہونا چاہیے جب کوئی تم سے ایک فضول سوال کرے تم اس سے دو سوال ویسے ہی کرو۔

عربی کا احترام

مجھے تو اس سے بھی تکلیف ہوتی ہے کہ لوگ خط میں لکھ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں کو سلام پہنچا دیجئے بھلا خواہ مخواہ اپنے ایک دو پیسہ کی کفایت کے لیے دوسرے آدمی کو سلام پہنچانے کے لیے مزدور بنانا یہ کون سی آدمیت ہے اور خیر جہاں بے تکلفی ہو وہاں تو زیادہ مضائقہ نہیں مگر جس کو اپنا مربی بنایا جائے اس سے اپنا کام اس قسم کا لینا نری جہالت ہے صوفیاء نے تصریح کی ہے کہ شیخ کے خط میں کسی کو سلام نہ لکھنا چاہیے۔ اسی طرح ایک مرتبہ جب بخار کا زور ہوا تو لوگ خطوط میں مجھ سے تھانہ بھون کی حالت دریافت کرتے تھے کہ وہاں بیماروں کا کیا حال ہے میں اس کے جواب میں یہ شعر لکھ دیا کرتا تھا:

ماقصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر و دارا کے قصے نہیں پڑھے ہم سے سوائے مہر و وفا کے قصوں کے اور کوئی بات مت پوچھو)

اور واقعی مجھے بسا اوقات شہر کی حالت معلوم بھی نہیں ہوتی تھی نہ میں اس کی تحقیق کرتا ہوں کہ آج کتنی موتیں ہوئیں بعض لوگوں کو بیماری میں بھی مشغلہ ہوتا ہے کہ اموات کی شمار معلوم کرتے پھرتے ہیں اور مجلسوں میں بجائے خوف الٰہی کے تذکرہ کے یہی تذکرہ ہوتا ہے کہ آج اتنی موتیں ہوئیں کل اتنی موتیں ہوئی تھیں۔ یہ بھی ایک لایعنی مشغلہ ہے ایسے وقت میں انسان کو

طاعات میں مشغول ہونا چاہیے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرنی چاہیے نہ کہ دنیا بھر کے قصے لے بیٹھیں اور بیماری کے تذکرہ کو مشغلہ بنالیں۔ اسی طرح بعض لوگ خطوط میں خوابیں بہت لکھا کرتے ہیں اور ان کی تعبیر دریافت کرتے ہیں' میں اس کے جواب میں اکثر یہ شعر لکھ دیتا ہوں:

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(نہ شب ہوں نہ شب پرست کہ خواب کی تعبیر دوں' محبوب حقیقی کا غلام ہوں ان ہی کی باتیں بیان کرتا ہوں)

اور یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ بیداری کا حال لکھو اس کا جواب دوں گا' خوابوں سے کیا ہوتا ہے' ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ خط میں چند احوال بیداری کے لکھے جائیں اپنی امراض کی اصلاح دریافت کی جائے اور اگر کوئی عجیب خواب ہوا تو اس کا تذکرہ بھی کر دیا باقی سارے خط کا یہی حاصل ہونا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے وہ خواب دیکھا ہے یہ مجھ کو پسند نہیں اسی لیے میں خوابوں کی تعبیر بہت کم دیا کرتا ہوں' یہ تو فضول باتوں کا بیان تھا' لایعنی افعال کی تفصیل یہ ہے کہ بعض لوگ بلاوجہ فضول کاموں میں مشغول ہوتے ہیں' مثلاً ناول دیکھنا چھوٹے موٹے قصوں کا مطالعہ کرنا اس سے بے فائدہ وقت ضائع ہوتا ہے اس میں نہ کچھ دنیا کا نفع ہے نہ دین اس لیے کتابیں وہ دیکھنی چاہئیں جو دنیا یا دین کے لیے نافع ہوں۔

اہتمام اصلاح

بعض لوگوں کو اپنی اصلاح کا اہتمام ہوتا ہے دوسروں کے کاموں میں لگے رہتے ہیں کسی نے جو فرمائش کر دی اس کو پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں سو یاد رکھو کہ خدمت خلائق اگرچہ بہت اچھی چیز ہے مگر ہر کام کا ایک درجہ ہے سب سے مقدم انسان کے لیے اپنی اصلاح ہے اپنے کام سے جو وقت بچے اس میں مخلوق کی خدمت کا مضائقہ نہیں مگر اپنی حالت کی خبر نہ لینا اور دوسرے ہی کے کاموں میں سارا وقت گنوا دینا یہ خدمت کا ہیضہ ہے اس لیے الاھم فالاھم پر عمل کرنا چاہیے' بعض لوگوں کی یہ عادت کہ جہاں کوئی ان سے ملنے آ گیا بس اسی کو لے بیٹھتے ہیں۔ اس کی خاطر مدارت میں اپنے ضروری کاموں کا حرج کر دیتے ہیں ایسے لوگ ہمیشہ بے انتظام رہتے ہیں ان کا کوئی معمول پابندی سے ادا نہیں ہوتا' خاطر مدارت کے لیے دس پندرہ منٹ کافی ہیں اس کے بعد اپنے کاموں میں لگ جانا

چاہیے۔ اگر انسان میں انتظام کا سلیقہ ہو تو اس کو یہ باتیں خود بخود محسوس ہونے لگتی ہیں کہ کون سا کام مقدم ہے کون سا مؤخر ہے کس کی زیادہ ضرورت کس کی نہیں' اس لیے اپنے افعال کی نگہداشت لازمی ہے اس پر عمل کرنے سے سارے معمولات بخوبی ادا ہوتے رہیں گے۔
لایعنی اموال کی یہ صورت ہے کہ بعض لوگ ضرورت سے زیادہ مال حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک ذریعہ معاش تجارت کا اس قدر موجود ہے جس سے گزر خاصی طرح ہو رہا ہے مگر زیادہ مال کی حرص ہے اس لیے بڑے پیمانہ کا کارخانہ جاری کرنا چاہتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری عمر تحصیل مال ہی میں کٹ جاتی ہے' خدا کی طرف متوجہ ہونے کی توفیق نہیں ہوتی پھر غضب یہ کہ بڑا کارخانہ اگر ذاتی رقم سے کھولا ہے اس کا بھی چنداں مضائقہ نہیں بعض لوگ بلاوجہ قرض لے کر کارخانہ کھولتے ہیں اس میں جس قدر دقتیں اور پریشانیاں پیش آتی ہیں ان کا اندازہ وہ خود کر سکتے ہیں' بلاوجہ بلاضرورت قرض لینے کی بھی شریعت نے ممانعت کی ہے بعض لوگوں کو دوسروں کی امانتیں رکھنے کا شوق ہوا کرتا ہے کہ جس نے امانت رکھوائی اٹھا کر رکھ لی' بعض دفعہ اگر امانت ضائع ہو جاتی ہے تو اس شخص کو سخت پریشانی ہوتی ہے اگر ضمان نہ دے تو طبیعت نہیں مانتی' دوسرے شخص سے ندامت ہوتی ہے اور اگر ضمان دے تو اپنے دل پر گراں ہوتی ہے اتنی رقم میری بے فائدہ خرچ ہو رہی ہے اس لیے ہر شخص کو دوسروں کی امانتیں نہ رکھنی چاہئیں ہاں اگر کوئی بڑا منتظم ہو اور لوگوں کو اس پر ایسا اعتماد ہو کہ اگر وہ یہ کہہ دے کہ امانت ضائع ہوگئی ہے تو کسی کو اس پر خیانت کا وسوسہ بھی نہ آئے۔ ایسا شخص امانت رکھے تو مضائقہ نہیں بشرطیکہ امانت کی وجہ سے اس کو پریشانی لاحق نہ ہو ورنہ انسان کو ایسا کام ہرگز نہ کرنا چاہیے جس سے جمعیت قلب فوت ہو' غرض بے فائدہ باتیں فضول کام اور بے ضرورت مال کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے ہر قسم کے لایعنی امور سے احتراز کرنا چاہیے پھر دیکھئے دل میں کیسا نور اور اطمینان اور سکون رہے گا۔ اس دولت کے سامنے سلطنت بھی ہیچ معلوم ہوگی کیونکہ اصل راحت اسی کا نام ہے کہ دل کو چین و سکون ہو' بعض لوگ ایسے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں جن کا انجام ان کی قدرت سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ بجز پریشانی کے اور کچھ نہیں۔ چنانچہ آج کل اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے خلاصہ یہ کہ اس وقت مشائخ وغیرہ مشائخ علماء و عوام سب ہی اس مرض میں مبتلا ہیں کہ لایعنی امور سے احتراز کرتے اور اس وجہ سے دنیا و دین دونوں کا نقصان ہو رہا ہے۔

عورتوں کی عادت

بالخصوص یہ عورتیں کہ ان کو رات دن زیور اور کپڑے کے تذکرہ سے سوا اور کوئی کام ہی نہیں، پھر مصیبت یہ ہے کہ جس کے پاس زیور نہ ہو وہ تو دوسروں کے زیور کا ذکر کرتی رہتی ہیں اور جس کے پاس ہو وہ بھی چین سے نہیں بیٹھتی۔ اس کو اس کی تلاش رہتی ہے کہ اگر کسی کے پاس میرے زیور سے اچھا نمونہ ہو تو میں بھی اس کو تڑوا کر ویسا ہی بنواؤں چنانچہ جہاں کسی کا زیور پسند آیا اور اپنا زیور ان کے دل سے اترا اور انہوں نے فوراً فرمائش کی کہ اس کو تڑوا کر ویسا ہی بنایا جائے اس کی کچھ پروا نہیں ہوتی کہ ابھی ابھی اس کی بنوائی میں اتنے روپے گئے ہیں تڑوانے سے وہ سب لاگت ضائع ہو جائے گی اور دوسری لاگت الگ دینی پڑے گی مگر ان کی بلا پروا کرے جانتی ہیں شوہر کماوے گا اور لاوے گا ہم کیوں فکر کریں، بس ان کی تو اپنی فرمائش پوری ہونی چاہیے، شوہر کے ذمہ چاہیے کتنا ہی ہو جائے کپڑوں کی جمع کرنے کی بھرمار ہوتی ہے کہ صندوق بھرا ہوا ہے مگر کیا ممکن ہے کہ بزاز ان کے گھر کے سامنے سے خالی گزر جائے، غرض عورتوں کے اقوال وافعال واموال تو سراسر لایعنی ہیں ان کی فہرست گنانا تو گویا محال ہے۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(تمام جسم پر داغ ہی داغ ہیں پھایہ کہاں کہاں رکھا جائے)

خیر یہ مضمون تو ظاہر تھا جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اب میں ایک بات مختصر طور پر ایسی بیان کرنا چاہتا ہوں جو ذرا باریک بات ہے، جس کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔

اتباع شیخ

وہ یہ کہ بعض اوقات مشائخ طریق مریدین کو ایسے امور کا حکم دیتے ہیں جو بظاہر لایعنی معلوم ہوتے ہیں، جس سے ظاہر بین کو شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس حدیث کے خلاف کر رہے ہیں تو اس کی حقیقت سمجھنے کی ضرورت ہے پھر اس کے ساتھ جبکہ یہ بھی تاکید کی جاتی ہے کہ شیخ کی اطاعت کامل طور پر بجا لائیں تو یہ اشکال اور قوی ہو جاتا ہے۔ سو اول سمجھنا چاہیے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خلاف شریعت بھی اگر وہ امر کرے تو اطاعت کریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب وہ خلاف شرع نہ کرے بلکہ شریعت کے موافق حکم کرے اس میں اس کی اطاعت

بجالادیں لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ شیخ شریعت کے موافق امر کرتا ہے مگر مرید اس کو کم فہمی سے خلاف شرع سمجھ جاتا ہے اس لیے اس کا معیار یہ ہے کہ بیعت ہونے سے پہلے ہی اس کی حالت کا تجربہ کرلیا جائے جب تجربہ سے اس کا متقی اور کامل دیندار ہونا ثابت ہوجائے اور جتنی شرائط شیخ کامل کی ہیں وہ سب اس کے اندر معلوم ہوجائیں اس کے بعد بیعت ہوں پھر اس کے حکام میں پس وپیش نہ کریں کیونکہ شیخ کامل ہرگز شریعت کے خلاف امر نہیں کرسکتا اور خلاف شرع امر کے وہ شیخ کامل نہ ہوگا البتہ اگر اس کا موافق شرع ہونا سمجھ میں نہ آوے تو ادب کے ساتھ شیخ سے تحقیق کرلینا ضروری ہے اگر وہ نہ سمجھا سکا تو ادب کے ساتھ عذر کردے مگر گستاخی وسرتابی نہ کرے لیکن اگر بکثرت ایسا ہونے لگے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ کامل نہیں ہے لطف کے ساتھ اس کو چھوڑ دینا چاہیے اس تمہید کے بعد اب سمجھئے کہ بعض دفعہ شیخ کامل بعض مریدوں کو کسی اطاعت غیر واجبہ سے روک دیتا ہے مثلاً حکم دے دیا کہ تمام نوافل اور ذکر واذکار یک لخت موقوف کردو حالانکہ ان کا ترک لایعنی ہے اور بعض دفعہ بعض مباحات میں مشغول ہونے کا حکم دیتا ہے کہ خوب کھاؤ پیو، ہنسو، بولو، جنگل کی سیر کرو، تفریح طبائع کے لیے سفر کرو حالانکہ بظاہر یہ امور لایعنی ہوتے ہیں تو اس سے کم فہموں کو غلطی پیش آسکتی ہے کہ یہ عجیب شیخ ہے جو لایعنی امور کا حکم دیتا ہے اور مایعنی سے یعنی مفید کاموں سے منع کرتا ہے سو خوب سمجھ لو اس میں شیخ کی غلطی نہیں بلکہ تمہارے فہم کا قصور ہے اس کا راز یہ ہے کہ وہ اطاعت جو فی نفسہ مایعنی ہے اس مریض کے حق میں مایعنی نہیں ہے بلکہ کسی عارض کی وجہ سے مضر ہو رہی ہے اس لیے وہ اس کو ان خاص طاعات سے منع کررہا ہے۔ مثلاً شیخ دیکھتا ہے کہ اس مریض کو زیادہ نوافل اور ذکر وشغل کرنے سے عجب پیدا ہوگیا ہے یا اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگا ہے اس لیے وہ اس کو اذکار واشغال سے منع کردیتا ہے جیسے طبیب مریض کو کسی حلوے سے روک دیتا ہے حالانکہ اس میں میوہ جات پڑے ہوئے ہوتے ہیں مفرحات بھی اس میں موجود ہیں لیکن مریض کا معدہ کمزور ہے وہ اس کو ہضم نہیں کرسکتا، پس طبیب اس کو حلوے سے روک دیتا ہے اور کڑوی دوا پلاتا ہے کہ اس کے لیے کڑوی دوا ہی مفید ہے اسی طرح طاعات واذکار اگرچہ شیریں ہیں مگر بعض دفعہ ذاکر کا مزاج اس متحمل نہیں ہوتا بلکہ امراض کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے اس کو اذکار سے منع کرکے بعض مباحات میں

مشغول کیا جاتا ہے اس وقت طالب کو شیخ کا اتباع کرنا چاہیے اور ہمہ تن اپنے کو اس کے سپرد کر دینا چاہیے کہ وہ اس میں جو چاہے تصرف کرے اس کو مولانا فرماتے ہیں:

قال را بگذار مرد حال شو — پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ و حال پیدا کرو، حال پیدا کرنے کے لیے فرد کامل کے قدموں میں پڑ جاؤ)

چون گزیدی پیر میں تسلیم شو — ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو
صبر کن درکار خضر اے بے نفاق — تانگوید خضر رو ہذا فراق
گر خضر در بحر کشتی را شکست — صد درستی در شکست خضر ہست
آں پسر راکش خضر ببرید حلق — سرآں را در نیابد عام خلق

(جب تم پیر بنالو تو یاد رکھو کہ ہمہ تن تسلیم بن جانا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح زیر حکم حضرت خضر علیہ السلام چلنا یعنی مرشد کے افعال پر صبر وسکوت کرنا تا کہ خضر علیہ السلام یوں نہ کہہ دیں کہ جاؤ ہماری تمہاری جدائی ہے، اگر حضرت خضر علیہ السلام نے دریا میں کشتی کو توڑا تھا مگر واقع میں خضر علیہ السلام کے توڑنے میں سو درستی یعنی حفاظت تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے اس لڑکے کو قتل کر ڈالا تھا اس کا راز عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا)

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص حج کے واسطے شیخ سے اجازت لینے آیا مگر اس پر حج فرض نہیں یا فرض کو وہ ادا کر چکا ہے اب حج نفل کے لیے اجازت چاہتا ہے لیکن شیخ نے اس کو منع کر دیا ہے اس پر بعض لوگ متوحش ہوتے ہیں کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو حج جیسی طاعت سے منع کرتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ حج سے منع نہیں کرتا بلکہ تم کو معصیت اور کفر سے بچانا چاہتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ تم کمزور ہمت والے ہو صعوبت سفر اور مشقت طریق کا تحمل تم نہیں کر سکتے ایسی حالت میں اگر تم حج کرنے گئے تو اندیشہ ہے کہ ایک حج کے لیے پچاس نمازیں قضا کرو گے اور اگر زیادہ مشقت پیش آئی تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ تم کو حج ہی سے نفرت ہو جائے اور خدا کی طرف سے دل میں شکایت پیدا ہو جائے گی تو اس صورت میں حج کا ثواب تو کیا ملتا ایمان بھی مکہ ہی میں رہ جاتا اور فرض ادا ہی ہو چکا تھا تو خواہ مخواہ نفل کام کے لیے ایمان کو خطرہ میں ڈالنا یا کم از کم معاصی میں مبتلا ہونا کون سی عقل مندی ہے اس لیے وہ شیخ کامل ایسے شخص کے لیے یوں کہتا ہے:

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید　　　معشوق درین جاست بیائید بیائید

(اے لوگو! حج کے لیے کہاں جاتے ہو محبوب یہیں ہے ادھر آؤ' ادھر آؤ)

البتہ جس پر حج فرض ہو اس کو چلا جانا چاہیے اور مشقت سفر کے لیے دل کو یہ مضمون سمجھائے۔

اے دل آن بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی　　　بے زرو گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجان　　　شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل یہی بہتر ہے کہ عشق الٰہی میں مٹ جا' بے زر و مال کے حشمت اور دبدبہ میں قارون (دنیا داروں سے بہت بڑھ جا' لیلیٰ (مراد محبوب حقیقی) کے راستہ میں جان کو سینکڑوں خطرات ہیں اس راہ میں قدم رکھنے کی اول شرط یہ ہے کہ مجنوں بن جاؤ)

بات یہ ہے کہ حج میں تکلیف و مشقت اسی کو معلوم ہوتی ہے جس کو محبت نہ ہو ورنہ اہل محبت کو تو وہاں کی ہر کلفت کا لطف آتا ہے۔ آخر محبوبان مجازی کے وصال میں عشاق کیسی کیسی کلفتیں برداشت کرتے ہیں پھر کیا ان کو ان کلفتوں سے کچھ پریشانی ہوتی ہے ہرگز نہیں پس جس پر حج فرض ہو وہ اپنے دل کو یہ باتیں سمجھائے کہ عشاق ایک ادنیٰ سے محبوب کے لیے ہزاروں مشقتیں جھیلتے ہیں پھر تعجب ہے کہ میں محبوب حقیقی کے دربار میں پہنچنے سے ذرا سی کلفت کی وجہ سے رک جاؤں' اسی طرح دنیوی مقدمات کی کامیابی کے لیے اہل دنیا نہ گرمی کی پروا کرتے ہیں نہ سردی کی نہ بھوک کی پروا کرتے ہیں نہ پیاس۔ پھر حیرت ہے کہ میں مقدمہ آخرت کی کامیابی کے لیے ذرا سی تکلیف برداشت نہ کروں مجھے ہمت کر کے ضرور جانا چاہیے البتہ جس پر حج فرض نہ ہو یا وہ فرض ادا کر چکا ہے اس کو اگر شیخ منع کر دے تو اس سے یہی کہا جائے گا:

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید　　　معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(اے لوگو! حج کے لیے کہاں جاتے ہو محبوب یہیں ہے ادھر آؤ' ادھر آؤ)

اس کے لیے اس صورت میں حج سے زیادہ نفع صحبت شیخ میں ہوگا یہاں مرید کو شیخ کے ہاتھ میں اپنے آپ کو تسلیم کر دینا چاہیے۔

طریق تسلیم وتفویض

اس طریق میں تسلیم و تفویض بہت ضروری ہے بدون اس کے کام نہیں چل سکتا بشرطیکہ شیخ کوئی گناہ نہ کروائے' ہاں مباحات و مستحبات اس کی قلمرو ہیں ان میں وہ جس طرح چاہے

تصرف کرے اسے اختیار ہے اگر وہ کسی مستحب کام سے روک دے تو اس میں اس کی اطاعت لازم ہے کیونکہ وہ تم کو ایک مستحب سے روک کر اس سے افضل اور ضروری کام میں لگائے گا۔

اس راستہ میں نفس وشیطان کے مکائد بہت دقیق ہوتے ہیں، بعض دفعہ شیطان ایک مستحب کام کی رغبت دلاتا ہے مگر اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس میں مشغول ہوکر دوسرے اہم اور ضروری کام سے یہ رہ جائے گناہ کی رغبت تو سالک کو وہ اس لیے نہیں دلاتا کہ جانتا ہے کہ گناہ کا وسوسہ ڈالنے سے یہ فوراً سمجھ جائے گا کہ وسوسہ شیطانی ہے اور مستحب کام کی رغبت کو شیطانی وسوسہ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ ناواقف تو اس کو الہام رحمانی سمجھنے لگتا ہے مگر شیخ کامل سمجھ لیتا ہے کہ بعض دفعہ شیطان بھی مستحب کام کی رغبت دلایا کرتا ہے نہ اس لیے کہ وہ مستحبات سے خوش ہے یا سالک کا مستحبات میں مشغول ہونا اس کو پسند ہے بلکہ محض اس لیے کہ ایک ادنیٰ مستحب ہے اس کو مشغول کر کے اعلیٰ اور اہم کام سے روک دے چنانچہ ایک بار ایک طالب کے قلب پر تقاضا ہوا کہ فلاں جگہ چلو وہاں قتال ہو رہا ہے وہاں چل کر خدا کے راستہ میں جان دینا چاہیے وہ بے چارہ اس وقت تک خلوت نشین تھا، ذکر وشغل ومجاہدات میں مشغول تھا کہ دفعۃً ایک دن جہاد کا داعیہ قلب میں پیدا ہوا اب اس خطرہ کو شیطانی وسوسہ کوئی کہہ سکتا تھا، ظاہر میں تو بہت اچھا خیال تھا مگر وہ شخص چونکہ سچا طالب تھا اس لیے حق تعالیٰ نے دستگیری کی کہ اس نے اس خطرہ پر عمل نہیں کیا بلکہ حق تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھ کو اس خطرہ کی حقیقت سے مطلع کر دیا جائے۔ آخر الحاح وزاری کے بعد حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ خطرہ نفسانی ہے تمہارا نفس مجاہدات سے پریشان ہوگیا ہے اس لیے وہ تم کو جہاد کی رغبت دلاتا ہے کہ اس میں ایک دم سے خاتمہ ہوجائے گا۔ یہ روز کی مصیبت تو نہ رہے گی تو آپ نے نفس کی چال دیکھی وہ ان کو فرض سے فرض کفایہ میں مشغول کرنا چاہتا تھا کیونکہ جہاد کرنے والے اور بہت مسلمان موجود تھے ان کے ذمے فرض عین نہ تھا اور اصلاح نفس فرض عین ہے اور اس کی منشاء راحت طلبی تھی وہ چاہتا تھا کہ بس جہاد میں جا کر ایک دم سے فیصلہ ہوجائے یہ روز روز کی مشقت اور چکی پیسنا ختم ہوجائے۔ پس نفس وشیطان کے ان مکائد کو شیخ پہچان لیتا ہے اس لیے بعض دفعہ وہ مستحبات سے روک دیتا ہے جس سے اہل ظاہر متوحش ہوتے ہیں کیونکہ وہ حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ میرے ایک دوست نے ذکر وشغل بہت زیادہ کیا، دفعۃً ان کو شدید قبض طاری ہوا انہوں نے مجھے اطلاع کی میں نے کہا کہ سب کام چھوڑ دو اور خوب کھاؤ پیو، ہنسو، بولو، سیر وتفریح

میں مشغول ہو اور لکھنؤ جا کر سیر کرو یا کسی دوسری جگہ کا سفر کرو اس علاج سے ان کو بہت وحشت ہوئی کہ ذکر و شغل چھڑا کر اچھا کام بتلایا مگر باوجود حقیقت سمجھ میں نہ آنے کے انہوں نے اس پر عمل کیا، تین چار دن میں بسط قوی حاصل ہو گیا اور سارا قبض جاتا رہا، بڑے خوش ہوئے تو یہ بات تھی کہ کثرت مجاہدات سے نفس تھک گیا تھا جیسے بعض دفعہ روز روز مٹھائی کھانے سے جی اکتا جاتا ہے اس لیے تبدیل ذائقہ کی ضرورت تھی جیسے جب غذا ہضم نہ ہو تو کھانے کے ساتھ چٹنی کھا لیا کرتے ہیں چنانچہ جب نفس کو مجاہدات سے چھڑا کر سیر و تفریح میں مشغول کیا گیا ذائقہ بدل گیا تو وہ انقباض بھی جاتا رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راز کو خوب سمجھا ہے اسی لیے حدیث میں ہے جب رات کو نماز پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگے تو سو جاؤ پھر اٹھ کر کام کرنے لگو۔ "ولن یمل الله حتی تملوا" ہمارے حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سبق کا تکرار ایسے وقت ختم کرنا چاہیے جبکہ کچھ شوق ختم ہو جائے مثلاً بارہ دفعہ کہنے کا شوق ہو تو دس بار ہی کہہ کر ختم کر دو تاکہ آئندہ کے لیے شوق باقی رہے اس سے اکتا کر ختم نہ کرنا چاہیے۔ اس سے آئندہ کو ہمت ہار جاتی ہے اور اس کی ایک عجیب مثال بیان فرمائی۔ گویا معقول کو محسوس کر دیا فرمایا دیکھو چلتی پھراتے ہوئے کچھ ڈورا اس کے اوپر لپٹا ہوا چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اس ڈورے پر آسانی سے پھر لوٹ آوے اور اگر کبھی غلطی سے سارا ڈورا اتر جاتا ہے پھر دقت سے لوٹتی ہے۔ غرض اسی طرح اور بہت نظیریں ہیں جن میں شیخ مستحبات سے روک کر مباحات میں مشغول کرتا ہے مگر وہ مباحات ہی مالایعنی ہیں اور مستحبات اس شخص کے لیے لایعنی ہوتے ہیں باقی اس کے لیے قواعد ہیں یہ نہیں کہ جب چاہا جو چاہا حکم دے دیا، قواعد ضرور ہیں مگر وہ پاس رہنے والے کو بتلائے جائیں اور وہ ان سے کام لینے لگے۔

عدم مہارت فن

تو عدم مہارت فن کے سبب وہی قصہ ہوگا کہ ایک حکیم صاحب اپنے صاحبزادہ کو ساتھ لے کر ایک مریض کو دیکھنے گئے نبض دیکھ کر کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے آج آپ نے نارنگی کھائی ہے مریض نے اقرار کیا، لوٹتے ہوئے صاحبزادہ نے دریافت کیا کہ آپ کو نبض سے یہ کیوں کر پتہ چل گیا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ نبض سے تو کچھ اتنا معلوم ہوا تھا کہ اس نے کوئی چیز قاطع صفرا استعمال کی ہے پھر مجھے پلنگ کے نیچے سے نارنگی کے چھلکے نظر آئے، تو میں

سمجھ گیا کہ اس نے نارنگی کھائی ہے۔ بس اب صاحبزادہ کہاں تھے بڑے خوش ہوئے کہ ہم کو آج بڑا مسئلہ معلوم ہوا جب حکیم صاحب مر گئے اور صاحبزادہ کا دور دورہ ہوا تو کسی مریض کے یہاں بلائے گئے آپ کو تو وہ مسئلہ یاد ہی تھا' نبض دیکھ کر چارپائی کے نیچے نظر کی تو ایک نمدہ پڑا ہوا دیکھا' کہنے لگے کہ آپ نے آج نمدہ کھایا ہے لوگ اس پر ہنسنے لگے بیمار نے کہا بھلا نمدہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ جو میں کھالیتا تو آپ کہنے لگے کہ نبض سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آج نمدہ کھایا ہے اس نے ملازموں سے کہا کہ اس جاہل کو نکالو۔ اس کی دم میں نمدہ اسی طرح اناڑی آدمی کو اگر یہ قواعد بتائے جائیں گے وہ بھی ایک قاعدہ یاد کر کے سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکے گا' باقی محققین نے اس کے لیے اصول وقواعد بیان کئے ہیں اور محقق ان کو سمجھ کر استعمال بھی کرتا ہے اگرچہ ایسے لوگوں پر عوام نے طعن بھی بہت کئے ہیں مگر مشائخ پر طعن نہیں ہوسکتا وہ جو کچھ کرتے ہیں حقیقت سمجھ کر کرتے ہیں۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ جب ذکر سے طبیعت اکتا جائے تو اس ذاکر پر تھوڑی دیر ہنسنا بولنا بھی واجب ہے لوگوں نے اس مسئلہ کی وجہ سے امام پر بہت طعن کیا کہ دیکھو ہنسنے بولنے کو واجب کر دیا مگر محقق کا کلام محقق ہوتا ہے اس کا راز یہ تھا کہ اصل میں تو عمل واجب ہے اور بعض طبائع کی خصوصیت سے عمل موقوف ہوتا ہے۔ نشاط پر نشاط ہوتا ہے ہنسنے بولنے سے اور یہ مسلم ہے کہ **مقدمة الواجب واجب** پس اس میں کیا اشکال رہا۔ یہ مضمون طویل ہے لیکن وقت تنگ ہوگیا ہے اس لیے میں بیان کو ختم کرتا ہوں اور حدیث کا خلاصہ پھر بیان کیے دیتا ہوں کیونکہ خلاصہ بیان کر دینے سے مقصود محفوظ ہو جاتا ہے۔ حاصل اس ارشاد نبوی کا یہ ہے کہ فضول اور لغو باتیں اور کام چھوڑ دو اور فضول اسے کہتے ہیں جس کے چھوڑنے سے نہ دنیا کا ضرر ہو نہ آخرت کا اور اس کے کرنے میں نہ دنیا کا نفع ہو نہ آخرت کا' اب دعا کرو کہ حق تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں۔ آمین۔

وصلی اللّٰہ علی سیّدنا و مولانا محمّد وعلٰی اٰلہ واصحابہ اجمعین.

موانع الطریق کی تفصیل اوران سے بچنے کی تدابیر' حق تعالیٰ تک پہنچنے کا طریق۔

رفع الموانع

موانع طریق کی تفصیل کے متعلق یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ کو بھوپال سے آئے ہوئے چند مہمانوں کی خواہش پر بیٹھ کر فرمایا۔ ۱۵۰ کے قریب سامعین تھے۔ جن کی اکثریت صلحاء پر مشتمل تھی اور اہل علم کم تھے۔ مولوی محمد عبداللہ صاحب گنگوہی نے قلم بند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّم

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
مَآاَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِیْنُ اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّالَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ اَجْرٌ عَظِیْمٌ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَااسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْلَکُمْ وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ. (التغابن آیت نمبر ۱۱ تا ۱۸)

ترجمہ: (کوئی مصیبت بدوں حکم خداوندی نہیں پہنچتی اور جو شخص اللہ پر پورا ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے قلب کو صبر و رضا کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (خلاصہ

یہ کہ ہر امر میں) اللہ کا کہنا مانو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا مانو اور اگر تم (اطاعت سے) اعراض کرو گے (یاد رکھو) ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صاف صاف پہنچا دینا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر توکل رکھنا چاہیے۔ اے ایمان والو! تمہاری بعض بیبیاں اور اولاد تمہارے (دین کے) دشمن ہیں تم ان سے ہوشیار رہو اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کر جاؤ اور بخش دو تو اللہ تمہارے گناہوں کو بخشنے والا اور تمہارے حال پر رحم کرنے والا ہے' تمہارے مال اور اولاد تمہارے لیے آزمائش ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس اس کے لیے بڑا اجر ہے تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے احکام سنو اور مانو اور خرچ بھی کیا کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی فلاح پانے والے ہیں اور اگر تم اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح قرض دو گے اس کو تمہارے لیے بڑھاتا چلا جائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا قدردان اور بڑا بُردبار ہے پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے زبردست اور حکمت والا ہے)

تمہید: یہ سورۃ تغابن کا ایک پورا رکوع ہے ہر چند کہ آیتیں متعدد ہیں لیکن ان سب میں ایک جہت جامعہ ہے جس کی وجہ سے تمام آیتیں تلاوت کی گئیں اور گو بیان میں اختصار ہوگا لیکن بوجہ ارتباط آیات وجامعیت بیان کے اس مختصر ہی میں تمام آیتوں کے متعلق بیان ہو جائے گا اب میں پہلے وہ عنوان عرض کر دوں جس کی یہ آیتیں بمنزلہ شرح اور تفسیر کے ہیں تاکہ ان کو تمام بیان میں پیش نظر رکھا جائے اور اس سے یہ بھی اجمالاً معلوم ہوگا کہ آیات قرآنیہ میں کیسا ارتباط ہے لیکن یہ وقت اس مسئلہ پر مفصل گفتگو کرنے کا نہیں ہے اس لیے اگر اس کو بیان کیا جاوے گا تو اصل مضمون مقصود رہ جائے گا اس لیے اصل مضمون کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اس تمام رکوع کے اندر جہت جامعہ بمنزلہ عنوان کے ہے صرف ایک شے ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے ان آیتوں میں موانع طریق کو بیان فرمایا ہے یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ کے راستہ سے روکنے والی ہیں اور اللہ کی یاد سے غفلت میں ڈالنے والی ہیں یہ ان کی فہرست ہے لیکن صرف موانع کے بیان پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی مذکور ہے اور یہ حق تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ جہاں کسی مضرت کا وجود ہے وہاں اس کا دفع بھی موجود ہے اور اس حکمت کا ظہور تمام کائنات عالم پر ہوا ہے اور قرآن مجید میں تو خصوصیت کے ساتھ ہوا ہے کہ جہاں امراض کا ذکر ہے وہاں دوا بھی ہے اور جس جگہ معاصی کا بیان ہے وہاں اس کا علاج بھی ہے۔ حاصل آج کے بیان کا۔

خوشگوار اور نا گوارا امور

اس کے بعد سمجھئے کہ وہ موانع چند کلیات ہیں اور ان کی بے شمار جزئیات ہیں پھر ان کلیات کے لیے وہ کلی جامع ہیں اس طور سے یہ تمام مضمون باہم متناسق اور منتظم ہیں وہ موانع باوجود تعدد وتکثر کے جزئیات کے صرف دو امر کلی کے اندر منحصر ہیں یعنی صرف دو مانع ہیں اول ضرا یعنی وہ حالت کہ جس کا عروض انسان کو نا گوار ہے دوسرے سرا یعنی وہ کیفیت جس کا ظہور آدمی کو گوارا ہو لیکن یہ دونوں حالتیں مطلقاً مانع نہیں بلکہ قید افراط کے ساتھ یعنی ضراء میں وہ حالت جو زیادہ نا گوار ہے اور سراجہت میں وہ حال جو زیادہ گوارا ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ طریق جس کے موانع میں ہم کلام کر رہے ہیں اس سے مراد حق تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ ہے اور وہ کسی محسوس شے نہیں کہ کوئی بیٹا ہو یا سڑک ہو بلکہ حاصل اس کا شغل مع اللہ ہے اور شغل قلب کا فعل ہے جو کم و پیش ہر مومن کو حاصل ہے یہ تو حاصل ہوا طریق کا اب سمجھو کہ ہر شخص پر اکثر اوقات ان دو حالتوں یعنی سراء یا ضراء میں سے ایک نہ ایک حالت کا عروض علی سبیل التعاقب والتناوب ضرور رہتا ہے۔ بعض مرتبہ تو ادنیٰ درجہ ان حالتوں کا ہوتا ہے یعنی نا گواری اور خوشگواری کم درجہ کی ہوتی ہے کہ قلب کو اپنی اصلی حالت سے از جا رفتہ نہیں کرتی اور بعض مرتبہ زیادہ ہو جاتی ہے کہ قلب کو اپنی مشغول کر لیتی ہے اور اپنی اصل حقیقت سے دور کر دیتی ہے۔ بس یہ ہی حالت مانع طریق ہے باقی اس حالت کی کوئی ایسی تحدید کہ اس فلاں درجہ مانع ہے نہیں ہو سکتی بطور تشکیک کے حسب اختلاف قوت شغل مع اللہ کی ہر فرد کے اعتبار سے اس میں اختلاف ہوگا اور یہ شغل مع اللہ وہ چیز ہے کہ تمام شریعت جس کا ایک جز وطریقت بھی ہے اسی شغل میں اللہ کی شرح اور تفصیل ہے اور یہ جو میں نے کہا کہ جس کا ایک جزو طریقت بھی ہے اور طریقت کو شریعت پر عطف نہیں کیا تو کیا وجہ اس کی ہے کہ شریعت اور طریقت میں تباین بمعنی تنافی نہیں ہاں ایسا تباین کہا جا سکتا ہے جیسے کل میں اور اس کے اجزاء خارجیہ میں تباین ہوتا ہے کہ چھت کو یا دیوار کو بیت یا بیت کو چھت یا دیوار نہیں کہہ سکتے اور اجزاء ذہنیہ میں تو کل کا اس کے اجزاء پر اور اجزاء کا اپنے کل پر صادق آنا بھی ضروری ہے اس لیے میں تباین کے لفظ کو کہ موہم ہے چھوڑ کر یہ کہوں گا کہ شریعت اور طریقت اوڑ اور کہتے ہیں کہ شریعت

میں بہت سی چیزیں حرام ہیں اور طریقت میں حلال ہیں' کاش اس کا عکس کرتے تو اس سے تو اچھا تھا یعنی یہ کہتے کہ شریعت میں بہت سی چیزیں حلال ہیں اور طریقت میں حرام تو ہم اس کی یہ تاویل کر لیتے کہ مطلب ان کا یہ ہے کہ نرے فتوے پر مت رہو اس لیے کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کرنا منظور ہے اس لیے ہم کو بہت وہ چیزیں جن کو حق تعالیٰ نے شریعت میں بوجہ اپنے بندوں کے ضعف کے بطور رخصت کے جائز کر دی ہیں ان کے ساتھ ہم کو عملاً ناجائز کا سا برتاؤ رکھنا چاہیے تاکہ عزیمۃ پر عمل فوت نہ ہو لیکن اس کا تو نام و نشان نہیں بلکہ برعکس اس کے جو اعمال کہ شریعت میں حرام ہے ان کے نزدیک جائز ہے شراب پینا حرام ہے اور انکے نزدیک جائز ہے اور بہت سے صوفی ایسے بھی دیکھے گئے جو امرد پرستی کو سبب قرب کا جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود ان لوگوں کو دیکھا ہے کہ ایک ایک لڑکا ان کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کے جواز کے لیے ایک حدیث گھڑی ہے وہ یہ ہے "رایت ربی فی صورۃ ثباب امرد" (میں نے اپنے رب کو جواں مرد کی صورت میں دیکھا) اول تو یہ حدیث ہی نہیں' کسی کی گھڑت ہے اور اگر بالفرض ہو بھی تو توجیہ اس کی یہ ہوگی کہ مراد اس میں ایک تجلی مثالی ہے جو کہ مخصوص امرد ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ بزرگوں کو یہ تجلی مختلف صورتوں میں ہوئی ہے اور حاصل اس کا صرف مظہریت ہے یعنی ان کو ان صورتوں میں حق تعالیٰ کے علم قدرت وغیرہ صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اگر وہ اس حدیث سے قطع نظر کر کے کہیں کہ ہم امارد کو بحیثیت مظہریت ہی کے دیکھتے ہیں کہ اس میں بعض صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے سو ایسے مشاہدہ تو جس طرح امرد میں ہے اسی طرح بوڑھے میں بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ امرد بے ریش تو سبب قرب کا ہو اور سو برس کا بوڑھا یا ایک ماہ کا بچہ نہ ہو۔ بقراط کی حکایت شیخ سعدی شیرازی نے لکھی ہے کہ چلا جا رہا تھا ایک شخص کو دیکھا کہ پسینہ پسینہ اور بے خود ہو رہا ہے' پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے لوگوں نے کہا کہ یہ ایک بزرگ ہے اس نے ایک حسین لڑکے کو دیکھ لیا ہے اس میں حق تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کر رہا ہے' بقراط نے کہا کیا حق تعالیٰ نے صرف یہ ہی لڑکا ہی اپنی قدرت کے اظہار کے لیے پیدا کیا ہے اور کوئی نہیں' ایک دن کا بچہ بھی تو اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اس کو دیکھ کر اس کا حال متغیر نہ ہوا۔ حق تعالیٰ کی صنعت دیکھنے کے اندر تو دونوں برابر ہیں بلکہ طفل یک روزہ کے اندر بوجہ زیادہ عجیب ہونے کا قدرۃ کا ظہور زیادہ ہے یہ تو ایک حکیم یونانی کی حکایت ہے اس کو سن کر تو شاید لوگ رد کر دیں

کہ اس کی بات کا کیا اعتبار ہے لیکن شیخ سعدیؒ اس کی تصدیق کرتے ہیں اب تو کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ وہ تو سب کے نزدیک مسلم ہیں صوفی بھی ہیں اور حکیم بھی وہ فرماتے ہیں محقق ہماں بیند اندر ابل کہ درخوبرد یاں چین وچگل ۔یعنی جو شخص حقیقت بین ہے اور اونٹ میں بھی وہی دیکھتا ہے بلکہ اونٹ کے دیکھنے میں تو نفع محض ہے اور امرد کے دیکھنے میں فتنہ کا احتمال بھی غالب ہے اسی واسطے اونٹ کے دیکھنے کا امر بھی فرمایا ہے۔ارشار ہے: ''اَفَلاَ یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ'' (کیا وہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے پیدا کیا گیا) یہ نہیں فرمایا: ''اَفَلاَ یَنْظُرُوْنَ اِلَی الامارد کَیْفَ خلقوا'' (کیا وہ امردوں کونہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیے گئے)

کم علمی کی خرابی

یہ جہلا صوفیاء کفار قریش سے بھی بڑھ گئے ہیں اس لیے کہ انہوں نے قرآن شریف کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی آیت بقرآن ''غَیْرِ ھٰذا اَوْ بَدِّلْہُ'' یعنی اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن جس میں ہمارے معبودوں کی برائی نہ ہو لائیے یا اسی میں ترمیم کردیجئے جس کا جواب ارشاد ہوا ہے: ''قُلْ مَایَکُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِیْ'' یعنی میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں اس کو اپنی طرف سے بدل دوں جواب میں صرف تبدیل کی اس لیے نفی فرمائی کہ اس سے ہی تجدید کی نفی بھی ہوگی اس لیے کہ جب کہ ترمیم بھی اختیار میں نہیں ہے تو نیا قرآن لانا تو بطریق اولیٰ منتفی ہوگیا اور ان حضرات نے خود ہی ایک قرآن بنالیا کہ حق تعالیٰ تو فرماتے ہیں: ''اَفَلاَ یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ'' (کیا وہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیا گیا) اور یہ اپنے طرز عمل سے کہہ رہے ہیں: ''اَفَلاَ یَنْظُرُوْنَ اِلَی الامارد کَیْفَ خلقوا'' (کیا وہ لوگ امردوں کونہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیے گئے) انہوں نے تو صرف درخواست کی تھی مگر انہوں نے بدل کر دکھلا دیا۔گویا درپردہ قرآن مجید کا مقابلہ ہے کہ قرآن میں طریق قرب الٰہی کے مذکور نہیں ہیں ہم نے ایجاد کئے ہیں غرض قائل ہوئے تو اس کے ہوئے کہ طریقت میں بہت سی حرام چیزیں بھی حلال ہیں اور یہ مسلک نیا نہیں ہے پہلے بھی ان کے ہم خیال

لوگ ہوئے ہیں چنانچہ ایک فرقہ اباحیہ مشہور ہے کہ ان کے نزدیک ہر شے مباح ہے اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو اہل بدر کی شان میں وارد ہوئی ہے: "**اعملو ماشئتم فقد غفرت لکم**"[1] جو چاہو عمل کرو میں نے تمہارے لیے مغفرت کر دی۔ نیم ملا خطرہ ایمان کا مضمون ہے یہ ادھورے علم کی خرابی ہے حالانکہ خود اس حدیث کے اندر غور کرنے سے جواب ظاہر ہے۔ چنانچہ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ لفظ مغفرت فرمانا خود دال ہے گناہ ہونے پر اگر گناہ نہ ہوتا تو غفور [illegible] الحت یا احللت ہوتا۔ غرض کمالات میں کوئی مرتبہ ایسا نہیں ہے کہ اس پر پہنچ کر [illegible] سے ساقط ہو جاویں۔ الحاصل شریعت اور طریقت تنافی نہیں ہے اس لیے [illegible] ت کا شریعت پر عطف نہیں کیا۔ بہرحال تمام شریعت شرح ہے اسی شغل مع اللہ [illegible] ریق کار اور مانع کا حاصل ہوگا شغل الغیر یعنی قلب کو غیر حق کے ساتھ مشغول کر دینا [illegible] لیے۔ [illegible] لب ایسی چیز ہے کہ ایک وقت میں دو طرف اس کو توجہ تام نہیں ہوتی جب غیر کے [illegible] مشغول ہوگی تو اس سے لامحالہ حق تعالیٰ سے غفلت ہوگی۔

عبادت میں یکسوئی

اسی واسطے فلاسفہ نے کہا ہے: "**النفس لاتتوجه الی شیئین فی آن واحد**" اور یہاں سے ایک کام کی بات مستنبط ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اس کی شکایت کیا کرتے ہیں کہ ہم کو نماز میں وسوسے آتے ہیں اور اس کے مختلف علاج کرتے ہیں۔ چنانچہ مشائخ زمانہ تو اس کے لیے وظیفے بتلاتے ہیں کہ یہ وظیفہ پڑھو وسوسے نہ آئیں گے اور اس میں یہ قید لگا دی کہ جی لگا کہ پڑھنا۔ اس بے چارہ نے پڑھنا شروع کیا تو وسوسے وہاں بھی موجود پھر شیخ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت وسوے آتے ہیں انہوں نے اس کے لیے بھی ایک وظیفہ اور بتا دیا اب اس میں بھی وسوسے ہیں پھر اس کے لیے بھی تیسرا وظیفہ بتا دیا تسلسل محال لازم آ گیا اور ان حضرات نے یہ ثابت کر دیا کہ نماز میں جی لگنا اور وساوس کا قطع ہو جانا محال ہے اس لیے کہ تسلسل کو مستلزم ہے اور جو مستلزم محال کو ہو وہ خود محال ہے اب وہ بے چارہ پریشان ہو کر سمجھ جاتا ہے کہ بس جی نماز میں جی لگنا میرے لیے تو بہت مشکل

---

[1] السنن الکبریٰ للبیهقی ۹:۱۴۶، فتح الباری لابن حجر ۱۱:۴۷، کنز العمال: ۳۷۹۵۷

ہے اور وظیفے پڑھتا پڑھتا تھک جاتا ہے بعض مرتبہ انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ نماز بھی چھوڑ دیتا ہے۔ صاحبو! کوئی ان شیخ سے پوچھے کہ وظیفہ پڑھنے اور وساوس کے قطع ہونے میں کیا مناسبت ہے۔ آخر مرض اور دوا میں کوئی تناسب تو ہونا چاہیے' خوب سمجھو کہ وساوس کا حاصل شغل بالغیر ہے اس کا بجز اس کے کوئی علاج نہیں ہے کہ اپنے قصد اور اختیار سے خدا کے مشغول ہو' وساوس خود بخود منقطع ہو جائیں گے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص ٹکٹکی باندھ کر ایک شے کی طرف دیکھتا ہے اگر اس کی نگاہ بشراشرہ اس کی طرف ہے تو دوسری شے اس کو ہرگز نظر نہ آئے گی اور اگر اس میں کمی ہے تو آنکھ کی شعاعیں دوسری طرف بھی جائیں گی اور دوسری چیز بھی نظر آئے گی تو جس طرح ظاہر کی آنکھیں ہیں اسی طرح قلب کی بھی آنکھ ہے اگر قلب کو بتامہ شے واحد کی طرف متوجہ کر دیا جائے گا تو قلب کی شعاعیں دوسری طرف منتقل نہ ہوں گی پس کسی شے کا خیال نہ آئے گا اور اگر توجہ میں کمی ہے تو ضرور دوسری چیزیں بھی اس میں آئیں گی۔ پس علاج یہ ہے کہ جب وساوس آئیں فوراً توجہ الی الحق ہو جاؤ اور پھر اگر آئیں پھر اس توجہ کو تازہ کر لو لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ توجہ الی الحق کے انحاء مختلف ہیں جن پر توحید اور تمیہ کی شان غالب ہے تو ان کو براہ راست بلاواسطہ توجہ الی آنحضرت الحق حاصل ہو جاتی ہے' غائب کی طرف متوجہ ہونے میں ان کو کوئی شے مانع نہیں ہوتی اور جن کو یہ دولت حاصل نہیں ہے ان کے لیے توجہ الی الحق یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نام پاک کی طرف توجہ کرے اور نماز کے اندر خصوصیت کے ساتھ یہ طریق اختیار کریں کہ جو کچھ زبان سے کلمات ادا کریں اور جوارح سے جو افعال کریں ان کی طرف توجہ کریں اور اول ان کا قصد کر لیں اور ان کلمات اور افعال کی طرف توجہ کرنا توجہ الی الغیر نہ کہلائے گا اس لیے کہ وہ غیر ہے جو حق سے حاجب ہو اور جو موصل ہو اس کی طرف توجہ کرنا عین توجہ الی الحق ہے اور یہ طریق میرا ایجاد کیا ہوا نہیں بلکہ اسکی دلیل موجود ہے۔ دیکھو حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص دو رکعتیں پڑھے اور ان کی صفت یہ ہو کہ **مقبلاً علیھما بقلبہ** یعنی ان دو رکعتوں پر اپنے دل سے متوجہ ہو اب دیکھ لیجئے کہ رکعتیں کی حقیقت کیا ہے' رکعت نام ہے قیام قرأت رکوع سجود کا پس حاصل **مقبلاً علیھما** کے یہ ہوا **مقبلا علی القراءۃ والرکوع والسجود** پس عبادت کے اجزاء

خارجیہ اور ذکر اللہ کی طرف متوجہ ہونا مامور بہ اور مطلوب ہوا اور یہ ہی عین توجہ الی اللہ ہے اس لیے کہ موصل الی اللہ ہے۔ پس اس کو الی غیر الحق نہ کہیں گے اور جن کی چشم عبرت حق تعالیٰ نے کھول دی ہے ان کے لیے ہر شے موصل الی الحق ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(یعنی تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے' ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے' غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

پس جب نماز میں وسوسے آئیں ذکر کی طرف متوجہ ہو جاؤ' ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تسبیح اور قراءۃ یاد سے نہ پڑھو ارادہ سے پڑھو۔ مولانا اس کی مثال دیا کرتے تھے کہ میاں ہماری نماز تو ایسی ہے جیسے گھڑی کی جب اس کو کوک دیتے ہیں تو برابر چوبیس گھنٹے تک چلتی رہتی ہے اسی طرح ہم نماز جب شروع کرتے ہیں تو ہم کو کچھ خبر نہیں ہوتی' رکوع سجود قیام قراءۃ سب آپ سے آپ ادا ہوتے رہتے ہیں' نماز بھی ادا ہوتی ہے اور دکان اور بازار کے کام بھی ہوتے رہتے ہیں۔ جب سلام پھیرتے ہیں اس وقت خبر ہوتی کہ ہم نے نماز پڑھی ہے وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ ہم نماز محض یاد پر پڑھتے ہیں علاج میں کا یہ ہے کہ نماز یاد سے نہ پڑھو ارادہ سے پڑھو یعنی ہر فعل کرنے اور ہر کلمہ کہنے کے وقت مستقل ارادہ کرو اسی شان سے تمام نماز ختم کرو۔ دیکھیں کیسے وسوسے آتے ہیں البتہ نفس کو تھوڑی سی دشواری اور مشقت ضرور ہوگی کہ اس کو جو عادت تھی کہ شتر بے مہار کی طرح جہاں چاہتا تھا پھرتا تھا اس کو مقید کرنا پڑے گا۔ سو اتنی دشواری اور مشقت کوئی مشقت نہیں ہے' کیا آپ یہ چاہتے کہ نفس کو اتنی محنت بھی نہ کرنی پڑے۔ صاحبو! اگر جان بھی اس راہ میں جا کر کچھ مل جائے تو ارزاں ہے۔ ع متاع جان جانان جان دینے پر بھی سستی ہے اور یہاں جان دی بھی نہیں گئی بلکہ جان لی گئی ہے کہ ادھر ادھر جو نفس مارا مارا پھرتا ہے اس کو ایک جگہ آرام دینا ہے اگر اتنی مشقت بھی گوارا نہیں تو یہ احدی بننا ہے۔ واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے' باری باری سے ایک دن ایک لیٹا رہتا تھا اور دوسرا بیٹھا تھا ایک روز کا قصہ ہے کہ ایک سوار جا رہا تھا اس لیٹے ہوئے نے کہا کہ میاں سوار میرے سینہ پر جو یہ بیر رکھا ہے ذرا تکلیف کر کے یہ میرے منہ میں ڈال دو' اس سوار نے کہا کہ جو تیرے

پاس بیٹھا ہے یہ ڈال دے گا' وہ بیٹھا ہوا بولا کہ جناب بس رہنے دیجئے ایک روز میں لیٹا تھا اور میرے منہ میں کتا موت رہا تھا اس نے اس کو ہٹایا نہیں' میں اس کے منہ میں بیر ڈال دوں گا۔ اے صاحبو! خدا کی طلب کا دعویٰ اور پھر اس قدر سستی اور آرام طلبی آپ چاہتے ہیں کہ ہم کو اتنا بھی کام کرنا نہ پڑے مفت سفت مل جائے اتنا آسان طریق اور وہ بھی آپ نہ کریں تو بس نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ بزرگان دین یہ فرماتے ہیں:

صوفی نشود صافی تا درنہ کشند جامے　　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی جب تک مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے' پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

یہاں تو بسیار سفر بھی نہیں ہے نہایت ہلکا کام ہے غرض یہ طریقہ ہے نماز میں جی لگانے کا جو بطور تفریع کے یہاں بیان کیا گیا لیکن یہ طریقہ محض جاننے کے لیے نہیں ہے بلکہ عمل کرنے کے واسطے ہے' علوم اگر بہت سے حاصل کر لیے جائیں اور عمل نہ کیا تو وہ علوم کسی کام کے نہیں ہیں۔

علم کے عملی فوائد

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے جس شخص کو علوم بہت سے حاصل ہوں اور عمل نہ کرے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سپاہی ہو اس کے پاس بہت سے ہتھیار ہوں اس کو راہ میں دشمن ملے اور مقابل ہوا لیکن وہ ان اسلحہ کا استعمال نہیں کرتا تو کیا دشمن پر غالب ہوگا۔ یہ علوم بمنزلہ ہتھیاروں کے ہیں' شیطان کے دفع کرنے کے لیے ہتھیار بھی کیسے باالاُسنس کے مگر صرف ہتھیاروں کے لگانے سے خوش نہ ہونا چاہیے اکثر لوگ بزرگوں سے سن کر یا کتابیں دیکھ کر کچھ طریقے وصول الی اللہ یاد کر لیتے ہیں اور ان پر ان کو ناز ہے لیکن جب ان پر عمل ہی نہ کیا تو کیا فائدہ ایسے ہی لوگوں کے لیے ارشاد ہے: **"فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ"** (جو علم ان کو حاصل ہے اس سے بہت خوش ہیں) اگر کوئی خارش والا خارش کے بہت سے نسخے یاد کر لے تو اس سے کیا نفع جب تک کہ ان کو کوٹ پیس کر کام میں نہ لایا جائے۔ پس جب آپ کو یہ طریقہ نماز میں دل لگانے کا معلوم ہو گیا تو آج عصر ہی کے وقت سے اس پر عمل شروع کر دو۔ الحاصل یہ ایک تفریع مفید تھی اس پر کہ **"النفس لاتوجه الى شيئين فى آن واحد"** (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) اور مقصود مقام یہ ہے کہ شغل

مع غیر اللہ مانع طریق ہے پس اس رکوع میں ان موانع کی فہرست ہے اور وہ دو کلیوں میں منحصر ہے ایک وہ حالت جو بہت نا گوار ہو دوسری وہ کیفیت جو زیادہ گوارا ہو اس لیے جو شئے کم گوارا ہو وہ قلب کو مشغول نہیں کرتی۔ مثلاً آپ کچھ کام کر رہے ہیں عین مشغول حالت میں کسی مچھر نے کاٹ لیا یا عین کام کے وقت آپ نے ایک چنے کا دانہ اٹھا کر کھالیا۔ تو یہ دونوں حالتیں کام کی مانع نہ ہوگی۔ مانع وہ حالت ہے جو زیادہ نا گوار ہو یا وہ حالت جو زیادہ گوار ہو جو زیادہ نہ گوار ہو۔ وہ مصیبت کہلاتی ہے اور جو زیادہ گوار ہو وہ نعمت ہے پس قلب کو مشغول کرنے والی دو چیزیں ہوئیں مصیبت اور نعمت لیکن ان کی ذات مانع نہیں ہے بلکہ مانع اس وقت ہے جب کہ قلب ان سے متاثر ہو۔ پس مصیبت اور نعمت کا ہر درجہ مانع نہیں ہے یہاں سے ایک اشکال دفع ہوگیا' تقریر اشکال کی یہ ہے کہ جب نعمت اور مصیبت مانع ہیں تو مصائب تو صلحاء اور اولیاء وانبیاء پر بہت آئے ہی۔ چنانچہ ارشاد ہے: "اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالا مثل[1]" (بلاؤں میں سب سے زیادہ حضرات انبیاءؑ مبتلا ہوئے اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام پر دنیوی نعمتیں بھی بہت فائض ہوتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِنْ قَبْلِکَ وَجَعَلْنَالَھُمْ اَزْوَاجاً وَّذُرِّیَّۃً" (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور اولاد بھی دی) تو اگر مصیبت اور نعمت شاغل ہیں تو انبیاء کے لیے بھی شاغل ہوں گی۔ جواب یہ ہے کہ نعمت اور مصیبت کی ذات شاغل نہیں ہے بلکہ ان سے متاثر ہونا مانع ہے۔

محبت ورحمت

انبیاء علیہم السلام کو تاثر اس درجہ کا نہ ہوتا تھا کہ مصیبت اور ان کو خدائے تعالیٰ سے مشغول کردے یہ تو نہ تھا کہ ان کو مصیبت سے تالم اور نعمت سے تلذذ نہ ہوتا تھا بلکہ ان کو ہم سے بھی زیادہ ہوتا تھا لیکن خدا تعالیٰ کی یاد سے ان کو غفلت نہ ہوتی تھی ہم لوگوں کو ہو جاتی ہے اولاد کے ساتھ ان کو ہم سے زیادہ انس تھا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے حضرت حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بچے سے

---

[1] کنز العمال: ۳۲۵۳' اتحاف السادۃ المتقین ۵:۱۱۶

تھے' بڑے بڑے کرتے پہنے ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر سے دیکھا کہ الجھلے پلجھے گرتے پڑتے آ رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ چھوڑ کر ان کو اٹھا کر گود میں لے لیا اور یہ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: ''اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ'' (تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں) مجھ کو دیکھ کر صبر نہ آیا۔ ایک مرتبہ ایک رئیس نجد کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھتے تھے آپ حضرت حسن کو یا حسین کو پیار کر رہے تھے اس رئیس نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے تو دس بیٹے ہیں میں تو ایک کو بھی پیار نہیں کرتا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کیا کروں' اگر حق تعالیٰ نے تمہارے دل سے رحمت ہی نکال لی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے استغناء کو پسند نہیں فرمایا' آج اگر کوئی مولوی ملا منبر پر سے اتر کر کسی بچے کو لے لے تو لوگ بدنام کر دیں۔

شانِ بزرگان

میں اس وقت دیکھتا ہوں کہ جو چیزیں شریعت میں ناجائز ہیں لوگ اس کو بہ کثرت جائز سمجھتے ہیں اور جو جائز ہیں ان کو ناجائز سمجھتے ہیں وظیفہ پڑھنے کی حالت میں بولنا حرام سمجھتے ہیں۔ خواہ شرعاً کتنا ہی ضروری کام بولنے کا ہو لیکن بولتے نہیں اگر کوئی کچھ کہے گا تو ہوں ہوں کریں گے لیکن زبان سے بولنا حرام ہے' وظائف بہت پڑھتے ہیں لیکن لوگوں کو ستاتے ہیں' اپنی وجاہت سے دباؤ ڈال کر لوگوں سے کام لیتے ہیں' دعوتیں کھاتے ہیں اگر اس غریب کے ہاں کھانے کو بھی نہ ہو مناسب تو یہ ہے کہ ایسے غریب آدمی کی دعوت منظور بھی نہ کرے۔ اودھ میں ایک بزرگ تھے' کسی تعلق دار کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے' ایک غریب آدمی ان کا معتقد تھا اس نے عرض کیا کہ حضرت آج مسی کی روٹی میرے ہاں کھا لیجئے۔ ان بزرگ نے منظور فرمالیا وہ شخص پانچ روپے ماہوار کا نوکر تھا۔ وہ ایک مرغ لایا اور چاول وغیرہ خرید کئے' پانچ روپیہ ایک دن میں خرچ کر ڈالے' ان بزرگ کو خبر ہوئی اس کو بلایا اور فرمایا بھائی تم سے ہماری مسی روٹی کی ٹھہری تھی' یہ تکلفات تم نے کیوں کئے' اس نے کہا حضرت جی یونہی کہہ دیا کرتے ہیں' فرمایا کہ بھائی ہم نہ کھائیں گے' ہم کو مسی روٹی کھلاؤ گے تو کھائیں گے' یہ سب چیزیں ابھی واپس کر آئیں اور مسی روٹی پکوائی' لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ کا کیا حرج تھا کیوں واپس کرادی' فرمایا کہ بے چارے کی کل پانچ روپیہ تو تنخواہ ہے اگر آج ہی یہ صرف کر دیتا تو مہینہ بھر اس کے

بال بچے بھوکے رہتے' میری جان کو کوستے' شب کو وہ غریب حسب الحکم مسی روٹی لایا اتنا اس نے اضافہ کر دیا کہ گھی سے چپڑ دی اس پر شاہ صاحب نے کچھ انکار نہیں کیا' فرمایا جب ان تعلق دار صاحب کے یہاں دستر خوان پر قسم قسم کے کھانے آئے اور سب دوست احباب جمع ہو گئے لوگوں نے چاہا شاہ صاحب کو یہ روٹی نہ کھانے دیں اور عمدہ کھانا کھلا دیں' اول ایک نے کہنا شروع کیا کہ حضرت کچھ تبرک ہم کو بھی عطا ہو' دوسرا بولا کہ حضرت میرا بھی بہت جی چاہتا ہے' بزرگوں کو حق تعالیٰ نے فراست صحیحہ عطا فرمائی ہے سمجھ گئے یہ مل کر میری روٹی اڑانا چاہتے ہیں انہوں نے اس میں سے ایک روٹی دے کر فرمایا کہ اس کو بانٹ لو زیادہ کسی کو ایک ٹکڑا بھی نہ دوں گا' غرض انہوں نے وہی روٹی اس جگہ بیٹھ کر کھائی' بزرگوں کی یہ شان ہوتی ہے۔

آج کل کے بزرگ

آج کل کے بعضے بزرگ اور مولوی صاحب کھانے کے بزرگ اور مولوی ہیں۔ مولوی ہونا گویا اپاہج ہو جانا ہے' گھر کے کام کاج کو ہاتھ نہیں لگاتے اس لیے کہ حضرت بن گئے ہیں۔ اگر گھر کا سودا سلف خرید کر دیں گے تو ان کی بزرگی میں فرق آ جائے گا حالانکہ صحابہؓ کی شان یہ تھی ''لیوث النھار و رھبان اللیل'' یعنی دن کو اگر کوئی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دیکھتا تھا تو سمجھتا تھا کہ شیر ہیں اور رات کو راہب بن جاتے تھے کہ شب بیداری میں گزارتے تھے۔ اب تو یہ حالت ہے کہ ذرا کوئی تہجد پڑھنے لگے تو پیر بننے کے مدعی ہو جاتے ہیں اور اگر دو چار مرید ہو گئے تو وہ بنانا شروع کر دیتے ہیں اور کاروبار سے تو بالکل ہی معطل ہو جاتے ہیں اگر پیاس ہو تو پیاسے بیٹھے رہیں گے یہ نہیں کہ خود اُٹھ کر پانی پی لیں کہیں گے کوئی ہے یہ خدام حضرت جی حضرت جی کہہ کر مزاج بگاڑ دیتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

نفس ازبس مدحہا فرعون شد   کن ذلیل النفس ہونا لاتسد

(نفس بہت سی تعریفوں سے فرعون ہو گیا' ذلیل نفس بنو اور اس کی خودروی بند نہ کرو)

فی الواقع شہرت بہت بری بلا ہے دین کے لیے تو مضر ہے ہی دنیا میں بھی اس کی بہت آفات ہیں جیسے مولانا فرماتے ہیں:

خشمہا   وچشمہا   ورشکہا   برسرت ریز وچو آب آز مشکہا

یعنی لوگوں کے غصے اور چشم بد اور غبطے ورشک تیرے سر پر اس طرح برستے ہیں جیسے مشکوں سے پانی گرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑا بننا بہت مشکل ہے آج کل کے بزرگ شاہ صاحب نہیں؛ سیاہ صاحب ہیں۔ بزرگوں کی یہ شان ہوتی ہے جیسا ان بزرگ نے کیا کہ تمام سامان اس غریب کا واپس کرادیا اور دعوت میں مسی روٹی پکوائی اور باوجود اس کے کہ اودھ میں تہذیب بہت ہے کہ جس کو تعذیب کہنا مناسب ہے لیکن انہوں نے کچھ پروانہ کی اور وہی روٹی کھائی۔

تعظیم اور تہذیب

ہمارے ان قصبات میں الحمدللہ ایسی تہذیب نہیں ہے سادگی ہے برتاؤ میں' بات چیت میں ہر امر میں سادگی ہے' میرے پاس ایک گاؤں کا آدمی آیا کرتا تھا' سلسلہ میں داخل تھا' ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگا کہ ہمارے گاؤں میں ایک فقیر آیا کرتا ہے میں اس کا طالب ہوجاؤں میں نے اس کو دھمکایا اس لیے کہ وہ فقیر پابند شریعت نہ تھا' ایک مدت کے بعد میں نے پوچھا کہ اب کس کے طالب ہو' سادگی سے کہنے لگا کہ بس اب تو تیرا ہی پلہ پکڑ لیا ہے مجھے اسکی زبان سے یہ بات ایسی اچھی معلوم ہوئی کہ میں نے اس سے کئی مرتبہ یہ ہی بات کہلائی اودھ میں تو یہ بات ایسی ہے جیسے گولی ماردی اور تعظیم وتکریم کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی آ جائے تو نصف قامت کھڑے ہوجاتے ہیں جیسے میاں جی لڑکوں کو سزا دینے کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ اودھ تشریف لے گئے تھے۔ ایک رئیس نے اسی طرح تعظیم کی۔ مولانا نے انگوٹھا دکھادیا اس نے کچھ نذر پیش کی' مولانا نے منہ چڑادیا' یہ انکی اس تعظیم وتہذیب مفرط کا رد تھا اور اس قصہ میں یہ بھی ہے کہ جب وہ غریب مسی روٹی لایا اور ان امراء نے چاہا کہ شاہ صاحب کو یہ روٹی نہ کھانے دیں اور تہذیب کی وجہ سے یہ تو کہہ نہیں سکے کہ حضرت یہ روٹی نہ کھایئے بلکہ یہ کہا کہ حضور ہم بھی تبرک لیں گے تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں' بزرگ بھولے نہیں ہوتے ان کو اللہ تعالیٰ فراست اور عقل صحیح عطا فرماتے ہیں۔ انبیاء میں کوئی بھولا نہیں ہوا اگر ایسے ہوتے تو مفسدوں کے مکر اور ان کی چالوں سے کیسے واقف ہوتے ان کے دھوکہ میں آ جایا کرتے۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کی شان یہ تھی کہ قیصر کے ہاں جو یہاں کا ایک قاصد گیا تھا اس سے قیصر نے پوچھا کہ تمہارا خلیفہ کیسا ہے تو انہوں نے کہا کہ ان کی شان ہے "لا یخدع و لا یخدع" یعنی وہ نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہ کسی کے دھوکہ میں آتے ہیں۔ قیصر نے سن کر کہا کہ کسی کو دھوکہ نہ دینے سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے دیندار ہیں اور دھوکہ نہ کھانے سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے عاقل ہیں اور جس شخص کے اندر یہ دونوں صفتیں ہوں وہ کسی سے مغلوب نہ ہوگا۔ اسی طرح ان صاحب کی حقیقت سمجھ کر کہہ دیا کہ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ یہ روٹی مجھ کو نہ کھانے دو گے' سو یاد رکھو میں کسی کو نہ دوں گا اور وہ روٹی خود انہوں نے کھائی صرف ایک روٹی ان کی درخواست پر دے دی اور یہ جو اس قصہ میں ہے کہ لوگوں نے جب پوچھا کہ حضرت اس میں کیا مصلحت تھی کہ آپ نے سب سامان واپس کرا دیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم دیوانے ہوئے ہو' بیچارے کی پانچ روپیہ تو تنخواہ ہے اور وہ سب آج ہی اگر خرچ کر دیتا تو تمام مہینہ بے چارا تکلیف میں رہتا اور اس کے اہل وعیال کو ستے وہ اور بال بچے کہتے کہ اچھے بزرگ آئے تھے کہ صفایا ہی کر گئے' اس لیے مشائخ کو چاہیے کہ اپنے متوسلین اور احباب کی رعایت کریں ان کی وسعت سے زائد نذر قبول نہ کریں۔

طبعی راحت وکلفت

مگر اب ان اخلاق کو چھوڑ کر بزرگی اس میں رہ گئی ہے کہ وظیفہ میں بولنا ان کے نزدیک حرام ہے اگر بولیں گے تو وظیفہ ٹوٹ جائے گا ان کا وظیفہ کیا ہوا جولاہہ کا تاگا ہے۔ خدا جانے یہ مسئلہ کس نے تراشا ہے کہ وظیفہ میں بولنے سے وظیفہ ٹوٹ جاتا ہے' جس چیز کو خدا نے بولنے سے ٹوٹ جانے کو کہا ہے وہ تو ٹوٹ جاتی ہے جیسے نماز باقی کوئی شے نہیں ٹوٹتی۔ سو اب بزرگی اس کا نام رہ گیا ہے کہ جس شے میں تنگی کرنا چاہیے اس میں وسعت کرتے ہیں اور وسعت کی جگہ تنگی بڑا بزرگ وہ ہے کہ اگر گھر میں آگ بھی لگ جائے یا کوئی شخص مرتا ہو تو وظیفہ کو قطع کر کے اس کی مدد نہ کرے۔ یاد رکھو بزرگ وہ ہے جو قدم بقدم ہو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پس اولاد کے ساتھ انبیاء کو بہت محبت ہوتی ہے مگر وہ محبت ان کو حق تعالیٰ سے غافل نہیں کرتی۔ پس معلوم ہوا کہ نعمت اور مصیبت کی ذات مانع نہیں ہے بلکہ وہ درجہ مانع ہے افراط کے درجہ میں ہو اور خواص کو کوئی درجہ بھی نہیں ہوتا کیونکہ ان کو مصیبت میں زیادہ

ناگواری اورنعمت میں زیادہ گوارائی ہی نہیں ہوتی بخلاف عوام کے انکومصیبت اورنعمت جارفتہ کردیتی ہے اس مضمون کودوسرے عنوان سے سمجھوکہ انبیاءواولیاءکو بلااورنعمت سے راحت اور کلفت تو ہوتی ہے لیکن وہ راحت اور کلفت طبعی ہوتی ہے ان کواس میں مبالغہ اورانہماک نہیں ہوتا پس راحت اور کلفت کے دودرجے ہوئے اول طبعی دوسرا درجہ انہماک اور مبالغہ کا کہ بشر اشرہ اور باسرہ اس میں کھپ جائے اور دوسری طرف مطلق دھیان نہ ہو انبیاء واولیاء کوطبعی راحت اور طبعی کلفت ہوتی ہے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ کی وفات ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوا اور فرمایا" ان بفراقک یا ابراھیم لمحزونون"[1] (اے ابراہیم میں تمہارے فراق سے غمگین ہوں) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو جاری ہوئے بعض صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیا ہے۔ فرمایا: یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے قلب میں رکھی ہے اسی طرح حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو آتے دیکھ کر جوش محبت سے ان کو منبر سے اتر کر اٹھالیا لیکن یہ حزن اور محبت طبعی تھی جس کا ادراک خاصہ ہے طبع سلیم کا حال اگر کسی پر حال غالب ہوتو اس وقت یہ طبعی کلفت اورراحت بھی نہیں ہوتی لیکن انبیاء پر بوجہ ان کے علوی مقام کے حال غالب نہیں ہوتا وہ اس سے منزہ ہوتے ہیں وہ حالت پرخود غالب ہوتے ہیں' غلبہ حال اولیاء متوسطین پر ہوتا ہے جس میں ان کوراحت سے راحت اور کلفت سے کلفت نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض اولیاء اللہ کی اولاد کا انتقال ہوا۔ وہ ہنس دیئے لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسے لوگ بڑے کامل ہیں' کامل ہونے میں انکے شک نہیں ہاں اکمل نہیں ہیں اکمل وہ ہے کہ جس کی حالت جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہوکہ آنسو ٹپک رہے ہوں اور دل من کل الوجوہ اپنے مولا کی قضا پر راضی ہو۔ شاید کسی کو اشکال ہو کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے اس لیے میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں' دیکھو کسی شخص کے دنبل ہوجائے' سول سرجن کو دکھلایا اس نے کہا کہ یہ بغیر شگاف کے صاف نہ ہوگا' اب اس میں مریضوں کی مختلف حالت ہوتی ہے بعض دل کے کمزور ہوتے ہیں ان کو تو کلورافارم سونگھا کر بیہوش کر کے شگاف دیتے ہیں اس وقت اس مریض کو اس چیر پھاڑ کا کچھ الم محسوس نہیں ہوتا اس لیے کہ دوسری شے اس کے حواس پر غالب ہے۔ یہ مثال ان اولیاء اللہ کی ہے جن پر حال ایسا غالب ہوتا ہے کہ ان کو مصیبت کا الم محسوس نہیں ہوتا اور ایک قوی شخص

---

[1] جامع المسانید ۳: ۵۷۶

ہے کہ اس نے کہا کہ مجھ کو بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں' تم بشوق تمام اپنا کام کرو۔ ڈاکٹر نے وہ دنبل تراشا' تراشنے میں اس کو تکلیف بھی ہوگی اور آہ بھی زبان سے نکلے گی اور یاد رکھو یہ آہ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے تکلیف میں آہ سے بڑی راحت ہوتی ہے یہ آہ مصیبت کی مقلل ہے غرض اس زخم کے تراشنے کے وقت اس مریض کا منہ بھی بنجاوے گا لیکن وہ دل سے راضی ہے' کاٹنے والے سے ذرا بھی اس کے دل میں کدورت نہیں ہے۔ چنانچہ جب وہ زخم صاف ہو گیا تو جراح کہتا ہے لائیے انعام فوراً جیب سے نکال کر دس روپیہ اس کی نذر کئے اور اب وہ جھگڑ رہا ہے کہ حضور بہت کم ہے اور دیجئے اس نے دس روپیہ اور نکال کر دیئے۔ اب کوئی اس سے پوچھے کہ ایک تو اس نے مصیبت میں ڈالا پھر اس کو انعام دیا جاتا ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ وہ اس زخم پر راضی تھا۔ سو بظاہر یہاں بھی وہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اگر راضی تھا تو ناک منہ کیوں چڑھایا اور اگر ناراض تھا تو انعام کیوں دیا۔ وہ بھی جواب دے گا کہ کلفت طبعیہ کی وجہ سے تو ناک منہ چڑھایا اور دل سے راضی تھا کہ اس کا انجام بہتر ہے۔ یہ مثال عباد المکین کی ہے کہ ان کو مصیبت میں طبعی کلفت اور رنج ہوتا ہے اور دل چونکہ یقین رکھتا ہے کہ اس میں حکمت اور مصلحت میرے مولا کی ہے اس لیے راضی ہے اعتراض یا کدورت یا انقباض نام کو بھی نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ شخص بڑا قوی دل ہے کہ باوجود ہوش وحواس کے پھر از جارفتہ نہیں ہوا اور اپنے خیر خواہ معالج سے اس کو کچھ انقباض نہیں ہوا اگر جاہل اور نادان ہوتا تو ضرور اس کے مکدر ہو جاتا اور وہ شخص جس کو بیہوش کیا گیا ہے وہ درجہ میں اس سے کم ہے۔ سول سرجن جانتا ہے کہ اگر ہم اس کو بیہوش نہ کریں گے تو بہت شور مچاوے گا اور ہم کو کام نہ کرنے دے گا پس جن کو غلبہ حال کا کلورافارم سونگھا دیا گیا ہے وہ درجہ میں ان حضرات سے کم ہیں اور یہ امر بہت ظاہر ہے اس لیے شریعت نے رضا بالقضاء کا حکم کیا ہے۔ التذ اذ بالقضاء کا حکم نہیں کیا اور مشائخ کے کلام سے بھی اس کا ثبوت ہوتا ہے۔ چنانچہ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں۔ وگر تلخ بیندم درکشید (اگر تلخ دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں) معلوم ہوا کہ تلخی کا تو احساس ان کو ہوتا ہے لیکن اس سے راضی ہیں۔ قضا کے سامنے بولتے نہیں۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو مگر میرے لیے پسندیدہ ہے میں اپنے محبوب پر اپنی جان اور دل قربان کرتا ہوں جو میری جان کو رنج دینے والا ہے)

معلوم ہوتا ہے کہ دل رنجانی ہوتی ہے لیکن وہ خوش ہے بہرحال رضا بالقضاء کلفت طبیعہ کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے اور جن کو اس میں لذت ہوتی ہے کلفت نہیں ہے وہ صاحب کمال نہیں ہے۔

کامل کی شان

صاحب کمال کی پہچان یہ ہے کہ اس کا حال انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہو۔ دیکھو! حضرت یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کے فراق میں کیا حال ہوا کہ روتے روتے آنکھیں مبارک سفید ہوگئی تھیں جیسا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "یَااَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ وَابْیَضَّتْ عَیْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِیْمٌ" (کہا اے افسوس یوسف پر اور اس کی آنکھیں سفید ہوگئیں) جب بیٹوں نے یہ حال دیکھا تو کہا: "قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُتَذْكُرُ یُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْتَكُوْنَ مِنَ الْهَالِكِیْنَ" یعنی بیٹوں نے کہا کہ قسم اللہ کی (اے ابا) تم تو ہمیشہ یوسف ہی کو یاد کرتے رہو گے یہاں تک کہ سخت مریض ہو جاؤ گے یا بالکل ہلاک ہو جاؤ گے۔ یعقوب علیہ السلام نے سبحان اللہ کیا جواب ارشاد فرمایا ہے' فرماتے ہیں: "اِنَّمَآ اَشْكُوْبَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ" تو اپنے رنج و غم کا اپنے اللہ سے شکوہ کرتا ہوں اور میں اپنے اللہ کے یہاں کی وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ یہ وہی مضمون ہے ہم درتو گریزم۔ دیکھئے ماں جب بچے کو مارتی ہے تو وہ روتا ضرور ہے لیکن رو کر پھر ماں ہی کو لپٹ جاتا ہے۔ بس بڑا کمال ان اولیاء اللہ کا ہے کہ ان کو غم محسوس ہو اور از جا رفتہ نہ ہوں اور اس شخص کی کیا ہمت ہے کہ ادھر سے ان کو ایسی لذت دی گئی ہے کہ اس کے غلبہ میں سب بھول گئے اور جو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (میں اللہ کے یہاں کی وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) مطلب یہ ہے کہ بث اور حزن کا راز تم کو معلوم نہیں ہے وہ مجھ کو معلوم ہے یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ کاملین کی حالت کا انداز عوام اور ناقصین بلکہ متوسطین میں بھی نہیں کر سکتے۔ مولانا فرماتے ہیں:

کار پاکاں راقیاس خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے زابدال حق آگاہ شد
گفت اینک مابشرانیاں بشر — ماؤ ایشاں بستہ خوابیم وخور

(بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں یکساں ہیں جیسے شیر وشکر یکساں ہیں تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انہوں نے اللہ کے اولیاء کو پہچانا نہیں اور کہنے لگے کہ ہم بھی انسان ہیں وہ بھی انسان ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں)

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ کاملین بظاہر عوام مؤمنین کے مشابہ ہوتے ہیں ان میں کوئی امتیازی نشان نہیں ہوتا اس لیے ان کے مراتب کا ادراک ہر ایک کو نہیں ہوسکتا۔ظاہر حال ان کا اور عوام کا یکساں ہوتا ہے پھر کیسے کوئی پہچانے ہاں جو صاحب بصیرت ہے اس کو ادراک ہوتا ہے پس صورت عوام کا مشابہ اور حقیقت متفاوت جیسے کسی بزرگ نے حضرت حق سے ناز کر کے پوچھا تھا کہ اے اللہ فرعون نے ''اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى'' (میں تمہارا بلند مرتبہ رب ہوں) کہا اور منصور نے ''انا الحق'' (میں حق ہوں) کہا دونوں کا ایک ہی مدلول ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ایک مردود ہوا اور دوسرا مقبول۔ارشاد ہوا کہ فرعون نے ''اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى'' (میں تمہارا بلند مرتبہ رب ہوں) ہمارے مٹانے کو کہا تھا۔اس لیے ملعون ہوا اور منصور نے ''انا الحق'' (میں حق ہوں) اپنے مٹانے کو کہا۔اس لیے مقبول اسی مضمون کو مولانا فرماتے ہیں:

گفت فرعونے انا الحق گشت پست　　　گفت منصورے انا الحق گشت مست

لعنۃ اللہ ایں انا را در وفا　　　رحمۃ اللہ آں انا را در قفا

(فرعون نے انا الحق کہا مردود ہوا' حضرت منصورؒ نے انا الحق کہا مقبول ہوئے' وفا میں انا اللہ کی رحمت ہے اس انا کے پیچھے اللہ کی لعنت ہے)

منصور کے انا الحق کے معنی یہ تھے کہ انا کوئی شے نہیں جس کو انا کہا جاتا ہے وہ بھی حق ہے اور فرعون کے انا الحق کے معنی یہ ہیں کہ حق جس کو کہا جاتا ہے وہ انا (میں) ہی ہے سوائے میرے کوئی حق نہیں ہے۔ یہاں بھی صورت دونوں قول کی یکساں اور معنی متفاوت غرض انبیاء مغلوب نہیں ہوتے لیکن رضا میں کامل ہوتے ہیں اور مغلوب نہ ہونے کے سبب انبیاء کو مصیبت میں لذت نہیں ہوئی اور جن پر حال غالب تھا ان کو مصیبت میں کلفت محسوس ہوئی بلکہ لذت اور مزہ آیا اور تیسرا وہ عوام کا ہے کہ ان کو مصیبت میں الم اس قدر محسوس ہوتا ہے کہ

وہ اس میں کھپ جاتے ہیں اور دوسری جہت مقابل یا تو بالکل گم ہو جاتی ہے یا مغلوب ہو جاتی ہے اور بعضوں کی بلکہ اکثر کی زبان سے شکوہ اور شکایت بھی اپنے مولا کا نکلتا ہے عوام کی مصیبت ان کا جیل خانہ ہے اور خواص کے لیے زخم کا نشتر ہے عوام مصیبت میں اسی کا سبق لے کر بیٹھ جاتے ہیں جس کا کوئی حاصل نہیں۔ سو ایسا نہ کرنا چاہیے بلکہ مومن کو چاہیے کہ جو معالجات اور آداب ہر مرض اور ہر حال کے متعلق حق تعالیٰ نے ہم کو ارشاد فرمائے ہیں ان پر عملدرآمد کرے اس لیے کہ کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کا علاج ہم کو نہ بتلایا گیا ہو۔

درد ازیارست درماں نیز ہم   دل فدائے اوشد وجاں نیز ہم

(درد بھی محبوب کی طرف سے ہے اور علاج بھی محبوب کی طرف سے ہے، دل اور جان میری اس پر فدا ہے)

حقوق مصائب

اب دیکھنا چاہیے کہ مصیبت کے کیا حقوق ہم پر لازم کیے گئے ہیں سو ارشاد ہے: "اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" یعنی ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں۔ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" (ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں) لیکن یہ مراد نہیں ہے کہ صرف زبان سے انا للّٰہ الخ کا وظیفہ پڑھتے رہیں۔ حضرت اگر نرا وظیفہ پڑھنا مراد ہوتا اور کوئی مناسبت آپ کے حال سے ان کلمات کو نہ ہوتی تو رکوع میں **سبحان ربی العظیم** (پاک ہے میرا رب عظمت والا) اور سجدہ میں **سبحان ربی الاعلیٰ** (پاک ہے میرا رب برتری والا) کہنے کی خصوصیت نہ ہوتی، دونوں میں ایک قسم کا ذکر مشروع ہوتا۔ یہ ضروری ہے کہ **سبحان ربی العظیم** کو رکوع کی حالت سے مناسبت ہے اور **سبحان ربی الاعلیٰ** کو سجدہ کے ساتھ تعلق خاص ہے جن کی وجہ سے دونوں میں تفاوت ہوا اور وہ بظاہر یہ ہے کہ سجدہ میں پستی زیادہ ہے کہ اشرالاعضاء کو اخس الاشیاء کے ساتھ ملحق کر دیا ہے تو یہ حالت مقتضی ہے کہ حق تعالیٰ کی صفت زیادت علوم کو متحضر کیا جائے جو مدلول ہے افعل التفضیل کا کہ وہ پاک ذات سب سے برتر ہے اور رکوع میں بہ نسبت سجدہ کے پستی کم ہے اس لیے اس حالت میں نفس عظمت کا استحضار مناسب ہوا کہ صیغہ فعیل افعل کی طرح نہیں ہے معنی تفصیل

میں پس معلوم ہوا کہ نرا وظیفہ پڑھنا مراد نہیں ہے بلکہ دل سے اس کو سمجھ کر اس سے متاثر ہونا مقصود ہے۔ اسی واسطے ہر قول کی نسبت ارشاد ہے "قُلْ لَّهُمْ قَوْلاً بَلِيْغًا" کہ آپ ان کو ایسی بات فرمائیے کہ جو مؤثر ہو اور بات تو وہی ہے جس کا منشاء قلب ہو۔ جیسا شاعر کہتا ہے:

ان الكلام لفي الفواد وانما   جعل اللسان على الكلام دليلا

یعنی کلام تو دل میں ہے اور زبان تو کلام کی بری ترجمان ہے۔ بس قالوا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قالوا باللسان بلکہ یہ ہیں "قالوا من انفسهم" یعنی اپنے دل سے کہتے صرف زبان سے نہیں کہتے۔ آپ شاید اس کو سن کر یہ سمجھے ہوں گے کہ دل میں یہ وظیفہ پڑھ لیں گے۔ یعنی الفاظ کا خیال کر لیں۔ افسوس

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

قرآن کا اعجاز

یاد رکھو کہ نرا دل فعل بغیر سمجھے بھی کام کا نہیں حق تعالیٰ اس کی بھی شکایت فرماتے ہیں: "وَلَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا" یعنی ان کفار کے لیے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں۔ پس دل سے کہنا بے معنی تخیل و تصور الفاظ بھی کارآمد نہیں ہے بلکہ مضمون کا فہم شرط ہے۔ اس لیے ہم اس کی شرح بقدر ضرورت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت کہتے ہیں انا للہ یعنی دل سے اپنے یقین رکھتے ہیں کہ ہم اللہ کی ملک ہیں سبحان اللہ کیا تعلیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ امر ثابت ہے کہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں اور ملک اور قبضہ و تصرف کا کوئی حصہ ہمارا نہیں تو اگر مالک اپنی کسی شے کے اندر تغیر تبدل کرے اور اپنی ایک مملوک چیز کو اپنی دوسری مملوک چیز سے جدا کر دے تو یہ امر قابل اعتراض و مزاحمت نہیں ہے۔ دیکھئے اگر آپ کی ملک میں ایک الماری ہے اور اس میں کچھ کتابیں رکھی ہیں اگر آپ ان کتابوں کی ترتیب بدل دیں کہ ان میں ایک کتاب کو کسی دوسرے خانہ میں رکھ دیں تو وہ کتاب جس سے علیحدہ کیا ہے یہ نہیں کہہ سکتی کہ میری بہن کو علیحدہ کیوں کر دیا اور نہ کوئی اور کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کی جگہ کیوں بدل دی۔ پس اگر ہمارا مالک ہمارے کسی عزیز کو ہم سے علیحدہ کر کے دوسرے جہاں میں منتقل کر دے تو ہم کو کوئی حق نہیں ہے کہ چوں و چرا کریں۔ وہ مالک ہیں يتصرف فينا كيف

یشاء پس مومن کو چاہیے کہ ان کے معنی کو سمجھ کر تسلی حاصل کرلے اور واقعی اگر یہ مضمون قلب میں راسخ ہو جائے تو مادہ غم کو بیخ سے کاٹنے والا ہے اس کے ہوتے ہوئے رنج اور حسرت کا نام نشان نہیں رہ سکتا۔ دیکھئے یہ ہے تعلیم اسلامی کہ بقراط اور سقراط اور جہاں بھر کے فلاسفہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اگر کوئی مدعی ہو تو بتلائے کہ اس کے سوا کون سی تدبیر ہے کہ جس سے انسان کو تسلی حاصل ہو اور گو اس قدر جملہ بھی مصیبت کا اثر دور کرنے کے لیے کافی تھا لیکن یہ اس شخص کے لیے ہے کہ توحید کے اندر اس کا قدم راسخ اور اعتقاد کے ساتھ حال بھی میسر ہو اور جو اس مرتبہ کا نہ ہو اس کے دل میں خیال گزر سکتا ہے کہ اس پر تو ہمارا ایمان ہے کہ ہم سب اللہ کے ہیں اور نہ ہم کو حق چوں و چرا کا ہے لیکن چونکہ ہمارا بیٹا یا عزیز ہم سے جدا ہو گیا ہے اس کا رنج ہمارے دل کو پاش پاش کر رہا ہے اور اس کی مفارقت دائمی ہم کو ستا رہی ہے اس کا کیا علاج اس لیے اس پر ''وانا الیه راجعون'' بھی بڑھا دیا گیا ہے یعنی ہم سب اسی کی طرف جانے والے ہیں۔ مطلب ہے کہ اگر تم کو بہت ہی بے قراری ہے اور وہ وہی شے تمہارا مطلوب ہے اور اس کے بغیر تم کو چین نہیں آتا تو تم اپنے نفس سے کہو کہ ہم سب اسی طرف جانے والے ہیں وہاں سب ایک دوسرے سے مل لیں گے اور حیات دنیوی کا زمانہ وہاں رہنے کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں اب گزر جائے گا جب یہ مضمون پیش نظر ہوگا اور یقین کامل اس کا ہو جائے گا تو پوری تسلی اور راحت اس کو حاصل ہو جائے گی۔ یہ ہے قرآن کا اعجاز معنوی ہیں اور یہ ہیں اس کی تعلیمات آج کوئی دکھلائے تو کہ ایسی تعلیم کہاں ہے اور تمام تعلیم یافتہ اور فلاسفر جمع ہو کر بتلائیں کہ اس کے سوا کون سا طریقہ ہے تسلی کا اور کچھ اسی باب میں یہ تعلیم نادر نہیں بلکہ قرآن وحدیث کی تمام تعلیمات ایسی ہی ہیں وللہ الحمد میں بقسم کہتا ہوں کہ جس کا قرآن وحدیث پر ایمان نہیں ہے یا ایمان میں ضعف ہے اس کی راحت اور تسلی کا کوئی طریقہ ہی نہیں اور قرآن مجید کی ہر ہر تعلیم اور ہر ہر ادا ایسی ہے کہ بے اختیار یہ شعر یاد آتا ہے:

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(سر سے پیر تک جس طرف نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے یعنی اس کا وہ حسن ہے کہ ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے)

یہ حق ہے مصیبت کا کہ جو ہم کو تعلیم کیا گیا ہے اس حق کے ادا کرنے والے کو نا گواری رہ ہی نہیں سکتی۔ دیکھو اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں عزیز حیدرآباد کا وزیر اعظم ہو گیا ہے کہ ہم بجائے اس کے کہ اس کی جدائی کا رنج ہو خوشی ہوگی اور شوق ہوگا کہ کسی طرح ہم بھی وہاں پہنچیں اسی طرح معتقد آخرۃ کو وہاں جانے کا شوق ہونا چاہیے اور جو وہاں پہنچ گئے ہیں ان پر خوش ہونا چاہیے کہ اچھا ہوا کہ دنیا کے قید خانہ سے ان کو رہائی ہوئی۔ بعضے بزرگوں پر اس درجہ یہاں کے چھوٹنے کا شوق ہوا ہے انہوں اس کی تمنا کی ہے چنانچہ بعض ان میں سے کہتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویران بروم　　راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تادر میکدہ شادان و غزل خواں بروم

(وہ دن بہت اچھا ہوگا کہ اس ویرانہ مکان یعنی دنیا سے جاؤں جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے دیدار کے لیے چلا جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش و خرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

میکدہ اصطلاحی لفظ ہے اس سے مراد مقام قرب ہوتا ہے اور بعض مرتبہ میکدہ سے راہ محبت وعشق اور کعبہ سے طریق زہد و عبادت بھی مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

از مدرسہ بکعبہ روم یا بمیکدہ　　اے پیر رہ بگو کہ طریق صواب چیست

(مدرسہ سے طریق زہد اختیار کروں یا طریق عشق اے پیر راہ بتلا کہ کون سا طریق مناسب ہے)

غرض اس مضمون کو سمجھنے کے بعد غم بالکل جاتا رہے گا اور اگر اب بھی رہے تو سمجھ لو کہ اس مضمون کا اس کو یقین ہی نہیں ہوا اور وہ غم کے اندر اپنی عمر فضول ضائع کر رہا ہے جس سے کوئی حاصل نہیں۔ اس لیے کہ وہ محبوب سے ملے گا تو ہے نہیں جیسا عرفی کا شعر ہے:

عرفی اگر بگریہ بمیسر شدے وصال　　صد سال می تواں بتمنا گریستن

(عرفی اگر رونے سے وصال محبوب میسر آ جائے تو میں سو برس تک اس کی تمنا میں رو سکتا ہوں)

محبت کا تقاضا

صاحبو! اگر آپ کا محبوب کوئی آپ کی چیز لے لے تو وہ محبوب اگر آپ کا محبوب ہے تو آپ کچھ بھی چوں و چرا نہیں کریں گے بلکہ خوش ہوں گے اور اگر چوں و چرا کرو تو معلوم

ہوا کہ وہ محبوب آپ کو محبوب نہیں بلکہ وہ شے محبوب ہے بلکہ محبت کا مقتضی تو یہ تھا کہ آپ روویں بھی نہیں مگر اس پر یہ شبہ آپ کریں گے کہ انبیاء بھی تو مصیبت میں روئے ہیں جیسا کہ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا صاحبزادہ کے انتقال پر مذکور ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے رونے اور ان حضرات کے رونے میں زمین وآسمان کا فرق ہے ہم تو محض اس شے کی یاد میں روتے ہیں اور وہ حضرت دیکھتے ہیں کہ اس وقت حضرت حق کو ہمارا رونا ہی مطلوب ہے کہ دلیل افتقار ہے اس لیے روتے ہیں سو آپ کو بھی رونے کی اجازت ہے اس محبوب شے کا لے لینا خود دلیل ہے اس کی کہ محبوب حقیقی کو مصلحت کے لیے تمہارا رولانا بھی منظور ہے سو روؤ لیکن حدود کی رعایت رکھو کہ اس محبوب شے کو محبوب حقیقی سے مت بڑھاؤ کہ اس کا ہی وظیفہ کرلو بس رو رلا کر پھر محبوب حقیقی کی یاد میں مشغول ہو جاؤ' اگر بالکل نہ روئے تو بھی آپ نے اس مصیبت کے راز کو نہ سمجھا اور اگر ساری عمر روتے رہے اور اسی کو لے تو مالک حقیقی آپ کا محبوب نہ ہوا۔ خدا کے سامنے روؤ' اس کے دھلانے کو روؤ تا کہ افتقار اور عجز تمہارا ظاہر ہوا' خدا سے دوسروں کے سامنے روؤ' جو اس راز کو سمجھ گئے ہیں وہ روئے بھی ہیں۔ مولانا رومی فرماتے ہیں:

کیں تضرع رابرحق قدرہاست کان بہا کا نجاست زاری راکجاست
گر تو خواہی کزبلا جاں و آخری جان خودر او تضرع آوری
اے خوشا چشمے کہ آن گریاں اوست اے خوشا آں دل کہ آن بریان اوست

(اس گریہ وزاری کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت قدر ہے جو قیمت اس کی دربار خداوندی میں ہے وہ گریہ وزاری کہاں ہے۔ اگر بلا سے چھٹکارا چاہتے ہو تو اپنی جان کو گریہ وزاری میں لاؤ' وہ آنکھ بہت اچھی ہے جو محبوب کی جدائی میں رونے والی ہے اور وہ دل بہت اچھا ہے جو محبوب کی محبت میں بریاں ہے)

پس جو مصیبت میں اس کے رلانے سے روتے ہیں وہ بھی گریاں اوست میں داخل ہیں رونا اور مصیبت دونوں بڑی نعمت ہیں کہ اس میں بندہ کا افتقار ظاہر ہوتا ہے پس جو نہ روئے اور ضبط کر کے پتھر سا بنا رہے اس نے مراد حق کو پورا نہ کیا۔ حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ

تعالیٰ عنہ بیمار ہوئے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیسی طبیعت ہے' فرمایا اچھی نہیں بیمار ہوں۔ کسی نے پوچھا حضرت آپ تو بڑے عارف ہیں جزع فزع کرتے ہیں' فرمایا کہ دیوانے ہو گیا' میں اپنے خدا کے سامنے بہادر بنوں کہ وہ تو میرا ضعف ظاہر کریں اور میں قوت ظاہر کروں۔ ایک بزرگ رو رہے تھے کسی نے پوچھا آپ کیوں رو رہے ہیں' فرمایا کہ بھوک لگ رہی ہے اس شخص نے کہا حضرت آپ بھوک میں روتے ہیں' فرمایا کہ محبوب حقیقی جب ہمارے رونے ہی کو بھوک لگا دیں تو ہم کیوں نہ رو دیں مگر ایسا رونا نہیں جس رونے کی مشق عورتوں کو ہوتی ہے جب کہیں تعزیت وغیرہ میں جاتی ہیں تو ڈولی گاڑی میں اچھی خاصی ہوتی ہیں اور اس سے اترتے ہی ہو ہو کرنا شروع کر دیتی ہیں' غرض رونا جو غم میں بے ساختہ جوش زن ہو ممنوع نہیں بلکہ عین مراد حق ہے یہ بھی ہے کہ بطریق مذکور نفس کو تسلی دو' پس جب اس طرح مراد حق پوری ہو جائے تو اب اس رونے شغل چھوڑ دو اور اگر سوچ سوچ کر اس کو لے کر بیٹھ گئے تو یہ برا ہے اور حق تعالیٰ بزبان حقیقت اس کو پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اے شخص جس کے پاس ہم ہوں اس کو کون چیز غمگین کر سکتی ہے تو جو اسی کو لے بیٹھا ہے' معلوم ہوا کہ ہم تجھ کو محبوب نہیں۔

محبت کا مظاہرہ

اور صاحبو! غور تو کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے قلوب میں جیسے محبوب تھے اتنا محبوب کسی محبّ کی نظر میں نہ کوئی ہوا اور نہ ہو' آپ کی محبوبیت کی یہ کیفیت تھی کہ آپ کا آب دہن مبارک اور آب بینی صحابہ زمین پر نہ گرنے دیتے تھے فوراً اپنے منہ کو اور بدن کو مل لیتے تھے اور چاٹ لیتے تھے کوئی اس قصہ کو سن کر دل میں اپنے گھن نہ کرے اس لیے کہ اول تو محبت وہ شے ہے کہ کسی مرد اور عورت کے ساتھ اگر تعلق ہو جاتا ہے تو یہ معاملہ اس کے ساتھ بھی لوگ کرتے ہیں اور حالانکہ یہ محبت محض نفسانی وشہوانی ہوتی ہے اور جہاں محبت حقیقی ہو وہاں اگر یہ امر ہو تو تعجب کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس نفاست اور لطافت میں اس درجہ پر تھی کہ ہمارے علماء نے تصریح کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بول و براز بھی پاک تھا۔ ایک صحابی نے غلطی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون پی لیا تھا ان کی اولاد میں کئی نسل تک خوشبو رہی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ مبارک بجائے عطر کے استعمال کیا جاتا تھا'

پس جب آپ کے فضلات میں نہ بوتھی نہ کدورت تو پھر طبعی گھن بھی نہیں ہوسکتی اور آپ کی محبوبیت کی یہ کیفیت تھی کہ عورتیں طبعاً اپنی اولاد کی محبت میں غرق ہوا کرتی ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو محبت کی یہ حالت تھی کہ ایک غزوہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے کہ ایک عورت سر راہ اشتیاق میں کھڑی تھی کسی نے کہا کہ تیرے بیٹے اور بھائی شہید ہو گئے تو وہ پوچھتی ہے کہ یہ تو بتلا دو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی صحیح سلامت ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ وہاں وہ تو ہیں' کہنے لگی کہ کچھ پرواہ نہیں' ان کی تو یہ حالت تھی۔

فان ابی ووالدتی وعرضی لعرض محمدٌ منکم وقاء

(یقیناً میرے باپ اور میری ماں اور میری آبرو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کیلئے تم سے بچاوے)

پھر اس قدر آپ کی محبوبیت پر آپ قیاس کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر صحابی کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ صحابہؓ پر یہ صدمہ ایسا ہوا کہ اس صدمہ کی نظیر روئے زمین پر نہ پہلے کبھی ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی۔

خدمت دین

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس صدمہ میں کیا سب سے زیادہ ہوش و حواس اس صدمہ میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہی رہے جو سب سے زیادہ عاشق تھے ورنہ بقیہ صحابہ کے شدۃ صدمہ سے ہوش بجا نہ تھے جب صدیق اکبرؓ نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً منبر پر تشریف لے گئے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر خاص نظر تھی۔ جب ان کو منبر پر دیکھا سب منبر کے گرد جمع ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعد حمد و نعت فرمایا: "الا ان من کان منکم یعبد محمدا فان محمد قدمات ومن کان یعبد الله فان الله حی لایموت" (یعنی آگاہ ہو جاؤ' بے شک جو تم میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کیا کرتا تھا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وفات پا گئے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ زندہ ہے ان کو موت نہ آئے گی) اور اس کے بعد یہ آیت

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْقُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا

یعنی نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر ایک رسول ان سے پہلے بھی بہت رسول گزر چکے ہیں کیا پس اگر وہ مر جائیں گے تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو شخص پھر جائے گا تو وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہ بگاڑے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فانی ہونا بیان فرمایا اور جس کے واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے اس پر استقامت کی تعلیم فرمائی اور اس کے بعد حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا'' یعنی کسی جان کے لیے یہ نہیں ہے کہ وہ بغیر حکم الٰہی کے مر سکے اور آپ نے آیت بھی پڑھی۔ ''اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ'' صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ کلام سن کر ہماری یہ حالت ہوئی کہ گویا ہم نے یہ آیت پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں کلام اللہ سن کر جو حالت قلب کے تاثر کی ہوا کرتی ہے اس کو سن کر وہی حالت ہوگئی اور ہوش سے آ گئے اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ غور کرنا چاہیے کہ حضور جس کام کے لیے تشریف لائے تھے یعنی دین حق کی اشاعت اور احیاء وہ کام ہم کو کرنا چاہیے چنانچہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس شغل کو لے کر نہیں بیٹھے اور سب کے سب فوراً خدمت دین میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ غزوات اور فتوحات اور تفسیر اور حدیث اور فقہ اور علوم کی اشاعت خدمات دین اس درجہ تک کیں کہ نادان آدمی کو دیکھ کر سرسری نظر سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں نہیں ہوئے تھے وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے علماء نے کئے حالانکہ یہ غلط ہے اس لیے بنیاد حضور ہی نے رکھی تھی اور بنیاد رکھنا ہی کسی کام کی مشکل کام ہے اور جب بنیاد رکھی جائے اور بنیاد درست ہو جائے تو آگے اس کے چلانا کون سا مشکل کام ہے اسی مشکل کے موقوف علی الرسول ہونے کے مضمون کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ'' یعنی جو لوگ کافر ہوئے ہیں اہل کتاب اور مشرکین سے وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے یہاں تک کہ ان کے پاس دلیل روشن آئی اور وہ دلیل اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان رسولؐ ہیں جو پاک صحیفوں کی تلاوت کرتے ہیں کہ ان صحیفوں

میں لکھے ہوئے مضبوط مضمون ہیں۔ غرض صحابہ نے اس صدمہ جانکاہ کا وظیفہ نہیں کیا حالانکہ صحابہ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا اور اسی وجہ سے صدمہ بے حد سخت تھا پس ہم کو بھی چاہیے کہ ہم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اقتدا کریں۔

نسخہ کیمیا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "**اصیب بمصیبة فلیتعز بمعصیتی**"[1] یعنی جس کو کوئی مصیبت پہنچے اس کو چاہیے کہ میری مصیبت سے وہ تسلی حاصل کرے یعنی میری وفات سے جو میری امت کو صدمہ پہنچا ہے اس کو یاد کرے یعنی یہ سوچے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس میرے محبوب سے بھی زیادہ محبوب ہیں جب آپ ہی اس حیات ظاہری میں نہ رہے اور اس پر ہم نے صبر کر لیا تو اس کی کیا پرواہ ہے اس پر وہ شخص شبہ کر سکتا ہے جو یہ کہے کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہی نہیں لیکن مسلمان تو ایسا کہہ نہیں سکتا۔ بفضلہٖ تعالیٰ ہر مسلمان کو اپنی جان، اولاد اور مال سے زیادہ محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور جس کو نہیں اس کی طرف ہمارا روئے سخن نہیں ہے۔ غرض ان طریقوں کے اختیار کرنے سے مصیبت کا جو زیادہ ناگواری کا درجہ ہے وہ نہ رہے گا ورنہ مصیبت اپنی اپنی حد سے بڑھ کر حضرت حق سے مانع ہو جائے گی اور یہ اور زیادہ مصیبت پر مصیبت ہوگی۔ یہ آداب ہیں مصیبت کے الحاصل دو چیزیں حضرت حق سے مانع ثابت ہوئیں، نعمت اور مصیبت پھر ان کی اور بہت سی جزئیات ہیں پس ان میں سے امہات جزئیات کی فہرست ان آیات میں ارشاد فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے: "مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" یعنی کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر اللہ کے حکم سے یہ علاج ہے مصیبت کے مانع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم مالک اور محبوب ہیں اور مصیبت ہمارے ہی حکم سے آتی ہے تو تم کو اس پر اعتراض اور چوں و چرا کا حق نہیں ہے اگر حق تعالیٰ مالکیت اور محبوبیت اور اس کا اعتقاد کہ مصیبت اسی کے حکم سے آتی ہے قلب میں راسخ ہو جائے تو مصیبت کی شدۃ الم قلب کو ہرگز از جا رفتہ نہ کرے گی۔ یہ نسخہ کیمیا کا اثر رکھتا ہے۔

---

[1] کنز العمال: ۶۶۵۵، الکامل لابن عدی ۷: ۲۶۲۵، بلفظ آخر

فقدان عمل

آ گے ارشاد ہے: "وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ" یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اس علاج کی ہدایت فرماتا ہے یہ جواب ہے ایک سوال کا جو جملہ اولیٰ کو سن کر ناشی ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے علاج تو بتلا دیا اور ہمارا اس پر ایمان بھی ہے کہ مصیبت اس کے حکم سے آتی ہے لیکن قلب میں اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا تو اس کا جواب ارشاد ہے کہ تمہاری طرف سے ایمان اور ایقان ہونا چاہیے کام تم شروع کرو' یعنی یقین تم پختہ کرلو' باقی ہدایت اور اثر تو ہم دیں گے' ہاں جو تمہارا کام ہے اگر تم وہی نہ کرو تو اس کا کوئی علاج نہیں' ہم لوگوں کی آج کل یہ حالت ہے کہ کام تو کرتے نہیں اور ثمرات کی امیدیں باندھتے ہیں۔ ہماری ایسی مثال ہے جیسے مریض کسی حکیم کے پاس گئے اور اس سے نسخہ لکھوایا اور شکایت کرتے پھرتے ہیں کہ ہم کو شفا نہیں ہوئی کسی نے پوچھا کہ میاں کسی طبیب سے تم نے معالجہ نہ کیا ایک نے کہا کہ جناب نسخہ تو میں نے لکھوالیا تھا' دوسرے نے کہا کہ میں نے نسخہ کے دام بھی پوچھ لئے تھے' تیسرے نے کہا کہ میں نے خرید بھی لیا تھا' چوتھے نے کہا کہ میں نے اس کو پکا بھی لیا تھا' پانچویں نے کہا کہ میں نے پکایا بھی اور اس کو برتن میں انڈیل بھی لیا تھا' چھٹے نے کہا کہ جناب میں نے پیا بھی لیکن فوراً قے کردی' خدا کی بتلائی ہوئی تعلیمات پر ہمارا ایسا ہی عمل ہے جیسا کہ ان مریضوں کا ہے کہ تعلیم پر ایک نے بھی عمل نہ کیا پھر شفا ہوتو کیسے ہو۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ لوگ کام نہیں کرتے اس طرف سے کچھ کمی نہیں کوئی ذرا کام شروع کر کے دیکھے ہماری تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ حرکت ہی نہیں ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ نظر کے روکنے پر قدرت نہیں ہے میں نے کہا کہ قدرت تو ہے ہاں یہ کہو کہ روکنے میں کلفت ہوتی ہے اس کو برداشت نہیں کرتے اور کرسکتے ہوتو بہت دیر تک الجھتے رہے اور میں ان کی ہر بات کا جواب دیتا رہا مگر ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔ وہ اطراف کانپور کے رہنے والے تھے' وہاں جا کر انہوں نے خط بھیجا کہ واقعی میری سمجھ میں آ گیا کہ قدرۃ ہے تو وہ بات کیا ہوئی کہ وہاں پہنچ کر انہوں نے کام شروع کیا۔ یعنی نظر کو روکا تو تجربہ ہوا اور اس سے پہلے کام تو نہیں کیا تھا' خالی باتیں بنا رہے تھے اور اپنے خیال میں اس

کو محال سمجھ رکھا تھا اس لیے الجھتے رہے اور بعضے لوگ کام بھی شروع کرتے ہیں اس کا کچھ اثر بھی نہیں ہوتا مگر پھر کچھ غلبہ شہوات کا ہوتا ہے اور کام چھوڑ دیتے ہیں سو یہ لوگ طریقہ سے کام نہیں کرتے واللہ اگر طریقے کے موافق کام کریں تو ضرور ہدایت ہو۔

ہدایت کا راستہ

حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں: "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" یعنی جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں تو ہم ضرور ان کو اپنے راستے بتلاتے ہیں اسی طریق پر یہاں ارشاد ہے کہ تم کام کرو جب تم کام کرو گے تو تمہارے قلب کو ہم ہدایت کریں گے۔ آگے ارشاد ہے: "وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" یعنی اللہ ہر شے کو جانتا ہے پس یہ بھی جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں سعی کرنے والا ہے اور کون نہیں ہے اس کے بعد جاننا چاہیے کہ مریض کو جو مرض پیش آتا ہے اس کا ایک علاج تو خاص اسی مرض کا ہوتا ہے اور اسی کا خاص پرہیز ہوتا ہے۔ مثلاً مرض اگر خلط سوداء کے سبب سے ہے تو اسی کا خاص علاج اور خاص پرہیز کرایا جاتا ہے کہ نسخہ بھی اسی کا اور جو چیزیں سوداء بڑھانے والی ہیں ان ہی سے بچنا بھی اور ایک عام علاج اور عام پرہیز ہے کہ جس کو تمام امراض میں پیش نظر رکھنا مریض کو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو چیزیں عامتہً مضعف اور کلیتہً منافی طبیعت ہیں ان سے بچنا چاہیے' یہاں تک تو حق تعالیٰ نے اس مرض یعنی مصیبت کے مانع عن الطریق ہونے کا خاص نسخہ کہ جو ایک خاص مراقبہ ہے کہ ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے' ارشاد فرمایا تھا آگے ایک عام جس کا تمام اوقات میں ہر شخص کو التزام کرنا چاہیے۔ ارشاد فرماتے ہیں اس لیے کہ اگر خاص مرض کے لیے خاص نسخہ کا استعمال کیا اور قواعد عام صحت کی رعایت نہ رکھی تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع مرتب نہ ہوگا وہ عام علاج یہ ہے جس میں تندرست اور مریض سب شریک ہیں۔ یعنی "وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" یعنی ہم نے جو خاص علاج خاص مرض کے لیے تم کو تعلیم کیا ہے اسی پر اقتصار نہ کرو کہ یہ مراقبہ تو کر لیا اور دیگر احکام شرعیہ میں اخلال کیا بلکہ اس کے ساتھ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امور میں اطاعت کرو اور یہ وہی وجہ ہے کہ اطیعوا کا متعلق ذکر نہیں فرمایا جس سے بقاعدہ بلاغت عموم مستفاد ہوتا ہے۔

یعنی اگر تم نے صرف خاص اسی نسخہ کو استعمال کیا اور عام قواعد کی رعایت نہ کی۔ مثلاً احکام کی پابندی نہ کی اور معاصی کا ارتکاب کرتے رہے تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع متعدد یہ تم کو نہ ہوگا اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ حق تعالیٰ نے جس مضمون کو ارشاد فرمایا ہے اس کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔ اس کے بعد سمجھو کہ بعضے مریض ایسے سست اور کاہل یا کنجوس یا بد پرہیز ہوتے کہ طبیب سے نسخہ لکھوانا اور دوا خریدنا پھر اس کو پکا کر پینا اور پرہیز کرنا ان کو نہایت شاق اور پہاڑ معلوم ہوتا ہے ہاں مرض کی شکایت کیا کرتے ہیں اور یہ کہا کرتے ہیں دوا دارو تو صاحب ہم سے ہوتی نہیں کوئی شخص ایسے ملے کہ چھو کر دے اور مرض جاتا رہے۔

طبیب کا منصب

ایسے ہی روحانی مرض کے مریض بھی دیکھے جاتے ہیں بلکہ ایسے لوگ بہ کثرت ہیں کہ جو مجاہدہ ریاضۃ تو اختیار کرتے نہیں ہاں یہ چاہتے ہیں کہ کوئی بزرگ توجہ ڈال دیں اور ہمارا مرض جاتا رہے ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے۔ حالانکہ محض توجہ سے بغیر اپنے کئے کچھ نہیں ہوتا تو ایسے مریضوں کے لیے ارشاد ہے: "فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ" یعنی ہم نے جو تمہارے مرض کا علاج اپنے رسول کی معرفت ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم اس نسخہ کے استعمال کرنے اور اس کا جو خاص اور عام علاج و پرہیز ہے اس سے اعتراض کرو تو یاد رکھو کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ تم کو علی الاعلان دوا اور پرہیز بتلا دیں کہ جو طبیب کا منصب ہے کیا طبیب کا یہ تھوڑا احسان ہے کہ تم کو دیکھ کر وہ دوا بتلا دے اس کے ذمہ یہ نہیں ہے اور نہ اس کے بس میں یہ ہے کہ شفا اور صحت تمہارے منہ میں زبردستی ٹھونس دے اگر تم کو اپنی صحت مدنظر ہے تو جو دوا بتلائی گئی ہے ہمت سے اس کا استعمال کرو ورنہ تم جانو اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ انبیاء اور اولیاء کی توجہ میں برکت نہیں' بے شک برکت ہے لیکن وہ توجہ مشروط ہے اس کے ساتھ کہ تم بھی خود کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ ورنہ توجہ مؤثر نہیں ہوگی اور نہ اس کے متوجہ کرنے کا یہ طریق ہے کہ ہم لوگ کچھ نہ کریں اور نری تمنائیں کیا کریں کہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہو جائے کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ تمہاری طرف متوجہ ہو۔ ہاں تم کام کرو' بزرگوں کو بھی توجہ ہوگی پھر اس توجہ کی برکات تم کو خود مشاہدہ ہو جاویں گے۔ دیکھو طبیب

شفیق جب یہ دیکھتا ہے کہ یہ مریض ہمارے نسخہ کو استعمال کر رہا ہے تو اس مریض کے حال پر خود توجہ ہوتی ہے اور پھر اس کے لیے قسم قسم کی دوائیں وہ خود تجویز کرتا ہے بلکہ اپنے پاس سے دیتا ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کو صحت ہو جائے اور اگر یہ دیکھتا ہے کہ یہ دوا نہیں پیتا یا دوا پینے کے ساتھ جان کر بد پرہیزی کرتا ہے تو اس کو کچھ بھی خیال نہیں پس حضور کے وقت میں حضور کو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے وارثوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے جب وہ دیکھیں گے کہ یہ شخص اللہ کی راہ میں مرکھپ رہا ہے اور اس نے کوئی دقیقہ اپنی وسعت کا اٹھا نہیں رکھا اور اس وقت اگر اس کی امداد نہ کی گئی تو کچھ عجب نہیں کہ ہمت ہار دے تو اس وقت ادھر سے فوراً مدد ہوگی واللہ وہ بڑے شفیق ہوتے ہیں اور بڑے دینے والے ہوتے ہیں ہاں کوئی لینے والا چاہیے یہ بیان تو ان لوگوں کا تھا جو کام میں لگے ہی نہیں اب ایک وہ ہیں جو کام کرتے ہیں اور ان کو اس کے کچھ ثمرات بھی حاصل ہوئے۔

ناز اور عجب

مگر ان میں ایک مرض پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ جہل اور کمی بصیرت سے یہ سمجھے کہ یہ ثمرات ہمارے کام کرنے سے مرتب ہوئے اور اس پر ان کو ناز اور عجب پیدا ہو گیا تو ان کے اس مرض کے دفعیہ کے لیے ارشاد ہے: "اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ" مطلب یہ ہے کہ تم کو حضرت حق اور موجود حقیقی کے سامنے اپنے وجود کا دعویٰ کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ ارے یاد رکھو کہ ماسوا اس کے کوئی موجود حقیقی نہیں ہے پس ناز چہ معنی مومنین کو یہ چاہیے کہ اسی ایک ذات پر بھروسہ رکھیں اور غیر کو کہ جس میں اپنا وجود بھی ہے فانی محض اور ہالک محض سمجھیں نہ کہ اپنے وجود کا دعویٰ کریں تم کچھ بھی نہیں ہو اور نہ کچھ کر سکتے ہو یہ ہمارا ہی کام تھا کہ تم کو کام کی توفیق دی اور اس کے اسباب مہیا کر دیئے اور پھر اس میں کامیابی عطا فرمائی۔ یہاں تک مصیبت کے متعلق بیان تھا جو مانع عن الطریق ہوتی ہے۔

عفو و درگذر

اب دوسرا مانع نعمتہ ہے کہ جو اپنی زیادہ گوارائی کے سبب مانع عن الطریق اور ہمارے لیے رہزن بن جاتی ہے آگے اس کے متعلق ارشاد ہے: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ

اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ" یعنی اے ایمان والوتمہاری بیبیوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن بھی ہیں تو تم ان سے احتیاط رکھوایسا نہ ہو کہ یہ تم کو اپنے اندر مشغول کر کے راہ حق سے ہٹا دیں اور گو نعمتیں تو بہت ہیں لیکن دنیا میں اولاد اور ازواج انسان کو بہت محبوب ہوتی ہیں اس لیے بالتخصیص ان کا ذکر فرما کر ان سے تحذیر فرماتے ہیں اوراس آیت میں جوازواج اوراولادکوحق تعالیٰ نے مانع عن الطریق فرمایا ہے تو ان کا مانع ہونا دوطریق سے ہے اول طریق تو یہ ہے کہ اولاد اورازواج ایسی فرمائشیں کریں کہ جوخدااور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہیں اور یہ مغلوب ہوکران کا ارتکاب کریں۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ تو کچھ نہیں کہتے مگر یہ خودان کی محبت میں ایسا مستغرق ہے کہ وہ محبت اس کو مانع بن رہی ہے پہلی صورت میں مانعیت اختیاری ہر چند کہ ظاہر نظر میں یہ جملہ دونوں طریق کو عام معلوم ہوتا ہے لیکن مانعیت آگے جو ارشاد ہے: "وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" (اوراگرتم معاف کرواوردرگزرکرواوران کا گزشتہ قصور معاف کردوتو اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور بڑے رحم والے ہیں) قرینہ اس کا ہے کہ یہاں مانعیت اختیاری ہی مراد لی جائے جس پر غصہ متحمل ہونے کے بعد عفوو صفح کی ترغیب واقع ہوئی چنانچہ شان نزول سے بھی اس مراد کی تعین ہوتی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باہر کے کچھ مسلمان علوم سیکھنے کے لیے آ کر رہنا چاہتے تھے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ جو شخص کسی گھر میں بڑا ہوتا ہے وہ اگر کہیں چلا جاتا ہے تو گھر بے رونق ہوجاتا ہے کبھی بعضی کلفتوں کا بھی خیال ہوا کرتا ہے اس لیے گھر کی بیبیاں بچے یہ ہی چاہا کرتے ہیں کہ یہ کہیں نہ جائیں چنانچہ ان کو بھی اسی طرح روکا مگر بعد چندے جب یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو انہوں نے دیکھا جو صحابہؓ اس سے پہلے آئے ہوئے تھے وہ اور مسائل میں بہت دور نکل گئے ان کو بڑی حسرت اور ندامت ہوئی کہ ہم بیوی بچوں ہی میں رہے اور دوسرے لوگ بہت دور نکل گئے اور ہم سے بہت زیادہ بڑھ گئے۔ یہ سوچ کر ان کو اپنی اولاد اور ازواج پر غصہ آیا اور یہ ارادہ کیا کہ گھر جا کر ان کو خوب ماریں گے کہ ہم کو راہ حق سے مانع ہوئے تو جس وقت انہوں نے

روکا تھا اس وقت جز واول آیت کا یعنی فاحذرو ھم تک نازل ہوا اور جب انہوں نے ان کے مارنے کوٹنے کا ارادہ کیا تو وَاِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا الخ نازل ہوا مطلب یہ ہے کہ اگر تم معاف کردو اور سزا سے درگزر کردو اور ان کا گزشتہ قصور معاف کردو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم والا ہے تمہارے گناہ بھی بخش دے گا اور تمہارے حال پر رحم فرمائے گا۔ پس یہ قصہ اور یہ جز وقرینہ اس کا ہے کہ یہاں اختیاری طریق مراد ہے۔

انہماک محبت

اور دوسری صورت اس سے مستنبط ہوتی ہے گو وہ مدلول مطابقی نہیں ہے لیکن مدلول التزامی ضرور ہے یا یوں کہوں کہ مدلول فصی نہیں تو مدلول بدلالۃ النص ضرور ہے اور اس صورت میں ان کو عدوا لکم فرمانا اس کے معنی اعتبار سے ہوگا کہ گو وہ مانعیت اور عداوت کے مباشر نہیں ہے لیکن سبب تو ہیں پس ان کو عدم فرمانا مشعر ذم ہے۔ درجہ سبب میں ہوگا نہ یہ کہ اس عداوت میں وہ عاصی ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص ایک کبوتر کے پیچھے بھاگا جاتا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان یتبع شیطان یعنی ایک شیطان ایک شیطانہ کے پیچھے جارہا ہے۔ اس کو شیطانہ اس لیے فرمایا کہ اس کے حق میں تو اس نے شیطان ہی کا کام دیا کہ اس کو ذکر اللہ سے غافل کردیا پس ایسے ہی اولاد اور ازواج اس محبّ کے حق میں بلا قصد عدو بن گئے کہ وہ ان کی محبت میں ایسا منہمک ہوا کہ اپنا اصلی کام بھول گیا۔ پس اصل مانع اور مدار منع انہماک فی المحبت ہوا اور اس مدار کے اعتبار سے کہ محبوب کو عام ہوسکتا ہے۔ یہ مضمون جیسا کہ اولاد اور ازواج کو شامل ہے غیر اولاد اور غیر ازواج کو بھی جس شے کی محبت میں بھی یہ مبتلا ہوکر اپنے مولا کو بھول جائے عام ہوگیا جس کو صوفیاء نے اس عبارت سے ادا کیا ہے۔ "ماشغلک عن الحق فھو طاغوتک" (جو چیز تجھ کو حق سے مانع ہوجائے وہ تیرا بت ہے) کہ جو چیز بھی تجھ کو حق سے مانع ہوجائے وہ ہی تیرا بت ہے حکیم ثنائی اسی مضمون کو فرماتے ہیں:

بہرچہ از دوست دامانی چہ کفر آں جرف وچہ ایمان
بہرچہ از یار دورافتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ بھی ہو)

اور اس میں ایمان سے مراد ایمان حقیقی نہیں اس لیے کہ وہ تو عین مطلوب ہے نہ کہ مانع عن المطلوب بلکہ یہ ایسا ہے جیسے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيْمَانُكُمْ" (بری ہے وہ چیز جس کو تمہارے ایمان حکم دیتے ہیں) اور اگر زیادہ غور کیا جائے تو یہ مانعیت غیر اختیاری بھی آیت کا مدلول مطابقی بن سکتا ہے اور **ان تعفوا** الخ اس پر بھی منطبق ہوجائے گا۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جیسے مباشرت مانعیت پر غصہ آتا ہے سبب مانعیت بھی موجب غیظ ہوجاتا ہے کہ اس شے کی محبت ہم کو ہمارے مقصود میں مانع ہوئی ہے اس کو ہی اڑانا چاہیے۔ باقی رہا شان نزول تو اس کا جواب یہ ہے کہ **العبرة لعموم الالفاظ لالخصوص المورد** (عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ خصوص مورد کا) پس اس صورت میں آیت مانعیت کی دونوں طریق کو دلالۃ مطابقی سے شامل ہوجائے گی اور "**ان تعفوا و تصفحوا الخ**" (اگر معاف کرو اور سزا سے درگزر کرو) بھی بلاتکلف دونوں پر منطبق ہوجائے گا اور یہ دو طریق تو مانعیت کے ازواج اور اولاد کی حیات میں تھے کہ یا تو اولاد اور ازواج نے اس کو خود روکا تھا شاید خود ان کی محبت میں اس قدر مغلوب تھا کہ اللہ کی یاد سے رک گیا تھا۔

ابتلاء محبت

تیسری صورت میں ان کی مانعیت کی ایک اور ہے کہ اولاد یا ازواج مر گئے یہاں مصیبت اور محبت دونوں مانع جمع ہوگئے، محبت تو مقتضی ہے، یاد کو کہ اس کی وجہ سے یہ سب اشغال سے معطل ہوگیا اور محبوب کے فقدان کے الم کا مصیبت ہونا ظاہر ہی ہے اور وہ بھی شاغل عن الحق ہو رہا ہے اور جاننا چاہیے کہ حیات محبوب میں جو مانعیت اور ممات محبوب میں جو مانعیت ہے یہ دونوں مانع نفس مانعیت میں تو مشترک ہیں لیکن ان میں ایک فرق ہے جس پر نظر کر کے بعد ممات والی مانعیت زیادہ عجیب اور فہم سلیم سے زیادہ بعید ہے۔ وہ یہ کہ محبوب کی حیات کی صورت میں تو فی الجملہ گو حقیقتاً نہ سہی مگر ظاہراً بہ نسبت حالت ممات کے شخص کسی قدر معذور بھی ہے کہ محبوب مجازی کا کچھ قرب ہے کچھ مشاہدہ ہے یا امید مشاہدہ ہے یہ محرک ہوگیا ہے اس کی محبت میں ایسا مبتلا رہے گا کہ وہ محبت اس محبوب حقیقی سے مانع ہوگئی مگر اس کے فقدان و ممات کی صورت میں تو کوئی عذر نہیں ہے اس لیے کہ اس سے

مفارقت بھی ہوگئی اور اس کی محبت کا کوئی محرک بھی نہ رہا' ادھر دوسرا محبوب یعنی حقیقی موجود ہے اور اس سے تسلی کرنا ممکن پھر تعجب ہے کہ جو محبوب اس کے پاس موجود ہوا اس میں تو مشغول ہو کر تسلی نہ پائے اور محبوب مجازی جو کہ سامنے موجود بھی نہیں اس کی یاد میں گھلے کہ جس کا کوئی نتیجہ سوائے اپنی جان گھٹانے کے نہیں ہے واقعی یہ شخص بالکل معذور نہیں اور یہ ساری خرابی غیر اللہ کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق بڑھانے کی ہے۔

محبت اور شرک

یاد رکھو کہ یہ محبت بعض مرتبہ شرک کے درجے میں پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ ایسی محبت کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: "**وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادً يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ**" یعنی بعضے لوگ ایسے بھی ہیں کہ سوائے اللہ کے انہوں نے شریک بنا رکھے ہیں کہ ان سے مثل اللہ کی محبت کے محبت کرتے ہیں' دیکھئے اس آیت میں جیسے کہ اتخاذ انداد یعنی شرک فی الالوہیت کی شکایت ہے اسی طرح یہ عمل بھی اسی درجہ میں محل شکایت ہے کہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے خدا کے ساتھ ہونی چاہیے یعنی جیسی خدا کی محبت سے کسی وقت قلب خالی نہ ہونا چاہیے ایسی محبت دوسروں سے کرتے ہیں۔ واقعی ایسی محبت شرک کا شعبہ ہے اور شرک کا شعبہ ہونے کے علاوہ عذاب جان بھی ہے اور وہاں تو عذاب ہی ہوگا یہاں بھی سخت مصیبت ہے چنانچہ دوسرے مقام پر اسی مضمون کو ارشاد فرماتے ہیں: "**وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا**" یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان منافقین کے اموال واولاد اچھے معلوم نہ ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ کا بس یہ ارادہ ہے کہ ان اموال اور اولاد کے سبب سے ان کو دنیا کی حیات ہی میں عذاب دے۔ غرض سخت حسرت وافسوس ہے کہ محبوب حقیقی کے ہوتے ہوئے محبوب مردہ یا زندہ کے ساتھ کہ وہ بھی اہل بصیرت کے نزدیک مردہ ہی ہے' لگایا جائے اگر کوئی کہے کہ اس تعجب کا مبنیٰ تو یہ مقدمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا زیادہ محبوب ہو تو اس کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ احب کے ہوتے ہوئے محبوب ادنیٰ کی طرف کیوں التفات ہے۔ سو یہ زیادہ محبوب ہونا کہاں ثابت ہے۔ ہمارا زیادہ محبوب تو وہی تھا جس پر ہم مفتون ہیں تو جناب من آپ اس زیادہ محبوب ہونے کو تسلیم

کر چکے ہیں ایمان لانا یہ خود اس احبیت کے اقرار کو مستلزم ہے چنانچہ اسی آیت میں ارشاد ہے: "وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ" جو لوگ ایمان لائے ان کو سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہے پس آپ تو رجسٹری شدہ محبّ ہیں۔ ضرورت ہی اس بات کی نہیں ہے پس جب آپ عاشق اور محبّ ٹھہرے تو عاشق کے لیے بڑی غیرت کی بات ہے کہ محبوب کو چھوڑ کر غیر پر نظر ڈالے۔ مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک عورت چلی جا رہی تھی اس نے دیکھا کہ میرے پیچھے ایک مرد آ رہا ہے، پوچھا کہ میرے پیچھے کیوں آ رہا ہے اس نے کہا کہ میں تیرا عاشق ہوں اس عورت نے کہا کہ میرے پیچھے میری بہن آ رہی ہے وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے وہ شخص لوٹ گیا اس عورت نے بڑھ کر اس کے ایک دھول رسید کی اور یہ کہا:

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی　　　در بیان دعویٰ خود صادقی
پس چرا برغیر افگندی نظر　　　ایں بود دعویٰ عشق اے بے ہنر

(اس نے کہا کہ اے احمق اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعویٰ عشق میں سچا ہے پس کس واسطے غیر کی طرف متوجہ ہوا اے بے ہنر یہ محض عشق کا دعویٰ ہے)

دیکھئے ایک ادنیٰ عورت نے جب شرکت پسند نہیں تو احکم الحاکمین کہ جس کو بے انتہا غیرت ہے اس کو کب پسند ہوگا کہ ہمارے چاہنے والے غیر پر نظر ڈالیں، غرض عشق تو سوائے محبوب کے کسی شے کو نہیں چھوڑتا۔

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت　　　ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے)

حضرت سلطان ابراہیم ابن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ جب سلطنت چھوڑ کر درویشی اختیار کی تھی تو گھر میں ایک بچہ چھوڑ گئے تھے۔ جب وہ بچہ جوان ہوا تو اس نے اپنے باپ کا پوچھا، کہا گیا وہ تو درویش ہو گئے، مکہ معظمہ میں ہیں یہ لڑکا مکہ معظمہ حج کو پہنچا، مطاف میں دونوں باپ بیٹے کا اتفاق اجتماع بلا تعارف ہو گیا اور حضرت ابراہیم کی نظر اس پر پڑی، محبت کا جوش ہوا کئی بار اس کو دیکھا، مریدوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ ایک امرد حسین کو دیکھ رہے ہیں اس لیے یہ لڑکا بادشاہ کا لڑکا ناز و نعمت کا پلا ہوا نہایت حسین و جمیل تھا اور وہ زمانہ یہ

زمانہ تو تھا نہیں کہ جتنا زیادہ کوئی امرد پرست ہوا اتنا ہی زیادہ بزرگ ہؤا اس زمانہ میں شریعت کے احکام کا غلبہ تھا' مریدوں کو گمان ہوا کہ بے شک شیخ کو لغزش ہوئی ہے بعد طواف کے ہم متنبہ کریں گے وہ لڑکا حضرت ابراہیم کی جستجو میں آیا تھا۔ بعد طواف کے ہر ایک سے پتہ حضرت ابراہیم کا پوچھتا تھا' لوگوں نے بتایا خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں اور میرا نام محمود ہے' حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ تم نے کچھ پڑھا بھی ہے عرض کیا کہ قرآن مجید اور علم دین پڑھا ہے پھر پوچھا کہ صوم وصلوٰۃ اور احکام شرعیہ کے پابند ہو' معلوم ہوا کہ پابند ہیں' دیکھئے اللہ کے بندوں کی ایسی محبت ہوتی ہے اس لیے پوچھا کہ اگر معلوم ہوگا کہ جاہل اور خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف ہے تو میرے کس کام کا ہے۔ جب اس کا ہر طرح سے کامل ہونا معلوم ہوا تو اور زیادہ محبت کا جوش ہوا اور سینہ سے لگایا' فوراً الہام ہوا کہ اے ابراہیم ہمارے ہوتے ہوئے غیر پر نظر

حب حق ہو دل میں یا حب پسر — جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کرو

دعا کی کہ اے اللہ یہ لڑکا میرے اور تیرے درمیان میں حجاب ہے اس حجاب کو اٹھا لے فوراً اس کے گردہ میں درد ہوا اور جاں بحق ہوا لیکن اہل سیر نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کے ایک مرتبہ سینے لگا دینے سے سلطان محمود کے اندر نسبت قوی پیدا ہوگئی تھی' مزار ان کا مکہ کے باہر اب تک موجود ہے۔ اہل بصیرت ان کی نسبت کی قوت کا احساس کرتے ہیں لیکن اس قصے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اولاد کے ساتھ محبت حرام ہے۔

درجات محبت

بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا معاملہ ہر بندہ کے ساتھ جدا ہے بعضوں کے لیے وہ غیر کے ساتھ ادنیٰ درجہ محبت کا بھی بلاضرورت ادائے حقوق پسند نہیں فرماتے اس لیے ان کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ ہوتا ہے ورنہ اولاد کے ساتھ محبت رکھنا اسی طرح ازواج کے ساتھ اسی طرح دوسرے تعلقات والوں کے ساتھ مشروع ہے بشرطیکہ غلو نہ ہو جس کا ضابطہ یہ ہے کہ جیسے مصیبت کے دو درجے تھے اسی طرح محبت کے بھی دو درجے ہیں ایک محبت لاداء الحقوق دوسری محبت لتحصیل الحظوظ ادائے حقوق کے لیے جو محبت ہے وہ فی نفسہ عقلی محبت ہے اگر چہ اس میں

طبیعت بھی ہو اور تحصیل حظوظ کے لیے جو محبت ہے وہ نری طبعی ہے اسی کا نام عشق ہے پس ادائے حقوق کے لیے جو محبت ہے اس میں کوئی ملامت نہیں ہے بلکہ ایک درجہ میں اس کی تحصیل ضروری ہے اور تحصیل حظوظ کے لیے بھی محبت منع نہیں بشرطیکہ واجبات اور محرمات میں اس سے اختلال نہ ہو مثلاً بیوی سے کسی کو عشق ہو کوئی ملامت نہیں لیکن اس کو بڑھائے نہیں اس لیے کہ بڑھ کر شاغل عن الحق ہو جائے گی ہاں اگر محبت بالکل نہ ہو اور یہ خوف ہے کہ مجھ سے ادائے حقوق میں کوتاہی ہوگی اس لیے محبت کی تحصیل کرتا ہے یا کچھ تو ہے مگر اس کو اس مصلحت ادائے حقوق کے لیے بڑھاتا ہے تو جائز بلکہ مستحب ہے اور جو اس قدر محبت موجود ہے کہ ادائے حقوق کے لئے کافی ہے مگر محض تحصیل لذت کے لیے اس کو بڑھاتا ہے یعنی ایسے اسباب غیر ضروری کا ارتکاب کرتا ہے کہ جن سے محبت بڑھے اور غرض لذت اور عیش پرستی ہے تو یہ برا ہے بلکہ بعض اوقات مفضی کے المضر ب ہو کر ظناً یا یقیناً حرام ہے اور یہ بھی راز ہے اس میں کہ حب کا تعویذ کرنا ناجائز ہے چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ بیوی کو حرام ہے کہ تسخیر زوج کے لیے تعویذ کرے مطلب اس کا یہ ہے کہ جس وقت محبت بقدر ضرورت موجود ہے لیکن صرف اس واسطے کہ زوج میرا ہی الو بن جائے نہ ماں کا رہے نہ باپ کا تعویذ کرتی ہے یہ حرام ہے ہاں اگر حقوق ادا نہ کرتا ہو تو تعویذ وغیرہ کا کچھ مضائقہ نہیں۔ پس جبکہ محبت جائز کا بھی جیسے کہ زوجین ہوتی ہے بڑھانا حد سے زائد پسندیدہ نہیں تو جو محبت اصل سے ہی ناجائز ہے وہ تو کیوں کر قابل ملامت نہ ہوگی اور بیوی تو بیوی ہمارے مشائخ محققین نے تو شغل رابطہ کو کہ جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے شیخ کی صورت کا تصور کیا کرے پسند نہیں کیا ہے اور بعضوں نے ناجائز بھی کہا ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایسا تصور کرنا کہ غیر متصور کا تصور ہی نہ کرے یہ صرف خدا ہی کا حق ہے۔ چنانچہ مولانا اسماعیل صاحب شہید نے اس شغل کو "مَاهٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْٓ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ" (یہ کیا واہیات مورتیں ہیں جن کی عبادت پر تم جمے بیٹھے ہو) میں داخل فرمایا ہے اسی طرح توجہ متعارف بین الصوفیہ کہ جس کی حقیقت یہ ہے کہ شیخ تمام خطرات سے خالی ہو کہ طالبین کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ محققین نے اس کو بھی ناپسند کیا ہے اس لیے کہ قلب کو ماسوا طالب سے جب خالی کر لیا تو حق تعالیٰ کی یاد بھی اس میں برائے نام ہی رہ جائے گی یعنی جتنی کہ قلب میں رچ چکی ہے اور درجہ اختیار سے نکل کر درجہ اضطرار میں پہنچ گئی ہے۔

توجہ الی اللہ

باقی قصداً توجہ الی اللہ نہ رہے گی اس لیے کہ قصد طالب کی طرف متوجہ ہے تو اس وقت یہ شخص توجہ الی اللہ کا جو کہ مامور بہ ہے تارک ہوا کیونکہ مامور بہ توجہ اختیاری ہے نہ کہ اضطراری میں اس کی حرکت کا تو فتویٰ نہیں دیتا اس لیے کہ اکثر مشائخ کا معمول رہا ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ نیت ان حضرات کی اس میں خیر ہی کی تھی اس لیے جائز ہی کہتا ہوں مگر مجھ کو اس جائز سے اس قدر نفرت ہے جیسے بعض کو اوجھڑی کھانے سے نفرت ہوتی ہے مجھ کو اس میں بالکل صورت شرک کی سی معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ یہ خدا کا حق ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی شے کو دل میں نہ لائے۔ پس جبکہ اس شغل القلب بالغیر کو جس میں نیت بھی خیر ہے محققین نے پسند نہیں کیا تو جس محبت کا ثمرہ "لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنيَا" (تا کہ دنیا میں ان کو اس وجہ سے عذاب دے) ہو اور جس تعلق کا نتیجہ ظلمت ہے ظلمت ہو وہ تو کیونکر نا جائز نہ ہوگی اور محبت کا بڑا سبب یا تو نظیر ہے اگر وہ مشاہد ہے اور اگر مر گیا ہے یا غائب ہے تو کثرت تخیل و تصور ہے پس نظر کی بھی حفاظت ضروری ہے اور تخیل اور تصور کو بھی دوسرے کام میں لگ کر متفرق کر دینا چاہیے ورنہ کثرت تخیل کا نتیجہ اکثر جنون ہوتا ہے۔ مولانا نصیحت میں فرماتے ہیں:

عشق بامردہ نباشد پائدار — عشق راباحی وباقیوم دار
عشق ہائے کزپے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود
غرق عشقے شوکہ غرق است اندریں — عشق ہائے اولیں و آخریں

(مردہ کے ساتھ عشق کی پائیداری نہیں اس لیے اس حی و قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے جو عشق محض رنگ وروپ پر ہوتا ہے اس کا انجام حسرت وندامت ہے وہ عشق نہیں، عشق حقیقی میں غرق ہو جاؤ اس میں غرق ہونا اولین و آخرین کا عشق ہے)

تو مگو مارابداں شہ بار نیست — برکریما کارہا دشوار نیست

یعنی یہ مت کہو کہ ہمارا تو اس درگاہ میں دخل نہیں ہے اس لیے کہ کریم پر کار دشوار نہیں تم مطلب تو کرو وہ کریم تم کو رسائی دے گا۔ افسوس ایسی ذات کے ساتھ تو محبت نہ کریں کہ جو خود تم کو طلب کرے اور جس کی محبت میں ہر طرح کا چین لطف سکون حاصل ہو اور ایسوں کے اوپر مریں کہ جن کی محبت سے مالیخولیا اور جنون اضطراب بے قراری بے چینی ہو اور اکثر وہ تمہاری طرف التفات بھی نہ کرے۔

مردہ کا تخیل

خصوص جس شخص نے مردہ کا تخیل غالب کرلیا ہو ایسے شخص کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ اپنا علاج کرے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ صحیح نہیں ہے اور مردہ کو یاد کر کر کے زیادہ رونے سے ایک یہ بھی خرابی ہے کہ مردہ کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ صحابی بیمار ہوئے اور ان کو نزع شروع ہوا ان کی بیوی یہ کہہ کر رونے لگی ہائے میرے سردار انہوں نے آنکھ کھول کر منع کیا کہ کیا میں تم کو منع نہیں کرتا تھا کہ نوحہ مت کرنا۔ جب تم یہ کہتی تھی کہ ہائے سردار تو فرشتے مجھ کو کہتے تھے کہ کیا تو ایسا تھا' دیکھو اس طرح کی بات سننے سے بھی تکلیف ہی ہوتی ہے اسی طرح میری بڑی ہمشیرہ کے انتقال کے بعد میری تائی صاحبہ یعنی بڑی چچی بہت روتی تھیں۔ ایک بار مرحومہ کو خواب میں دیکھا' کہتی ہے کہ تائی تم نے رو رو کر ندی نالے بہادیئے' میں تمہارے پاس آیا کرتی مگر تم نے رستہ ہی نہ رکھا' اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اموات کو بعض اوقات احیاء کے افعال کا احساس ہوتا ہے اور وجہ اس کی کبھی یہ ہوتی ہے کہ فرشتے اطلاع کردیتے ہیں اور کبھی کبھی حق تعالیٰ کی طرف سے اقتراب روحانی کا اذن ہوجاتا ہے اس سے ان کو ادراک ہوتا ہے۔ جلال الدین سیوطی نے شرح الصدور میں ایک حکایت لکھی ہے کہ بزرگ اپنی والدہ کی قبر پر جا کر قرآن مجید پڑھا کرتے تھے' ایک روز انہوں نے اپنی والدہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہتی ہیں بیٹا جب تم میرے پاس آیا کرو تو آتے ہی قرآن مجید نہ شروع کردیا کرو' تھوڑی دیر بیٹھ کر شروع کیا کرو تا کہ میں تم کو جی بھر کر اول دیکھ لیا کروں جب تم قرآن شروع کردیتے ہو تو اس کے انوار تمہارے چہرے کو مجھ سے چھپا دیتے ہیں۔

حرام محبت

الحاصل یہ تفصیل تو حلال محبت میں تھی اور جو حرام محبت ہے' جس کا نام لوگوں نے عشق رکھا ہے' جس کو بجائے عشق کے اگر فسق کہا جائے تو بجا ہے خواہ وہ محبت' عورتوں کے ساتھ ہو یا لڑکوں کے ساتھ یہ تو کسی طرح بھی جائز نہیں' آج کل لڑکوں کی محبت کا مرض بہت عام ہوگیا ہے اور یہ فتنہ عورتوں سے زیادہ سخت ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عورتیں تو خود بھی اجنبی مردوں سے بچتی ہیں اور ان میں حیا بھی ہوتی ہے اور نیز وہ پردہ میں بھی رہتی ہیں دوسرے یہ کہ عورت

مردملیں تو فوراً لوگوں کو بدگمانی ہوتی ہے اور لڑکوں میں بچاؤ کی کوئی چیز نہیں ہے اس لیے اس میں ابتلاء بہت ہے اور نہایت سخت چیز ہے یہ وہ فعل ہے کہ جس نے قوم لوط کو تباہ کر دیا ہے اور جو لوگ اس میں مبتلا ہیں ان کی بہت سی قسمیں ہیں چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ لوطی کی تین قسمیں ہیں قسم ینظرون وقسم یقبلون وقسم یفعلون۔ یعنی ایک قسم تو وہ ہے جو صرف دیکھتے ہیں اور دوسری قسم جو بوس و کنار کرتے ہیں، تیسری قسم جو یہ فعل کرتے ہیں اور میں عرض کرتا ہوں کہ چوتھی قسم ایک اور ہے وہ یہ ہے یصورون ویتخیلون یعنی تصور تخیل میں مبتلا ہیں۔ یہ قلب کی لواطت ہے اور دلیل اس کی وہ حدیث ہے ''والقلب یزنی و زنا ان یشتھی'' اور یہ فعل زیادہ سخت اس لیے ہے کہ عورت کسی وقت حلال ہونے کا محل تو ہے اور اس فعل خبیث میں تو حلت کا وسوسہ بھی نہیں اور یہ فعل فطرت سلیمہ کے بالکل مبائن اور مخالف ہے اور اس فعل سے عقوبتہ بھی سخت بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ چند سال ہوئے تھانہ بھون کا ہی قصہ ہے کہ ایک شخص حق تعالیٰ کی طرف مشغول تھا۔ اس کے قلب پر یہ آیت وارد ہوئی ''اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰی اَھْلِ ھٰذِہِ الْقَرْیَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ'' یہ آیت قوم لوط کے بارے میں ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ ہم بیشک اس بستی والوں پر بسبب ان کے فسق کے آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اس شخص نے منبر پر بیٹھ کر سب کو سنا دیا اور یہ کہہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس فعل خبیث میں مبتلا ہیں توبہ اور استغفار پڑھنا چاہیے لیکن کسی نے نہ سنا۔ اس کے بعد ہی اس شدت سے طاعون ہوا کہ گھر کے گھر خالی ہو گئے اور نظر بصیرت و کشفی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل کی ظلمت قلب پر بہت سخت ہے زنا میں اتنی ظلمت نہیں ہے فقط ہاتھ لگانے ہی سے بے حد ظلمت طاری ہو جاتی ہے اصل فعل کا درجہ تو آگے رہا، بزرگوں نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ جس شخص کو اپنی بارگاہ سے مردود کرنا چاہتے ہیں اس کو امردوں کی محبت میں مبتلا کرتے ہیں یہ تمام تر کلام محبت کے بارے میں تھا۔

حب مال

تیسرا مانع کہ وہ بھی فرو نعمت کا ہے حب مال ہے اس لئے آگے اس کو ارشاد فرماتے ہیں ''اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ'' یعنی تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہے اور اللہ کے نزدیک اجر عظیم ہے کیونکہ اولاد کا فتنہ زیادہ سخت ہے اس لیے یہاں اس کو

مکرر ارشاد فرمایا اور نیز اس لیے کہ اموال کے ساتھ محبت کا ایک منشاء اولاد کی محبت بھی ہے اس لیے بھی اولاد کو مکرر ذکر فرمایا اور مال کی محبت کے بھی دو درجے ہیں ایک تو بضرورت حدود شرعیہ کے اندر یہ مذموم اور مانع نہیں اور ایک وہ محبت جس کے غلبہ میں حقوق شرعی فوت ہوتے ہیں۔ چنانچہ آج کل یہ بلا بھی عام ہے جو کہ حب مال کا شعبہ ہے وہ یہ کہ حقوق العباد میں بہت کوتاہی کرتے ہیں اس زمانہ میں لوگ بڑے باہمت ہیں جو ڈھونڈ ھ ڈھونڈ ھ کر اہل حقوق کو حقوق پہنچاتے ہیں۔ آج کل بڑے بڑے دیانتداروں کی یہ کیفیت ہے کہ نمازیں بہت پڑھیں گے حتیٰ کہ نوافل اور تسبیح ذکر و شغل کے پابند لیکن حقوق کے ادا کرنے میں تساہل حتیٰ کہ بعض علماء کا یہ حال ہے کہ کسی مردہ کے ورثہ اس کا مال ان کے مدرسہ یا مسجد میں لائیں بے تکلف لے لیتے ہیں نہ اس کی تحقیق کرتے ہیں کہ اس کے کتنے وارث ہیں اور سب کی رضا مندی ہے یا نہیں کوئی ان میں بالغ تو نہیں ہے اس بلا میں باستثناء خاص خاص بندوں کے سب ہی مبتلا ہیں۔ خصوص مدارس میں تو اس چندہ کا قصہ بڑا نازک ہے میں نے ایک جگہ کی حکایت سنی ہے کہ شادیوں کے موقع میں جو مدارس میں لوگ دیا کرتے ہیں سو ایک شادی ہوئی ایک خاص مدرسہ میں شادی والوں نے نہ دیا تو منتظم مدرسہ نے دعوت کے موقع پر میزبان سے خود کہا کہ مدرسہ کا حق نہیں آیا کوئی اس بھلے مانس سے پوچھے کہ حق کے یہاں کیا معنی ہیں حق تو وہ ہے جو شرعاً واجب ہو۔ بعض برادریوں میں دستور ہے کہ جس کے ہاں شادی ہو اس سے جبراً مدرسہ یا مسجد کے لیے کچھ مقدار خاص روپیہ کی لیتے ہیں جو بالکل ناجائز ہے۔ بہرحال عوام یا خاص باستثناء اخص الخواص سب ہی ان بے احتیاطیوں میں مبتلا ہیں جن میں خواص کے ان افعال اور تعلق اہل اموال سے بے حد ضرر ہو رہا ہے ایک موقع پر ایک ڈاڑھی منڈے صاحب کہہ رہے تھے کہ ہم فلاں مدرسہ میں گئے تھے ہماری بڑی تعظیم کی گئی۔ دیکھو یہ ہماری تعظیم مال ہی کی وجہ سے ہے اگر ہم مالدار نہ ہوتے یا اس مال کی اہل مدرسہ کو امید نہ ہوتی تو ایسے علماء ہم کو کیوں پوچھتے' اتفاق سے میں ایک مدرسہ میں کلکتہ گیا تو ان ہی حضرات نے جو اس وقت وہاں آئے ہوئے تھے میرا وعظ سنا میں نے وعظ کہا اور اس میں حب مال پر زیادہ مضمون بیان کیا۔ انہوں نے اس کی بھی شکایت کی' تھوڑا عرصہ ہوا نواب صاحب ڈھاکہ کی استدعا پر جو میں کلکتہ تک گیا تو ملے' بہت تعظیم سے پیش آئے اور کہنے لگے کہ ہم کو تو آنے سے ناامیدی ہوئی تھی نواب صاحب نے بیان کیا کہ اس نے (یعنی احقر نے) ایک شرط کی ہے جو

مشکل ہے میں نے پوچھا کہ وہ شرط کیا نقل کی تھی کہنے لگے کہ نواب صاحب نے بیان کیا کہ یہ شرط کی ہے کہ ہم کو کچھ نہ دیا جائے' میں نے کہا کہ یہ شرط کیا مشکل ہے یہ تو بہت آسان ہے' وہ کہنے لگے کہ جناب یہ کیسے ہوسکتا ہے اپنے محبوب کی خدمت کرنے کو تو جی چاہا ہی کرتا ہے' میں نے کہا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محبوب کی خدمت محبوب کے گھر بیٹھے ہوئے کردی جائے' یہ ضروری ہے کہ بلا ہی کردیں کہنے لگے جناب گستاخی معاف پیاسا کنویں کے پاس جایا کرتا ہے کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا' میں نے کہا کہ آہا تو کیا آپ ہم کو پیاسا اور اپنے آپ کو کنواں جانتے ہیں' واللہ آپ خود پیاسے ہیں اور ہم کنویں ہیں آپ اپنے کو دنیا کی دولت کی وجہ سے کنواں کہتے ہوں گے۔ سو بحمد اللہ جس قدر دنیا کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس موجود ہے اور جس قدر تم کو دین کی ضرورت ہے اس سے تم لوگ مفلس ہو۔ غرض میں نے خوب ہی کان کھولے لیکن بولے بالکل نہیں۔ جب وہ چلے گئے تو لوگ کہنے لگے کہ بہت ہی اچھا ہوا یہ بڑا مغرور ہے جس کو چاہے کہہ لیتا ہے غرض ان مدارس کے چندوں نے علماء کو بہت بے وقعت کردیا ہے اگر علماء اپنی حالت درست کرلیں اور ان مالداروں کو منہ لگالیں اور قناعت اختیار کرلیں تو پھر عوام پر بھی بہت اچھا اثر ہو اور جب علماء ہی کو اموال کے ساتھ اس قدر دلچسپی ہو کہ دولت مندوں کی خوشامدیں کریں تو عوام بے چاروں کی کیا شکایت ہے واللہ اگر یہ لوگ خوشامد اور حرص چھوڑ کر استغناء کا معاملہ کریں تو امراء ان کے دروازوں پر خود آویں' البتہ آنے والوں کے ساتھ بداخلاقی نہ کریں اور فتنہ کے معنی یہاں وہ نہیں ہیں جس کو عام لوگ فتنہ فساد کہا کرتے ہیں بلکہ فتنہ کے معنی امتحان کے ہیں یعنی اولاد اور مال تمہارے لیے امتحان کی چیز ہے یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ تم ان کے ساتھ مشغول ہوتے ہو یا ہماری طرف اور جو امتحان میں کامیاب ہوگا اس کے واسطے اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

تقویٰ

یہاں موانع کی فہرست تمام ہوگئی اور وہ کل تین چیزیں ہوئیں ایک مصیبت اور نعمت کے افراد میں سے ایک اولاد از واج دوسرا مال اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مانعیت ان کی بوجہ افراط محبت و تاثر کے ہے اب اس مقام پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ محبت اور تاثر تو قلب میں ہوتا ہے اور وہ اختیار میں نہیں ہے۔ یہ تو سخت مصیبت ہوئی تو آگے اس کا جواب ارشاد ہے: "فَاتَّقُوا اللّٰهَ

مَااسْتَطَعْتُمْ" (تقویٰ اختیار کرو اللہ تعالیٰ سے جتنا تم سے ہو سکے) مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ کون کہتا ہے کہ تم آج ہی جنید جیسے ہو جاؤ میاں جس قدر تم سے ہو سکے تقویٰ کرتے رہو رفتہ رفتہ مطلوب تک پہنچ جاؤ۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت "اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ" (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) کی ناسخ ہے لیکن میرے تفسیر کر دینے سے معلوم ہوا ہوگا کہ "اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ" (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب آیت "فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ" (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ سمجھے کہ امر کا صیغہ اس میں فور کے واسطے ہے اسی وقت اللہ سے ایسا درجہ تقویٰ حاصل کر لو جو حق ہے اس کا اور قاعدہ تو یہ ہی ہے کہ امر فور کے لیے نہیں ہوتا لیکن گاہ گاہ قرائن سے فور بھی محمل ہوتا ہے پس صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس احتمال سے کانپ اٹھے اس لیے جو حق ہے تقویٰ کا وہ فوراً کیسے حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد یہ آیت "فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَااسْتَطَعْتُمْ" (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنا تم سے ہو سکے) بطور اس کی تفسیر کے نازل ہوئی مطلب یہ ہوا کہ حق تقاتہ درجہ منتہیٰ کا ہے اور اس مامور بہ کا حاصل کرنا علی الفور واجب نہیں ہے بلکہ بقدر استطاعت تقویٰ اختیار کرو اور بتدریج اس میں جتنی جتنی ہو سکے ترقی کرتے رہو حتیٰ کہ جو تقویٰ مطلوب ہے اس پر جا پہنچو گے پس اس تقریر ان دونوں آیتوں میں نسخ اصطلاحی نہیں ہوا اور بعض روایات میں جو یہاں نسخ کا لفظ آیا ہے وہ بالمعنی المصطلح نہیں بلکہ بالمعنی الاعم ہے جو تفسیر مبہم کو بھی شامل ہے اب یہاں پر یہ خلجان ہوا کہ تقویٰ کا سلسلہ ایسا دراز ہے کہ اس کے علوم موقوف علیہا اور اعمال موتی بہا کا احاطہ حاصل نہیں تو عمل کی کیا صورت ہو آگے اس کا دفعیہ فرماتے ہیں: "واسمعوا واطیعوا" یعنی تم اپنا دستور العمل یہ بنالو کہ سنو اور مانو اور اپنی طبیعت کو پریشان نہ کرو جب کوئی بات سنی فوراً اس پر عمل شروع کر دو گو اس وقت احاطہ نہ ہو۔ البتہ یہ نہ کرو کہ سن کر غفلت اور عمل میں کوتاہی کرو جیسا کہ ایک شخص میرے پاس آئے کہ میں تمہارا مرید ہوں میں نے کہا کہ کب سے ہوئے تھے کہا کہ پانچ برس ہوئے اور جو وظیفہ آپ نے بتلایا تھا وہ پڑھتا ہوں میں نے کہا کہ بندہ خدا اس درمیان میں نہ خود آئے اور نہ خط کے ذریعے سے اپنے حال کی اطلاع کی اچھے مرید ہو کبھی تم نے ایسا بھی

کیا ہے کہ حکیم کو نبض دکھلا کر اور نسخہ لکھوا کر پانچ برس تک غائب رہے ہو وہاں تو گھنٹہ گھنٹہ بھر کے بعد حکیم جی کو اطلاع کرتے ہو اور یہاں تم نے پانچ برس کے بعد خبر لی ہے۔ افسوس کہ طالب کو چاہیے کہ جب کسی شیخ سے رجوع کرے تو دو امر اپنے اوپر لازم کرلے اطلاع اور اتباع یعنی اطلاع اپنے احوال کی اور اتباع اس کی تعلیم کا پس "واسمعوا واطیعوا" میں ایک اعلیٰ درجہ کا دستور العمل بتلادیا گیا ہے اور چونکہ مال انسان کو بطبع محبوب ہے اور نیز انسان کے اندر بخل بھی طبعی سا ہے اس لیے تقویٰ کے افراد میں سے تعمیم بعد تخصیص کے طور پر اہتمام شان کے لیے اس کو مستقل طور سے بھی ارشاد فرماتے ہیں: "وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ" (اور خرچ بھی کیا کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا) یعنی اپنے نفسوں کے مال خرچ کرو اور لانفسکم اس لیے فرمایا کہ شاید تم یہ سمجھنے لگو کہ اس کا نفع حق تعالیٰ کا ہوگا۔ سو یاد رکھو کہ اس انفاق کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوگا ہم تو غنی بالذات ہیں اور چونکہ جملہ کلام سابق یعنی "اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا" سے بعضے کوتاہ میں ممکن ہے کہ یہ سمجھیں کہ صرف ظاہر احکام پر عمل کر لینے سے بس مقصود حاصل ہو جائے گا۔

تزکیہ نفس

اس لیے آگے ان اعمال ظاہرہ کی روح متعین فرماتے ہیں۔ ارشاد: "وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں) مطلب یہ ہے کہ صرف اعمال ظاہرہ کی صورت پر مت رہو بلکہ روح کو بھی حاصل کرو اور اس کو ہم ایک مختصر عنوان میں بیان کرتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نفس کی حرص سے بچالیا جائے تو یہ لوگ ہیں کامیاب یعنی جب نفس کے اندر اس قدر سماحت پیدا ہو جائے کہ غیر اللہ کا تعلق اس میں نہ رہے اور غیر پر نہ گرے تو جانو کہ فلاح حاصل ہوگئی اور یہ روح عادتاً الٰہیہ میں حاصل ہوتی ہے اہل اللہ کی خدمت و صحبت سے اور یوق بصیغہ مجہول فرمایا یہ نہیں فرمایا "ومن یوق نفسہ" (جو شخص اپنے بچے کی حرص سے) اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ وقایۃ (نگہداشت) تمہارا کام نہیں ہے بلکہ بچانے والے ہم ہیں یعنی اپنے پر ناز نہ کرنا ہم بھی ہیں جو مقصود پہنچا دیتے ہیں۔ جس کا ظاہری واسطہ اہل اللہ ہیں اس سے دوام مجاہدہ کی حد بھی بیان فرما دی کہ جب تک نفس کے اندر حرص اور شح باقی رہے اس وقت تک مجاہدہ نہ چھوڑو اور چونکہ نفس کے اندر حرص اور شح جبلی ہے کہ کسی طرح قابل زوال نہیں اس لیے مجاہدہ بھی مدۃ العمر ہی ضروری

ہے۔ البتہ بعد چندے اس میں زیادہ مشقت نہیں رہتی اور چونکہ "وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ الخ" اس کی تمام حرصیں جو غیر اللہ کے متعلق ہیں چھڑانا مقصود ہے اور یہ جب تک کہ نفس کو اس سے بڑی چیز کو حرص نہ دلائی جائے یہ نکل نہیں سکتی جیسے کسی کے پاس پیسہ ہو تو اس کو جب تک روپیہ یا گنی کا لالچ نہ دیا جائے اس کو چھوڑ نہیں سکتا اس لیے آگے ثمرہ اعمال کی خیر کی حرص دلاتے ہیں۔

حرص کی قسمیں

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ مطلق حرص مذموم نہیں بلکہ حرص کی دو قسمیں ہیں غیر اللہ کی حرص تو مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کی حرص محمود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَكُمْ" یعنی ہم جو تم سے تمہارے اموال اور اولاد اور ازواج اور تمہارے جان چھڑانے (یعنی قلب سے نکالنے) کے لیے آیات سابقہ میں ارشاد کر آتے ہیں اس سے ڈرو مت کہ ہم تو بالکل ہی مفلس ہو جائیں گے تم یہ سب چیزیں ہم کو قرض دے رہے ہو۔ سو اگر تم اچھا قرض دو گے یعنی خالص بلا ریاء کے یعنی ان کی جب مفرط کو چھوڑ دو گے اور جس کے لیے انفاق بھی لازم ہے جان بھی مال کا بھی تو ہم اس کو بڑھا دیں گے۔ مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں:

خودکہ باید ایں چنیں بازار را | کہ بیک گل می خری گلزار را

نیم جان بستاند وصد جان دہد | آنچہ درد ہمت نیاید آن دہد

(تم ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلے چمن ہی کو خرید لو حقیر اور فانی جان لیتے ہیں اور جان باقی عطا کرتے ہیں جو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں وہ عطا کرتے ہیں)

اور دوسرے مقام پر اضعافا کثیرہ ہے یعنی بہت حصے بڑھا دیں گے جس کی کوئی انتہا نہیں اور بعض روایتوں میں جو سات سو تک مضاعفت آئی ہے اس سے مراد تحدید نہیں بلکہ تکثیر ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث اس پر صاف دلیل ہے وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ایک چھوارہ راہ خدا میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ وہ احد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے اب احد پہاڑ سے چھوارہ کے حجم کے برابر ٹکڑے کرو دیکھو کس قدر ہوتے ہیں سنکھو مہا سنکھوں تک نوبت پہنچتی اور اگر وزن میں چھوارہ کے برابر ٹکڑے کرو تو اور بھی زیادہ ہوں گے۔ اب یہاں خیال ہوتا ہے کہ ہاں دیں گے تو سہی لیکن ہمارے جرائم اس قدر ہیں کہ یہ سب ثواب

اس میں نہ کہیں وضع ہوجائیں جیسے ملازم کی تنخواہ جرم کے سبب ضبط ہوجاتی ہے اس کے لیے آگے ارشاد ہے: "وَيَغْفِرْ لَكُمْ" یعنی گناہوں سے اندیشہ نہ کرو سب بخش دیں گے اور چونکہ انسان بہت کم حوصلہ ہے اس لیے اس مضمون کو سن کر خیال اور تعجب ہوسکتا ہے کہ اس قدر عطا اور پھر اس کے ساتھ مغفرت کیسے ہوگی تو اس لیے ارشاد فرماتے ہیں: "واللّٰه شكورٌ حليمٌ" یعنی اس عطا اور مغفرت سے تعجب نہ کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ شکور یعنی بہت قدر دان اور بہت حلم والے ہیں تمہاری طرح ذرا سی بات پر ان کو غصہ نہیں آتا بلکہ سب معاف فرما دیتے ہیں۔ باقی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مغفرت بلا تبعہ بدرجہ وعدہ ان کے ہی واسطے ہے جو پہلے گناہوں سے صدق دل سے توبہ کرلیں اور آئندہ کو اصلاح کا قصد کریں جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(پھر تمہارا رب ان لوگوں کے لیے جنہوں نے جہالت سے برے اعمال کیے پھر اس کے بعد انہوں نے توبہ کرلی اور اصلاح کرلی' بے شک تمہارا رب بعد اس کے گناہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

اور چونکہ پہلے قرض کو حسن کے ساتھ موصوف کرکے یہ بتلایا ہے کہ حاصل عمل ہو۔ ریاء اس میں نہ ہو تو ممکن ہے کہ بعضوں کا خیال ہوجائے اور اس پر ناز ہوجائے کہ ہمارے اعمال خالص ہیں اس لیے آگے ارشاد ہے: "عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ" یعنی غیب اور شہادت کے ہم عالم ہیں اور اسی میں خلوص اور ریاء بھی داخل ہے پس کوئی شخص اپنے اوپر ناز نہ کرے اور نہ دوسرے کو مرائی نہ سمجھے اس لیے کہ وہ عزیز زبردست بھی ہیں کہ ناز کرنے والے کا ناز توڑ دیتے ہیں اور بعض مرتبہ مرائی اور تعجب کی سزا میں جو التواء ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حکیم ہیں سب کام حکمت سے کرتے ہیں اور اس التواء میں بھی حکمت ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان آیات میں حق تعالیٰ نے موانع طریق کی تفصیل اور ساتھ ساتھ ان کے رفع کی تدبیریں ارشاد فرمائی ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

طرز زندگی کا دستور العمل' اہل تصوف کی معمول بہ چند چیزیں ہیں' تہجد' تلاوت قرآن' تبلیغ دین' ذکر' تبتل' توکل' صبر تہجد سے محروم رہنے والوں کی غلطی بیان فرمائی۔

سیرت صوفی

زندگی کے دستور العمل کے متعلق یہ وعظ ۲۳ صفر ۱۳۲۹ھ
کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر فرمایا۔
جسے مولوی نور حسین پنجابی نے قلم بند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّم

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِصْفَہٗ اَوِانْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا اَوْزِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا وَاذْکُرِاسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَااِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا وَاصْبِرْ عَلٰی مَایَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَۃِ وَمَھِّلْھُمْ قَلِیْلًا. (المزمل آیت ۱ تا نمبر ۸)

ترجمہ: (اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات کہ اس میں قیام نہ کرو بلکہ آرام کرو یا اس نصف سے کسی قدر کم کردو یا نصف سے کچھ بڑھادو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو' ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں' بے شک رات کے اٹھنے میں دل وزبان کا خوب میل ہوتا ہے اور بات ٹھیک نکلتی ہے اور بے شک دن میں تم کو بہت کام رہتا ہے اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو وہ مشرق ومغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ رہو اور ان جھٹلانے والوں' ناز ونعمت میں رہنے والوں کو حالت موجودہ میں چھوڑ و اور ان لوگوں کو تھوڑے دنوں کی اور مہلت دو' ہمارے یہاں بیڑیاں اور دوزخ ہے اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے اور دردناک عذاب ہے' جس دن پہاڑ اور

زمین ہلنے لگیں گے اور پہاڑ ریگ رواں کی طرح ہو جائیں گے)

تمہید: بعض احباب ارباب سلوک نے مجھ سے استدعا کی کہ اگر ہمارے لیے کچھ دستور العمل کے طور پر بیان ہو جائے تو بہتر ہے اس وقت بوجہ کسی مضمون کے حاضر ہونے کے اور نیز ایسے مضامین کے لیے خلوت مناسب ہونے کے میں نے حتمی وعدہ نہیں کیا' مگر آج صبح کو سورۃ مزمل کی یہ ابتدائی آیات قلب میں وارد ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ ان میں تمام تر طریق سلوک ہی مذکور ہے اس لیے آج انہیں آیات کے متعلق کچھ بیان کیا جاتا ہے اور بیان سے پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ عوام یہ نہ سمجھیں کہ اس میں ہمارا نفع کیا ہوگا۔ یہ طریقہ تو خواص کے لیے ہے یعنی یہ کہ طریقہ جو بیان ہوگا تارکان دنیا کے لیے ہے ہم دنیاداروں کے لیے نہیں۔ سو بات یہ ہے کہ سرے سے یہ تقسیم ہی صحیح نہیں کہ دنیاداروں کے لئے اور احکام اور دینداروں کے لیے اور احکام کیونکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں اور احکام شرعی سب کے ساتھ یکساں متعلق ہیں بلکہ حقیقت میں مسلمان دنیادار ہوتا ہی نہیں کیونکہ دنیاداری حقیقت میں یہ ہے کہ حرام وحلال میں کچھ امتیاز نہ رہے جس طرح سے بنے مال حاصل کرنے کو مقصود سمجھے۔ اگر کہیں دونوں غرضیں دین ودنیا کی جمع ہو جائیں تو دنیوی غرض کو مقدم رکھا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ دین سے ہم کو کوئی غرض نہیں کیونکہ شریعت کے احکام اس قدر دشوار ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کریں تو دنیا کی زندگی مشکل ہے۔ سو ظاہر ہے کہ اسلام کے ساتھ ان خیالات کی گنجائش کہاں ہے کیونکہ اس سے تو باری تعالیٰ کی تکذیب کی نوبت پہنچتی ہے۔ "يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُبِكُمُ الْعُسْرَ وَلَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ احکام میں دشواری منظور نہیں) اور اگر یہ عذر کیا جائے کہ ہم تکذیب نہیں کرتے مگر جب واقعات ہی روزمرہ اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ احکام شرعیہ پر چلنا بہت مشکل ہے تو ہمارا کیا قصور ہے۔

احکام شرعیہ کی اہمیت

اس اشتباہ کا جواب یہ ہے کہ ایک مشقت تو ہوتی ہے ذات حکم میں مثلاً وہ حکم فی حد ذاتہ سخت اور دشوار ہے یہ امر اور اغلال کہلاتے ہیں امم سابقہ میں بعضے ایسے احکام تھے مگر اس امت میں اس قسم کے احکام نہیں رکھے گئے اور ایک مشقت یہ ہے کہ دراصل ذات حکم میں تو کوئی

دشواری نہیں مگر ہم نے اپنے اغراضِ فاسدہ کی وجہ سے خود اپنی حالت ایسی بگاڑ لی اور قوم نے متفق ہو کر شریعت کے خلاف عادتیں اختیار کر لیں کہ وہ رسم عام ہو گئی اور ظاہر ہے کہ جب اس رسم عام کے خلاف کوئی حکم شرعی پر چلنا چاہے گا تو ضرور اس کو اس آسان اور بے ضرر حکم میں دشواری پیدا ہو گی اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کو دو پیسہ کا نسخہ لکھ دے مگر مریض چونکہ ایسے گاؤں میں رہتا ہے جہاں کے لوگوں کی نادانی کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ وہ لوگ اس قسم کی ضروری اور مفید چیزوں کی رغبت نہیں رکھتے وہ چیزیں وہاں نہیں آتیں اور نہیں مل سکتیں۔ اس دو پیسہ کے نسخہ کو وہاں نہیں پی سکتا۔ اب فی نفسہ نسخہ گراں نہیں کمیاب نہیں مگر اس گاؤں والوں نے خود اپنا دستور بگاڑ رکھا ہے اس واسطے وہاں نہیں مل سکتا۔ اس صورت میں ہر عاقل کہے گا کہ علاج بالکل آسان ہے مگر یہ قصور اس جگہ کے رہنے والوں کا ہے کہ ایسی معمولی چیزیں بھی نہیں مل سکتیں۔ ایسا ہی ہمارا حال ہے کہ مجموعہ قوم نے مل کر ایسی حالت بگاڑ دی ہے کہ اب احکام شرعیہ کے بجالانے میں دشواری پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً بہانہ کیا جاتا ہے کہ تنخواہ کم ہے، بھلا اگر رشوت نہ لیں تو کام کیسے چلے، اگر اپنے اخراجات اندازہ سے رکھے جائیں تو تنخواہ کیوں نہ کفالت کرے یا مثلاً عام طور پر بیر، آم، بیع، پھل آنے سے پہلے کی جاتی ہے اور اگر ایک بچنا چاہے تو ضرور کسی قدر دقت پیش نہیں آتی ہے لیکن اگر سب اتفاق کر لیں کہ اس طرح سے کوئی خرید و فروخت نہ کرے تو دیکھیں پھر کیا دشواری پیش آتی ہے دشواری حقیقی تو وہ ہے کہ اگر سب مل کر بھی اس کو دور کرنا چاہیں جب بھی دور نہ ہوں اور سب مل کر اس مذموم رسم اور طریق کو چھوڑنا چاہیں اور چھوٹ جائے تو یہ دشواری نہیں، آسان ہے یہ عارضی دشواری تو صرف اپنا طرز معاشرت بگاڑ دینے اور طریق تعامل کو خراب کر دینے سے پیدا ہو گئی ہے، سو یہ تنگی خود اپنے اوپر تنگی ڈال لینے سے ہوئی، تعجب ہے کہ خود اپنی تنگی کو نہ دیکھیں، شریعت پر تنگی کا الزام دیں۔ جیسا کہ اس شیر نے جس کا قصہ مثنوی میں ہے خرگوش کے بہانے سے اپنا عکس دیکھا اور اس کو دوسرا شیر سمجھ کر اس پر حملہ کرنے کو کنویں میں کود پڑا اور اصل وہ خود اپنے اوپر حملہ کرنا چاہتا تھا ایسے ہی ہم اپنے عیب کو آئینہ شریعت میں دیکھ رہے ہیں اور نا سمجھی سے اس کو شریعت کی تنگی بتلا رہے ہیں سو یہ در حقیقت شریعت پر حملہ نہ ہوا بلکہ خود اپنی ذات پر حملہ کر رہے ہیں۔

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچوں آن شیرے کہ برخود حملہ کرد

(بے وقوف تو اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا)

ہماری تنگی کا قصہ یہی ہے کہ بعض لوگ عذر کرتے ہیں کہ ہم ناجائز معاملات رشوت ستانی وغیرہ ضرورت کی وجہ سے کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ لوگ جس کو ضرورت کہتے ہیں وہ ضرورت ہی نہیں بلکہ محض حظوظ نفسانیہ ہیں جن کا نام ضرورت رکھ دیا ہے۔ مثلاً کسی کی نوکری کے پیسے میں اتنی گنجائش ہے کہ معمولی درمیانی قیمت کے کپڑے پہن سکتا ہے مگر بیش قیمت زرق برق کپڑے پہننے کی گنجائش نہیں۔ اس صورت میں عقلمند آدمی کبھی بھی ایسے گراں قدر کپڑوں کی ضرورت تسلیم نہیں کرسکتا کہ جس ضرورت کے واسطے رشوت وغیرہ لینا پڑے اور اگر اس پر بھی کچھ تنگی ہو تو آخر صبر تعلیم اسی حالت کے لیے ہے اور جو مرتبہ صبر سے گزر جائے تو ایسے لوگوں کی امداد کے واسطے شریعت نے خاص قواعد مقرر کیے ہیں ان سے منتفع ہونا چاہیے۔ غرض مسلمان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے کسی حالت میں بھی دنیا کو دین پر ترجیح دینا جائز نہیں۔ پس اس اعتبار سے مسلمان دنیا دار ہو ہی نہیں سکتا' صرف کافر ہی اہل دنیا ہے جو دین کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دیتے ہیں اور اس شعر کا مطلب اس تقریر پر بالکل صاف ہو گیا ہے۔

اہل دنیا کافراں مطلق اند روز و شب در چق چق و در بق بق اند

(صرف کفار اہل دنیا ہی رات دن زق زق بق بق میں گرفتار ہیں)

یعنی پہلے مصرع میں مبتداء مؤخر اور خبر مقدم ہے۔ یعنی جو محض کافراں مطلق ہے صرف وہی اہل دنیا باقی مسلمان کی شان ہی اور ہے: ''اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' (اللہ ساتھی ہیں ان لوگوں کے جو ایمان لائے) اس میں عام مومنین کے لیے درجہ ولایت کا ثابت کیا گیا ہے گو وہ ولایت عامہ ہی ہو کیوں کہ خاصہ میں اتنا اور زیادہ ہے: ''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ'' (وہ لوگ جو ایمان لائے اور متقی ہیں) اور اگر دنیاداری کے معنی عام لئے جائیں کہ ''طلب المال ولو علی وجه الحلال'' (مال کی طلب اگرچہ حلال ذریعے سے ہو) تو یہ منافی دین کی نہیں تا کہ ایسا شخص مخاطب احکام دینیہ کا نہ ہو کیونکہ خود حضرات انبیاء علیہ السلام سے کاروبار دنیوی اکل و شرب و نکاح و صنعت وغیرہ

سبھی کچھ ثابت ہے غرض دنیوی کاروبار دین کے منافی نہیں بشرطیکہ وہ شریعت کے دائرے میں ہوں، اللہ جل جلالہ کی رحمت تو یہاں تک وسیع ہے کہ باوجود ظلم و گناہ کی بھی ولایت عامہ اور اصطفائے عام سے مؤمنین کو محروم نہیں کیا۔

نفس کی اہمیت

فرماتے ہیں:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ

(پھر یہ کتاب ان لوگوں کے ہاتھ پہنچائی جن کو اپنے بندوں سے پسند کیا ان میں سے بعض اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، بعض متوسط ہیں اور بعض نیکوں میں سبقت لے جانے والے ہیں) ظاہر ہے کہ مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا.

(اور بعضے ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے متوسط درجہ کے ہیں اور بعضے ان میں سے خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کیے جاتے ہیں وہ جن کو ہم نے پسند کرلیا ہے) کی قسم ہیں اور مقسم کا صدق ہر قسم پر واجب ہے پس اصطفا ظالم لنفسہ کو بھی شامل ہوا۔ بھلا جب گناہ کے ساتھ بھی ولایت عامہ اور اصطفا باقی رہتا ہے تو ضروری اشتغال دنیا کیسے منافع دین ہوسکتا ہے۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب ہم تو دنیا کے کتے ہیں ہم سے دین کا کام کیا ہوسکتا ہے۔ تعجب ہے کہ اپنے منہ سے اس ذلت و بے حمیتی کا اقرار کیا جاتا ہے گویا خدا تعالیٰ نے ان کو دین کے واسطے پیدا ہی نہیں کیا اور غضب تو یہ ہے کہ ان بھلے مانسوں نے اپنے لئے تو ایسے ناجائز لقب تراشے ہیں اہل دین کے لیے بھی ایسے القاب نازیبا کا بے محابا استعمال کرتے ہیں جیسے مسجد کے مینڈھے اس پر بطور جملہ معترضہ کے ہنسی کی حکایت یاد آ گئی۔ ایک طالب علم کو کسی متکبر نے کہہ دیا مسجد کا مینڈھا اس نے کہا بلا سے پھر بھی دنیا کے کتوں سے تو اچھے ہی ہیں اور اس کے جواب میں لطیفہ یہ ہے کہ اہل دین کے لیے جو وہ لقب تجویز کرتے ہیں وہ تو ایک دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے مگر دنیا کا یہ کتا

اقراری لقب ہے اور "المرء یوخذ باقرارہ بالجھلہ" (آدمی اپنے اقرار سے پکڑا جاتا ہے) ایسے القاب اپنے لیے یا غیر کے لیے تراشنا ممنوع ہے۔ "قال اللہ تعالیٰ لاتنابزُوْا بالْاَلْقَابِ بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَالْاِیْمَانِ" (ایک دوسرے کو برے القاب سے مت پکارو ایمان لانے کے بعد) حدیث شریف میں آیا ہے کہ "لیس لنا مثل السواء" (بری مثل ہمارے لیے نہیں) عجیب ہے کہ بعض لوگ ایسے واہیات القاب کو انکسار اور تواضع سمجھتے ہیں اس کی مثال میں ایک قصہ یاد آ گیا کہ میرے سامنے ریل میں ایک دولت مند مسخرے اپنے کھانے کو گوہ موت کہہ کر ایک شخص کو مدعو کیا تھا اور ان ہی کے ایک جلیس نے ان کو کہا کہ ہاں کھانے کی ایسی بے ادبی تو انہوں نے تواضع کی توجیہ کی تھی سو ایسی تواضع حماقت ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ کوئی چیز حتیٰ کہ اپنا نفس بھی ہمارے ملک حقیقی نہیں کہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں بلکہ یہ ہم سب سرکاری چپڑاسی ہیں سرکاری مد سے زیادہ اس سے کام لینا یا سرکاری اصول کے خلاف اس کی بے قدری کرنا جائز نہیں۔ اہل اللہ اسی بناء پر کبھی اپنے نفس کی بھی قدر کرنے لگتے ہیں اور عام لوگ کچھ اور سمجھ جاتے ہیں۔ سچ کہا ہے:

در نیا بدحال پختہ ہیچ خام — پس سخن کوتاہ باید والسلام

(ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو کوتاہ کرنا چاہیے اور سلام)

سو وہ حضرات اس حیثیت سے اپنے نفس کی قدر کرتے ہیں کہ وہ اس نفس کو سرکاری چیز سمجھتے ہیں اور اسی طرح ہاتھ پاؤں اور دماغ یہ سب سرکاری مشینیں ہیں جن کو ہمارے سپرد کیا گیا ہے اگر ہم اپنی بے اعتدالی سے ان کو بگاڑیں گے تو خود مورد عتاب مستوجب عذاب بنیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے: "ان لنفسک علیک حقا وان لزوجک علیک حقا وان لعینک علیک حقا"[1] (تجھ پر اپنے نفس کا بھی حق ہے اور اپنی بیوی کا بھی حق ہے اور اپنی آنکھوں کا بھی حق ہے) اگر اپنے دل و دماغ آنکھ کی حفاظت اور خدمت اس نیت سے کریں گے کہ یہ ہمارے مولیٰ کے سپرد کی ہوئی چیزیں ہیں ان کی عزت وحرمت خدمت وحفاظت ہم پر بوجہ عبد و خادم ہونے کے ضروری

---

[1] مسند احمد ۶: ۲۸۶، المستدرک للحاکم ۳: ۶۰، اتحاف السادۃ المتقین ۴: ۱۵۲

ہے تو اس میں بھی ثواب ملے گا، یہی معنی ہیں "انما الاعمال بالنیات"[1] (اعمال کا ثواب نیتوں پر ہے) اور اس مرتبہ میں کہ ان اعضاء کو محبوب سے تعلق ہے۔ کسی نے کہا ہے:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را کو دامن گرفتہ بسویم کشیدہ است

(مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے میرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہنچے ہیں ہر گھڑی اپنے ہاتھوں کو ہزار بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

اور بعض کے کلام سے جو ان اشیاء کا اپنی طرف منسوب ہونا اور اس نسبت کے درجے میں ایسے اقوال صادر ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے کہا گیا ہے:

بخدار شکم آید زود چشم روشن خود کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

(بخدا مجھ کو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ وہ محبوب کے چہرہ انور کو دیکھتی ہیں)

تو یہ ہے غلبہ حال کا ورنہ اہل مقام کی تحقیق وہی ہے

درود شریف کی فضیلت

حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے کہا جب آپ کو دولت وصول میسر ہو چکی ہے تو اب کیوں تسبیح رکھتے ہیں۔ آپ نے کیا لطیف جواب دیا کہ میاں جس کی بدولت ہم کو یہ دولت ملی کیا اب اس رفیق کو چھوڑ دیں ہرگز نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے گھوڑا پالتا ہے اس گھوڑے کا بول و براز بھی ضائع نہیں جاتا بلکہ میزان اعمال میں اس کے اندازے کے موافق اعمال رکھے جائیں گے اور ان پر ثواب ملے گا۔ یہ سب برکت نسبت الی اللہ کی ہے اور ایسی خسیس اشیاء کے حسنات میں شمار ہونے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص مصری خریدے تو جو تنکا مصری میں ہوگا وہ بھی مصری کے بھاؤ ملے گا اور دعا کے اول اور آخر درود شریف پڑھنے کی یہی حکمت ہے کہ درود شریف کو تو بہر

---

[1] الصحیح للبخاری ۱:۲، سنن الترمذی :۱۶۴۷، سنن النسائی کتاب الطهارة باب: ۵۹، سنن ابن ماجه: ۴۲۲۷

حال اللہ تعالیٰ ضرور ہی قبول کریں گے اور یہ ان کے کرم سے بعید ہے کہ اول اور آخر تو قبول کرلیں اور بیچ والی لپٹی ہوئی چیز کورد کردیں اور درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص مقبول ومحبوب ہیں آپ پر بے کسی کی درخواست کے بھی رحمت فرماتے ہیں سو جب کسی نے آپ پر رحمت کرنے کی درخواست کی تو یہ گویا اس شخص کی خیر خواہی ظاہر ہوئی جس سے یہ بھی مقبول ہوگیا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص ہر عید پر اپنے لڑکے کو کچھ انعام دیا کرتا ہے تو وہ تو دے ہی گا اگر کسی شخص نے اس کو انعام دینے کی نسبت کہہ بھی دیا تو وہ شخص اس کہنے کی وجہ سے اس کہنے والے پر بھی مہربان ہوجائے گا اور یہ سمجھے گا کہ اس کو ہمارے لڑکے سے محبت ہے اس لیے درود شریف ضرور قبول ہوتا ہے اور طفیل میں یہ شخص بھی۔ جب درود شریف قبول ہوگا تو دعا اس کے ساتھ وہ بھی ضرور قبول ہوگی اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کھانڈ کے چنے کہ اندر چنا ہوتا ہے اوپر کھانڈ لپٹی ہوئی ہوئی ہے اس مٹھائی کے سبب وہ چنے بھی مٹھائی کے حساب میں بکتے ہیں کیونکہ اس پر کھانڈ لپٹی ہوئی ہے اس واسطے وہ اسی کے حکم میں ہوگئی۔ اسی طرح وہ بھی گویا درود شریف کے حکم میں ہوگئی یا جیسے پتے مٹھائی کے ساتھ جاتے ہیں اور پھر ان کو کوئی واپس نہیں کرتا اور یہی راز اور حکمت ہے۔ نماز میں جماعت کی کیونکہ بدانوا بہ نیکان بخشد کریم۔

جماعت کی فضیلت

جماعت میں نیک بھی ہوتے ہیں ان کی نماز غالباً قبول ہوگی اور بروں کی نماز بھی چونکہ نیکوں کے ساتھ ہے اس واسطے وہ بھی قبول ہوجائے گی اس کی ایک فقہی نظیر ہے وہ یہ کہ اگر متعدد اشیاء ایک سودے سے خریدی جائیں تو یا سب واپس کی جاتی ہیں یا سب رکھی جاتی ہیں اور جو ہر ایک کا الگ الگ سودا ہوتا ہے تو معیب کو واپس کرسکتے ہی۔ پس اللہ تعالیٰ بھی بندوں سے یہی معاملہ کرتا ہے اسی لیے جماعت مشروع فرمائی کیونکہ یہ تو مستبعد ہے کہ سب کی نمازیں واپس فرمائیں تو سب ہی قبول فرمالیں گے۔ البتہ اس میں ایک یہ شبہ رہ گیا کہ جماعت تو صرف فرضوں کے ساتھ مخصوص ہے وہ تو اس جماعت کے ذریعے سے قبول ہوگئی

مگر سنت باقی رہ گئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تابع ہمیشہ اپنے متبوع کے حکم میں ہوا کرتا ہے سنتیں تابع ہیں فرضوں کی وہ بھی فرضوں کے ساتھ قبول ہو جائے گی جیسے کوئی شخص گائے بھینس خریدے تو اس کے رسے وغیرہ بھی گو وہ کیسے ہی بوسیدہ ہوں لے لیتا ہے۔ غرض انضمام واقتران کے یہ فوائد ہیں اسی طرح اگر کوئی شخص اعمال دنیویہ میں بھی نیت خیر رکھے گا تو اس کو ضرور ثواب ملے گا۔

نیت کی اہمیت

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی اپنے مرید کے گھر گئے' وہاں ان کے گھر روشن دان دیکھا۔ پوچھا یہ کیوں رکھا ہے اس نے جواب دیا روشنی کے واسطے انہوں نے فرمایا کہ روشنی تو بدون نیت کے بھی آتی ہے اگر اس کے رکھنے میں یہ نیت کر لیتا کہ اس میں سے اذان کی آواز آیا کرے گی تو تجھے اس کا ثواب ملتا رہتا اور روشنی تو خود آ ہی جاتی۔ مطلب یہ ہے کہ نیت صالحہ رکھنے سے سب اعمال دنیوی بھی قابل ثواب بن جاتے ہیں۔

پس ایسی دنیا منافی دین نہیں پس ایسا دنیا دار بھی دیندار ہی ہے

اور پہلے معنی کر دنیادار کوئی مسلمان نہیں تو سب مسلمان دیندار ہی ہوئے اور دو قسمیں بن کر کوئی فرق نہیں ہوا یہ دیندار اور دنیا دار کا فرق بوجہ جہل بالا حکام کے ہم نے تراش لیا ہے اور جب فرق نہ ہوا تو کیا وجہ ہے کہ دستور العمل الگ الگ رکھا جائے یہ بات جدا رہی کہ حالت عذر وضرورت میں کسی کے لیے کچھ تخفیف کر دی جائے! سو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دستور العمل ہر ایک کے واسطے الگ الگ تجویز کیا جائے۔ دستور العمل تو ایک ہی رہے گا مواقع ضرورت اس سے مستثنیٰ سمجھے جائیں گے بس یہ تو طے ہو چکا ہے کہ دستور العمل سب کا ایک ہے مگر عوام کا ایک شبہ اور وسوسہ اور رہ گیا کہ شاید اس دستور العمل کا نفع مشروط ہو۔ فہم کے ساتھ اور وہ مخصوص ہے خواص کے ساتھ تو ہم کو اس پر چلنے سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ سو یہ خیال اور عذر بھی درست نہیں کیونکہ نفع ان اعمال کا علی حسب استعداد سب کو ہوتا ہے' جیسے تنجن کھانے سے اس شخص کو لذت ہوگی جو اس کی حقیقت اور اجزاء سے واقف اور ماہر ہے

ایسے ہی وہ شخص بھی متلذذ ہوگا جو تنجن کی حقیقت سے بالکل واقف نہ ہو اور اسی طرح اس کا نفع قوت وغیرہ بھی جس طرح اس پہلے شخص کو ہوا ہے اسی طرح اس کو بھی حاصل ہوگا ایسا ہی خیال کرنا چاہیے کہ اعمال حسنہ کے نفس منافع اور برکات سب کے لیے عام ہیں۔ دیم زمین سفرہ عام اوست۔ (روئے زمین اس کا عام دستر خوان ہے) البتہ خواص کے لیے بوجہ زیادہ فہم کے ایک خاص زائد لذت ہوگی اور آخرت میں بھی اس کا ثواب اصل عمل کے ثواب پر زائد ملے گا مگر مقصود میں عوام وخواص سب شریک ہیں۔

مزمل کی تفسیر

اب وہ دستور العمل بیان کیا جاتا ہے اتفاق سے وہ ضروری ہدایات جو اس مبحث کے مناسب ہیں۔ ان آیات میں پورے طور پر جمع ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ: یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا اَوْ زِدْ عَلَیْهِ الآیۃ (اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات کہ اس میں قیام نہ کرو یا نصف سے کچھ بڑھا دو) ہر چند کہ یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم اس کا امت کو بھی شامل اور مزمل کے معنی ہیں چادر اوڑھنے والا۔ چونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی تکذیب سے بہت تکلیف ہوئی تھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو چاہتے تھے کہ یہ کم بخت ایمان لائیں تاکہ نار جہنم سے چھوٹ جائیں اور وہ لوگ ایمان تو کیا لاتے الٹی تکذیب پر کمر باندھ رکھی تھی اور آیات الٰہی سے مسخر اور مقابلہ کیا کرتے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بوجہ شدت غم ورنج وحزن وملال کی چادر اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے اس لیے خاص اس حالت کے اعتبار سے ''یاایها المزمل'' (اے چادر اوڑھنے والے) نداوخطاب میں فرمایا گیا تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گونہ تسلی ہو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص ہجوم اعدا اور ان کے طعن وتشنیع سے پریشان ہو رہا ہو۔ اس وقت اس کا محبوب خاص اسی حالت کے عنوان سے اس کو پکارے جس کے ساتھ اس کا تلبس ہے دیکھئے اس شخص کو کتنی تسلی ہوگی اور اس لفظ کی لذت اس کو کتنی معلوم ہوگی جس کی ایک وجہ یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ محبوب کو میرے حال پر نظر

ہے ایسا ہی یہاں بھی "یایھا المزمل" (اے چادر اوڑھنے والے) کے عنوان سے جو کہ مناسب وقت سے ہے ندا دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین دی گئی ہے اور بعد اس کے بعض اعمال کا حکم دیا جاتا ہے اور ان بعض عارضی احوال پر صبر کرنے کا ارشاد فرماتے ہیں۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: "فَاصْبِرْ عَلٰى مَايَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ" (پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کریں اور اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید میں مصروف ہوں) اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اوپر کی مثال میں اس شخص کا محبوب اس کو یہ کہے کہ میاں تم ہم سے باتیں کرو، ہم کو دیکھو، دشمنوں کو بکنے دو جو بکتے ہیں، آؤ تم ہم سے باتیں کرو، وہ کام کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ایسا تسلیہ بذریعہ وحی کے ہوا مگر امت میں اہل اللہ کو اس قسم کے خطابات وغیرہ بذریعہ الہام اور واردات کے ہوتے ہیں اور اس پر لفظ مزمل کی تفسیر سے ایک مسئلہ نکلتا ہے وہ یہ کہ سابقہ معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر اوڑھنے کی وجہ شدت، ملال وحزن تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال کے لوازم بشریت سے نہیں نکلتا جیسا یہاں پر بوجہ تکذیب مخالفین کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مغموم ہونا معلوم ہوتا ہے یہاں اتنا فرق ہے کہ ہم لوگوں کا غم ایسے مواقع پر بوجہ تنگ دلی و ضعف تحمل کے ہوتا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا غم بوجہ غایت شفقت اور رحم کے تھا۔ آپ اس پر مغموم تھے کہ اگر یہ لوگ ایمان پر نہ آئیں گے تو جہنم میں جائیں گے اس وجہ سے ان پر رحم آتا تھا اور غم پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے: "لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ" (شاید ان کے ایمان نہ لانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان دے دیں گے)

کارپاکاں راقیاس از خود مگیر ‎ ‎ گرچہ ماندر در نوشتن شیر وشیر

(نیک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگر شیر اور شِیر لکھنے میں ایک طرح ہیں مگر معنوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے)

حقوق کی رعایت

مگر یہ بات ثابت ہے کہ کامل باوجود کمال عرفان کے لوازم طبعی سے نہیں نکلتا اور یہی

ہونا بھی چاہیے کیونکہ اگر کسی کو اذیت ومصیبت میں تکلیف جو لازمہ طبعی ہے محسوس نہ ہوتو صبر کیسے متحقق ہوگا کیونکہ صبر تو نام ہے ناگوار چیز پر ضبط نفس کرنے کا اور جب کسی کو کوئی چیز ناگوار ہی معلوم نہ ہو تو ضبط کیا کرے گا۔ البتہ غلبہ حال میں محسوس نہ ہونا اور بات ہے لیکن غلبہ حال خود کوئی کمال کی چیز نہیں ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ بیٹے کے مرنے کی خبر سنی تو قہقہہ لگا کر ہنسے اور آنحضرت کے اپنے بیٹے ابراہیم پر آنسو بہانا ثابت ہے۔ اور یہ فرمانا ہے کہ "انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون" (اے ابراہیم میں تمہاری جدائی سے غمگین ہوں) اب اگر ظاہر میں کسی شخص کے سامنے یہ دونوں قصے بیان کردیئے جائیں اور یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ یہ قصہ کس کا ہے اور وہ کس کا تو ظاہر بات ہے کہ یہ شخص پہلے بزرگ کو جنہوں نے قہقہہ لگایا زیادہ باکمال سمجھے گا حالانکہ یہ مسئلہ مسلم و بدیہی ہے کہ ولی کسی حال میں نبی سے نہیں بڑھ سکتا اور یہ بھی مسلم ہے کہ اولیاء کے کمالات انبیاء کے کمالات سے مستفاد ہیں سو دراصل ان دونوں قصوں کی حقیقت یہ ہے کہ اس ولی کی نظر میں صرف حقوق حق پر تھی، حقوق عباد و اولاد کی اہمیت اس کے قلب سے مستور تھی اس واسطے حقوق عباد کا اثر ظاہر نہیں ہوا جو ترحم کی وجہ سے غم پیدا ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر دونوں حقوق پر تھی۔ حقوق حق پر بھی اور حقوق عباد پر بھی۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت سے تو صبر کیا اور جزع فزع نہیں کیا اور حقوق عباد یعنی ترحم علی الاولاد کی وجہ سے آنسو جاری ہوئے سخت دلی نہیں کی۔ "انما یرحم اللّٰہ من عبادہ الرحماء" (اللہ تعالیٰ رحم دل بندوں پر رحم کرتا ہے) اس کی ایک مثال ہے مثلاً آئینہ کے دیکھنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو ضرورت سے خریداری وغیرہ کے لیے صرف آئینہ کو دیکھتے ہیں اس کی موٹائی چوڑائی شفافیت پر ان کی نظر ہوتی ہے یہ مثال ہے محجوبین غافلین اہل صورت کی اور ایک وہ کہ صرف اس چیز کو دیکھتے ہیں جو کہ آئینہ میں منعکس ہوتی ہے اور آئینے کو نہیں دیکھتے یہ مثال ہے غیر کاملین مغلوب الحال لوگوں کی یہ غلبہ حال سے مظہر کو نہیں دیکھتے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں اور ایک وہ جو آئینہ اور صورت منعکسہ دونوں کو دیکھتے ہیں اور دونوں کی حقوق کی رعایت کرتے

ہیں اس کو جمع الجمع کہتے ہیں یہ شان ہے انبیاء علیہم السلام اور عارفین کاملین کی کہ حقوق حق کی رعایت کے ساتھ حقوق عباد کی رعایت بھی ان کا نصب العین رہتی ہے یہ لوگ جامع ہیں۔

بر کفے جام شریعت در کفے سندا اۓ عشق ہر ہوسناکے نادند جام سندان باختن

(ادھر شریعت کا خیال، ادھر عشق (باطن) کا خیال شریعت اور عشق کے مقتضاء پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے)

ایسی باریکیوں کو سمجھنے کے واسطے بڑی فہم کی ضرورت ہے ورنہ ظاہر میں تو نا گوار نہ گزرنا زیادہ کمال معلوم ہوتا ہے بہ نسبت نا گوار گزرنے کی۔

نفس کی حیلہ سازی

اسی طرح دوسری کیفیات وجدانیہ کے تفاضل میں اس قسم کی غلطی واقع ہوتی ہے کہ بعض باتیں کمال سمجھی جاتی ہیں حالانکہ اسمیں کوئی نقص خفی ہوتا ہے جیسے مبالغہ فی التواضع کو بعض دفعہ مقتضی ہوجاتا ہے ناشکری کی طرف کیونکہ اسمیں الہام ہوتا ہے انکار نعمت کا ایسا ہی بعض آدمی کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے ذکر شغل کیا مگر کچھ نہیں ہوا اور سمجھتے ہیں کہ یہ کہنا انکساری ہے حالانکہ علاوہ ناشکری نعمت ذکر کے اس میں ایک نقصان بھی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذکر و شغل کو اس قابل سمجھا کہ اس کو قبول کیا جائے اور اس کے صلہ میں ان کو بڑا رتبہ دیا جائے اور یہ کبر ہے۔ یہ نفس کے بڑے بڑے مکر ہیں ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ذکر خود ایک مستقل نعمت ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اگر کوئی خادم اس قسم کی شکایت کرتا تو آپ فرماتے خود ذکر کی توفیق ہونا کیا تھوڑی نعمت ہے جو دوسرے ثمرات کی تمنا کرتے ہو اور اکثر ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

یابم اورا یانیابم جستجوۓ میکنم حاصل آید یانیاید آرزوۓ میکنم

(اس کو پاؤں یا نہ پاؤں جستجو کرتا ہوں ملے یا نہ ملے آرزو کرتا ہوں)

بودے اگر ایں ہم نہ بودے الخ۔ (مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتا) کسی خادم نے حضرت سے بیان کیا تھا کہ میں نے اب کے چلہ کھینچا اور روزانہ سوا لاکھ اسم ذات پڑھا مگر

کچھ فائدہ نہ ہوا۔ شاید حضرت مجھ سے ناراض ہیں کہ ثمرہ نہیں ملا۔ فرمایا اگر میں ناراض ہوتا تو تمہیں سوا لاکھ پڑھنے کی توفیق ہی کہاں ہوتی اور یہ ثمرات کے طالب ایک اور بہت بڑی غلطی میں ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ ثمرات اصل مقصود ہیں اور اعمال مقصود **بالغرض** اور یہ سخت غلطی میں ہیں، اعمال خود مقصود بالذات ہیں اور اصل ثمرہ ان کا **حصول رضا دخول** جنت دیدار خداوندی ہے۔ افسوس ہے کہ طالب ثمرات عشق میں مجنوں سے **بھی** کم ہیں وہ تو لیلیٰ کے نام کی مشق کو بڑا مقصود سمجھ رہا ہے مگر یہ لوگ دوسری چیزوں کی تلاش میں ہیں کیا مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے بھی کم ہے۔

دید مجنوں رایکے صحرانورد — دربیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتان قلم — مے نمودے بہرکس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں — می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق لیلیٰ میکنم — خاطر خود راتسلی مے دھم

(کسی نے مجنوں کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے اور ریت پر انگلیوں سے کسی کو خط لکھ رہا ہے اس نے دریافت کیا اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر کے اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں)

ہمینم بس کہ داند ماہ رویم — کہ من نیز از خریداران اویم

(یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جان لے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں سے ہوں)

کبھی ثمرات کا قصد مت کرو یہ تو ایک قسم کی مزدوری ہوئی جو کہ عشق محبت کے سراسر خلاف ہے۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو بندگی فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط سے مت کر کہ آقائے حقیقی بندہ پروری کا طریقہ خود جانتے ہیں)

رضا اور ثمرات

ایک عارف کو غیب سے آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں ہوتی انہوں نے اس پر

بھی عبادت کو نہ چھوڑا بلکہ بدستور اسی طور پر پھر بھی عبادت کرتے رہے کسی نے ان سے کہا کہ جب تمہاری عبادت قبول نہیں ہوتی تو پھر اس کے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کیا اچھا جواب دیا بھائی کہ اگر اور کوئی دروازہ ہوتا تو اس کو چھوڑ کر اس طرف چلے جاتے۔ جب دوسرا دروازہ ہی نہیں پھر اور کہاں جائیں اور کیا چارہ کریں۔

توانی ازاں دل پرداختن کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن

(اس شخص سے دل خالی کر سکتے ہو جس کے متعلق معلوم ہو کہ بغیر اس کے گزر کر سکتے ہو)

بس معاً غیب سے آواز آئی کہ جب ہمارے سوا اور کوئی نہیں تو خیر جیسی کچھ ہے وہی قبول ہے۔

قبول است گرچہ ہنر نیستت کہ جز ماپنا ہے وگر نیستت

(قبول ہے اگر چہ تمہارا اس میں کمال نہیں بجز اس بات کے کہ تو نے کہہ دیا کہ ہمارے سوا تیری کوئی جگہ پناہ کی نہیں ہے)

عبادت میں تو بجز رضائے خدا کے اور ثمرات کا طلب کرنا یہی اخلاص کے بالکل خلاف ہے۔ "وَمَآاُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" (ان لوگوں کو یہی حکم کیا گیا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادات اسی کے لیے خاص رکھیں)

از خدا غیر خدا راخواستن ظن افزونیست کلی کاستن

(خدا کا نام دوسری چیز کے مانگنے کی نیت سے لینا تنزلی ہے اللہ کا نام اس واسطے ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوں)

بدردو صاف ترا حکم نیست دم درکش کہ انچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

(دردو صاف یعنی قبض وبسط تجویز کرنے کا تم کو کچھ حق نہیں جو کچھ ساقی نے عطا کر دیا اس کی عین عنایت ہے)

میلان معصیت

اوپر جو بیان ہوا ہے کہ کامل لوازم بشریہ سے نہیں نکلتا اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوئی ہے کہ طبیعت کا میلان انسانی خواہشوں کی طرف یہ ایک امر طبعی ہے۔ سو طبیعت کا میلان اگر کسی معصیت کی طرف ہو یہ منافی کمال نہیں۔ بعض لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ

میلان کو بھی مقبولیت وتقویٰ کے خلاف سمجھتے ہیں اور پھر جی میں کڑتے ہیں اور قلب کی ساری توجہ اسی فکروغم میں مصروف کر دیتے ہیں مثلاً پہلے کسی کے ساتھ تعشق تھا پھر اللہ نے توفیق توبہ کی عطا فرمائی اور وہ تعلق نہ رہا اب اگر حصول کمال کے بعد کبھی طبیعت کی رغبت اس طرف معلوم ہونے لگے تو پریشان ہوتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ میلان بھی تقویٰ کے خلاف ہے۔ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ خود معصیت تو خلاف تقویٰ ہے۔ میلان معصیت اس کے خلاف نہیں۔ میلان معصیت بعض اوقات بعد کمال کے بھی زائل نہیں ہوتا اس کے زوال کی فکر فضول ہے ہاں البتہ کاملین اور دوسرے میں یہ فرق ہے کہ کاملین کا میلان غیر ثابت اور مغلوب ہوتا ہے تھوڑے سے تذکرے سے زائل ہوجاتا ہے۔ جناب باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''اذا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَاهُمْ مُبْصِرُوْنَ'' (جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو وہ اللہ کی یاد میں لگ جاتے ہیں' یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) اور اس سے پہلے ''وامّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ'' (اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے) اور متوسطین اہل سلوک کا میلان ذرا شدید ہوتا ہے دل کو بہت تنگی پیش آتی ہے اور مجاہدہ سے مغلوب ہوتا ہے اور مجوبین کا میلان ادھر غالب ہوجاتا ہے اور حقیقت میں اگر میلان نہ رہے تو معاصی سے بچنا کوئی کمال ہی نہیں اور میلان میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔

مجاہدہ اور ترقی

اور مجاہدہ سے ترقی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ملائکہ کو ان مدارج میں ترقی نہیں ہے کیونکہ ان میں مجاہدہ متصور نہیں اور بشر میں مجاہدہ بوجہ میلان اور رغبت معاصی کے متصور ہے اس لیے ان کے مدارج میں بسبیل لاتقف عند حد ترقی ہوتی رہتی ہے۔ حکیم ترمذی ایک بزرگ گزرے ہیں جوانی میں ان پر ایک عورت عاشق ہوگئی تھی اور ہر وقت ان کی تلاش اور جستجو میں رہتی۔ آخر کار ایک دن موقع پر ایک باغ میں ان کو دیکھا اور وہ باغ چاروں طرف سے چار دیواری کی وجہ

سے بند تھا۔ وہاں پہنچ کر ان سے اپنے مطلب کی درخواست کی' یہ گھبرائے اور گناہ سے بچنے کی غرض سے بھاگ کر دیوار سے کود پڑے' اس قصہ کے بعد ایک روز بڑھاپے کے زمانے میں وسوسے کے طور پر خیال آیا کہ اگر میں اس عورت کی دل شکنی نہ کرتا اور اس کا مطلب پورا کر دیتا اور پیچھے توبہ کر لیتا تو یہ گناہ بھی معاف ہو جاتا اور اس کی دل شکنی بھی نہ ہوتی۔

قرب عہد نبوت

اس وسوسہ کا آنا تھا کہ بہت پریشان ہوئے اور روئے

بردل سالک ہزاران غم بود   گر خلالے از بہارش کم شود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم طاری ہوتے ہیں اگر ذرہ بھر بھی اس کی باطنی حالت میں کمی ہوتی ہے)

اور اس پر قلق ہوا کہ جوانی میں تو اس گناہ اور کوشش سے بچتا رہا اور آج بڑھاپے میں یہ حال ہے اور یہ سمجھے کہ جو کچھ میں نے اعمال اشغال کئے ہیں وہ سب غارت اور اکارت گئے اس پر حکیم موصوف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ اے حکیم کیوں غم کرتے ہو' تمہارا درجہ وہی ہے اور جو کچھ تم نے کیا وہ ضائع نہیں ہوا اور اس وسوسہ کی یہ وجہ تھی کہ یہ زمانہ وسوسے کا میرے زمانہ سے دور ہو گیا تھا اور اس گناہ سے بچنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ زمانہ میرے زمانے سے قریب تھا اور قرب عہد نبویؐ میں برکت ہے۔ ایک بزرگ اسی وجہ سے باسی روٹی کو پسند فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قریب ہے اور تازی میں کسی قدر بعد آ گیا ہے۔ سبحان اللہ جب قرب عہد نبوت میں یہ برکت ہے تو ارشادات نبوتؐ پر عمل کرنے میں کیسی برکت ہوگی۔ ایک مولوی صاحب طبیب بھی تھے مجھ سے اپنا قصہ بیان فرماتے تھے کہ میں بیمار ہوا' بخار تھا' ہر چند علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا' آخر کار میں نے ایک حدیث کے مطابق جس میں بخار کا علاج غسل سے آیا' نہر میں غسل کیا۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے بعد مجھے اور بیماریاں تو ہوئیں مگر بخار کبھی نہیں ہوا۔ ہر چند کہ بعض شراح اس علاج غسل کو غیر مادی بخار کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں مگر اہل عقیدت کے لیے سب اقسام کو عام ہے علاوہ

ازیں یہ مسئلہ طبیہ ہے کہ دوا معین ہے غافل نہیں۔ سو اہل عقیدت کی طبیعت میں اس عمل سے قوت ہوگی اور وہ اپنی قوت سے فعل کرے گی۔ حکیم ترمذی کے اس قصہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ باوجود میلان کے ان کو میلان معصیت کا ہوا اور ان کے کمال کی تصدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رویائے صادقہ میں فرمائی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو شیوخ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز بتلا دیجئے کہ کبھی ہم میں برے کام کی رغبت ہی پیدا نہ ہو، یہ بالکل غلطی ہے اور منشاء اس کا نام واقفی ہے۔

لوازم بشریہ

انسان جب تک زندہ ہے لوازم بشریہ سے چھوٹ نہیں سکتا، کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ وسوسہ اور خیال آ ہی جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کسی عورت کے دیکھنے وغیرہ سے اس کی طرف میلان یا وسوسہ معلوم ہو تو اپنے گھر میں بیوی سے رفع حاجت کرے کیونکہ "**ان الذین معها مثل الذی معها**" (جو چیز اس عورت کے پاس ہے اس کی بیوی کے پاس بھی ہے) اس علاج سے وہ طبیعت کا میلان دور ہو جائے گا۔ اطباء نے بھی تعشق کا علاج تزوج لکھا ہے اگر خاص معشوقہ سے ہو تو بہت ہی بہتر ہے ورنہ غیر جگہ سے نکاح کرنے سے دوسرے تعشق میں کمی آ جاتی ہے۔ باقی تھوڑا بہت میلان تو تمام عمر رہتا ہے اگر اس کے مقتضی پر عمل نہ ہو تو اس کی فکر نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس کی طرف توجہ کرنے سے اور اس فکر میں پڑنے سے وہ اور بڑھے گی اور تنگی پیش آئے گی اور سالک اس جھگڑے میں پھنس کر مطالعہ محبوب سے غافل ہو جائے گا اور انسان صرف مطالعہ محبوب ہی کے لیے پیدا ہوا ہے اس کو دوسری جانب اتنی توجہ ہی نہ کرنا چاہیے۔ اگر ان باتوں کی طرف طبیعت کو نہ لگایا جائے گا یہ آپ سے آپ دور ہو جائے گی۔ بالخصوص وسوسہ کا علاج تو یہی ہے کہ اس کی طرف خیال نہ کرنے اور اپنی توجہ ذکر کی طرف رکھے اس سے وہ وسوسہ خود بخود جاتا رہتا ہے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وسوسہ کا آنا کوئی نقصان کی بات نہیں ہے اس کی وجہ سے جو تنگی پیدا ہوتی ہے وہ موجب تصفیہ قلب ہو جاتی ہے اور اس کے دور کرنے میں جو مجاہدہ ہوتا ہے اس سے رفع درجات ہوتا ہے اور جو جو بیان کیا گیا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے اوپر بدگمانی کرے اور ان باتوں کی

طرف زیادہ التفات نہ کرے اور زیادہ موشگافی اور باریک بینی سے کرید کرید عیوب کو نہ دیکھے۔ یہ خواص اہل طریق کے واسطے ہے کیونکہ وہ اس طرف لگ کر مطالعہ محبوب سے غافل ہو جائیں گے باقی عوام کو بے فکر ہونا نہ چاہیے کیونکہ اگر وہ اپنے عیوب کی نگہداشت اس مستعدی سے نہ کریں گے تو اور بڑے بڑے گناہوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔

آداب تعلقات

اب ندائے "یاایھا المزمل" (اے چادر میں لپٹنے والے) کے بعد احکام کا بیان ہوتا ہے۔ حاصل احکام یہ ہے کہ تعلق دو طرح کے ہیں ایک خالق کے ساتھ دوسرا مخلوق کے ساتھ۔ اور یہ تعلق دو قسم کا ہے موافق کے ساتھ اور مخالف کے ساتھ' اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: "قُمِ اللَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلاً" (نماز میں رات کو کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی رات) اس میں ایک تو قیام وطاعت ادب تعلیم کیا ہے اور اس کے ساتھ اقتصاد (میانہ روی) کا ارشاد فرمایا ہے۔ ادب یہ کہ قیام لیل کے لیے وہ وقت مقرر فرمایا گیا ہے جو کہ نہ بھوک کی تکلیف کا وقت ہے اور نہ معدہ کی پری کا وقت ہے کہ طبیعت میں گرانی اور بوجھ ہو اور قیام میں کدورت ہو بلکہ ایسا وقت دونوں تکلیفوں سے خالی ہے اور طبیعت میں نشاط اور سرور ہوتا ہے اور اسمیں شبہ بالملائکہ بھی ہوتا ہے کیونکہ انکی یہی شان ہے کہ نہ بھوک لگے نہ کھانے سے گرانبار ہوں اور نیز رات کے وقت یکسوئی ہوتی ہے اور اقتصاد یہ کہ ساری رات کے قیام کا حکم نہیں دیا کیونکہ اس میں سخت تعب ہوتا ہے بلکہ کچھ حصہ سونے کے لیے بھی رکھا گیا ہے اور چونکہ ہر وقت ہر حالت اور ہر شخص کے لیے ایک مقدار متعین نہیں ہو سکتی اس لیے او تخییر یہ سے نصف اور ثلث اور دو ثلث میں جو مفہوم ہے "انقص منه قليلا اوزد عليه" (اس نصف سے کسی قدر کم یا نصف سے بڑھا دو) کا جیسا دوسرے رکوع سے معلوم ہوتا ہے' اختیار دے کر مخاطب کی رائے پر چھوڑا گیا کہ اگر زیادہ قیام نہ ہو سکے تو تھوڑا ہی سہی۔

تہجد کی حدود

حدیث میں ہے "وشیٔ من الدلجة" اس اقتصاد میں ایک یہ بھی حکمت اور مصلحت

ہے کہ توسط میں دوام ہوسکتا ہے اور افراط میں دوام نہیں رہ سکتا اور پہلے یہ قیام لیل کے کہ مراد تہجد ہے، فرض تھا۔ بعد اس کے فرضیت منسوخ ہوکر منسوخیت باقی رہ گئی اور اقرب الی الدلیل تہجد کا سنت موکدہ ہونا ہے تہجد سے محروم رہنے والوں کو اکثر غلطیاں ہورہی ہیں، بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تہجد صرف اخیر ہی شب ہوتا ہے اور اس وقت اٹھنا دشوار ہے اس لیے انہوں نے چھوڑ رکھا ہے۔ یاد رکھو کہ اگر اخیر شب میں نہ اٹھ سکے تو اول شب میں بھی وتر سے پہلے تہجد پڑھنا جائز ہے۔ بعضے یہ سمجھ رہے ہیں کہ تہجد کے بعد سونا نہیں چاہیے اور سونے سے تہجد جاتا رہتا ہے۔ یہ لوگ اس لیے نہیں اٹھتے، یہ بھی غلطی ہے۔ تہجد کے بعد سونا بھی جائز ہے۔ غرض اہل سلوک کے لیے یہ عمل تہجد کا بھی ضروری ہے اور اگر کبھی قضا ہوجائے تو زیادہ غم میں نہ پڑھے، تہجد کی قضاؤں میں کرلے۔ اس آیت سے یہی مراد ہے: ''وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَاَنْ يَّذَّكَّرَا'' الخ (وہ ایسا ہے کہ اس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے بنائے اور یہ سب دلائل اس کے لیے ہیں جو سمجھنا چاہے) بعض لوگوں کا اگر تہجد قضا ہوجائے تو حد سے زیادہ پریشان ہوجاتے ہیں اور کراہتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ہمارا تہجد کبھی قضا نہ ہوا تھا یہ کیا ہوگیا۔ یاد رکھو اتنی پریشانی کا انجام بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ بجائے مطالعہ کے محبوب اپنے مطالعہ میں مشغول ہوجاتے ہیں حالانکہ اس غم میں لگ کر اصل ذکر سے جو کہ مقصود ہے رہ جاتے ہیں اور انسان مطالعہ محبوب کے لیے پیدا ہوا ہے اس کو غیر میں مشغول نہ ہونا چاہیے۔ ماضی و مستقبلت پردہ خدا است۔ (ماضی اور مستقبل بندہ اور خدا کے درمیان حجاب ہے) غرض نفس کو پریشانی میں زیادہ مبتلا نہ کیا جائے اور تجربہ ہے کہ بعض اوقات آسانی رکھنے سے نفس خوشی سے کام دیتا ہے اور تنگی اور بوجھ ڈالنے سے پہلا کام بھی چھوٹ جاتا ہے اس لیے بہت تنگی نہ کرو کہ مزدور خوش دل کند کار بیش بعض محققین کا قول کہ ذاکر شاغل کو مرغن کھانا چاہیے ورنہ ضعف ہوجائے گا اور کسی وقت بے کار ہوجائے گا۔ خوب کھاؤ، پیو اور اس سے کام لو البتہ یہ یاد رہے کہ کھانے پینے میں ایسی زیادتی نہ ہو کہ کسل ہوجائے یا بیماری ہوجائے، بیمار ہوکر اور خرابی میں پڑ جائے، اسی لیے ''کلوا واشربوا'' (کھاؤ اور پیو) کے ساتھ ''ولا تسرفوا'' (اور حد سے نہ نکلو) بھی فرمایا

ہے حضرات اہل بیت میں سے کسی بزرگ کا قصہ ہے کہ ان سے کسی نصرانی حکیم نے پوچھا تھا کہ قرآن کو کتاب جامع کہتے ہیں کہ اس میں طب کی ضروری چیز ہے نہیں' فرمایا اصل طب موجود ہے "کلوا وشربوا ولاتسرفوا" وہ دنگ رہ گیا۔ بطور جملہ معترضہ کے یاد آ گیا کہ غالب جو ایک آزاد شاعر ہے اس نے اپنے مذاق پر یہ شعر کہا تھا:

ہم توبہ جب کریں گے شراب و کباب سے

جب آ گے "کلوا وشربوا ولاتسرفوا" نہ ہوا ایسا ہی روحانی تنگی قبض حزن وغیرہ سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے کیونکہ اس میں بھی تزکیہ نفس ہوا کرتا ہے۔

توسط کے ضرورت

خاص کر وسوسہ کی طرف تو التفات بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ در پے ہونے سے اس میں اور بھی ترقی ہوتی ہے محقق اس کی طرف تو التفات بھی نہیں کرتا اور وسوسہ کے پیچھے پڑنے میں اس کے سوا اور بھی بہت خرابیاں ہیں اسی ایک وسوسہ سے اور شاخیں نکلنی شروع ہوتی ہیں اور رہا غم سو وہ الگ ہے اور غم کی وجہ سے اصل ذکر و شغل کا فوت ہونا یہ الگ ہے ایسا ہی استغفار اور توبہ کے وقت معاصی کے تذکر و استحضار میں ایک قسم کا توسط ہونا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب گناہوں کی پوری فہرست پڑھنے بیٹھ جاؤ۔ صرف اجمالی طور پر سب گناہوں سے توبہ کرے ہر گناہ کا نام ضروری نہیں۔ حدیث میں ہے: "**وما انت اعلم به مني**" (اور وہ گناہ بھی جن کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں) اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے اس میں سب گناہ آ گئے اگرچہ یاد نہ آئیں کیونکہ اس سوچ میں وقت ضائع کرنا' مطالعہ محبوب سے غافل ہونا ہے البتہ جو خود یاد آ جائے اس سے بالخصوص توجہ کر لے ایک شخص کا ذکر ہے۔ رمی جمار کے وقت وہاں جوتیاں مار رہا تھا اور ایک ایک گناہ گن کر شیطان کو گالیاں دیتا تھا اور مارتا تھا' سو یہ لغو ہے' ہر ایک گناہ کا نام لینا اور تلاش اور سوچ میں عمر عزیز کا جو دراصل مطالعہ محبوب کے لئے تھی اس سوچ بچار میں کھونا نہ چاہیے۔

عمر عزیز قابل سوز وگداز نیست   ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

(عمر عزیز مفت نہ ضائع کرنی چاہیے' یہ رشتہ دراز نہیں اس کو مت جلاؤ)

اہل سلوک کو بالخصوص اس کا خیال بہت ضروری ہے کہ مطالعہ محبوب سے غفلت نہ ہو۔ واقع میں عارف ہی کی نظر امور تک پہنچتی ہے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی خادم نے اس بات کا افسوس ظاہر کیا کہ اب کی بیماری کی وجہ مدت تک حرم میں حاضر ہونا نصیب نہ ہوا۔ آپ نے خواص سے فرمایا کہ اگر یہ شخص عارف ہوتا تو اس پر کبھی افسوس نہ کرتا کیونکہ مقصود قرب حق ہے اور اس کے لیے جس طرح نماز حرم میں ایک طریق ہے اسی طرح اس کے لیے مرض بھی ایک طریق ہے تو بندہ کا کیا منصب ہے کہ اپنے لئے خود ایک طریق متعین کرے یہ مربی کے اختیار میں ہے۔ طبیب کی تجویز مریض کی تجویز سے ہزار درجہ زیادہ بہتر ہے۔

بدرد صاف ترا حکم نیست دم درکش　　　که هر چه ساقی ماریخت عین الطاف است

(درد و صاف یعنی قبض و بسط کی تجویز کا ہم کو حق نہیں جو کچھ عطا ہو جائے تربیت باطنی کے لیے وہی مصلحت اور وہی عین لطف ہے)

یہ سب بیان تھا قیام لیل اور اس کے آداب کا اقتصاد کے ساتھ

اہمیت تلاوت و نماز

اب دوسرا معمول اہل سلوک کا مذکور ہوتا ہے "وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا" ترتیل کے معنی ہیں تھام تھام کر پڑھنا' صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک یہ بھی طریق حصول نسبت کا تھا کہ قرآن اور نماز پر مداومت اور محافظت کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں دریافت کرنا کہ آجکل کے صوفیاء کے طریقوں میں سے کون سا طریقہ آپ کے موافق ہے اور اس کے جواب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ ارشاد کہ ہمارے زمانے میں تقرب کا ذریعہ ذکر کے ساتھ قرآن اور نماز بھی تھا اور اب صرف ذکر پر اکتفا کر لیا ہے۔ مشہور ہے اور اس تغیر کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قلوب بہ برکت صحبت نبویؐ اس قابل تھے کہ

ان کواور قیود کی جو بعد میں حادث ہوئیں ضرورت نہ تھیں۔ ان کے میں صحبت نبویؐ کے فیض سے خلوص پیدا ہو چکا ہے۔ وہ حضرات تلاوت قرآن اور کثرت نوافل سے بھی نسبت حاصل کر سکتے تھے۔ ان کو اذکار کے قیود زائد کی حاجت نہ تھی۔ برخلاف بعد کے لوگوں کے کہ ان میں وہ خلوص بدون اہتمام کے پیدا نہیں ہوسکتا اس لیے صوفیاء کرام نے کہ اپنے فن کے مجتہد گزرے ہیں اذکار اشغال خاصہ اوران کی قیود ایجاد کیں اس وجہ سے کہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ خلوت میں جب ایک ہی اسم کا بتکرار ورد کیا جاتا ہے اوراس کے ساتھ ضرب و جہر وغیرہ قیود مناسبہ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے اوراس تاثیر نفس وقلب میں اوقع واثبت ہوتی اور رقت وسوز پیدا ہوکر موجب محبت ہوجاتا اور محبت سے عبادت میں اخلاص پیدا ہوجاتا ہے اور اللہ عبادت خالص کا حکم فرماتے ہیں: ''وَمَآاُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَاُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ. الخ'' (ان لوگوں کو یہی حکم کیا گیا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو صرف اسی کے لیے خاص رکھیں) وغیرہ من الآیات۔ پس معلوم ہوا کہ حضرات صوفیاء نے یہ قیود ذکر کر کے بطور معالجہ تجویز فرمائے' اور اصل مقصد وہی اخلاص ہے پس اگر کسی شخص کو ان قیود سے مناسبت نہ ہو یا بغیر ان قیود کے کسی کو اذکار مسنونہ نوافل و تلاوت قرآن میں پورا اخلاص پیدا ہوسکتا ہے تو صوفیاء کرام ایسے شخص کے لیے ان قیود کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ پس اب معلوم ہوگیا کہ یہ تمام قیود واصلاح وتقویت کے واسطے علاجاً تجویز کئے گئے ہیں۔ کوئی شرعی امر قربت مقصودہ نہیں سمجھا جاتا جو بدعت کہا جائے۔ الحاصل یہ دوسرا دستور العمل تھا۔ اہل سلوک کے واسطے یعنی تلاوت قرآن۔ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں: ''اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَيْكَ قَوْلاً ثَقِيلاً'' (ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں) اس کو ماقبل سے اس طور پر ربط ہے کہ مراد تو قولاً ثقیلاً اسے وحی ہے جو کہ ثقیل تھی اور نماز اور تلاوت قرآن مجید کی مزاولت سے قوت احتمال اثقال وحی کی پیدا ہوگئی اس لیے پہلے نماز اور تلاوت کا حکم فرمایا' پھر اِنَّا سَنُلْقِی الخ میں وحی کا وعدہ کیا۔ اب اس کی تحقیق کہ نزول وحی کے وقت ثقل معلوم ہونے کا کیا سبب تھا۔ سو یہ امر معقول متوسط سے

خارج ہے۔ باقی روایات سے ثقل ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ نزول وحی کے وقت اونٹنی کا بیٹھ جانا اور ایک صحابی کا یہ قول کہ نزول وحی کے وقت (جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ران ان کی ران پر تھی) یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری ران بیٹھی جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت شدت سرما میں بھی نزول وحی کے وقت پسینہ آجاتا اس ثقل کے آثار روایات میں وارد ہیں اور ان آیات میں کہ "اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَکَ" (کیا ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر سینہ کشادہ نہیں کر دیا اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ بوجھ اتار دیا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر توڑ رکھی تھی) یہ شرح صدر اور وضع وزر جو موجب نقض ظہر تھا میرے نزدیک اسی طرف اشارہ ہے اور آیت "لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ" (اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے) الخ اس معنی میں بھی بہت ہی صاف ہے اور نماز اور تلاوت اور ذکر کی مزاولت اور کثرت سے قوت کا پیدا ہونا اور ثقل وحی کے احتمال کی طاقت پیدا ہو جانا اس طور پر ہے کہ چونکہ ذکر وغیرہ سے واردات اور فیوض غیبیہ علمی و عملی قلب پر فائض ہوتے ہیں ان کے ورود سے قلب میں بتدریج قوت پیدا ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے شدت و ثقل کا مقابلہ اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے چنانچہ اہل تلوین کا اضطراب اور اہل تمکین کا استقلال اسی وجہ سے ہے کہ پہلے قلب میں قوت تحمل کی نہ تھی پھر ذکر کی کثرت سے احتمال اثقال کی طاقت آ گئی اور اسی شعر میں ان ہی واردات میں سے بعض کا ذکر ہے:

بنی اندر خود علوم انبیاء   بے کتاب و بے معید واوستا

(اپنے اندر بغیر کتاب و معاون اور استاد کے حضرات انبیاء علیہم السلام سے جیسے علوم دیکھو گے)

اور یہ حالات واردہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ کبھی ذوق، شوق و سرور انبساط ہوتا ہے کبھی حزن و انقباض ہوتا ہے۔ بسط کے الگ فائدے ہیں اور قبض کے علیحدہ مصالح اور سب محمود ہیں کیونکہ قبض میں بھی تزکیہ نفس و اصلاح عجب ہوتی ہے۔

چونکہ قبض آمد تو دردے بسط بیں   تازہ باش چیں میفگن برجبیں

چونکہ قبض آید اے راہرو آں صلاح تست آیش دل مشو

(جب قبض پیش آئے اس میں بسط کا ملاحظہ کرو خوش وخرم رہو پیشانی پر بل مت ڈالو جب تم کو قبض کی حالت پیش آئے وہ تمہاری اصلاح باطنی کے لیے ہے اس سے رنجیدہ مت ہو)

تام توجہ الی اللہ

آگے ارشاد ہوتا ہے: "اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَاَقْوَمُ قِيْلاً"، (بے شک رات کے اٹھنے میں دل و زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور بات خوب ٹھیک نکلتی ہے) اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ رات کو اٹھنے کے وقت چونکہ شور وشغب سے سکون ہوتا ہے اور افعال معاش کا بھی وقت نہیں ہوتا۔ اس لیے قلب میں یکسوئی ہوتی ہے اور اس لیے اس وقت جو کچھ زبان سے پڑھا جاتا ہے دل کو اس سے بہت تاثیر ہوتی ہے اور جو کچھ کیا جاتا ہے اس کا اثر قوی ہوتا ہے تو گویا اس وقت آیات میں اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ الخ مضمون آیت "اقبل قم اللیل او رتل القرآن الخ" کی تعلیل ہے کہ اس وقت بوجہ ان اسباب کے حضور قلب زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا قیام لیل وترتیل کا فائدہ اس وقت پورے طور سے حاصل ہوگا اور حضور قلب کے متعلق ایک طرف تجربہ سے معلوم ہوا ہے وہ یہ کہ مبتدی ہر ہر لفظ پر بتکلف مستقل ارادہ کرے۔ اسی طرح الفاظ پر توجہ رہنے سے حضور حاصل ہو جاتا ہے اور بعد چندے ملکہ ہو جاتا ہے' زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی اور منتہی کو ملاحظہ ذات سے حضور میسر ہو سکتا ہے ابتداء میں یہ مشکل ہے کیونکہ مبتدی کو غائب کا تصور جمتا نہیں اور منتہی ذات کا ملاحظہ رکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: "اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلاً"، پہلے بطور حکمت کے بیان ہوا ہے کہ تہجد اور قرآن پڑھا جائے کیونکہ اس وقت اہل کا اثر زیادہ ہوگا اب اس کے علاوہ ایک اور وجہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو دن میں اور کام بھی رہتے ہیں ان کی وجہ سے خاص قسم کی توجہ الی اللہ تام نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہ وقت شب کا کہ مصروفیت سے خالی ہے تجویز کیا گیا اور وہ کاروبار یہ ہے مثلاً تبلیغ دین' تربیت خلائق' حوائج ضروریہ' لازمیہ بشریت ہر چند کہ تبلیغ دین اور تربیت خلائق خود بھی دین ہے

لیکن چونکہ ان میں ایک قسم کا تعلق مخلوق سے ہوتا ہے جو لہٰذا اس میں خاص قسم کی توجہ الی اللہ پورے طور پر نہیں ہوسکتی۔ جیسی خاص خلوت میں ہوسکتی ہے۔ یہاں سے بھی اس اوپر والی بات کی تائید ہوتی ہے کہ انسان باوجود کمال کے بھی لوازم بشریہ سے بالکل نہیں چھوٹ سکتا' دیکھئے آیت صاف دلالت کررہی ہے کہ نہار کا صبح طویل یکسوئی سے ایک درجہ میں آپ کو بھی مانع ہوجاتی ہے اور چونکہ آپ کے تمام احوال کامل ہیں اس سے معلوم ہوا کہ خلق کی طرف مشغول ہونا منافی کمال نہیں پس صاحب کمال پر بھی ہروقت یکساں حالت نہیں رہتی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آپ کو اس بناء پر منافق کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ اور حالت ہوتی ہے اور پیچھے کچھ اور اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حالت تو ہماری بھی یہی ہے آخر یہ قصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچا اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ولکن یا حنظله ساعة ساعة ایک گھڑی کیسی۔ ایک گھڑی کیسی اور درحقیقت اگر ہروقت وہی حالت تجلی کی رہے خود جسمانی ترکیب بھی ٹھیک نہ رہے اور تعطل ہوگا کیونکہ حالت علیہ میں انتظام تغذیہ وغیرہ کا ممکن نہیں پھر اس فنا کی نوبت آجائے گی ونعم ما قیل

چو سلطان عزت علم برکشد	جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے تو سب چیزیں فنا ہوجاتی ہیں)

جدت اور لذت

دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ ذوق لذت جب ہی آتی ہے کہ اس حالت میں دوام نہ ہو ورنہ دوام سے عبادت ہوجائے گی اور لذت جو بسبب جدت کے معلوم ہوتی ہے نہ رہے گا کل جدید لذیز اس کے علاوہ ایک اور حکمت بھی ہے وہ یہ کہ غلبہ استغراق میں قصد نہ رہے گا اور بلا مقصد کے اعمال کا اجر نہیں اور بلا اعمال قرب نہیں ملتا اور اعمال ہی دنیا میں مقصود ہیں۔ دنیا میں انہیں اعمال کے واسطے بھیجا گیا ہے ورنہ دنیا میں آنے سے پہلے روح

کوخود ایسی حالتیں حاصل تھیں اور حضور دائم میسر تھا مگر اعمال نہ تھے ان کے واسطے دنیا میں بھیجا گیا۔ لہٰذا اعمال اوران کا اجرام مہتم بالشان ٹھہرا اس لیے محققین صوفیاء نے فرمایا ہے کہ استغراق میں ترقی نہیں ہوتی ان سب باتوں سے معلوم ہوگیا کہ تجلی میں جیسی حکمتیں ہیں ویسی استتار میں بھی ہیں اور یہاں ایک فائدہ قابل غور معلوم ہوا۔ وہ یہ کہ باوجود یہ کہ تبلیغ دین وتعلیم احکام مستعدی نفع ہے اوروہ نفع لازمی سے بڑھ کر ہے اس لیے منتہی کواس کا زیادہ اہتمام ہوتا ہے مگر باایں ہمہ یہ ارشاد ہے کہ چونکہ آپ کودن میں بہت کام رہتے ہیں رات کو تہجد اور ترتیل سے قرآن پڑھا کیجئے اور ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ" (آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب فارغ ہوجایا کریں تو محنت کیا کیجئے اور اپنے رب کی طرف توجہ کیجئے) اس سے یہ ثابت ہوا کہ کامل کو اپنے لیے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے اور بعد تکمیل بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیے اور نہ ازخود اس کا وہ حال رہے گا نہ دوسروں کواس سے کامل نفع پہنچے گا کیونکہ بدون خود کئے ہوئے تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔ یہی معنی ہیں قول مشہور "من لاورد له لاوارد له" (جس کے لیے ورد نہیں اس کے لیے وارد نہیں) کی البتہ غلطی ہے کہ منتہی قطع تعلق کرکے دوام خلوت اختیار کرلے۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست ۔۔۔ بہ تسبیح سجادہ و دلق نیست

(طریقت سوائے خدمت خلق کے اور کسی چیز کا نام نہیں، تسبیح مصلی اور گدڑی کا نام نہیں)

لیکن خود اپنے کو قابل ارشاد نہ سمجھنے لگے البتہ جب شیخ اجازت دے دے تو امتثالاً اس کام کو بھی شروع کردے اور پہلے سے اس کی نیت کرنا اور ذکر وشغل اس نیت سے کرنا بھی سخت مضر ہے اوراس نیت کے ساتھ کامیابی مشکل ہے۔

اشتغال بالخلق

وجہ یہ ہے کہ یہ نیت بڑا بننے کا شعبہ ہے اب کامل کی توجہ الی الخلق میں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ اشغال بالحق اس کو یاد حق سے مانع ہوگا سواس شبہ کی منتہی کامل کے حق میں گنجائش نہیں

کیونکہ منتہی کی بسبب وسعت صدر کے یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کو شغل خلق یاد حق سے مانع نہیں ہوتا اور نیز خلق کے ساتھ اس کا مشغول ہونا بھی بامر حق ہوتا ہے اور اس کو مقصود اس سے امتثال امر اور رضائے حق جل وجلالہ ہی ہوتی ہے اور خلق کی طرف اس کی توجہ خدا ہی کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس کو اشتغال بالخلق مانع عن الحق نہیں ہوسکتا بلکہ یہ اشغال خود حقوق خلق سے ہے اور اس آیت میں سبحا طویلا (بہت کام) بطور جملہ معترضہ کے مخلوق کے اس حق کی طرف اشارہ ہے اور مخلوق کا وہ حق یہ ہے سَع عام تربیت ارشاد لیکن اس حق خلق میں حق خالق کو نہ بھولنا چاہیے۔ چنانچہ یہاں بھی مخلوق کے حقوق کے بیان سے پہلے ''قم الیل '' الخ (رات کو قیام کریں) میں حقوق اللہ بیان کیے گئے تھے اور مخلوق کے حقوق کے بعد بھی ''واذکر اسم ربک '' (اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر) فرمایا گیا ہے تو گویا یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اس شغل میں ہمیں نہ بھول جانا۔ اول آخر دونوں جگہ یاد دلایا گیا ہے اور واذکر اسم ربک میں اکثر مفسرین لفظ اسم کو زائد کہتے ہیں اور بعض زائد نہیں قرار دیتے اور اس اختلاف سے یہاں ایک عجیب مسئلہ مستفاد ہوگیا اور اختلاف امتی رحمۃ کا ظہور ہوگیا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ اہم قول کا تو موافق حالت منتہی کے ہے اور عدد زیادہ کا قول موافق حالت مبتدی کے ہے کیونکہ مبتدی کو خود سمعی اور مذکور کا تصور کم جمتا ہے اس کے لیے یہی کافی ہے کہ اسم ہی کا تصور ہوجائے برخلاف منتہی کے اسکو ملاحظہ ذات بلا واسطہ سہل ہے اور حدیث ''ان تعبداللّٰہ کانک تراہ''[1] میں مشہور توجیہ پر منتہی کا طریق اور اس کی حالت کا بیان ہے اور عام کے لیے حضور ایک سہل اور مفید طریق خدا کے فضل سے سمجھ میں آیا ہے اور یہ کہ آدمی یہ خیال کرلے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مثلاً فرمائش کی ہے اور میں اس فرمائش پر اس کو سنا رہا ہوں اس سے بہت آسانی سے حضور میسر ہوجاتا ہے اس کے بعد ارشاد ہے ''وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيلًا'' (اور سب سے قطع کرکے ان کی طرف متوجہ ہوجاؤ) اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تبتل کو صرف واذکر اسم کے متعلق کیا جائے تو اس صورت میں تبتل سے اشارہ ہوگا مراقبہ کی طرف یعنی ذکر کے ساتھ مراقبہ ہو اور

---

[1] الصحیح للبخاری ۶: ۱۴۴، تفسیر ابن کثیر ۶: ۳۵۲، کنز العمال: ۵۲۴۹

ایک یہ کہ تبتل کو مستقل حکم کہا جائے۔ مطلب یہ ہوگا کہ علاوہ احکام مذکورہ کے یہ بھی حکم ہے کہ سب سے قطع تعلق کر و بایں معنی کہ سب کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تعلق علمی اور حبی سے مغلوب ہوجائے اور اثر اس مغلوبیت کا تعارض مقاصد کے وقت معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک وقت میں دو کام متضاد پیش آئے ایک کام تو اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے اور دوسرا غیر اللہ کے متعلق کا اور دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو تو ایسے وقت پر اللہ کے کام کو اختیار کرنا اور خلاف مرضی حق کو چھوڑ دینا بس یہی معنی ہیں قطع تعلق کے نہ یہ کہ کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے۔

تعلق حجاب است ذی حاصلے — چو پیوندھا بگسلی واصلے

(تعلقات غیر اللہ حجاب اور لا حاصل ہیں، جب ان تعلقات کو قطع کرلو گے تو تم واصل ہو گے)

توکل کی ضرورت

البتہ اختلاط میں افراط کرنا مضر ہے اس کے آگے فرماتے ہیں کہ "رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا"، وہ مشرق ومغرب کا مالک ہے اور اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں تو اس کو اپنے کام سپرد کرنے کے قرار دو) مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرو اس سے معلوم ہوا کہ اہل سلوک کے لیے توکل کی بھی ضرورت ہے اور یہ ان کا معمول ہونا چاہیے نکتہ اس توکل کی تعلیم میں یہ ہے کہ اعمال مذکورہ بالا کے اختیار کرنے کے بعد حالت میں تغیر تبدل قبض و بسط شروع ہوگا اس میں ضرورت توکل کی ہوگی اس لیے فرماتے ہیں کہ آخر مشرق ومغرب کا رب ہے اس لیے اس نے جو حالت تم پر وارد کی ہے اس میں کوئی حکمت ضرور ہوگی اور ثابت ہے کہ اکثر قبض میں تصفیہ اور تزکیہ خوب ہوتا ہے اس لیے تم کو تنگ دل نہ ہونا چاہیے اور پھر خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے اس میں کچھ مصلحت رکھی ہوگی اور مشرق ومغرب کا ذکر قبض و بسط کی حالت کے کس قدر مناسب ہے کہ اس میں ظہور ہوتا ہے واردات کا اور مغرب مناسب ہے حالت قبض کے پس مشرق ومغرب کا نمونہ باطن انسان میں بھی پایا گیا۔ "ولنعم ماقیل"

آسانہا است درو لایت ہماں — کارفرمائے آسماں جہاں
درره روح پست و بالا ہاست — کوہ ہائے بلند و بالا ہاست

(ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرما ہیں، روح (باطن) کے راستہ میں نشیب وفراز کوہ وصحرا موجود ہیں)

اور جس طرح مغرب میں آفتاب مستور ہوتا ہے معدوم نہیں ہوتا اسی طرح قبض میں کیفیات سلب نہیں ہوتیں بلکہ مستور ہو جاتی ہیں اور پھر بسط میں گویا طلوع ہو جاتی ہیں۔

معمول اہل تصوف

حاصل کل یہ ہوا کہ اہل سلوک کے لیے یہاں چند ضروری معمول بیان کیے گئے ہیں قیام لیل یعنی تہجد۔ تلاوت قرآن تبلیغ دین ذکر وتبتل توکل اور چونکہ تعلق خلق کی دو قسم ہیں ایک موافقین کے ساتھ اس کا بیان اشارتاً "اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلاً" (بے شک آپ کو دن میں بہت کام رہتا ہے) میں ہوا ہے جس کا حاصل تبلیغ دین اور ارشاد و تربیت ہے چونکہ موافقین سے تعلق محبت ہے اس کے حقوق بوجہ اس کے کہ وہ حالت طبعی ہے تقاضائے حب کی وجہ سے خود بخود ادا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہ ہوئی۔ البتہ مخالف کے معاملہ میں ممکن تھا کہ کچھ افراط تفریط ہو جاتی اس لیے اس کا بیان اہتمام سے فرماتے ہیں: "وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلاً" (اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کیجئے اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ رہیں) مطلب یہ کہ مخالف کی ایذا پر صبر کیجئے اور ان سے علیحدہ رہیے اچھے طور پر کہیں ایسا نہ ہو کہ سختی سے ان کی آتش عناد اور بھڑک اٹھے اور زیادہ تکلیف پہنچائیں ہجر جمیل سے مراد قطع تعلق ہے اس طرح پر کہ قلب میں تنگی نہ ہو پھر جب صبر کی تعلیم دی گئی تو اس تسہیل کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی اپنے انتقام لینے کی خبر سنا کر آپ کو تسلی بھی فرمائی جاتی ہے: "وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلاً" (ان جھٹلانے والوں، ناز ونعمت

میں رہنے والوں کو موجودہ حالت میں چھوڑ دواور ان لوگوں کو تھوڑے دنوں اور مہلت دو) یعنی مخالفین کے معاملہ کو ہم پر چھوڑ دیجئے ہم ان سے پورا بدلہ لے لیں گے یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اہل حق کے مخالفین سے پورا انتقام لیتے ہیں اس لیے بھی مناسب یہی ہے صبر اختیار کیا جائے کیونکہ جب اپنے سے بالا دست بدلہ لینے والا موجود ہے تو کیوں فکر کیجئے خدا تعالیٰ کی اس سنت کے موافق مخالف کو آخرت اور دنیا دونوں میں رسوائی ہو جاتی ہے۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات　　　با در وکشاں ہرکہ درافتاد بر افتاد
ہیچ قومے راخدا رسوا نہ کرد　　　تادلے صاحبدلے نامد بدرد

(اس دیر مکافات میں بہت تجربہ ہم نے کیا ہے کہ جو شخص اہل اللہ سے الجھا ہلاک ہو گیا' خدا تعالیٰ نے کسی قوم کو رسوا نہیں کیا جب تک اس نے کسی صاحب دل کو رنجیدہ نہیں کیا)

الغرض اہل تصوف کی معمول یہ چند چیزیں ہوئیں جن کا بیان اس مقام پر ہوا قیام لیل یعنی تہجد۔ تلاوت قرآن تبلیغ دین ذکر وتبتل توکل' صبر اس لیے اس مجموعہ بیان کو جو کہ اہل تصوف کے معمولات کو بفضلہٖ حاوی اور شامل ہے سیرۃ الصوفی کے لقب سے بلقب کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور ''یایھا المزمل ''(اے چادر لپیٹنے والے) میں دو لطیفے معلوم ہوئے ایک یہ کہ جس طرح آپ بوجہ غایت حزن والم اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھے اسی بعض اہل طریق کا معمول ہوتا ہے کہ چادر ایسے طور پر لپیٹ لیتے ہیں کہ نظر منتشر نہ ہو اور اس کا قلب منتشر نہ ہو اور جمعیت کے ساتھ ذکر میں لگا رہے دوسرا لطیفہ یہ کہ المزمل کے معنی عام میں کمبل اوڑھنا بھی ہوتا ہے تو ''یایھا المزمل '' (اے چادر لپیٹنے والے) میں اشارہ ہوگا لقب ''یایھا الصوفی'' کی طرف کیوں کہ لفظ صوفی میں گو اختلاف ہے مگر ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد موٹا کپڑا کمبل وغیرہ مراد لیا جائے پس صوفی اور مزمل متقارب المعنی ہوئے اور اہل تصوف نے یہ لباس اس لیے اختیار کیا تھا کہ جلدی پھٹے نہیں جلدی میلا نہ ہو اور بار بار دھونا نہ پڑے اور بعض اہل شفقت اس خاص وجہ

سے بھی یہ شعار رکھتے تھے مستور ہونے کی حالت میں بعض لوگ ان کو ایذا پہنچا کر مبتلائے ہمال ہو جاتے تھے اس لیے انہوں نے ایک علامت مقرر کی جیسے آیت "ذَالِکَ اَدْنٰی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ "اس کی نظیر ہے بس یہ حکمتیں تھیں اس لباس میں اور اب تو محض ریاء وسمعہ کی غرض سے پہنچتے ہیں جو بالکل اس شعر کا مصداق ہے۔

نقش صوفی نہ ہمہ صافی بیغش باشد اے بسا خرچہ کہ مستوجب آتش باشد

(صوفی کی موجودہ حالت اگر بالکل درست اور بیغش نہ ہو وہ صوفی نہیں اگر چہ خرقہ پہن لے' اے شخص بہت سے خرقہ آگ میں جلانے کے قابل ہیں)

اس لیے یہ اب قابل ترک ہو گیا ہے۔

بحمداللہ تمت